انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

مستقل سلسلے

اپریل 2016
جلد 39 شمارہ 1
قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ
کرن
37-اردو بازار کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37-اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

ہر انسان کی زندگی میں ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب وہ ٹھہر کر زندگی کے بارے میں سوچتا ہے۔

زندگی کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا زندگی ایک دریا ہے جو اپنے تند و تیز دھارے میں ہم کو بہالئے لیے جارہا ہے، جس کے سامنے ہم بے اختیار ہیں۔

ایک ایک لمحہ تلاطم کا مظہر۔ ایک کے بعد دوسرا مسئلہ۔ کہیں قرار نہیں، کہیں سکون نہیں۔ بے اعتباری بے یقینی کے لمحوں میں زندگی کی معنویت کے بارے میں بے شمار سوال اٹھتے ہیں۔

زندگی میں خوشیوں اور غموں کی ایک بھرپور کائنات ہے۔ زندگی کے سادہ صفحے پر احساس اور جذبوں کی عبارت خود تحریر کرنا پڑتی ہے۔

زندگی بامعنی اس وقت ہوتی ہے جب ہم اس کو کسی مقصد کے تحت گزارتے ہیں۔ زندگی کا روشن پہلو سامنے رکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔

زندگی بہت خوشگوار ہو سکتی ہے اگر ہم اپنی ذات سے دوسروں کو خوشیاں بانٹیں۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ یہ خوشیاں لوٹ کر ہمارے پاس واپس ضرور آئیں گی۔

اور اگر دوسروں کو خوشی نہیں دے سکتے تو اتنا تو ضرور کر سکتے ہیں کہ ہماری ذات کسی کے لیے دکھوں کا موجب نہ بنے۔

اپنے اردگرد کے لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کریں، آپ بھی خوش رہیں گے۔

اس شمارے میں،

- "کھولے پنکھ یادوں نے"، مصنفین سے سروے،
- اداکار آغا علی وحید قریشی سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ زرتش خان کہتی ہیں میری بھی سنیے،
- "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں عاصمہ حسین،
- اس ماہ حورالعین اقبال کے مقابل ہے آئینہ،
- "من مورکھ کی بات نہ مانو"، آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول،
- دل ٹوٹ کے ہارا تھا"، نایاب جیلانی کا مکمل ناول اختتام کی طرف،
- انیلا کرن علی کا مکمل ناول "جو لکھا تھا میرے نصیب میں"،
- "دل آباد کریں"، نازیہ جمال کا مکمل ناول،
- فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ "شاید"، کی آخری قسط،
- "میرے بدگمان" ام ایمان قاضی کا ناولٹ،
- "مٹھی بھر یقین" دیا شیرازی کا ناولٹ،
- نظیر فاطمہ، عابدہ احمد، سعدیہ اقبال اور سحرش فاطمہ کے افسانے اور مستقل سلسلے،

ہمکت،

کرن کتاب "بہار، رنگ اور خوشبو" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقّا، کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

اس مسندِ عزّت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب، گزر ہوئے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں، تو ہے تیرے غضب سے
اور دل میں بھروسا ہے، تو ہے تیرے کرم کا

مانند حباب، آنکھ تو، اے درد! کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

خواجہ میر درد دہلوی
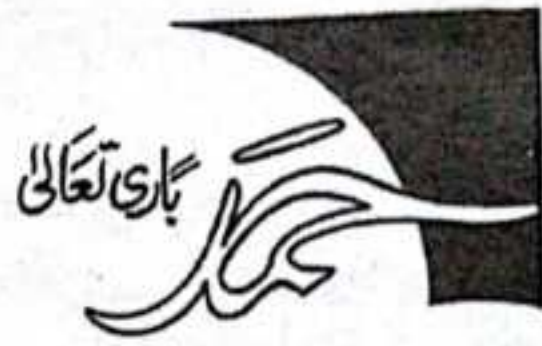
ذکرِ سرکارؐ کا ہوتا رہا دیر تک
یاد میں ان کی روتا رہا دیر تک

یاد میں ان کے آنسو نکلتے رہے
داغ دل کے میں دھوتا رہا دیر تک

لذّتِ ذکرِ احمدؐ کی رعنائیاں
سجدۂ عشق ہوتا رہا دیر تک

روضۂ پاک سے ہم بچھڑے تو پھر
ہجر کانٹے چبھوتا رہا دیر تک

پہنچے انجم جہاں، محفلِ نعت میں
کیف و مستی کا چرچا رہا دیر تک

قمر انجم

آفان وحید قریشی سے ملاقات

شاہین رشید

دھیمے اور نرم لہجے میں بات کرنے والے "آفان وحید" نے اس فیلڈ میں آنے کے بارے میں نہ سوچا تھا نہ پلاننگ کی تھی' مگر انسان کے لیے پلاننگ تو اس کا رب کرتا ہے "آفان وحید" کا روزگار اس فیلڈ سے وابستہ ہونا تھا' سو رب نے راستے ہموار کیے اور سب کچھ سیٹ ہو گیا.... آفان بہترین فنکار اور بہترین انسان بھی ہیں۔ انتہائی کا آپریٹو اور دوسروں کا خیال رکھنے والی شخصیت ہیں۔

★ "کیا حال ہیں جی؟"

☼ "اللہ کا شکر ہے۔"

★ "کیا مصروفیات ہیں.... کیا آن ایئر ہیں کیا انڈر پروڈکشن ہیں؟"

☼ "جی مصروفیات تو ماشاء اللہ کافی ہیں اور جو آن ایئر ہیں ان میں "گزارش" "جدائی" "حسرتیں" "بھائی" "رب رازی" "نیلم کنارے" شامل ہیں کچھ کی شوٹنگ چل رہی ہیں اور ان کے نام ابھی ڈیسائیڈ نہیں ہوئے ہیں۔"

★ "مزا آرہا ہے اس فیلڈ میں؟"

☼ "ایمان داری سے بتاؤں کہ اب میں نے اپنا کام انجوائے کرنا شروع کیا ہے' کیونکہ اداکاری میرے پلان میں شامل نہیں تھی' شروع میں تو میں میڈیا سے دور ہی رہتا تھا کیونکہ بائے نیچر exhibitions (نمائشی) نہیں ہوں۔ مجھے کھلنے میں بہت ٹائم لگا اور مجھے ابھی بھی لگتا ہے کہ مجھے جیسا کھلنا چاہیے تھا نہیں کھلا۔"

★ "شاید اس لیے چیخ و پکار والے اور غصے والے رول آپ نہیں کرتے؟"

☼ "ہاں جی ایسا ہی ہے.... لیکن اصل زندگی میں تو میں بہت غصے کا تیز ہوں.... بلکہ بہت زیادہ تیز ہوں.... لیکن میں نے ایک آدھ ہی کردار ایسا کیا ہے جو غصے والا ہو.... A پلس سے ایک سیریل چلا تھا "میرا رقیب" جو کہ سجل علی کے ساتھ تھا.... اور اینڈ میں میرا رول کافی اگریسو ہو گیا تھا.... اور اب میں ایسا رول کرنا چاہ رہا ہوں۔"

★ "ہاں جی.... اصل زندگی والا رول بھی کرنا چاہیے' ابھی تک تو بڑے فرماں بردار شوہر' بیٹے اور بھائی کا ہی رول کر رہے ہیں؟"

☼ "بالکل.... جی بالکل.... اب اس سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

★ "مجھے یاد ہے کہ آپ کو ناظرین نے سب سے پہلے "تیرے پہلو" سوپ میں دیکھا تھا.... ایسا ہی ہے نا؟"

☼ "جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں.... میری شروعات اس سیریل سے ہوئی تھی۔ اور اس وقت این

سی اے سے پینٹنگ میں گریجویشن کیا تھا اور مجھے اپنے فیوچر کے بارے میں بھی اتنا اندازہ نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے.... تو جب مجھے آفر آئی اس ڈرامے کے لیے تو میں نے سب سے مشورہ کیا اور خود بھی سوچا کہ چلو ٹرائی کر کے دیکھتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے۔ اگر کامیابی نہ ملی تو کچھ اور کرنے کا سوچوں گا.... مگر میرے لیے خوشی کا مقام تھا کہ مجھے اس سیریل میں پسند کیا گیا اور مجھے ایک پہچان دی اور مجھے سیکھنے کا بھی بہت موقع ملا۔"

★ "یہ کب کی بات ہے؟ اور بے شک اس سیریل نے آپ کو پہچان دی مگر اب آپ زیادہ پہچانے جاتے ہیں؟"

※ "یہ بات ہے 2009ء کی.... اور اس لحاظ سے پانچ سال ہو گئے ہیں مجھے اس فیلڈ میں آئے ہوئے.... اور میں نے جتنا بھی کام کیا وہ میرے لحاظ سے بہترین تھا.... مگر جہاں تک پہچان کی بات ہے تو اس دوران ایسا بھی ہوا کہ میں نے چھ چھ مہینے کام ہی نہیں کیا.... کیونکہ میرا دل ہی نہیں کرتا تھا.... اس فیلڈ میں کچھ کرنے کا.... مجھے اسکرپٹ ملتے تھے میں انہیں پڑھ کر ایک طرف رکھ دیتا تھا.... کہ نہیں کرنا.... زندگی میں آپ اپنی عمر کے لحاظ سے بہت سے فیزز سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ ساری چیزیں سیٹ ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو آپ کے دماغ کی یا مائنڈ کی جو دھند ہوتی ہے وہ چھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ تو پھر جب clearity جب بڑھتی ہے تو کامیابی بھی خود بخود آپ کی آنا شروع ہو جاتی ہے۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔ پھر آپ کی فیلڈ کی طرف آتے ہیں؟"

※ "جی.... میرا پورا اور اصلی نام "آفان وحید قریشی" ہے۔ 29 ستمبر کو شہر کراچی میں جنم لیا۔ مادری زبان پنجابی ہے کیونکہ تعلق پنجاب سے ہے۔ دو بھائی اور دو بہنوں میں میرا نمبر تیسرا ہے اور تعلیم کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتایا ہی ہے۔ والد چونکہ ایئر فورس میں تھے تو میری پیدائش کے وقت ان کی پوسٹنگ کراچی میں ہوئی ہوئی تھی۔ تو بس والد صاحب کی وجہ سے کافی شہر دیکھنے اور گھومنے کو ملے' امی ہاؤس وائف ہیں اور سب بہنوں بھائیوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔"

★ "اور آپ؟"

※ "میری بھی ہو جائے گی.... اور میں نے آپ کو بتایا نا کہ جب دھند چھٹنا شروع ہوتی ہے تو چیزیں خود بخود سامنے آنا شروع ہو جاتی ہیں تو جو میرے مقدر میں ہو گی وہ سامنے آجائے گی۔"

★ "فیلڈ میں اتفاقاً" آ گئے.... لیکن کوئی خواب تھا آپ کا کہ فیوچر میں کیا کرنا ہے؟"

※ "ایمان داری کی بات ہے کہ میرے والدین نے کبھی ہمیں اس بات کے لیے فورس نہیں کیا کہ آپ کو یہ بننا ہے۔ بچپن میں میں ڈرائنگ بہت اچھی کرتا تھا تو سب میری تعریف کرتے تھے۔ میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں بہت ذہین طالب علم تھا اور کبھی سیکنڈ بھی نہیں آیا تھا' ہمیشہ فرسٹ آتا تھا تو میری ذہانت کو دیکھتے ہوئے میرے ابو کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں.... لیکن جب انہوں نے پینٹنگ میں میرا رجحان دیکھا تو مجھے "این سی اے" داخل کروا دیا تو میں پلاننگ نہیں کرتا آنے والے سالوں کے لیے.... میں گھبرا جاتا ہوں میں محنت کرتا ہوں اور سب کچھ اپنے اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ویسے میں جو کام بھی کرتا تھا اور کرتا ہوں بہت محنت کے ساتھ کرتا ہوں۔"

★ "شوبز میں اتفاقاً" آئے' مگر یہ اتفاق کیسے ہوا؟"

* "جی شوبز میں تو حادثاتی طور پر ہی آیا... لیکن میں ریڈیو ایف ایم 101 سے پروگرام کرتا تھا ایف ایم 101 سے شروعات کیں اور اس کے بعد ایف ایم 103 پر چلا گیا... ٹین ایج کے زمانے سے میں نے ریڈیو جوائن کرلیا تھا اور ریڈیو جوائن کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ میرا تلفظ اچھا ہو گیا۔ میرے لفظوں کی ادائیگی اچھی ہو گئی... جب شوبز میں اداکاری کی فیلڈ میں آیا تو اداکاری تو مجھے بالکل بھی نہیں آتی تھی لیکن چونکہ لہجہ اور ادائیگی اچھی تھی تو چل گیا۔"

★ "آفر آئی تو کیا احساسات تھے؟... کہ کرسکوں گا کہ نہیں؟"

* "یہی کہ میں تو بالکل بھی نہیں کر سکوں گا... اور میں کرنا بھی نہیں چاہتا تھا... لیکن ڈائریکٹر نے مجھے دو تین بار کال کیں اور کہا کہ اس کردار کے لیے لوگ ساری زندگی خواہش کرتے ہیں' اور تمہیں بڑے سوپ اوپرا میں جس میں سارا چوہدری ایک بڑا نام ہے کے ساتھ لیڈ رول میں لے رہے ہیں تو آپ کیوں انکار کررہے ہیں... میں نے دو چار دن سوچا اور پھر سائن کر دیا... اور بس پھر جیسے راستے کھلتے چلے گئے۔"

★ "اور آپ باقاعدہ کماؤ پوت بن گئے... ریڈیو سے اچھا معاوضہ ملتا تھا؟"

* "ہاں مل جاتا تھا... گزارہ ہو جاتا تھا اور میں نے کون سا گھر چلانا تھا... مجھے یاد ہے کہ جب ریڈیو سے پہلا معاوضہ ملا تو بہت خوش تھا اور اپنے گھر والوں کو مکڈونلڈ لے کر گیا تھا۔"

★ "ایک عام تاثر یہ ہے کہ شوبز کے لوگوں کے بڑے مزے ہوتے ہیں جبکہ جاب والے بہت محنت کرتے ہیں؟"

★ "ایسا بالکل بھی نہیں ہے... بلکہ ہم سب کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے اور مجھے ہمیشہ اس بات پر اعتراض رہا جب لوگوں نے کہا کہ شوبز کی فیلڈ بہت بری ہے... جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس فیلڈ میں بہت پیارے لوگ بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جن سے آپ نہیں ملنا چاہتے... اور میرا خیال ہے کہ شوبز میں برائی تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ ضروری ہے کہ حسن انسان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور ہم لوگوں کی پرابلم یہ ہے کہ ہمیں شکل سے اچھا دکھنا ہے' اور بکنا ہے اور یہ چیزیں انسان کو بہت "ان سیکور" بنا دیتی ہے اور وہ کہتے ہیں نا کہ "سفر جوانی کے بڑے دشوار ہوتے ہیں" اور ہم ہر وقت اس کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں"

★ "بے شک اچھی شکل بہت ضروری ہے۔ مگر میرے خیال میں پرفارمنس زیادہ اہم ہوتی ہے بہ نسبت خوب صورتی کے؟"

* "اہمیت تو پرفارمنس کی ہی ہونی چاہیے' مگر پاکستان کی ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم لوگ پریٹی پریٹی... خوب صورتی... اور گلیمر میں پھنس کر رہ گئے ہیں... اگر آپ باہر کے ملک میں دیکھیں تو لوگوں کو ان کی پرفارمنس پر' ان کی پرسنالٹی پہ ان کا کیریئر بڑھنا شروع ہوتا ہے یہاں تو جیسے ہی آرٹسٹ 35 کی عمر تک پہنچتا ہے اس کے کیریئر کا ڈکلائن (Decline) زوال شروع ہو جاتا ہے... آپ جب یہ ایک چیز میں ڈگری لینے کے قابل ہو جاتے ہیں تو آپ کو ریٹائر کردیا جاتا ہے... مردوں کو یہ تھوڑا فائدہ ہے کہ وہ خواتین کی بہ نسبت تھوڑا زیادہ عرصہ چل جاتے ہیں۔ جبکہ خواتین تو 30 کے بعد ہی آپا' بھابھی اور ماں کے رول میں آجاتی ہیں اور یہ بہت غلط بات ہے۔"

★ "اپنے ڈرامے دیکھتے ہیں؟"

* "جب میرے پہ فیز آتا ہے تو میں دیکھنا شروع کر دیتا ہوں اور جب میں اپنے ڈرامے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا آپ پسند نہیں آتا... جس کی وجہ سے میں تھوڑا مایوس ہو جاتا ہوں... مگر پھر اپنے آپ کو بہتر کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔"

★ "آفان آپ بتا رہے تھے کہ آپ غصے کے بہت تیز ہیں... تو اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ توڑ پھوڑ یا کمرے میں بند کرلیتے ہیں؟"

* "جب غصہ آتا ہے تو کوشش کرتا ہوں کہ حدوں کو پار نہ کروں اور توڑ پھوڑ نہیں کرتا مگر چیختا چلاتا بہت

ہوں اور بے وقوفانہ باتیں کرتا ہوں اور بہت غصہ بھی بہت کرتا ہوں... اور یہ غصہ ہمری فیملی کی طرف سے ملتی ہیں۔ میرے ابو کافی غصے کے تیز ہیں اور شاید ان کی طرف سے غصہ مجھ میں بھی آیا ہے۔ آپ یقین کریں کہ کوئی بہت زیادہ نظر بھر کے دیکھ لے خاص طور پر کوئی لڑکی تو مجھے بہت غصہ آتا ہے اور میں سنا بھی دیتا ہوں۔"

★ "دنیا میں آکر کیا سوچتے ہیں؟"

✲ "یہی کہ میرا دنیا میں آنے کا کوئی مقصد ضرور ہے اور یہ بات میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں کہ جب میں اداکاری کر رہا ہوتا ہوں اور پیسے کما رہا ہوتا ہوں تو مجھے بہت شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کچھ کمی ہے ابھی بھی... لیکن میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان کو اپنی زندگی کا مقصد اس سے مانگنا چاہیے جس نے آپ کو پیدا کیا ہے۔ اللہ سے صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ مجھ سے کچھ اچھے کام کرانا اور مجھے اس دنیا سے آرام اور عزت کے ساتھ اٹھائیے گا... اور بہت زیادہ تعریف سے گھبراتا ہوں کہ کہیں مجھ میں کوئی برا چھپے ہیج نہ آجائے اس لیے تنقید کو بھی بڑے حوصلے کے ساتھ سن لیتا ہوں۔"

★ "کوئی سین جس کو کرنے میں آپ کو اب مہارت ہو گئی ہو؟"

✲ "مجھے اب رونے والے سین کرنے میں بہت مہارت ہو گئی ہے۔ حالانکہ مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے... ایک سیریل میں تو میں کافی رویا تھا تو میں نے ہمایوں سعید سے کہا تھا کہ ابھی میرے کیریئر کا آغاز ہے اور مجھے ایسے رول مل رہے ہیں تو لوگوں نے کہنا ہے کہ یہ تو ہیرو لگتا ہی نہیں ہے۔ تو ہمایوں نے کہا تھا کہ "یاد رکھنا ڈرامے میں جو لڑکا روتا ہے وہی ہیرو بنتا ہے۔ اور ان کی یہ بات بالکل درست نکلی' کیونکہ میں جس سیریل میں رویا ہوں اسی میں مجھے بہت داد ملی ہے۔"

★ "فلم کی ہے؟"

✲ "نہیں کی تو نہیں ہے۔ مگر کرنی ہے کرنا چاہوں گا جب اس فیلڈ میں آگئے ہیں تو پھر کیوں نہ فلم کریں۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ میں ڈرامہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ انڈیا میں جو فلم ہے اور پاکستان میں ڈرامہ ہے۔ پاکستان کی فلم کو اسٹیبلش ہونے میں ابھی ٹائم لگے گا... ابھی سے اس طرح کی باتیں کرنا کہ میں ڈرامہ نہیں کروں گا فلم ہی کروں گا غلط ہے کیونکہ ڈرامہ ہی ہمیں فلم تک پہنچاتا ہے۔"

★ "کوئی کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"

✲ "میں ایک اگریسو کردار بہت شوق سے اور ضرور کرنا چاہوں گا اور اگر مجھے آفر ہوا تو بالکل بھی منع نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ کردار میری شخصیت کے قریب ہو گا۔"

★ "کوئی کردار ایسا کیا کہ جس کو کر کے آپ کو افسوس ہوا ہو؟"

✲ "جی بالکل ایسا کردار کیا... لیکن میں اس کو Mention (مینشن) نہیں کروں گا کہ بری بات ہو جائے گی... وہ ڈرامہ تو ہٹ ہوا تھا مگر مجھے اپنا کردار بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا۔"

★ "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"

✲ "بہت زیادہ... بہت ہی زیادہ کیونکہ کبھی کبھی میں خود بھی اپنی اس عادت سے پریشان ہو جاتا ہوں۔ شوٹ پر ایک ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جاتا ہوں۔"

★ "کوئی کردار ایسا کیا جو آپ کی شخصیت کے قریب تھا؟"

✲ "جی ایک ڈرامہ سیریل "ایک پل" کیا تھا... اس میں مجھے اپنا کردار اپنی شخصیت کے قریب لگا تھا۔"

★ "اب تو بہت جلدی پہچان لیتے ہوں گے لوگ

آپ کو؟"

☼ "جی بالکل.... ابھی گزشتہ دنوں میں ایئرپورٹ پہ تھا تو ایک صاحب بولے کہ آپ کو میں نے "تیرے پہلو" میں دیکھا تھا اور اب میں آپ کے ڈرامے دیکھتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ آپ نے بہت بہت Improve (امپروو) کیا ہے اور پھر اس نے کچھ تلخ اور برے جملے بھی میرے منہ پر بولے.... مگر میں خاموش رہا تو کہا آپ نے برا تو نہیں مانا.... مگر میں خاموش رہا کہ کیا کہتا اسے۔"

★ "اندازہ ہوا ہوگا کہ لوگ آرٹسٹوں کو کتنی گہری نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں؟"

☼ "جی بالکل.... پہلے اتنا احساس نہیں تھا' مگر اب احساس ہوتا کہ ہم دوسروں سے کتنے مختلف ہیں کہ ہمارا تو ایک ایک نوالہ گنا جارہا ہوتا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاپر تک دیکھے جارہے ہوتے ہیں آپ کے ساتھ کون لوگ ہیں آپ بات کس طرح کر رہے ہیں سب دیکھا جارہا ہوتا ہے۔ جبکہ گھر کے اندر کی زندگی بالکل ویسی ہی ہے جیسی عام لوگوں کی ہوتی ہے۔"

★ "کبھی زندگی سے نفرت ہوئی؟"

☼ "نہیں نفرت تو خیر کبھی نہیں ہوئی.... مگر بری اس وقت لگتی ہے جب کچھ رکاوٹیں جو آپ نے خود اپنے لیے پیدا کی ہوئی ہوتی ہیں.... تو بس اس وقت بری لگتی ہیں۔"

★ "آپ دن رات کام کرتے ہیں.... جو کچھ آپ حاصل کررہے ہیں وہ محنت کے بل بوتے پر یا قسمت کے بل بوتے پر؟"

☼ "پیسے کا جو کھیل ہے اس میں قسمت کا عمل دخل زیادہ ہے۔ کیونکہ جو آپ کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ ہی آپ کو ملتا ہے۔"

★ "زندگی کب بدلی؟"

☼ "زندگی تو ہر لمحہ بدل رہی ہے۔ شروع سے بدل رہی ہے اور جب تک زندگی ہے اس نے بدلنا ہی ہے۔"

★ "جھوٹ بولتے ہیں؟"

☼ ہنستے ہوئے.... "اگر میں کہوں کہ نہیں بولتا تو غلط ہوگا۔ ویسے جھوٹ بولنے سے مجھے بہت زیادہ خوف آتا ہے۔ میں کم بولتا ہوں مگر بولتا ضرور ہوں۔ بعض اوقات کسی چھوٹی سچویشن میں بھی بول دیتا ہوں اور کبھی بڑی میں بھی بول دیتا ہوں۔"

★ "آفان آپ بتارہے تھے کہ آپ فجر کی نماز قضا پڑھتے ہیں تو تھوڑا جلدی اٹھ جایا کریں؟"

☼ "یہی بات میری بہن نے بھی کی کہ صبح جلد اٹھ جایا کرو اور نماز پڑھ کر یوگا کیا کرو.... مگر پتا نہیں کیا بات ہے کہ صبح کے اجالے سے مجھے ڈیپریشن ہوتا ہے.... تو صبح کے اجالے سے میری دوستی نہیں ہے۔"

★ "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"

☼ "جب لاہور میں ہوتا تو چھٹی انجوائے کرتا ہوں۔ امی ابو کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتا ہوں ورنہ تو چھٹی بس ایسے ہی گزر جاتی ہے اور ہاں جب لاہور میں امی ابو کے ساتھ ہوتا ہوں تو پھر امی کے ساتھ بیٹھ کر اپنے کام کی ساری روداد بتاتا ہوں.... اور امی جب توجہ کے ساتھ سنتی ہیں تو اچھا لگتا ہے۔"

★ "یہ جو لوگ گوسپ کرتے ہیں.... ان کے بارے میں کچھ کہیں گے آپ؟"

☼ "ہم نے اپنے اوپر مصیبتیں بہت طاری کی ہوئی ہیں۔ بہت سے بوجھ اپنے کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے ہیں اور اتنا بوجھ اٹھا کر ہم کیسے سوچ سکتے ہیں کہ کسی جگہ پہنچ جائیں گے.... تو جو لوگ اس طرح کے گوسپ کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں تو وہ غلط کرتے ہیں۔"

★ "اور آخری سوال کہ منیر نیازی کا ایک مصرعہ ہے کہ "ہمیشہ دیر کردیتا ہوں؟"

☼ "ہاں جی.... میں نے بہت سے معاملات میں کافی دیر کردی ہے تو اس بات کا مجھے پچھتاوا ہوتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے آفان وحید سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے وقت دیا۔

☼ ☼

زرنش خان

شاہین رشید

1 "میرا نام؟"
"زرنش خان۔"

2 "نام کا مطلب؟"
"پھول۔"

3 "پیار کا نام؟"
"Zee۔"

4 "تاریخ پیدائش؟مادری زبان؟"
"1993ء لاہور / ہم پٹھان ہیں۔"

5 "بہن بھائی؟"
"تین بہنوں میں میرا آخری نمبر' ایک بھائی وہ بھی مجھ سے بڑا ہے۔"

6 "شادی؟"
"نکاح ہو چکا تھا پہلے جو کہ تقریباً" 4 سال رہا اور رخصتی 14 فروری 2015ء کو ہوئی۔"
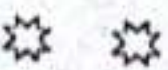
7 "فیوچر پلاننگ؟"
"شادی کرلی ہے۔۔۔ اپنا گھر سنبھالنا ہے اور فیملی بنانی ہے اور پھر ملک سے باہر جا کر اپنا بزنس کرنا ہے۔"

8 "پہلا ڈرامہ؟"
"محبت اب نہیں ہوگی۔"

9 "آن ایر ڈرامہ؟"
"صحرا میں سفر۔"

10 "پسندیدہ چینل؟"
"8xn اور اسٹار ورلڈ۔"

11 "شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟"
"تھائی لینڈ۔"

12 "کھانے میں پسند ہے؟"
"کانٹی نینٹل کھانے پسند ہیں۔"

13 "کوکنگ سے لگاؤ؟"
"چائنیز بنا لیتی ہوں۔ مگر مجھے اپنے شیف کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بہت پسند ہے۔ خاص لذت ہے اس کے ہاتھ میں ویسے میں کھانے پینے کی بہت شوقین ہوں۔"

14 "موبائل فون کے لیے میری سوچ؟"
"وقت کی ضرورت ہے اور میں بھی ضرورت کے وقت ہی استعمال کرتی ہوں۔ اس کے دوسرے فنکشن سے مجھے دلچسپی نہیں۔"

15 "لوگ وقت ضائع کرتے ہیں؟"
"بالکل کرتے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ گھنٹوں فیس بک پہ لگے رہتے ہیں۔۔۔۔ پتا نہیں کیا کرتے ہیں شکر ہے مجھے شوق نہیں ہے۔"

16 "غصے میں کیفیت؟"
"توڑ پھوڑ کرتی ہوں یا پھر اپنے کمرے میں خاموشی سے بیٹھ جاتی ہوں۔ کبھی کبھی کنٹرول نہیں ہوتا۔۔۔ اکثر

غصے میں کھانا پینا بھی چھوڑ دیتی ہوں۔

17 "سوشل ہوں؟"

"جی بہت زیادہ سوشل ہوں۔ ہر وقت دل چاہتا ہے کہ کوئی رونق میلہ لگا رہے۔ تقریبات ہوتی رہیں۔"

18 "تھک جاتی ہوں تو؟"

"تو لونگ ڈرائیو پہ چلی جاتی ہوں۔ مجھے گھومنا پھرنا اچھا لگتا ہے۔"

19 "کون سے تہوار شوق سے مناتی ہوں؟"

"اپنی سالگرہ.... گھر والوں کی سالگرہ.... عید' بقر عید اور رمضان المبارک سب بہت شوق سے مناتی ہوں اور ہاں قومی تہوار بھی.... بس مجھے موقعہ ملنا چاہیے کچھ بھی ارینج کرنے کا۔"

20 "صبح اٹھتے ہی خواہش ہوتی ہے؟"

"کہ مجھے میرے بیڈ پہ ہی ناشتا مل جائے۔"

21 "اپنی فٹنس کے لیے کیا کرتی ہوں؟"

"جوگنگ کرتی ہوں اور اپنی ڈائیٹ کا بہت خیال رکھتی ہوں۔"

22 "میری صبح کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟"

"اگر رات کو جلدی سو جاؤں تو صبح گیارہ بارہ بجے ورنہ پھر اور بھی دیر ہو جاتی ہے۔"

23 "وقت سے پہلے کیا ملا؟"

"بہت ڈھیر ساری کامیابیاں.... میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی کامیابیاں دے گا۔"

24 "برے لگتے ہیں وہ لوگ؟"

"جن کے اپنے اندر اتنی خامیاں ہوتی ہیں مگر وہ دوسروں کی خامیوں پر ایسے تبصرے کر رہے ہوتے ہیں جیسے خود بہت پاک صاف ہوں۔ دوسروں کی برائیوں میں لوگ اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔"

25 "جھوٹ بولتے وقت کیفیت؟"

قہقہہ.... "ڈرتی ہوں کہ پول نہ کھل جائے.... اور سچ بتاؤں ہمیشہ پکڑی جاتی ہوں۔ سب کہتے ہیں تم جھوٹ بولنے میں اناڑی ہو بہت زیادہ۔"

26 "ملکوں ملکوں گھومنے کے بعد دل چاہتا ہے؟"

"کہ یہ سب جگہیں گھومنے کی ہیں.... رہنے کی جگہ تو اپنا دیس پاکستان ہے.... میں تو کسی ملک کی شہریت لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

27 "میرے بیگ کی تلاشی لی جائے تو؟"

"تو بہت گند بلا نکلے گا۔ ہر چیز میرے بیگ میں ہوتی ہے۔ جب بیگ سے کچھ لینا ہو تو بہت ہاتھ مارنے پڑتے ہیں۔ اتنا کچھ بھرا ہوا ہوتا ہے۔"

28 "وہ وقت جو بھول نہیں سکتی؟"

"جب میرے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے میرے.... اور ایسا کوئی وقت جس میں امی ابو پریشان ہوں یا میرے لیے فکر مند ہوں یا بیمار ہوں' میں بہت اپ سیٹ ہو جاتی ہوں۔"

29 "مجھے برا لگتا ہے جب؟"

"میرے والدین کے علاوہ میری زندگی میں کوئی مداخلت کرے۔ مجھے نصیحت کرے۔ میں نے نصیحت کا حق صرف اور صرف اپنے والدین کو دیا ہوا ہے اور کسی کو نہیں۔"

30 "شاپنگ میں میری پہلی ترجیح؟"

"پرفیوم اور بیگز۔"

31 "گھر میں کس کے ساتھ بے تکلف ہیں؟"

"سب کے ساتھ ہی.... مگر اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بہت زیادہ فرق ہے جبکہ ان کی عمر اور میری عمر میں "تقریباً" پندرہ سال بڑے ہیں۔ وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں اور یہ بات مجھے ان کی بہت پسند ہے۔"

...ہوں؟"

"کہ کردار کے حوالے سے مجھ پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھائے گا اور نہ ہی میں کوئی ایسا سین کروں گی جس میں مجھے مار کھاتے ہوئے یا تشدد کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہو۔"

35 "سیاست میں میری پسندیدہ شخصیت؟"

"عمران خان.... ان کی بہت بڑی سپورٹر ہوں۔"

32 "خدا سے کوئی شکایت؟"

"توبہ کریں.... اس نے اتنی خوبصورت زندگی دی ہے۔ ایک مکمل انسان بنایا ہے.... بے شمار کامیابیاں دی ہیں۔ اتنی نعمتیں دینے والے سے شکوہ کرنا میرے نزدیک گناہ کبیرہ ہے۔"

33 "کھانا اس وقت تک نہیں کھاتی؟"

"جب تک کھانا تمام لوازمات کے ساتھ ٹیبل پہ نہ ہو میں کھانا نہیں کھاتی۔"

34 "کردار لیتے وقت کس بات کی وضاحت کر دیتی

36 "گھر آتے ہی دل چاہتا ہے؟"

"کہ امی کے گلے لگوں اور ڈھیر ساری باتیں کروں اور سارا دن کی ایک ایک بات امی کے گوش گزار کروں اور اپنا دل ہلکا کروں اور انجوائے کروں۔"

37 "میں شرما جاتی ہوں؟"

"جی.... میں شرما جاتی ہوں.... جب مجھے کوئی رومانٹک سین کرنا پڑتا ہے میں بہت زیادہ ری ٹیکس دیتی ہوں.... ڈائریکٹرز کہتے ہیں کہ پلیز ایزی فیل کریں.... اور اپنے فریم سے نکل آئیں.... یہ ڈرامہ ہے

حقیقت نہیں ہے۔"

38 "ہڑبڑا کر اٹھتی ہیں؟"

"نہیں جی.... بہت آرام سے اٹھنے کے بعد بھی اپنے آپ کو بستر سے اتارنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتی رہتی ہوں۔"

39 "کہاں سکون ملتا ہے؟"

"اپنی ماما کے کمرے میں.... بہت سکون ملتا ہے ان کی گود میں رکھ کر۔"

40 "شادی میں کون سی رسم انجوائے کرتی ہوں؟"

"مہندی کی اور جب لڑکیاں ڈانس کر رہی ہوں۔ دولہا دلہن کے گھر آنے پر دودھ پلائی کی رسم بہت اچھی لگتی ہے۔"

41 "گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟"

"میری سویٹ امی کا غصہ تیز ہے.... اور میرے سویٹ ابو تو میرے رول ماڈل ہیں۔"

42 "بن مانگے رب سے کیا ملا؟"

"بہت کچھ.... پیارے والدین، بہن بھائی.... محبتیں، چاہتیں، کامیابیاں اور اب اتنا اچھا شوہر.... بہت شکر گزار ہوں اپنے رب کی۔"

43 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"ایئر فورس کا.... وردی میں بہت اچھے لگتے ہیں نوجوان اور یہ پروفیشن بھی بہت باعزت ہے۔"

44 "فارغ وقت کے مشاغل؟"

"کہیں لونگ ڈرائیو پہ نکل جاتی ہوں یا پھر پینٹنگ شروع کر دیتی ہوں.... فون پر باتیں کرنے سے مجھے بہت چڑ ہے۔"

45 "شوبز کی بری بات؟"

"لوگ وقت کی پابندی نہیں کرتے.... جبکہ میں بہت زیادہ پابند ہوں وقت کی.... بے شک لوگ گھڑی سیٹ کرلیں کہ زرنش نے اتنے بجے کہا تھا تو اتنے ہی بجے آتی ہو گی۔"

46 "شوبز کی کوئی ایسی شخصیت جس سے ملنا چاہتی تھیں؟"

"ہاں جی.... میں نے "سلیم ناصر مرحوم" کے ڈرامے دیکھے تو مجھے بہت اچھے لگے تھے.... تو بس دل چاہا کہ کاش وہ زندہ ہوتے تو میں ان سے ضرور ملتی۔"

47 "کھانا کس ہوٹل میں کھانا پسند کرتی ہوں؟"

"5 اسٹار یا کوئی بھی معیاری ریسٹورنٹ یا ہوٹل۔"

48 "میری ایک اچھی عادت؟"

"کہ میں اپنی غلطی مان لیتی ہوں اور سوری بھی کر لیتی ہوں۔ لیکن اگر غلطی کسی اور کی ہو تو پھر میں معاف نہیں کرتی۔"

49 "سستی کب سوار ہوتی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے کبھی بھی نہیں، بہت ایکٹو رہتی ہوں۔ ہر وقت فریش رہتی ہوں۔"

50 "اپنے سرہانے کیا چیزیں رکھ کر سوتی ہوں؟"

"لیمپ، اپنی نوٹ بک، پین، پانی کی بوتل اور فون تو لازمی رکھتی ہوں۔"

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- رائنا

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا

اعتذار

اس ماہ تنزیلہ ریاض کے ناول "راہنزل" کی قسط چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر شامل اشاعت نہیں ہے۔ آپ اگلے ماہ یہ قسط پڑھ سکیں گی۔ ان شاء اللہ

عاصمہ حسین

شاہین رشید

کھنکتی سریلی آواز کی مالک عاصمہ حسین گزشتہ پانچ چھ سال سے ریڈیو کی فیلڈ سے وابستہ ہیں۔۔۔ ریڈیو سے انہیں جنون کی حد تک لگاؤ ہے اس لیے انہوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ ریڈیو کو بنایا۔ آج کل 101-FM سے وابستہ ہیں اور شام 5 سے 7 ان کا پروگرام ہوتا ہے۔

محبت بھرے انداز میں بات کرنے والی عاصمہ حسین اس بار "آواز کی دنیا سے" ہماری مہمان ہیں۔

* "کیسی ہیں عاصمہ حسین؟ اور یہ شہزادی کون ہیں؟"

☆ ہنستے ہوئے۔۔۔ "میں ہی ہوں شہزادی۔۔۔ گھر میں سب پیار سے مجھے شہزادی کہتے ہیں۔۔۔ ویسے میرا پورا نام شہزادی عاصمہ حسین ہے۔"

* "او۔۔۔ اچھا۔۔۔ بولنے کا انداز بہت خوب صورت ہے تب ہی تو ایف ایم کی آر جے ہیں۔۔۔ انٹرویو کے آغاز میں میں آپ کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہوں گی ۔۔۔ مثلاً "فیملی بیک گراؤنڈ۔۔۔ اور۔۔۔؟"

☆ "جی میرا پورا نام جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ شہزادی عاصمہ حسین ہے لیکن جب سے میں نے ایف ایم جوائن کیا ہے 'میں عاصمہ حسین کے نام سے ہی آن ایئر آتی ہوں۔۔۔ میں پنجابی راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔۔۔ میرے بابا جانی جن کا انتقال ہو چکا ہے وہ فوج میں تھے اپنی شادی سے پہلے 'بعد میں پھر انہوں نے اپنا بزنس شروع کر دیا تھا۔۔۔ اور جب میں بہت چھوٹی تھی تب بابا جانی کا انتقال ہوا تھا۔۔۔ امی ہاؤس وائف ہیں اور والد کے انتقال کے بعد انہوں نے ہی ہمیں لکھایا پڑھایا اور ہمیں پروان چڑھانے کے لیے بہت محنت کی۔۔۔ اور اللہ میری امی کو طویل زندگی دے 'آج وہ اپنے محنت کا پھل کھا رہی ہیں اور آج بھی وہ ہمیں بہت سپورٹ کرتی ہیں اور ہم بہن بھائی ان کے لیے جتنا بھی کر لیں وہ ان کی محنت کے ایک ذرہ برابر بھی نہیں ہو گا۔۔۔ اور ہم ماشاء اللہ سے چار بہنیں ہیں اور ہمارے چھ بھائی ہیں۔"

* "اب میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ۔۔۔؟"

☆ قہقہہ۔۔۔ "ہم جب سب اکٹھے ہوتے ہیں تو بس پھر ہمیں کسی اور کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔۔۔ ہم خود بہت انجوائے کرتے ہیں اور بہنوں بھائیوں میں میرا نمبر پانچواں ہے۔ میں یکم اپریل 1986ء میں پیدا ہوئی یکم اپریل کی وجہ سے بہت کم لوگوں نے میری پیدائش کو تسلیم کیا تھا۔ (ہنستے ہوئے) پائلٹ اسکول سے میں نے میٹرک کیا اور بی اے پرائیویٹ کیا اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ جاب بھی کی۔۔۔"

* "شادی۔۔۔ پسند سے کریں گی؟"

☆ "جی.... ابھی نہیں ہوئی اور نہ ہی ارادہ ہے اور جب میں ایسا بولتی ہوں تو امی بہت ناراض ہوتی ہیں.... لیکن میں منع کر دیتی ہوں.... میری چھوٹی بہن شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے اور اس کو دیکھ کر میں کہتی ہوں کہ تم نے کیوں اتنی جلدی شادی کرلی۔ لائف کو انجوائے کرتیں.... اور جہاں تک پسند کی بات ہے۔ تو میرے خیال میں دونوں کی پسند ہو تو بہتر رہتا ہے۔ میں وہیں شادی کروں گی جہاں میری امی راضی ہوں گی۔"

* "ریڈیو پہ آمد کیسے ہوئی؟"

☆ "یوں کہ میں ریڈیو کی بہت پرانی سامع ہوں اور 94.6 ایف ایم کو میں نے بہت سنا ہے.... اور اس چینل کو سن سن کر مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی اس سیٹ پہ بیٹھوں اور اسی طرح بولوں جس طرح یہ لوگ بولتے ہیں۔ اور مزے کی بات کہ جب میں اس ایف ایم پہ فون کرتی تھی اور کسی آر جے سے میری بات نہیں ہو پاتی تھی تو میں بھی سوچتی تھی کہ جس دن میں اس سیٹ پہ بیٹھی میں بھی ان سے بات نہیں کروں گی.... تو خیر میں آڈیشن کے لیے گئی ایف ایم 104 یہ کشمور کا چینل ہے اور یہ پہلا چینل ہے جو تین صوبوں میں سنا جاتا ہے۔ صوبہ سندھ، صوبہ پنجاب اور صوبہ بلوچستان.... اور جب میں آڈیشن دینے لگی تو مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا.... تو وہاں ہی کسی نے کہا کہ آپ اتنا گھبرا رہی ہیں تو ہمیں نہیں لگتا کہ آپ کامیاب ہو پائیں گی۔ مگر مجھے تو ایک ہی ہفتے بعد کال آئی کہ ہم آپ کو آپ کی آواز کی وجہ سے بلا رہے ہیں اور پہلے آپ کو ہم ٹریننگ دیں گے پھر پروگرام، یقین مانیے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ اظہار مشکل ہے، میری ٹریننگ ہوئی اور 28 ستمبر 2015ء کو میں آن ایر ہوئی۔ ایف ایم 104 میں، میں نے 4 سال کام کیا ایک سال پروگرام منیجر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔"

* "اتنی اچھی پوسٹ تو چھوڑنے کا خیال کیسے آیا؟"

☆ "اس لیے کہ جس چینل پہ میں کام کرتی تھی وہ بے شک تین صوبوں میں سنا جاتا تھا مگر کراچی میں نہیں سنا جاتا تھا.... تو اللہ کا نام لے کر ایف ایم 101 میں آئی اور جس دن آئی اسی دن مجھے منتخب کر لیا گیا اور مجھے یہاں آ کر بہت عزت ملی ہے.... ویسے تو نیٹ کے ذریعے سے بھی مجھے لوگ سنتے تھے اور دیگر صوبوں میں تو سب ہی سنتے تھے.... مگر کراچی ایک بڑا شہر ہے اور یہاں ایف ایم سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

* "وہ آر جے جو آپ کو اہمیت نہیں دیتے تھے جن کی وجہ سے آپ اس فیلڈ میں آئیں ان سے ٹاکرا ہوا آپ کا؟"

☆ "میں 94.6 میں آر جے بھٹی" کو سنا کرتی تھی اور ملتان کے آر جے "بخاری" کو سنا کرتی تھی اور یہ لوگ اتنی دور ہیں کہ ان سے ٹاکرہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں "آر جے زاہدہ" جو ایف ایم 94.6 میں ہوتی ہیں انہوں نے خاص طور پر اپنے پروگرام میں ذکر کیا کہ عاصمہ حسین اب ہماری کمیونٹی میں شامل ہو گئی ہیں اور وہ بھی آر جے بن گئی ہیں.... تو مجھے بہت اچھا لگا۔"

☆ "ایف ایم 101 میں آ کر زیادہ انجوائے کر رہی ہو یا پہلے کرتی تھیں؟"

☆ "مجھے یہاں اس لیے بہت زیادہ مزا آتا ہے کہ یہاں صرف اور صرف پاکستانی گانے سنوائے جاتے ہیں.... اور یہاں سب کا خیال رکھا جاتا ہے بالکل فیملی ممبرز کی طرح.... اور یہاں سیکھنے کا موقعہ ہر قدم پر ملتا ہے اور اگرچہ مجھے اس فیلڈ میں پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن لگتا ہے کہ ابھی میرا پہلا قدم ہے اور چونکہ یہ ایک سرکاری چینل ہے تو کچھ کہنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا ہے اور بہت سی باتوں کو سوچنا پڑتا ہے...."

* "مطلب آزادی تو نہیں ہے جو دیگر چینلز مطلب ایف ایم میں ہوتی ہے؟"

☆ "میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ پابندی اچھی چیز ہے۔ دوسرے چینلز پہ تو ہم کچھ بھی بول دیتے ہیں.... یا کچھ بھی لگا دیتے ہیں تو یہاں ایسا نہیں ہے۔ اور یہاں کی ایک بات اور بھی بہت اچھی ہے کہ ہم کہیں بھی جائیں تو پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کو انگریزی آتی

ہے اور یہاں پر پہلا سوال یہ ہوتا ہے۔ آپ کی اردو اچھی ہے.... کیونکہ اردو ہماری قومی زبان ہے ہمیں اس پر فخر ہونا چاہیے اور جب ہمارے ملک میں باہر سے کوئی سربراہ آتا ہے تو وہ اپنی زبان میں بات کرتا ہے۔ ہماری اردو میں نہیں.... تو پھر ہم کیوں ان کی زبان میں بات کریں۔"

* "معاوضہ اچھا ملتا ہے؟"

* "جی.... اور آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں کہ جب میں نے ایف ایم 101 جوائن کیا تو جو معاوضہ ہمیں ملتا تھا اس میں ایک ماہ بعد ہی اضافہ ہو گیا.... تو میم ربیعہ اکرم نے کہا کہ تمہارے قدم تو سب کے لیے بہت مبارک ثابت ہوتے ہیں۔"

* "اپنی آواز کا استعمال کہیں اور کیا.... جیسے وائس اوور ڈبنگ وغیرہ؟"

* "نہیں ابھی تو نہیں کیا.... اور پتا نہیں کیا جھجک ہے.... ورنہ مجھے بہت آفرز آتی ہیں.... آپ یقین کریں کہ مجھے ایف ایم 105 والوں نے 107 والوں نے بلایا مگر میں نہیں گئی کہ جہاں سے میں نے اتنا کچھ سیکھا ہے ان کو میری ضرورت ہے اور میں اپنے مفاد کی خاطر ان لوگوں کو کیوں چھوڑ دوں۔"

* "ترقی کے چانس جہاں بھی ملیں اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے؟"

* "104 بھی میں نے اس صورت میں چھوڑا جب مجھے احساس ہوا کہ اب یہاں میری ضرورت نہیں ہے.... تو اس لیے '101 کو فی الحال تو چھوڑنے کا سوچ ہی نہیں سکتی.... ویسے ٹی وی پہ میں بہ حیثیت مہمان کے بھی جا چکی ہوں آج ٹی وی والوں نے بلایا تھا .... پی ٹی وی والوں نے مجھے بلایا تھا ایک پنجابی پروگرام کے لیے.... لیکن پنجابی ہونے کے باوجود میری پنجابی اچھی نہیں ہے۔"

* "اچھا.... یہ بتائیں کہ کب کب ہوتے ہیں آپ کے پروگرام اور فارمیٹ کیا ہوتا ہے پروگرام کا؟"

* "میرا پروگرام جمعرات اور جمعہ کو ہوتا ہے۔ شام

5 بجے سے 7 بجے تک دو گھنٹے لیکن چونکہ میرا گھر ریڈیو سے نزدیک ہے تو جب کوئی نہ آئے تو پھر مجھے بلا لیا جاتا ہے.... میرا پروگرام "ایوننگ ڈرائیو ٹائم" کے نام سے ہوتا ہے۔ اس میں ڈرائیونگ کے ٹپس بھی دیتی ہوں اور "آئی کیو" کے سوال بھی کرتی ہوں.... تو بہت ہلا گلا والا پروگرام ہو جاتا ہے.... اور جب لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اداس بیٹھے ہوتے تھے۔ اکیلے بیٹھے ہوتے تھے لیکن آپ کا پروگرام سن کر ہم فریش ہو گئے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ساری محنت وصول ہو گئی ہو.... اور مزے کی بات یہ کہ شروع شروع میں تو "آئی کیو" کے سوالوں پہ لوگ چکرا کر رہ جاتے تھے مگر اب انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ جواب کیا ہو سکتے ہیں' مگر کچھ لوگوں کے تو سر سے بات گزر جاتی ہے کچھ لوگ فوراً" جواب دے دیتے ہیں۔"

* "آئی کیو کے سوالات بھی خود تیار کرتی ہیں اور اسکرپٹ بھی کیا خود ہی لکھتی ہیں آپ؟"

* "جی آئی کیو کے سوال زیادہ تر میں خود ہی بناتی ہوں اور کوئی اسکرپٹ نہیں ہوتا' جو دل اور زبان پر آتا ہے بول دیتی ہوں اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ

اچانک سے کوئی ٹاپک دماغ میں آجاتا ہے تو پھر اس پہ بھی بولتی ہوں۔"

* "مزے کی جاب ہے۔ وقت کی پابندی تو بہت کرنی پڑتی ہوگی؟"

☆ "جی بہت مزے کی بات ہے کہ جب میں نے یہ جاب شروع کی تھی تو سب نے کہا تھا کہ نیا نیا جنون ہے۔ کچھ عرصے کے بعد تم اسے چھوڑ دو گی مگر ایسا نہیں ہوا' میں آج تک ریڈیو کی جاب کر رہی ہوں۔ اور جہاں تک وقت کی پابندی کی بات ہے تو میں اس معاملے میں بہت پنکچوئل ہوں.... میں نہ کبھی چھٹی کرتی ہوں اور نہ ہی دیر سے پہنچتی ہوں اور جس طرح پہلے دن جوش و خروش کے ساتھ گئی تھی آج بھی ویسے ہی جاتی ہوں.... بس ریڈیو پہ ہم سنے تو بہت شوق سے جاتے ہیں مگر لوگ ہمیں پہچانتے نہیں کہ یہ آواز کی دنیا ہے.... تو مائیک کی آواز میں اور عام بولنے میں کافی فرق آجاتا ہے۔ اس لیے لوگ نہیں پہچان پاتے ہاں کوئی تقریب ہو اور میں جاؤں تو رشتے دار دوست میرا تعارف ریڈیو کے حوالے سے ضرور کراتے ہیں۔"

* "گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے یا گھر میں کوئی نہیں سنتا تمہیں؟"

☆ ہنستے ہوئے.... "سوائے امی کے سب سنتے ہیں۔ میری بھابھی تو میرے پروگرام میں کال کے ذریعے حصہ بھی لیتی ہیں اور امی.... امی تو کہتی ہیں کہ تو گھر میں اتنا بولتی ہے تو پھر ریڈیو پہ کتنا بولتی ہوگی۔ بڑی باجی.... جب کبھی آتی ہیں تو کہتی ہیں تم تو پہلے بھی اتنا بولتی تھیں اب تو تمہاری زبان ہی نہیں رکتی.... تو بس گھر میں ملا جلا رجحان ہے ہر ایک کی تعریف کے مختلف انداز ہیں۔"

* "گھر میں اور بھی کسی کو شوق ہے ریڈیو میں بولنے کا؟"

☆ "نہیں جی.... میرا دل تھا کہ چھوٹی بہن بھی آئے اس فیلڈ میں مگر اس کو شوق ہی نہیں ہوا.... آئی ضرور .... مگر جلدی چھوڑ دیا۔"

* "آر جے بننے کے لیے کیا ضروری ہے؟"

☆ "جب میں نے جوائن کیا تھا اس وقت تو میرے ذہن میں کوئی بات نہیں تھی۔ جب ہم بیٹھے پروگرام کر رہے ہوتے ہیں وہ ایک الگ چیز ہوتی ہے اور جب ہم سن رہے ہوتے ہیں تو ہم ایک عام سامع ہوتے ہیں.... اس لیے مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا.... مگر جب سیٹ پہ بیٹھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ پہلی خوبی تو آر جے میں یہ ہونی چاہیے کہ اس کا موڈ خواہ کیسا ہی خراب یا برا ہو سننے والے پہ ظاہر نہیں ہونے دینا.... کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی سے بات ہی نہ کروں' مگر میں مائیک کے آگے ایسے کھلکھلا رہی ہوتی ہوں کہ سب سمجھتے ہیں میرا موڈ بہت اچھا ہے.... کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ مائیک بند کرتے ہی آنسوؤں بہنا شروع ہو جاتے ہیں.... باقی معلومات وغیرہ کا ہونا.... اچھے انداز میں بات کرنا' گائیڈ کرنا والی خوبیاں ہونا بھی بہت ضروری ہیں اور ہاں یہاں وقت کی اتنی پابندی ہے کہ اگر وقت پر نہیں پہنچتے تو آپ کو واپس بھیج دیں گے اس لیے میں ہمیشہ آدھا گھنٹہ پہلے ہی پہنچ جاتی ہوں۔ ویسے میم ربیعہ اکرم اتنی اچھی ہیں کہ ہم سب آر جیز کے ساتھ بہت کو آپریٹ کرتی ہیں۔"

* "لائیو کالز میں کبھی کسی نے کچھ Behave Miss (مس بی ہیو) کیا؟"

☆ "جب سے 101 میں آئی ہوں کچھ گڑبڑ نہیں ہوئی۔ لیکن جب میں پرائیویٹ چینل پہ تھی تو کسی نے مجھ سے کہا کہ "عاصمہ آپ کی آواز بہت اچھی ہے آئی لو یو" میرے ساتھ میری پروگرام منیجر تھیں اور میرا کمبائن شو چل رہا تھا تو میرے پسینے چھوٹ گئے اور پورے پروگرام میں مجھ سے بات ہی نہیں کی گئی.... اور میری ساتھی زرمینہ ہنسے جا رہی تھی۔ اب تو میں کافی ہوشیار ہو گئی ہوں۔ اب جواب دینا بھی آتا ہے۔"

* "گانے اپنی پسند کے سنواتی ہیں.... اور فوری طور

پر فرمائش کیسے پوری کرتی ہیں؟"

☆ "جی.... اور پہلے سے تیاری کر کے جاتی ہوں اور فوری فرمائش اس طرح پوری کرتے ہیں ہماری لائبریری میں سارے سونگ ہوتے ہیں.... اور میرا شو یہ بھی ہوتا ہے کہ لیسنو کے پیغام لیسنو کے نام (Listener) اور فرمائش ہوتی ہے تو ہم آسانی سے سنوا دیتے ہیں۔"

* "کمبائن شوز بھی کیے.... اور ریڈیو کے علاوہ کیا کیا کرتی ہیں؟"

☆ "جی.... اہم موقعوں پہ' اہم تہواروں پہ کمبائن شوز کرتی ہوں اور چونکہ میں شاعرہ بھی ہوں تو مجھے پہلے سے ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں دن کے لیے آپ نے کچھ لکھنا ہے.... ان شاء اللہ بہت جلد میری شاعری کی کتاب بھی منظر عام پر آجائے گی۔ "پتھر کی مورت" کے نام سے میری کتاب آئے گی اور شاعرہ تو میں ہوں ۔میں بیوٹیشن بھی ہوں اور میرے کام کو بہت سراہا جاتا ہے' پسند کیا جاتا ہے.... اور میرے کلائنٹ مجھ سے بہت خوش رہتے ہیں۔ پہلے تو میرا اپنا پالر تھا۔ مگر اب پرائیویٹ کرتی ہوں۔"

* "چھوڑا کیوں؟"

☆ "چونکہ یہ بہت محنت طلب کام ہے اور زیادہ تر جھک کر کرنا پڑتا ہے تو میری "کمر" میں درد ہو گیا تھا اور اپنی تکلیف کی وجہ سے میں نے ایک لڑکی رکھی تھی جو کہ کافی ضرورت مند بھی تھی مگر ہوا یہ کہ وہ میری گولڈ کی رنگ اور دیگر چیزیں لے کر بھاگ گئی.... تو بس پھر دل ہی اچاٹ ہو گیا...."

* "اپنے مزاج کے بارے میں بتائیں؟"

☆ "جو میرے دل میں ہوتا ہے وہ میرے چہرے سے ظاہر ہو جاتا ہے.... کسی سے ناراض ہوتی ہوں تو وہ چہرے سے ظاہر ہو جاتا ہے.... اور غصے کی تو میں بہت تیز ہوں.... اور پچھتاتی بھی ہوں اپنے غصے پہ دو منٹ کا ہوتا ہے بس.... اور غصے میں روتی بہت ہوں۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں اور روتے ہوئے چھوٹوں کو ڈانٹوں تو سب ہنستے ہیں مجھ پر.... اس پر مزید غصہ آتا ہے۔"

* "گھر داری سے لگاؤ؟"

☆ "گھر کی ذمہ داری سر پر پڑتی ہے تو گھر داری کرتی ہوں ورنہ نہیں کیونکہ اور لوگ ہیں نا.... کام نہ کرنے کی وجہ سے امی نے میرا نام شہزادی رکھا ہوا ہے.... امی کہیں جاتی ہیں تو پھر میں ہی گھر کو سنبھالتی ہوں۔"

* "کھیلوں سے لگاؤ ہے؟"

☆ "جی بالکل.... اب ورلڈ کپ کی پوری کوریج ایف ایم 101 کرے گا اور ایشیا کپ میں میں نے بھی پورا ٹائم دیا ہے اور ورلڈ کپ میں بھی دوں گی۔ بلکہ دے رہی ہوں۔ اور پہلے یہ اسلام آباد کو سہولت تھی اب ہمیں ہے.... تو ہماری نشریات کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔"

* "انٹرویو کرنے کا اتفاق ہوا؟"

☆ "عامر سلیم' ارشد محمود' خوش بخت شجاعت وغیرہ کے بھی کر چکی ہوں۔ تو بہت اچھا لگا ان سب کے انٹرویوز کر کے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عاصمہ حسین سے اجازت چاہی۔

کھولے پنکھ یادوں نے

ادارہ

کھولے پنکھ یادوں نے

الحمدللہ "کرن" کی کامیابی کا ایک اور سال مکمل ہوا۔ کامیابی کے اس سفر میں ہماری مصنفین اور قارئین بہنیں ہمارے ہم قدم ہیں۔ قاری کا مصنف سے دلی وجذباتی تعلق ہوتا ہے۔ ایسا تعلق جو ان کے دلوں کو جکڑے رکھتا ہے۔ ہماری قارئین مصنفین سے ایسی ہی وابستگی رکھتی ہیں۔ قارئین مصنفین کے بارے میں ہمیشہ جاننا چاہتی ہیں۔ لہٰذا "کرن" کی سالگرہ کے موقعے پر مصنفین سے ایک خصوصی سروے کا اہتمام کیا ہے۔ سروے کے سوالات درج ذیل ہیں۔

1 ۔ آپ کا اور کرن کا ساتھ کتنے سالوں پر محیط ہے؟
2 ۔ آپ کی سالگرہ کا دن گھر والوں اور احباب میں کون لوگ یاد رکھتے ہیں اور آپ کو مبارک باد دیتے ہیں؟
3 ۔ لکھنا بہت وقت اور ذہنی فراغت چاہتا ہے۔ لکھنے کے علاوہ آپ کی دیگر مصروفیات کیا ہیں؟
4 ۔ کوئی ایسا واقعہ ہے؟ جس کا مشاہدہ آپ نے بہت قریب سے کیا، لیکن کوشش کے باوجود لکھ نہ پائیں۔

تنزیلہ ریاض

سب سے پہلے کرن اور ادارہ سے وابستہ تمام لوگوں کو سالگرہ کی مبارکباد۔

1۔ میرا اور کرن کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ پندرہ سال تو ضرور ہی ہو چکے ہیں۔ میرا پہلا افسانہ کرن میں ہی چھپا تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے کرن کے لیے ناولز اور ناولٹ لکھے۔ مجھے اس ادارہ سے ہمیشہ ہی بہت پیار اور عزت ملی ہے۔ میرا ایک اور ناول "راپنزل" آج کل آپ لوگ کرن میں پڑھ رہے ہیں۔ یہ ناول میں نے کرن والوں کے بہت اصرار اور محبت بھری فرمائش پر لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ میری اس ادارہ اور کرن سے محبت کا ثبوت ہے۔

2۔) پہلے بہنیں یاد رکھتی تھیں۔ وش بھی کرتی تھیں۔ کارڈز پھول گفٹس والی نزاکتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ اب سب ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اب اپنی سالگرہ سے زیادہ بچوں کی سالگرہیں، ویڈنگ اینیورسری یاد رہتی ہیں۔ اپنی سالگرہ پر بہنوں اور امی سمیت میاں جی بس واٹس ایپ مسیج پڑھا دیتے ہیں۔ اور سچ بات یہ ہے کہ مجھے بھی ان لوگوں کے میسج سے ہی یاد آتا ہے کہ اوہو آج تو میں اس دنیا میں تشریف لائی تھی۔

3۔ لکھنے کے علاوہ پڑھنا میرا مشغلہ ہے۔ پڑھنے والی کوئی بھی چیز میری دسترس سے بچ نہیں سکتی پھر چاہے وہ کوئی کتاب ہو، میرے میاں کی خشک مارکیٹنگ کے جنرل یا پھر ان ہی کی جیب سے نکلنے والی اکیلے کی جانے والی شاپنگ کی رسیدیں۔ میں سب کچھ پڑھتی ہوں۔ اس پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کوکنگ اور بیکنگ میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے۔ نئی نئی ریسپیز ڈھونڈنا اور پھر انہیں بنانے کی کوشش کرنا مجھے اپنی امی سے ورثے میں ملا ہے اور اپنی بیٹیوں کی دلچسپیاں دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ یہ مشغلہ اگلی نسل تک ضرور منتقل ہوگا۔

4۔ واقعہ تو نہیں لیکن کردار ہیں جو مسلسل مجبور کرتے ہیں کہ ان پر بذریعہ قلم طبع آزمائی کی جائے۔ دیکھئے کب وقت ملتا ہے۔

فاخرہ گل

1 ۔ کرن کا اور میرا ساتھ کتنا پرانا ہے، یہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے، لیکن ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ کرن میں میری پہلی تحریر "نامحرم" تھی۔ (شاید چار یا پانچ سال پہلے) جسے

قارئین کی طرف سے بہت اچھا رسپانس ملا اور تب ہی مزید لکھتی گئی۔

2 ۔ ہمارے گھر میں شروع سے ہی سالگرہ کو بہت اہتمام سے منانے کا رواج ہے۔ ہم چھوٹے ہوتے تھے تو ابو اپنی جاب کی وجہ سے بے شک ویسے گھر نہ بھی آپائیں، لیکن ہماری سالگرہ کے لیے ضرور کسی بھی طرح ٹائم نکال کر پہنچتے، اس دن لازمی گھر پر ہوتے تھے۔ خاص طور پر کیمرے میں رول ڈلوایا جاتا، کیک کاٹا جاتا، مختلف اقسام کی چیزوں سے ٹیبل بھرا ہوتا، بہنیں گفٹ دیتیں آج بھی بچپن سے لے کر اب تک کی سال گرہ کی تصویریں دیکھتی ہوں تو امی ابو پر بہت پیار آتا ہے۔ اللہ انہیں سلامت و تندرست رکھے۔ میری پیاری سہیلیاں رضوانہ، فرحت اور فاطمہ کو ہمیشہ سالگرہ یاد رہتی تھی۔ پھر جب شادی ہوئی تو پانچویں دن میری سالگرہ بھی آگئی، بس تب سے اب تک ان سے بھی لیے جا رہی ہوں۔ دونوں بچے جب زیادہ چھوٹے تھے انہیں خود سے کہتی تھی کہ اتنے سی ڈرائنگ بناتے یا چاکلیٹ دیتے، اب انہیں سالگرہ پر گفٹ دینے کی عادت ہوگئی ہے تو اپنے بابا کے ساتھ جا کر خاص طور پر لیتے ہیں اور اب ویسے ہی فیس بک اور موبائل کسی کی سالگرہ بھولنے نہیں دیتے اور سب ہی دوست، احباب ضرور وش کرتے ہیں۔

3 ۔ یہ سچ ہے کہ لکھنا بہت فراغت مانگتا ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ میں بہت کم لکھ پاتی ہوں۔ بچوں کو لک آفٹر کرنا میرے خیال سے سب سے بڑی جاب ہے۔ اس کے علاوہ گھر گرہستی سوشل سرکل، پھر ہسبینڈ کے ساتھ تھوڑی بہت ہیلپ کراتی ہوں، اس کے بعد تھوڑا بہت ٹائم ملے تو لکھنے کا شوق پورا کرتی ہوں۔

4 ۔ بالکل ایسا ایک نہیں، تین چار واقعات ایسے ہیں، جن کا مشاہدہ بہت غور سے کیا، جنہیں لکھا جانا چاہیے تھا، لیکن جاننے کے باوجود ان پر آج تک لکھا نہیں اور نہ ہی کبھی لکھنے کا ارادہ ہے۔

صدف ریحان گیلانی

1 ۔ میرا اور کرن کا ساتھ۔ آہ۔ کیا یاد کروادیا۔ آپ نے بھی بے اختیار زندگی کے وہ حسین ترین دن یاد آگئے جب ہم بھی بے فکریوں کے پنڈولوں میں جھولا کرتے تھے۔ قلم پکڑنے کی کوشش تو بچپن سے ہی شروع ہو چکی تھی دھڑا دھڑا مطالعے سے یہ ہوا کہ اندر چھپی مصنفہ باہر آنے لگی۔

پھر تو قلم رواں ہوتا گیا۔ کرن میں میرا پہلا مکمل ناول تھا "(طلب کی راہوں میں" جو میرے بھیجتے ہی اسی ماہ لگا دیا تھا اور مجھے خبر ہی نہ تھی۔ اور یہ خوش خبری آپی نے دی۔ دعا ہے کہ کرن اسی طرح پھلتا پھولتا رہے۔ آمین۔

2 ۔ سالگرہ کا دن جس کی سب ہی کی زندگی میں خاص اہمیت ہوتی ہے۔ میری زندگی میں بھی ہے اور میں نے کبھی اتنا اہم سمجھا نہیں یعنی کبھی بھی اہتمام سے نہیں منایا۔

نہ میکے میں ایسا کوئی رواج تھا بس یوں ہوتا کہ اچانک سے بھی کسی کو یاد آجاتا۔ "ارے آج تمہاری سالگرہ ہے ناں۔" "اچھا۔ ہیں۔ واقعی۔

ہاں شادی کے بعد یہ ہوا کہ شاہ صاحب۔ یاد رکھنے لگے۔ اچھا سا گفٹ اور مزے دار سا کیک ان کی طرف سے ہوتا ہے اور ذرا خاص اہتمام سے کھانا میں خود بنالیتی ہوں۔ یوں مل جل کر ایک اچھی سی شام منالیتے ہیں اب ماشاء اللہ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ اور اپنی محبتوں کا اظہار بھی کرتے ہیں ابھی چند دن پہلے ہی "سالگرہ" کا دن گزرا ہے اور بچوں نے جس طرح مجھے ہوا لگنے دیے بغیر، چھپ چھپا کر انتظام کیا وہ میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ رہا۔

3۔ بالکل جی۔ بجا فرمایا آپ نے۔ لکھنا لکھانا بہت سا وقت چاہتا ہے اور فریش ذہن بھی۔ یہ کوئی عام مشغلہ نہیں فل ٹائم جاب ہے۔ (اس لیے تو مجھ جیسی زیادہ نہیں لکھ پاتی) میری نظر میں ہر لکھنے والی کی بڑی قدرو منزلت ہے پھر خاص طور پر ایک خاتون خانہ۔ جس کی زندگی پہلے ہی کئی حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ گھر۔ شوہر، بچے، سسرال، میکا، دوست احباب۔

عورت دیوار پر لگے اس مکرامے کی مانند ہوتی ہے۔ جس کی بے شمار لڑیاں ہوتی ہیں اور ہر لڑی میں ان گنت موتی۔ ایک ذمہ داری کے ساتھ دوسری فکر جڑی ہوتی ہے۔

میری مصروفیات کا دائرہ میری گھر سے لے کر میرے لکھنے اور پھر مجھ تک آتا ہے۔ اور اگر اس سارے چکر میں کبھی تھک کر اور بھولے سے کبھی شاہ صاحب کے آگے اظہار کر بیٹھوں تو حضرت فرماتے ہیں۔

"تم سے زیادہ مجھے احساس رہتا ہے تمہارا۔ میں تو چاہتا ہوں تمہارا کوئی ہاتھ بٹانے والی ہو، تم آرام کرو اور وہ کام

کرے۔ اب دیکھو ناں۔ اکثر لکھنے کے لیے تمہیں وقت نہیں ملتا۔ بچے تنگ کرتے ہیں مصروف رکھتے ہیں پھر گھر داری سارا کام تم خود کرتی ہو۔ تم بس پورے دھیان سے لکھا کرو، خوب لکھو۔ نام بناؤ۔ لیکن اس سے پہلے مجھے اجازت نامہ لکھ دو۔ بھئی دوسری شادی کا۔ اور دیکھو مجھے کوئی شوق نہیں وہ تو تمہاری سہولت کے لیے ہی کروں گا وہ تمہاری نوکرانی ہوگی۔" اور میں خوب تپ کر انہیں گھورتی اٹھ جاتی ہوں۔ اور ان کی ہنسی دور تک میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ سچی بات ہے پھر، تھکن کا لفظ بھی کئی ماہ تک زبان پر نہیں آتا۔

4۔ جب میں —— سوالات نوٹ کر رہی تھیں تو آخری سوال سن کر یک لخت ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اور میں نے فوراً —— کہا کہ اس سوال کا جواب میں آپ کو ابھی دے دیتی ہوں۔ "ایسا واقعہ تو میری اپنی ہی زندگی ہے۔"

یوں تو دنیا عجائبات سے بھری پڑی ہے۔ بہت سے واقعات ہوتے ہیں جنہیں آپ بے حد قریب سے دیکھتے ہیں۔ بغور مشاہدہ کرتے ہیں۔ تجزیہ کرتے ہیں نتیجہ نکالتے ہیں۔ اور ان کے محرکات آپ کو لکھنے پر اکساتے ہیں اور اکثر تو جنہیں تھوڑا توڑ مروڑ کر آپ ان پر لکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور خوب واہ واہ بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ اور ہر کہانی میں کوئی ایک واقعہ یا کردار ایسا ضرور ہوتا ہے۔ جسے آپ نے دیکھ یا سن رکھا ہو۔ پھر اس کے گرد تانے بانے بن کر ایک مکمل داستان بن جاتی ہے۔ یہاں میں اپنی دو تحریروں کے نام ضرور بتانا چاہوں گی جو حقیقت سے افسانہ بنے ہیں ان میں کچھ تھوڑا سا فکشن بھی ڈالنا پڑا۔ جو کہ لازمی بھی ہوتا ہے۔ "وفا کے وعدے نبھا دیئے سائیں۔" اور کرن میں شائع ہونے والا میرا افسانہ "بس اک حرف"۔

یہ وہ واقعات ہیں جو میں نے دیکھے اور سنے۔ اور یہاں تذکرہ ہو رہا ہے۔ جن پر نہ لکھا جا سکے تو بہت ایسی باتیں ہیں ایسے واقعات ہیں جو آپ کو حیرت کدے میں لے جاتے ہیں۔ ایک لکھاری کے لیے اپنی ذات پر لکھنا نہایت کٹھن امر ہے۔

میں نے بھی اپنی زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں تلخ و شیریں رویے۔ خالص، نا خالص لہجے، کئی رنگین صبحیں، اور کئی گھور سیاہ شامیں۔ بہت سے لوگ مشورہ دیتے ہیں۔ بھئی کبھی اپنی زندگی پر بھی تو لکھو نا۔" اور میں مسکرا دیتی ہوں۔

کیا یہ اتنا آسان ہے۔

سیما بنت عاصم

سب سے پہلے سالگرہ کی ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔ خداوند کریم یہ آب و تاب ہمیشہ برقرار رکھے۔ آمین۔

1۔ سن تو یاد نہیں۔ پہلا افسانہ خواتین ڈائجسٹ میں 1999 میں شائع ہوا پھر شعاع اور اس کے بعد کرن میں غالباً" اس کے اگلے سال کی بات ہے۔ یہاں اک بات ضرور لکھوں گی کہ کرن میں ہر پرچے سے زیادہ افسانے و ناولٹ شائع ہوئے۔ جس کا کریڈٹ مدیران کو جاتا ہے۔

2۔ پروردگار نے دوستوں کے معاملے میں خوش قسمت ترین بنایا ہے۔ یاد تو گھر والے بھی رکھتے ہیں۔ مگر 7 جولائی کی رات 12 بجے کے بعد سے وشنگ ایس ایم ایس آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ غزالہ عزیز۔ رضوانہ کوثر۔ نزہت جبیں ضیاء اور نام ذہن میں نہیں ان سے بہت ساری معذرت۔

3۔

پھر اک اور دریا کا سامنا تھا مجھے!!!
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

آپ نے بالکل سچ کہا۔ جب پڑھتے تھے تو سوچا کرتے ایسا تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں مگر جب عملاً" اس میدان میں قدم رکھا تو معلوم ہوا۔ "اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کر جانا ہے" سچ بتاؤں، تو گھریلو مصروفیات اب چھوٹی بہن اقرا نے بانٹ لی ہیں۔ میری مصروفیت بس کسی حد تک کچن سے ہے اور بس!

4۔ کیا کہوں ہم کہ اس سوال پر اک زخم چھڑ گیا ہے۔ کچھ چیزیں ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ہم انہیں محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ کھو جاتی ہیں، خالی پن تب

محسوس ہوتا ہے وہ ایک پرانی دوستی تھی۔ جو اک خلش کی نذر ہو گئی۔ کچھ ماہ پہلے شائع ہونے والا افسانہ "خلش" میری زندگی سے جڑی اک تلخ حقیقت۔ نہ جانے وہ خلش میرے اندر سانس لیتی کب سر ابھار گئی اور پھر صفحہ قرطاس پر بکھر گئی۔ اس خلش کی Ending Happy شاید میرے اندر دبی کوئی خواہش تھی۔ اک پرانی دوست سے اک رنجش کی بنا پر قطع تعلق۔ یقین کریں میں کبھی یہ سطریں نہ لکھ پاتی اگر چند روز قبل اس کا کفن میں لپٹا چہرہ عرصہ بعد نہ دیکھا ہوتا۔ اس افسانے کی بنیاد بھی یہ ہی جملہ تھا جواب لکھ رہی ہوں۔ خدارا رنجشوں کی آبیاری نہ کریں۔ اس سے صرف وقت ضائع ہوتا ہے اور حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ کسی کی خطا معاف کر دینا۔ بڑھ کر از خود مل لینا۔ آپ کو خساروں سے بچا لے گا۔ یقین رکھیں۔

دیا شیرازی

1۔ سب سے پہلے تو کرن ڈائجسٹ کا بہت شکریہ جس نے مجھے رائٹر کا اعزاز دیا اور مجھے سروے میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ میں اس میدان میں ابھی نئی ہوں اور خود کو ابھی رائٹر سمجھنا شروع نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے کرن میں جب میرا پہلا افسانہ "مہربان اجنبی" کے نام سے چھپا تھا تو میں کتنی ہی دیر بے یقینی سے دیکھتی رہی تھی کہ واقعی میرا نام لگا ہے۔ میری بڑی بہن جو اکثر مجھے تنگ کرتی تھی کہ تم اتنا لکھتی ہو لگی تو ایک کہانی بھی نہیں ہے۔ اس نے بے ساختہ کہا تھا "ارے دیا تم تو گودڑی کا لال نکلیں۔" یہ وہ یادگار باتیں ہیں وہ خوب صورت احساس جو کرن نے مجھے عطا کیے۔ کرن سے رشتہ میکے کا سا ہے لڑکپن جوانی سب اسی کے ساتھ گزرے ہیں۔ کرن کا انتظار بہت بے تابی سے رہتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ واحد ڈائجسٹ تھا جس میں ہمارے خطوط چھپتے تھے اور اپنا نام چھپا دیکھ کر اپنے ہونے کا احساس جاگتا تھا یہی وہ احساس تھا جس نے کہانیاں لکھنے پہ مجبور کیا۔

2۔ سالگرہ کا دن تو سب ہی کو یاد رہتا ہے۔ ہماری فیملی میں اکثر لوگ اگست کی پیداوار ہیں تو اس مہینے تقریباً" سب ہی کو وش کیا جاتا ہے۔ باقی مہینوں میں پیدا ہونے والے خود آکر بتاتے ہیں کہ آج ہماری سالگرہ ہے۔ میری پیاری دوست جمیلہ — جو نا صرف خود آتی ہے بلکہ بہت اہتمام سے گفٹ پیک کر کے لاتی ہے۔ اس سال تو بہت پیارا سا کیک بھی بنا کے لائی تھی یہ محبت اور توجہ اس کا خاصہ ہے اور آج تک اس کی جگہ کوئی نہیں لے پایا۔ البتہ اب میں دعا کرتی ہوں کہ میری سالگرہ کسی کو یاد نہ آئے تاکہ میں ہر تیسرے چھوتھے سال سالگرہ مناؤں اور اپنی عمر کا صرف ایک سال بڑھاؤں۔ ہاہاہا۔

3۔ لکھنا واقعی ایک وقت طلب کام ہے اور میں بہت کم لکھ پاتی ہوں۔ شادی کے بعد زندگی کچھ الگ ڈھب سے چلنے لگتی ہے۔ بظاہر فراغت مل بھی جائے تو سو کام دماغ میں منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ ذہنی یکسوئی نصیب نہیں ہوتی جو ایک لکھاری کو درکار ہوتی ہے۔ فارغ ٹائم میں گارڈننگ کرتی ہوں مجھے پودے لگانا اور ان کی دیکھ بھال کرنا اچھا لگتا ہے اس کے علاوہ انٹرنیٹ پہ آن لائن شاپس سرچ کرتی رہتی ہوں یہ واقعی بہت دلچسپ کام ہے۔ اس کے علاوہ پاکستانی ڈرامے بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ ڈرامے سے زیادہ توجہ رائٹر پہ رہتی ہے۔ ہماری ساری ہی رائٹرز تقریباً" ڈرامے کی طرف آگئی ہیں سوائے میرے مجھے بھی بہت شوق ہے ڈرامہ لکھنے کا دیکھتے ہیں قسمت کب یاوری کرتی ہے۔

4 ۔ زندگی میں ایسے کتنے ہی واقعات گزرے ہیں جو لکھنا چاہتی ہوں، واقعات جو مجھے متاثر کریں میرے اندر رچ بس جاتے ہیں۔ اپنے بہت سے پیارے رشتوں کو ریت کی مانند اپنے ہاتھوں سے پھسلتے دیکھا ہے اور میں چاہ کر بھی کچھ نا کر پائی، انسان کی بے بسی کا میں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ہم کتنے خواب سجاتے ہیں اور پل میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ تقدیر بہت ظالم شے ہے۔ ایسے بچھڑے لوگوں کے بارے میں لکھنا چاہتی ہوں جنہوں نے جانے میں بہت جلدی کی، لیکن ان کے بچھڑنے کے درد کو میں نے جس گہرائی سے محسوس کیا ہے۔ ابھی میرے قلم میں وہ گہرائی نہیں آئی جب خود کو اس قابل سمجھوں گی ضرور لکھوں گی۔

شہناز صدیقی

یہ کامیابیاں یہ عزت یہ نام تم سے ہے
خدا نے جو بھی دیا ہے مقام تم سے ہے

اپنی فیملی کے بعد یہ شعر صرف اور صرف پیارے کرن کے لیے۔

بقیہ صفحہ 268 پر

آسیہ مرزا

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو چھوڑ کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کرلیتا ہے۔ حازم اپنی سوتیلی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے جبکہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

حوریہ مومنہ کی بھتیجی اپنی پھوپھو اور اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے۔ فضا کی ایک امیرزادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر ملتی رہتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے' وہ فضا کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ اس راستے پر نہ چلے۔

عباد گیلانی جب موت کو اپنے قریب دیکھتا ہے تو مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے۔ حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا۔

(اب آگے پڑھیے)

چوتھی قسط

عباد گیلانی کو اپنا بدن یوں اکڑتا محسوس ہو رہا تھا جیسے بدن یکلخت گوشت پوست کے بجائے شیشے کا بن گیا ہو' اب چٹخا کہ اب چٹخا۔
کتنے زمانے پل بھر میں ہی آنکھوں کے آگے لہرا گئے' کتنے موسم ذہن کی سطح سے ٹکرا کر پلٹنے لگے تھے۔
سچ کہتے ہیں کہنے والے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہوتا کہ کسی معاملے میں آپ کا کتنا نقصان ہوا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس میں آپ کا ہاتھ کتنا ہے۔ سب کچھ اپنے ہاتھوں سے کھو دینے کا دکھ بڑا ظالم ہوتا ہے۔ یہ ایسا زخم ہوتا ہے' جس پر کوئی مرہم اثر نہیں کرتا۔ کھرنڈ نہیں آنے پاتی۔ اس کو پچھتاوے انگارے کی طرح سلگائے رکھتے ہیں۔
حازم ان کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ نہ رکھتا تو وہ شاید اسی پوزیشن میں کھڑے رہتے۔ مومنہ پلٹ کر جا چکی تھی۔ عباد گیلانی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ایک گہری سانس بھری اور یاور علی کی طرف دیکھا۔ یاور علی احساس ندامت سے دل گرفتہ سے بیٹھے تھے۔
"ہاں.... میں نے اسے تمہارے آنے کا نہیں بتایا تھا۔ صرف حازم کا کہا تھا۔" وہ گویا اقرار جرم کر رہے تھے' یوں ملول تھے۔
"اچھا ہی کیا آپ نے.... اس سے پوچھتے تو وہ کون سا مجھے اس دہلیز پر قدم رکھنے کی اجازت دیتی۔ میرا جرم تو اس رویے سے بھی زیادہ قابل سزا ہے۔"
عباد گیلانی کرسی پر یوں بیٹھ گئے گویا قدموں میں جان نہ رہی ہو۔ وہ یک دم نڈھال اور بیمار نظر آنے لگے۔

☼ ☼ ☼

وہ اعصاب شکن احساس کے ساتھ الٹے قدموں پلٹ گئی تھی۔ یاور علی نے اسے روکنا چاہا تھا۔ حوریہ اس کے پیچھے دوڑ کر آئی تھی اور اسے آگے بڑھ کر تھام لیا تھا۔
مومنہ کو اس نے کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ وہ بغیر حیل و حجت مرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ جیسے پیروں سے جسم کا بوجھ اٹھانے سے یک دم انکار کر دیا ہو اور پھر کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر اپنے منتشر اعصاب سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔
ذہن و دل میں اٹھنے والے اس طوفان نے سب کچھ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی بند کھڑکی زوردار جھکڑ سے کھل گئی ہو اور کمرے میں موجود ہر شے ادھر ادھر بکھر کر اڑنے لگی ہو۔ حوریہ ان کے لیے پانی لے آئی' مگر وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔
"پاپا کو یا مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ آپ کا ردعمل اتنا شدید ہو گا۔" حازم کی آواز ابھری تو حوریہ پلٹی۔ وہ دروازے کے فریم میں ایستادہ تھا۔ مومنہ کے رخ موڑنے پر وہ چلتا ہوا اندر آ گیا۔ بلیک پینٹ اور گرے شرٹ میں اس کا نکلتا قد اور بھرپور شخصیت جیسے کمرے میں موجود ہر شے پر حاوی ہونے لگی۔ حوریہ یک دم سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔ وہ مومنہ کے نزدیک چلا آیا۔
"سچ کہتے ہیں خوشی کا کلیہ ہر آدمی کے لیے ایک سا نہیں ہوتا۔ جو بات میرے لیے خوشی کا باعث ہو۔ دوسروں کے لیے اس میں معمولی خوشی بھی نہ ہو۔ شاید یہ اپنے احساسات اور سوچوں سے جنم لینے والی کیفیات ہیں۔ میں شاید زیادہ خوش فہم ہو رہا تھا یہاں آتے ہوئے۔" یہ کہتے ہوئے' وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے مبہم سے انداز میں مسکرایا تھا۔ مومنہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔
ماں بیٹے کے ملاپ کا یہ منظر کیسا تھا' حوریہ سوچ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی ماں کو گلے کیوں نہیں لگا لیتا یا مومنہ پھپھو اس کو سینے سے کیوں نہیں چمٹا لیتیں۔ درمیان میں کوئی انا ہے یا جذبات سرد ہو چکے ہیں۔ وہ دل گرفتہ

سی ہونے لگی۔
مگر یک دم اس نے دیکھا' حازم نے بڑی نرمی اور محبت سے مومنہ کو کندھوں سے تھاما تھا اور مومنہ کا کانپتا وجود بکھر سا گیا۔ وہ حازم کے سینے سے جا لگی۔
حازم نے کسی بڑ شفیق ماں کی طرح اسے اپنے سینے سے لگا کر' اس کے سر پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ کتنی عجیب سی بات ہے نا.... کبھی کبھی خوشیاں اس طرح غم' ندامت' کسک اور ملال سے مل جاتی ہیں' کہ ان کا اپنا کوئی رنگ نہیں رہتا۔ نہ دل پر کوئی رنگ جمتا ہے نہ ذہن میں خوشی کا کوئی تاثر بنتا ہے۔ یہ کبھی حیرت کی اتھاہ میں ڈوب کر حیرت کا ہی حصہ بن جاتی ہیں۔ کبھی کسی کسک اور ملال میں ڈوب کر پھیکی اور بدرنگ ہو کر دل کو لوٹنے لگتی ہیں' تو کبھی آہ بن کر کسی پچھتاوے کے گرداب میں پھنسی بے حقیقت تنکے کی طرح اڑتی دکھائی دیتی ہے۔

☼ ☼ ☼

نارسائی کی دھند کے اس پار
عشق میں کیا ہے جو ہوس میں نہیں

لذت پر کشادگی کے سوا
باغ میں کیا ہے جو قفس میں نہیں

حوریہ آج اپنی اتنی بڑی خوشی فضا سے شیئر کرنے آئی تھی۔ وہ اسے زبردستی کالج پکڑ کر لے آئی تھی۔ وہ مومنہ پھپھو اور حازم کے ملاپ کی داستان اسے سنا رہی تھی.... مگر فضا کے دھیان کی رو کہیں اور بہہ رہی تھی۔
وہ آج.... اس لڑکے سے ملنے کا دن طے کیے بیٹھی تھی اور یہ ہی بات وہ حوریہ کو بتانا چاہ رہی تھی' مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اسے کیسے بتائے۔ وہاں کس طرح لے کر جائے۔
"پھپھو.... بہت خوش ہیں فضا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے سے ایک دن اس طرح ملیں گی۔ حازم اپنے پاپا سے بالکل مختلف ہے۔" اس کا لہجہ کھنک دار تھا۔ جیسے مومنہ کو نہیں خود اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔
کالج یونیفارم اور سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ دھوپ اور جذبات کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں کے کانچ یوں دمک رہے تھے جیسے ان میں ستاروں کا عکس اتر آیا ہوا۔
"کیا بات ہے۔ کیا سوچ رہی ہو۔" وہ اپنی بات ختم کرنے کے بعد فضا کو دیکھنے لگی اور اسے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر اس کے آگے ہاتھ ہلایا۔
"پھر سے پریشان ہو رہی ہو۔ گھر میں کوئی مسئلہ تو کھڑا نہیں ہوا نا۔" فضا نے ایک گہری سانس کھینچی اور گھاس کے تنکے سے کھیلتے ہوئے دل گرفتگی سے ہنس دی۔
"اب کہاں خیریت.... ہر گزرتا دن.... تیر کی طرح چبھ رہا ہے۔ اب زندہ رہنا عذاب لگ رہا ہے۔"
"اپنے آپ کو سنبھالنا تو پڑے گا فضا۔ ورنہ تمہارے رویوں سے ہی تمہاری یہ بات لیک (ظاہر) ہو جائے گی۔"
فضا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کب تک.... آخر کب تک یہ راز.... راز رہے گا.... کب تک چھپے گی یہ بات.... اس کا کوئی حل تو نکالنا پڑے گا۔"
"ہاں تو نکالتے ہیں نا۔" حوریہ نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں اس سے مل کر کوئی حل چاہتی ہوں حوریہ۔"

"ہاں تو... یہی تو میں کہہ رہی ہوں نا... اس سے ملو... اس کو پریشرائز (دباؤ ڈالو) کرو..."

"یہ میں نہیں، تم کر سکتی ہو حوریہ..." وہ اس کی بات کاٹ کر چلانے کے انداز میں بولی۔

"تم مجھے زندگی کی طرف کھینچنا چاہتی ہو... تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا حوریہ... ورنہ... ورنہ میں مرجاؤں گی۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ کر رو پڑی۔

"میں..." حوریہ چپ سی رہ گئی۔

"ہاں تم... تم حوریہ... تم ہی اسے قائل کر سکتی ہو۔ تم اسے میری فیلنگز بتا سکتی ہو۔ اسے میری پریشانی بتا کر... پریشرائز کر سکتی ہو۔ پلیز... پلیز حوریہ... مجھے انکار مت کرنا۔ میرے اردگرد اتنا اندھیرا ہے، اتنا اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں تم ہی روشنی کی کرن ہو میرے لیے۔"

وہ اسے جھنجوڑ رہی تھی۔ التجا کر رہی تھی اور سچ ہی کہہ رہی تھی۔ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

"اوکے... مل لیتے ہیں اس سے بھی..." وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔ فضا کا چہرہ چمک اٹھا۔ آنسوؤں سے لبالب بھری پلکوں کو جھپک کر اس نے حوریہ کو دیکھا۔ دوسرے پل احساس تشکر سے اس سے لپٹ گئی۔

"آئی لو یو حوریہ... آئی لو یو..." اور حوریہ سوچنے لگی کہ وہ جو قدم اٹھانے جا رہی ہے، وہ درست ہے یا نہیں۔ کیا اسے، اس لڑکے سے ملنا چاہیے۔ پتا نہیں وہ... اس سے کس طرح بات کرے گی۔ کیا بات کرے گی۔ کس طرح فضا کے حق میں دلائل دے گی۔

وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی، مگر فضا نے اس کی سوچ کا ہر راستہ بند کر دیا تھا۔

اس کا رونا، گڑگڑانا، تڑپنا، اسے بہت اذیت دے رہا تھا۔ وہ کمزور پڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

7UP کا ٹن گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے وہ گلاس وال کے باہر کے منظر کسی حد تک بے دلی اور غیر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بلیک پینٹ، وائٹ اور بلیک ڈیزائن کی ٹی شرٹ میں اس کا متوازن جسم بے حد جچ رہا تھا اور اپنی پرسنالٹی کی اسی سحرانگیزی سے وہ خود بھی آگاہ تھا۔ ٹن کا آخری گھونٹ بھر کر اس نے خالی ٹن ٹیبل کی سطح پر پٹخنے کے انداز میں رکھا اور موبائل اٹھا کر فضا کے نمبر پش کرنے لگا۔

اسے یہ انتظار ذہنی آزار لگ رہا تھا۔ وہ درحقیقت فضا تنویر سے ملنے کا کوئی شوق، خواہش نہیں رکھتا تھا۔ فضا جیسی لڑکی اس کی نظر میں اس 7UP کے ٹن کی طرح تھی جسے منہ لگا کر گھٹا گھٹ خالی کیا اور ایک طرف پھینک دیا۔

اس کے یہاں آنے کی اصل وجہ فضا تنویر کی وہ سہیلی تھی جس کا ذکر اس نے بارہا فضا کے منہ سے سنا تھا اور ایک عجیب سا تاثر اس کے ذہن میں بنا ہوا تھا۔ فضا کی باتوں سے ایک خاکہ سا بن گیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس خاکے سے کتنا میچ ہے یا متضاد... بقول فضا کے، اس کی سہیلی اسے اپنے اس فرینڈ سے ملنے سے ٹوکتی اور منع کرتی رہی ہے۔ وہ اس کے بوائے فرینڈ کو فلرٹی اور ایک برا انسان کہتی آئی ہے اور آج وہ اس برے انسان سے اپنی اسی سہیلی کے ساتھ خود بہ نفس نفیس آ رہی تھی۔

ایک بھنچی بھنچی تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ وہ فضا کے نمبر پش کر رہا تھا کہ اسی دم ریسٹورنٹ کے مرکزی دروازے سے... فضا اندر داخل ہوتی دکھائی دی، اس کے ساتھ ایک دوسرا سراپا ابھرا... سیاہ چادر کے ہالے میں

مقید چہرہ... دور ہی سے نظروں کو منور کررہا تھا۔ وہ یک دم سنبھل گیا۔

"واؤ..." اس کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں سمٹ گئے۔ اعتماد سے قدم اٹھاتی وہ فضا کے ہمراہ اسی طرف آرہی تھی۔ شاید اس کا اعتماد اس کے بیک گراؤنڈ کا بخشا ہوا تھا یا اس بڑی سی پاکیزہ چادر کا...

"میں نے سوچا تم پنکچوئل تو ہو نہیں... شاید پہنچے بھی نہ ہو گے مگر ویری امیزنگ (بہت حیران کن)... تم تو خاصی دیر سے آئے بیٹھے لگ رہے ہو۔" فضا اس کے نزدیک آئی 'خالی ٹن' چائے کا خالی مگ اور اورنج جوس کے ادھورے گلاس پر طائرانہ نگاہ ڈال کر حیرت سے بولی۔

مگر وہ فضا کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ نہ دیکھ رہا تھا' نہ اسے سن رہا تھا۔ وہ تو فضا کے ہمراہ آئی حوریہ عادل کو دیکھنے میں محو تھا۔ وہ اس کے تصور کے اس خاکے سے بالکل برعکس ثابت ہوئی تھی۔ فضا کی کسی سہیلی کا کم از کم ایسا تصور اس کے ذہن کے کسی بھی گوشے میں ہرگز نہیں بن سکتا تھا۔

"حوریہ پلیز تم بیٹھو... میں موبائل میں بیلنس لوڈ کروا کر آتی ہوں۔" فضا وہاں سے چند منٹوں کے لیے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔ حوریہ نے سٹپٹا کر فضا کو دیکھا' مگر وہ اپنی بات کرکے رکی نہیں تھی۔ سامنے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ حوریہ گھبرا کر رہ گئی۔ یہ تو اس کے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ فضا نے اسے قطعاً" یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ وہاں سے غائب ہو جائے گی۔

"ارے مس حوریہ... بیٹھے نا آپ... جب یہاں تک کا سفر طے کر ہی لیا ہے تو اب یہ ہچکچاہٹ کیسی..." اس نے فضا کے جاتے ہی اس کی گھبراہٹ کو محسوس کرکے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے حوریہ کے بیٹھنے کے لیے کرسی کھینچی۔ ایک خوش گواریت جیسے اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔ ایسی ہی خوش گواریت کا احساس اس کے دل پر بھی ہوا تھا۔

"پلیز...!" اپنی خوش نما آنکھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر وہ یوں مسکرایا۔ گویا ان دونوں کے درمیان ایسی بے تکلفی کی فضا ہمیشہ رہی ہو۔

حوریہ کو بے حد مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ یہاں آکر اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کر ڈالی ہے۔ اسے اس لڑکے سے فون پر ہی بات کرنی چاہیے تھی۔ جانے کیوں وہ اس کی شخصیت کے اثر سے گھبرا کر رہ گئی تھی۔ بے شک اس کی نظروں میں وہ ایک بدکردار لڑکا تھا' مگر بظاہر وہ ایک ویل آف فیملی کا بڑا مہذب لڑکا دکھائی دے رہا تھا۔

"جناب! کیا خاطر کریں۔"

"تھینک یو..." وہ کرسی کھینچ کر باعث مجبوری بیٹھ گئی اور چادر کا کونا کچھ اور آگے کھینچ کر اس نے اپنی سفید چمکتی پیشانی کو چھپا دیا مگر اس کی آنکھوں کے بھورے کانچ پر سایا ڈالتی پلکوں کا اٹھنا جھکنا بڑا دلچسپ منظر پیش کررہا تھا۔

"میرا خیال ہے ان تکلفات کو رہنے دیجیے۔ میں کچھ سیریس (سنجیدہ) ٹاپک پر بات کرنا چاہتی تھی۔ فضا کے حوالے سے..." وہ یک دم بے مہر اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

حوریہ کو اس کی یہ بے تکلفی اور نگاہوں کی تپش گراں گزر رہی تھی۔ اس کا اعتماد ہولے ہولے بکھر رہا تھا' مگر وہ مسلسل خود کو با اعتماد ظاہر کررہی تھی۔ وہ بھی کرسی کھینچ کر اس کے بالکل سامنے ہی بیٹھ چکا تھا اور گویا اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ حوریہ کو وہ بے حد شاطر اور تجربہ کار لگا تھا۔ بات شروع کرنے کے لیے وہ لفظ تلاش کرنے لگی کہ وہ بولا۔

"آپ کو دیکھ کر میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا ہوں۔ کہاں فضا... اور کہاں آپ... آئی مین... کچھ

جوڑی میچ نہیں ہے۔" حوریہ نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"دوستی ایک جذباتی رشتہ ہے' کوئی کپڑوں جوتوں کی جوڑی نہیں کہ میچ ہونی چاہیے" اس کی بات پر وہ بے ساختہ ہلکے سے کھنکار کر ہنس دیا۔

"جذباتی... رشتہ... گڈ... اور شاید اسی رشتے نے آپ کو ایموشنل (جذباتی) کرکے یہاں آنے پر مجبور کردیا ہے۔"

"میرا خیال ہے آپ سمجھ دار بھی ہیں اور موقع شناس بھی... کیا خیال ہے... صرف اسی ٹاپک پر بات نہ کی جائے' جس کے لیے مجھے یہاں آنا پڑا ہے۔"

"کس لیے آنا پڑا ہے۔" اس کی آنکھوں میں حقیقی حیرانگی جھلکی تھی۔

"مجھے قطعاً" علم نہیں۔ آپ وضاحت کردیں۔ فضا نے تو مجھ سے یہ ہی کہا تھا کہ اس کی بیسٹ فرینڈ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے اپنے تراشیدہ لبوں کو باہم دبا کر بیسٹ کے لفظ کو واضح کیا تھا۔ ایک پل حوریہ کو اپنی پیشانی جلتی محسوس ہوئی۔ اسے لگا وہ اسے بھی فضا کے تناظر میں دیکھ رہا ہے۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ہنوز کھیل رہی تھی۔ حوریہ نے سوچا اس سے پہلے کہ وہ اپنا بچا کھچا اعتماد بھی کھودے' بات کھل کر' دوٹوک کرکے اس ملاقات کا اینڈ کرلے۔

"دراصل میں آپ سے ایک ریکوئسٹ کرنا چاہتی تھی کہ آپ پروپر طریقے سے فضا کا ہاتھ تھام لیں۔ اس سے شادی کرلیں۔ وہ آپ کو سچے دل سے چاہتی ہے اور..."

"اے... اے... ایک منٹ..." اس نے حوریہ کی چلتی زبان کو بریک لگانے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے باہم سکڑے تھے اور مسکراہٹ لحظہ بھر گم ہوئی تھی۔

"سچی محبت... کا اینڈ شادی ہی ہوتا ہے کیا؟" حوریہ نے نا سمجھ میں آنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا' تو وہ بولا۔

"مس حوریہ... فضا سے پہلے ذرا یہ پوچھ تو لیں گے اسے سچی محبت کا مطلب پتا ہے۔ سچی محبت ہوتی کیا ہے۔ وہ جانتی ہے۔ واہ... سچی محبت... ہا۔" اس کا انداز سراسر تمسخرانہ تھا۔ حوریہ' تاہم اپنے اعصاب کنٹرول میں رکھتے ہوئے نیم استہزائیہ انداز میں خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواباً" بولی۔

"تو آپ کو سچی محبت کا مطلب پتا ہے مسٹر..."

"بابر..." اس نے جلدی سے اپنا تعارف کرایا۔ "بابر... گیلانی۔"

حوریہ ایک ہلکی سی ہانس بھر کر رہ گئی۔ وہ یک دم سگریٹ کا پیکٹ ٹیبل کی سطح سے اٹھا کر کھولتے ہوئے بولا۔

"سوری... مگر کسی بھی خوب صورت موقع پر مجھے سگریٹ کی طلب ہونے لگتی ہے۔ آپ مائنڈ نہ کریں تو میں سلگالوں۔" وہ ایک سگریٹ نکال کر لبوں کے بیچ دباتے ہوئے بولا۔

حوریہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اسے اپنا ذہن کھولتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ "فضا کو بھی یہی کمینہ ملا تھا۔ شاید اس کی یہ ادائیں ہی اسے گھائل کرگئی تھیں۔ وہ سگریٹ سلگا کر ہلکا سا کش لگا کر بولا۔

"میں نے کبھی فضا سے محبت کا کوئی دعوا ہی نہیں کیا۔ کجا سچی محبت..." وہ سگریٹ پیتے ہوئے' بہت سکون سے بول رہا تھا۔

"ہمارے درمیان اس ٹاپک پر آئی مین محبت وحبت پر کبھی بات نہیں ہوئی۔"

"تو پھر... وہ سب کیا تھا۔" حوریہ شاکڈ سی اسے دیکھنے لگی۔ اسے لگا یہ شخص آہستہ آہستہ اپنا مہذب چولا اتار رہا ہے۔

"فلرٹ... دھوکا یا... ایک لڑکی کو شادی کے نام پر بے وقوف بناتے رہنا اور پھر..."

"اور... پھر..." وہ اس کے رکنے پر بولا اور ٹیبل کی سطح پر ہتھیلی ٹکا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

حوریہ نے نظروں کا رخ بدل لیا اور سامنے والی کلاک کو تکتے ہوئے ایک بھنچی بھنچی سانس کھینچی۔

"کیا یہ دھوکا نہیں ہے۔ آپ اپنے ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہیں، مطمئن ہیں، یہ سب کر کے۔" وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بولی۔

"وہ جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، اس کے لیے اب اس ماحول میں سانس لینا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ اسے خواب آپ نے دکھائے تھے۔ تعبیر دینا بھی آپ کا فرض ہے۔"

"چہ خوب... اب اس گھرانے میں سانس لینا دشوار ہو گیا ہے اور اس وقت جب ایک اجنبی مرد کے ساتھ گھر سے نکلنا... اس کے ساتھ گھومنا پھرنا... شاپنگز کرنا... خود کو کیش کرانا... آسان تھا۔ تب سانس لینا دشوار نہیں تھا۔ کوئی خوف، ڈر نہیں تھا۔"

"پلیز... آپ کو کوئی حق نہیں بنتا تھا کہ اس کی عزت کو پامال کرتے۔ زمین پر پڑے ہوئے مال پر بھی نظر ڈالنے کا حق نہیں ہے۔ چہ جائیکہ مال غصب کرنا... اس نے جرم کیا ہے تو آپ بھی اس کے جرم میں برابر کے شریک ہیں، مگر سزا صرف اس کے کھاتے میں کیوں؟"

وہ اپنا اعتماد بحال کر چکی تھی۔ اس کی چمکتی ریشمی لٹ اس کی چادر کے ہالے سے نکل کر اس کے چہرے پر جھول رہی تھی۔ بابر کے لیے یہ بڑا انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ ایک پل اس کا دل چاہا وہ اس کے سرخ ہوتے چہرے پر جھولتی اس لٹ کو چھولے، مگر وہ فضا تنویر نہیں تھی۔ تاہم وہ پرشوق نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے اس کی جانب جھکا۔

"ویری امیزنگ..." حوریہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔

"فضا کی فرینڈ... اور ایسی..."

"آپ..."

"او کے... او کے... میں اپنا جرم مانتا ہوں۔" وہ کرسی کی پشت پر ٹکتے ہوئے بولا۔ "مگر یہاں کتنے مجرموں کو سزا ملتی ہے مس حوریہ..." کسی کم سن بچے کی سی معصومیت سموتے ہوئے اور مسکینیت طاری کرتے ہوئے حوریہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر یوں سینے کی تہہ سے سانس کھینچ کر فضا کے سپرد کی گویا ساری فضا کو افسردہ کر دے گا۔

"آپ اسی لڑکی کے لیے بہت مخلص اور دکھی دکھائی دے رہی ہیں۔ مجھے فضا پر تو نہیں، آپ پر اب بڑا ترس آرہا ہے۔ جو آپ فضا جیسی لڑکی پر ترس کھا رہی ہیں۔"

"آپ بھی ترس کھالیں تھوڑا اس پر... کیا یہ اچھا نہیں ہوگا۔" وہ جل کر بولی۔

"ترس... وہ تو ترس کے بھی قابل نہیں ہے۔" حوریہ نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"آپ... اتنے برے خیالات رکھتے ہیں اس کے لیے۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔

"اس سے بھی زیادہ... مگر خیر... آپ مزید دکھی ہوں گی سن کر... اور سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کو دکھی نہیں کرنا چاہتا۔"

حوریہ نے لب بھینچ لیے۔ اسے لگا اس کی نگاہیں اس کے وجود میں گڑھتی جا رہی ہوں۔ وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے وہ بن چادر کے اس کے سامنے کھڑی ہو۔ ایسی آر پار اتر جانے والی نظریں تھیں۔ وہ جھٹکے سے کرسی دھکیل کر اٹھنے لگی کہ اس کا مضبوط ہاتھ اس کے ہاتھ پر آکر گر گیا۔ اس میں ہلکا دباؤ تھا اور پھر اسی طرف اتنا جھکا کہ پرفیوم کی تیز مہک حوریہ کے نتھنوں سے ٹکرا کر اس کے حواس جھلسانے لگی۔

"ایک شرط پر میں آپ کی بات مان سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ لودیتا ہوا تھا۔
"آج کا ڈنر آپ میرے ساتھ میری پسندیدہ جگہ پر کریں گی۔۔۔ اور۔۔۔" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ حوریہ کا ہاتھ بڑی سرعت سے اس کی گرفت سے نکل کر چٹاخ کے ساتھ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ وہ غصے سے پاگل ہوتی۔ شیرنی کی طرح کرسی دھکیل کر اٹھی تھی۔
"تم۔۔۔ بدکردار۔۔۔ انسان۔۔۔ میں فضا نہیں ہوں' جو تمہاری مکروہ باتوں اور اس بناوٹی پرسنالٹی پر مرمٹوں گی۔ تمہاری اس دولت کی اسیر فضا ہو سکتی ہے' میں نہیں۔ اتنی گھٹیا بات کرنے کی ہمت کیسے ہوئی تمہاری۔"
"حوریہ۔۔۔ حوریہ۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔ کیا کر رہی ہو یہ۔۔۔" فضا لپک کر اسے پکڑنے لگی۔ وہ دوبارہ اس پر جھپٹی تھی۔
"اتنی گندی بات۔۔۔ تم نے سوچی بھی کیسے۔ میں۔۔۔ میں تمہارا سر پھاڑ ڈالوں گی۔" ریسٹورنٹ کی فضا میں یک دم گویا دھماکا ہوا تھا۔ گو کہ دن کا وقت تھا۔ اکا دکا ہی میزوں پر لوگ تھے۔ وہ بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ریسٹورنٹ کی انتظامیہ بھی حرکت میں آگئی تھی۔
"میری نظر میں' تو تم پہلے بدخصلت اور بدکردار انسان تھے۔ آج ثبوت بھی دے دیا اس کا۔"
اس اچانک حملے کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھا۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ وہ تھپڑ کھا کر حواس باختہ ہو گیا تھا اور ٹھٹھرے منجمد اعصاب کے ساتھ کھڑا تھا۔ فوری طور پر اس کے ہاتھ سے اپنی ٹی شرٹ بھی چھڑا نہیں سکا تھا۔
فضا' حوریہ کو پکڑ کر زبردستی ریسٹورنٹ سے باہر کھینچنے لگی۔
حوریہ کے آنکھوں کے بھورے کانچ دہکتے ہوئے انگارے ہو رہے تھے۔ اس کے تن بدن میں آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اس پر ایک نفرت بھری نظر ڈال کر فضا کو ایک طرف دھکیل کر تقریباً" دوڑنے کے انداز میں ریسٹورنٹ کے مرکزی دروازے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼
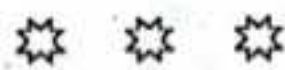
درد بس ریت نہیں ہے کہ اسے روند کر آگے بڑھ جائیں
درد صحرا ہے
دہکتا ہوا ظالم صحرا
پاؤں پڑ جائے جو اک بار تو جیون جل اٹھے
رات کسی بیتے ہوئے عشق کی
یادوں میں گزار آئے ہو
تم کہ ویراں کبھی ایسے تو نہ تھے
تم کہ خالی کبھی ایسے تو نہ تھے
تم کہ بکھرے کبھی ایسے تو نہ تھے
اے دل عشق زدہ!

حازم نے کمرے میں جھانکا۔ ڈاکٹر زمان نے عباد گیلانی کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی' مگر یاور علی کے گھر سے واپسی پر عباد گیلانی کی طبیعت اتنی بے کل تھی کہ حازم انہیں اسپتال ہی لے آیا تھا۔
"مجھے نیند آ رہی ہے حازم۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ تم گھر جاؤ۔" ان کا لہجہ اتنا دوٹوک اور بے لچک تھا کہ حازم

ناچاہتے ہوئے بھی چلا گیا۔ مگر دوسری صبح ہی صبح وہ اسپتال چلا آیا۔
ڈاکٹر زمان سے میٹنگ کرنے کے بعد وہ ان کے کمرے میں آیا۔ وہ بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹے تھے۔ حازم سمجھ نہ سکا کہ وہ سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں' مگر وہ کچھ دیر گومگو کیفیت میں ان کے سرہانے کھڑا رہا۔ پھر جھک کر آہستگی سے ان کے کندھے کو چھوا۔
"پاپا..." مگر وہ بے جنبش لیٹے رہے۔ حازم نے گھبرا کر ان کا کندھا ہلایا۔ عباد گیلانی نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے کروٹ بدلی۔
"اوہ...!" حازم کو ان کی آنکھیں گہری سرخ دکھائی دیں۔ اس کا باپ رویا تھا۔ اس نے ان کی آنکھوں کی سرخی کو دیکھا۔ اس نے کبھی مردوں کو روتے نہیں دیکھا تھا' اس کے خیال میں رونا کمزوری کی علامت ہے اور اس نے اپنے باپ کو کبھی کمزور پڑتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر آج ان کی آنکھیں کمزور ہونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔
"پاپا..." وہ بے ساختہ ان پر جھک آیا۔
"آئی ایم فائن مائی سن..." (میں ٹھیک ہوں میرے بیٹے...) عباد نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک پل کے لیے آنکھیں زور سے میچ لیں۔ ایک کرب' دل سے نکل کر رگوں میں خون کے ساتھ دوڑنے لگا۔ آنکھیں کھول کر اس نے حازم کو دیکھا۔ حازم کو ان میں پھیلی سرخی کچھ اور تیز محسوس ہونے لگی۔
"میں رات بھر پریشان رہا ہوں... پاپا... آپ کی طرح میں بھی رات بھر جاگتا رہا ہوں۔" وہ کرسی کھینچ کر ان کے سرہانے بیٹھ گیا۔
"کل آپ... جس طرح یاور علی کے گھر سے نکلے تھے اور گھر آنے کی بجائے ہاسپٹل جانے کی ضد کی اور مجھے گھر بھیج دیا۔ یقین کریں پاپا... میں لحہ لحہ بے چین رہا ہوں۔"
"پاگل ہو... دیکھو زندہ ہوں اور بالکل ٹھیک ہوں' ہوں نا...؟" وہ زبردستی مسکرائے اور اٹھنے لگے۔ حازم نے جلدی سے ان کا تکیہ اونچا کر کے بیڈ کراؤن سے لگا دیا۔ وہ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ "گھر میں سب ٹھیک ہے؟"
"جی..."
"بابر کو نہیں دیکھا... دو دن سے... وہ بہت لاپروا سا لڑکا ہے... اس کی مجھے بہت فکر رہتی ہے۔" عباد گیلانی کے لہجے میں فکر جھلک رہی تھی۔ پھر حازم کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولے۔
"عاظمہ بھی ایک لاپروا عورت ہے۔ تم بابر پر نظر رکھا کرو۔ اسے بزنس کی طرف لے آؤ۔ خالی بیٹھے رہنے سے وہ بے کار کے شغل میں مصروف رہتا ہے۔"
"میں کوشش کرتا ہوں پاپا... کہ وہ آفس میں آئے۔" حازم ان کی دواؤں کا کارڈ چیک کرنے لگا' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"آپ نے ماما سے ذکر کیا تھا کہ آپ یاور علی کی طرف جائیں گے یا ان کے بارے میں کچھ شیئر کیا تھا ان سے..."
"ہوں... کیوں کچھ کہا کیا تم سے اس نے...؟" عباد گیلانی تھے چونک کر حازم کو دیکھا۔
"نہیں مجھے تو خیر نہیں کہا کچھ... خیر آپ نے اپنی میڈیسن لی...؟" مگر عباد' حازم کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے تکیے پر سر ٹکاتے ہوئے بولے۔
"ہاں وہ فکر مند ہو گئی ہو گی کہ کہیں میں ماضی کے رشتوں کو پھر سے استوار نہ کر لوں۔ وہ ایک حاسد اور لالچی عورت ہے۔ اسے فقط دولت کی فکر ہے۔ اس کے بٹوارہ ہو جانے کا خوف..." پہلی بار وہ عاظمہ کے بارے میں اس طرح کے ریمارکس دے رہے تھے۔ حازم نے کچھ حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ تاہم کچھ بولا نہیں۔ جبکہ وہ

اپنی ہی دھن میں کہہ رہے تھے۔

"مگر اسے کیا پتا۔ ماضی کا دروازہ میں کھول ہی نہیں سکتا۔ کوئی ٹھنڈا جھونکا میں اپنے لیے چھوڑ کر نہیں آیا۔ بند دروازے کے پیچھے بھی گرم ہوائیں ہیں۔ ان کو کھولنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔" وہ بولتے بولتے جیسے لمحوں میں ہی کسی اور احساس کے جہان میں کھو سے گئے۔ مگر دوسرے پل چونکتے ہوئے حازم کی طرف سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا تمہاری مومنہ سے ملاقات ہوئی۔ تم ملے اس سے.... میرا مطلب ہے اپنی ماں سے.... تم نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"آپ نے کل موقع ہی نہیں دیا۔" حازم کرسی کھینچ کران کے نزدیک بیٹھ گیا۔ پھر مختصراً" بتانے لگا یہ بھی بتایا کہ اسے اپنی ماں سے مل کر بے حد مسرت ہوئی ہے۔ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے بار بار....

"ہاں وہ ایسی ہی ہے اسے ملنے کو بار بار دل چاہے۔" عباد گیلانی دھیرے سے بولے۔ پھر کسی خیال کے سحر سے نکلتے ہوئے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور حازم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تھپکتے ہوئے بولے۔

"مجھے بہت خوشی ہوگی جب تم اپنی ماں کے لیے اپنے دل میں اچھے جذبات رکھو گے۔ اسے میری وصیت سمجھ لو حازم.... میں نے اسے بہت دکھ دیے ہیں۔ اس کی ساری زندگی کو بے رنگ، بے نور کردیا ہے۔ تم اس کا ازالہ کردینا۔ میری زیادتیوں کا ازالہ تو ممکن نہیں ہوگا شاید.... مگر تم.... تم اپنی طرف سے جو خوشی اسے دے سکتے ہو ضرور دینا۔" عباد گیلانی کی آنکھوں میں نمی اتر آئی.... پھر وہ حازم کے چہرے کو کھوجتے ہوئے بولے۔

"تمہیں.... مجھ سے کسی لمحے نفرت تو محسوس ہوتی ہوگی اپنی ماں سے ملنے کے بعد...."

"پاپا.... ایسا کچھ نہیں ہے۔ غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں، ہم فرشتے نہیں ہیں۔ آپ ان باتوں کو بھول جائیں۔" وہ رسان سے بولا۔

"بھول ہی تو نہیں سکتا۔"

"اچھا.... میرے ساتھ باہر آئیے.... کہیں آؤٹنگ پر چلتے ہیں۔ میں کل گھر بھی لے کر جارہا ہوں آپ کو.... ایک ہی ماحول میں رہ کر گھٹن بڑھ جاتی ہے۔" حازم کا انداز قطعی تھا۔ وہ اٹھ کر ونڈو گلاس سے بلائنڈر کی ڈوریاں کھینچنے لگا۔

"یہ گھٹن بیرونی نہیں اندرونی ہے۔" وہ اسے یوں دیکھنے لگے جیسے اس کی یہ کوشش بے معنی ہو۔

"کبھی کبھی بیرونی موسم بھی دل کے موسم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ دیکھیے موسم کتنا (خوش گوار) Pleasant ہو رہا ہے۔" حازم نے شیشوں کی سلائیڈ کھول کر باہر کی فضا میں ایک گہری سانس کھینچی عباد گیلانی مسکرا کر اس کی طرف آگئے۔

"حازم.... تم نے دیکھا حوریہ کو.... بہت پیاری بچی ہے نا...." وہ اسٹک کے سہارے چلتے اس کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولے۔

"ہوں...."

"مومنہ سے بہت اٹیچڈ ہے۔ یاور علی بتا رہے تھے مجھے بھی ایسا ہی لگا۔ اس کی آنکھیں تو بالکل مومنہ جیسی ہیں۔" عباد نے کہتے ہوئے حازم کی طرف تائیدی انداز میں دیکھا۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی ردوبدل نہ دیکھ کر بولے۔

"تم نے شاید غور سے دیکھا نہیں اسے۔"

"پاپا.... یہ ابھی حوریہ کا ذکر کہاں سے آگیا۔"

"بھئی اچھے موسم میں لیے ۔ لوگوں کا ذکر خود بخود نکل آتا ہے۔" وہ پہلی بار کھل کر مسکرائے تھے۔ حازم بھی ہنس دیا۔
"چلیں.... دیکھا آپ نے موسم کا اثر ہوا نا آپ پر...."
"حازم... میں حوریہ سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ یک دم بولے تو حازم حیران رہ گیا۔
"وہ بچی مجھے بہت اٹریکٹ کر رہی تھی۔ حازم کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس خاندان سے نئے رشتے استوار کرلیں۔" حازم چلتے چلتے رک گیا۔ ایک پل اسے لگا اس کے اعصاب پر پتھر لگا ہو۔
"اچھا چلو.... تم پہلے مجھے وہاں لے تو جاؤ۔ میرا دل چاہ رہا ہے یاور علی سے ملنے کو.... بہت زیادہ...." وہ بچوں کی طرح بضد ہو گئے۔ حازم انکار نہیں کر سکا۔ وہ بھی لاشعوری طور پر اپنی ماں سے ملنے کا خواہش مند تھا۔
مگر یہ پاپا... کیا کہہ رہے تھے۔ (نئے رشتے) کمال ہے۔ وہ سر جھٹک کر بولا۔
"آپ بیٹھیے' میں ذرا ڈاکٹر زمان سے مل کر ابھی آتا ہوں۔ پھر چلتے ہیں۔" وہ انہیں کمرے میں چھوڑ کر ڈاکٹر زمان کی طرف نکل گیا۔

☼ ☼ ☼
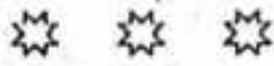
فضا نے اسے بمشکل پکڑا تھا۔ وہ رکشا میں بیٹھ رہی تھی۔ فضا بھی جلدی سے اس کے ہمراہ بیٹھ گئی۔
"حوریہ پلیز... مجھے بتاؤ تو سہی۔ کیا ہوا' تم سے اس نے کیا کہہ دیا۔"
"فضا پلیز تم اتر جاؤ اس رکشے سے...." وہ چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔
"مگر کیوں.... مجھے بتاؤ تو سہی...."
"میری زندگی کی یہ پہلی اور آخری غلطی تھی' جو میں تمہارے کہنے پر بلکہ تمہاری ہمدردی میں یہاں آگئی۔ آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش تک مت کرنا فضا۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہو حوریہ...." فضا نے اس کا پتھرایا ہوا چہرہ حیرت سے دیکھا۔ "دیکھو پلیز ایسے تو مت کہو۔ میرا تمہارے علاوہ اور ہے کون۔"
"سوری.... میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ لہجے کی گرمی دبا کر قدرے نرم ہوتے ہوئے بولی۔ "اب تم جاؤ۔"
"نہیں میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تمہیں ڈراپ کر کے پھر جاؤں گی۔" فضا یہ کہہ کر رکشا والے کو حوریہ کے گھر کا راستہ بتانے لگی۔ حوریہ کا چہرہ اتنا سرد اور سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اندر کسی طوفان کو دبائے ہوئے بیٹھی ہو۔ فضا نے اس کے بعد اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ گھر کے سامنے رکشا رکا تو وہ حوریہ کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔
"اس گھٹیا آدمی سے جتنی بھی گھٹیا پن کی امید کی جائے کم ہے۔ سوری میری وجہ سے تم ہرٹ ہوئیں۔"
"تمہیں ہر بات بہت دیر میں سمجھ میں آتی ہے۔ پہلے آجاتی تو اتنے طوفان سے نہ گزرنا پڑتا۔" وہ طنزیہ بولی اور چادر اور شولڈر بیگ سنبھال کر رکشے سے اتر گئی۔
رکشا پھڑپھڑاتا آگے بڑھ گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑی اپنے اعصاب کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر ایک گہری سانس بھر کر دروازے کی ڈور بیل بجانے لگی۔

☼ ☼ ☼

جس طرح بہت کچھ پانے کے بعد تھوڑا سا کھونا بھی بہت لگتا ہے۔ اسی طرح بہت کچھ کھونے کے بعد تھوڑا سا پانا بھی بہت لگتا ہے اور حازم کو سینے سے لگا کر اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ جیسے دل کے تپتے صحرا میں

بارش برس گئی ہو۔

''آہ عباد... کتنی بڑی دولت مجھ سے چھین لی تھی تم نے۔ میں تمہیں کیسے معاف کروں۔ بابا کہتے ہیں تم بستر مرگ پر موت کی آہٹیں سن رہے ہو۔ انہیں کیا پتا ان کی بیٹی تو برسوں سے مرگئی ہے۔ مرجانے والے انسان کو تو لوگ دفنا دیتے ہیں۔ مگر جو زندہ جسم میں مردہ روح لیے لیے پھر رہا ہو۔ اپنا لاشہ خود اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہو۔ اس کا کیا...؟ اس کے غم کا مداوا کیا ہو...؟ کیسے ہو...؟''

''پھپھو...'' حوریہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔ مومنہ دوپٹے کے پلو سے جلدی سے آنکھوں کے گوشے پونچھنے لگی اور اسی طرف رخ موڑ کر دیکھا۔

''پھپھو...'' وہ یک دم تڑپ کر ان کی گود میں سرڈال کر بلکنے لگی۔ مومنہ اس کے یوں اچانک رونے پر پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا... حور کیا ہوا میری بچی...'' مومنہ نے اسے کندھے سے اونچا کرکے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ مگر وہ بلک بلک کر روتی رہی۔

''چلو... رولو...'' وہ اسے پیار سے تھپکنے لگی اور سوچا کہ آنسوؤں سے دل کا غبار نکلتا ہے تو وجود ہلکا پھلکا ہوجاتا ہے۔ وہ پیار سے اس کے بال سہلانے لگی اور کچھ دیر اسے اپنی گود میں رونے دیا۔ پھر وہ چپ ہوئی' تب حوریہ کا چہرہ اونچا کرکے پوچھا۔

''یہ بتاؤ... یہ اتنا بہت سارونا کیوں آیا میری جان کو۔'' وہ اس کے رخساروں کو اپنی انگلی کے پور سے پونچھتے ہوئے بولی۔

''بس ایسے ہی...'' وہ سیدھی ہو بیٹھی اور چہرہ پونچھنے لگی۔

''ایں... ایسا... ایسا کیسے بھئی...''

''پھپھو... میں بس آپ کے لیے بہت پریشان ہوں۔'' وہ ان سے نظروں چرا کر بولی۔

''آپ کے بارے میں سوچنے لگی' تو سوچتے سوچتے رونا آگیا۔'' مومنہ نے اسے بغور دیکھا' پھر یک دم خود سے لپٹا لیا۔

''پگلی... میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' پھر اس کا سر اونچا کرکے اس کے چہرے کو جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کوئی اور بات تو نہیں ہے نا... یوں بھی میں تمہیں آج کل کچھ بجھا بجھا سا پریشان سا دیکھ رہی ہوں۔''

''ارے نہیں پھپھو... ایسا کچھ نہیں ہے۔'' وہ سنبھل کر زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

''پکی بات...''

''پکی بات...'' وہ ہنسی۔

''اچھا چلو آؤ... میرے ساتھ کچن میں تھوڑی ہیلپ کرو۔''

''کیوں... خیریت... کچھ خاص بنا رہی ہیں۔''

ہوں آؤ' بتاتی ہوں۔ وہ اسے پکڑ کر کچن میں چلی آئیں اور ملازمہ کو ہدایتیں دے کر وہ بھی جلدی جلدی کام میں لگ گئی۔ حوریہ کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

''لگتا ہے کوئی خاص مہمان آرہا ہے۔'' حوریہ نفاست سے کٹے ہوئے کھیرے کو پلیٹ سے ــــــ اٹھاتے ہوئے بولی۔ مومنہ فریج سے انڈے نکالتے ہوئے مسکرائی۔

''ہاں... حازم آرہا ہے۔ رات کا کھانا وہ میرے ساتھ' میرا مطلب ہے ہمارے ساتھ کھائے گا۔''

"واؤ۔۔۔" وہ خوشی سے مسکرا دی۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لائیں پھر تو آپ کی اس خوشی میں مجھے بھی پورا پورا آپ کا ساتھ دینا پڑے گا۔" وہ چھیڑتے ہوئے بولی اور انڈے پھینٹنے لگی۔

مومنہ چکن کو میرینیٹ کرنے کے لیے مسالا مکس کرنے لگی۔ حوریہ نے دیکھا ان کے چہرے پر چمکتی خوشی بے حد نمایاں تھی۔

☼ ☼ ☼

بابر جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گیا تھا اور آنکھیں بند کر کے خود کو کمپوز کرنے لگا۔ عاظمہ جب اندر آئی تو اس کی آنکھیں ہلکی نیند سے بند ہو رہی تھیں۔

"خدا کی پناہ۔۔۔ ہاسپٹل سے دونوں باپ' بیٹا کب اور جانے کہاں نکل جاتے ہیں' آؤٹنگ کے بہانے۔ بابر۔۔۔" عاظمہ کی اس آواز پر انتہائی بدمزا ہو کر اس نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"بابر میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہ اپنی سابقہ بیوی سے ملنے جا رہا ہے۔ آج کل اور حازم کو بھی اسی راہ پر لگا رہا ہے۔"

"مام پلیز۔۔۔ آپ چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے شور مچاتی رہتی ہیں۔ اگلے بندے کا بھی خیال کر لیں۔ کوئی سو رہا ہے' جاگ رہا ہے۔" اس نے کشن ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ناگواری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"پاپا۔۔۔ کیا کر رہے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ سو رہے ہیں۔ جاگ رہے ہیں۔ آپ کو اتنی انکوائری کی ضرورت کیا ہے' کون سا آپ پاپا کے پہلو سے لگی بیٹھی رہتی ہیں کہ ان کے ہونے اور نہ ہونے سے فرق پڑتا ہے آپ کو۔"

"اچھا۔۔۔ بکواس مت کرو۔ بہت سی باتوں کا فرق پڑتا ہے۔ یہ بتاؤ تم یہ منہ لپیٹے کمرے میں کیوں پڑے ہو۔ چہرے پر بھی بارہ بج رہے ہیں۔"

"تھینکس! آپ کو بھی کچھ دکھائی دیا اپنے سوا۔" وہ تمسخر سے سر جھٹک کر ہنس دیا۔ عاظمہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ بابر نے تکیہ سیٹ کیا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کشن بازوؤں میں دبا لیا۔

"حازم اگر پاپا کا خیال رکھتا ہے تو یہ فکر کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ جو کام آپ کو کرنا چاہیے وہ کر رہا ہے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔"

"تم نہیں سمجھتے۔" عاظمہ اس کی بات سن کر سر کو خفیف سا جھٹکتے ہوئے بولی۔

"وہ دونوں ان دنوں جس چکر میں پڑے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ صرف یہاں تک ہوتا تو مجھے کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ مگر بات کچھ اور رخ پر جا رہی ہے۔ خیر۔۔۔ میں خود دیکھ لوں گی۔ تم بتاؤ' کیا بات ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے یہ دن میں اس طرح کمرے میں بستر پر پڑے ہو۔" عاظمہ اسے دیکھنے لگی۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔ بس ذرا سستی ہو رہی ہے۔ امیر علی سے کہیے پلیز مجھے ایک کپ اسٹرونگ سی چائے بنا کر دے۔" عاظمہ سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے اٹھی اور قد آدم آئینے کے سامنے جا کر اپنا سراپا تکنے لگی۔ پھر بالوں کی سیٹنگ درست کرنے لگی' جو اس کی عادت تھی۔

"مجھے رات کو سبینہ کی طرف جانا ہے' گیٹ ٹو گیدر رکھی ہے' تم چلو گے۔ لائبہ بڑا یاد کرتی ہے تم دونوں کو۔۔۔ مجھے کہتی رہتی ہے خالہ آپ کے دونوں بیٹوں کو تو فرصت ہی نہیں ملتی خاندان میں کسی سے ملنے جلنے کی۔"

بابر بے زاری سے ہنسا۔ "مل لیں گے اس سے بھی کسی دن۔ بڑا شوق ہے اسے ملنے کا مجھ سے۔۔۔"

عاظمہ نے اسے بغور دیکھا۔ وہ مبہم انداز میں مسکرا رہا تھا۔ "کہیں میرا ملنا اسے مہنگا نہ پڑ جائے' ماما۔"

"الٹی سیدھی ہانکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔" عاظمہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔
"موڈ ہوا تو آجانا رات کو۔۔۔۔" وہ کمرے سے نکل گئیں۔
"اونہہ! فالتو ٹائم نہیں ہے یہاں۔ پہلے ہی دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔" وہ ہلکے سے بڑبڑایا اور کشن پھینک کر سگریٹ اٹھا کر سلگانے لگا۔
"ارے ہاں۔۔۔۔" عاظمہ نے دوبارہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔
"عباد کا نمبر ٹرائی کر' نا لگ جائے تو پوچھنا ضرور کے دونوں ہیں کہاں اور کہنا مما ہاسپٹل آئی تھیں۔ آپ نہیں تھے۔ میرا نمبر دیکھ کر تو وہ ریسیو کرے گا ہی نہیں۔"
"اوکے۔۔۔۔" اس نے سر ہلا دیا اور سگریٹ کا دھواں آنکھوں کے آگے پھیلا کر نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔ اسے لگا اس دھوئیں کے مرغولے میں حوریہ عادل کا سراپا ابھر رہا ہے۔ تذلیل کا احساس ایک بار پھر اس کی روح پر ٹپکنے لگا۔ وہ نئے سرے سے سلگنے لگا۔
"تو تم حوریہ۔۔۔۔ اپنے نام کی طرح پاکیزہ ہو۔"
اس نے آدھی سے زیادہ بچی ہوئی سگریٹ ایش ٹرے میں زور سے مسلی جیسے سگریٹ نہ ہو' حوریہ عادل ہو۔

☼ ☼ ☼
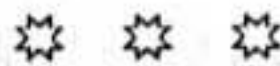
"پھپھو آپ کے یہ صاحب زادے کچھ مغرور قسم کے لگتے ہیں مجھے تو۔۔۔۔" حوریہ انہیں چھیڑنے کے لیے بول رہی تھی۔
"ارے نہیں۔۔۔۔ وہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ تمہیں کیا ایسا لگا۔" مومنہ نے ہاتھ دھوتے ہوئے اس کی دیکھا' پھر ہنس پڑی۔
"مجھے تو ایسا نہیں لگا چلو۔۔۔۔ ایسا ہے تو آج غور کرتی ہوں کہ اس میں اس کے باپ کا عکس ہے یا میرا۔۔۔۔"
"ارے رے۔۔۔۔ میں تو مذاق کر رہی ہوں پھپھو۔۔۔۔" وہ گھبرا کر جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔
"میں تو ابھی ان سے ٹھیک سے ملی بھی نہیں ہوں۔ نہ کوئی بات چیت ہوئی ہے۔ بس دیکھنے میں ایسا لگتا ہے اپنے پاپا کی طرح خوب صورت بھی اور مغرور سا بھی۔۔۔۔"
مومنہ تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ایک لمحے گہری سنجیدگی کی لپیٹ میں آگئی۔ مگر دوسرے پل زبردستی مسکراتے ہوئے اس کے کندھے کو تھام کر کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔
"آؤ۔۔۔۔ کچھ دیر آرام کر لو۔ تم بھی تھک گئی ہو گی۔ میرے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔" وہ دونوں ابھی کمرے میں آکر بیٹھی تھیں کہ ملازمہ انہیں بلانے آئی۔
"باجی جی۔۔۔۔ وہ حازم صاحب آگئے ہیں۔" مومنہ جھٹکے سے بیڈ سے اٹھی اور حوریہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکلی۔
"اتنی جلدی آگیا۔ وقت کا ہنکچوئل بھی ہے۔" ان کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکنے لگا تھا۔ اسی وقت رقیہ بھابھی بدحواس سی لاؤنج میں آئیں۔
"موی۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ حازم۔۔۔۔ آیا ہے۔" وہ رک کر پھر نظریں چرا کر مزید بولیں۔ "عباد کے ساتھ۔۔۔۔"
مومنہ جو جوش خروش سے پلٹی تھی۔ وہیں ٹھٹک گئی۔ "عباد۔۔۔۔ وہ کیوں آیا ہے۔" وہ جیسے خود سے بولی۔ پھر ہلکی سانس بھر کر اپنے اعصاب کو سنبھالتی بولی۔
"بانو انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔" بانو پلٹ گئی۔ رقیہ بھابھی اس پر ایک نظر ڈال کر لاؤنج سے چلی گئیں۔ اسی

وقت حازم لاؤنج میں داخل ہوا۔

"کوئی فارملٹیز کی ضرورت نہیں ہے مما! میں اپنی ماں کے گھر آیا ہوں۔ نانا کے گھر آیا ہوں۔ ڈرائنگ رومز فارمل مہمانوں کے لیے ہوتے ہیں۔" وہ بڑی بے تکلفی سے کہتا ہوا مومنہ کے پاس آیا اور بے حد محبت سے اسے خود سے لپٹالیا۔

"ارے حازم..." انہوں نے بھی بے حد محبت سے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔

حازم کو لگا اس کے خون میں کوئی میٹھا سیال دوڑنے لگا ہو۔ اس کی رگ رگ میں ٹھنڈک آمیز سکون اترنے لگا ہو۔ شدت محبت سے اس کے بازوؤں کا گھیرا مومنہ کے گرد تنگ ہو گیا۔ مومنہ کا بدن اس کے مضبوط کڑیل بیٹے کے توانا بازوؤں میں خوشی اور محبت سے کانپنے لگا۔ حازم نے نرمی سے اسے صوفے پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"حوریہ ادھر آؤ۔" مومنہ یک دم حوریہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ حازم کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ اس طرح پکڑے ہوئے تھی۔ جیسے کوئی خوف زدہ بچہ اپنے کسی بڑے کا ہاتھ کھوجانے کے ڈر سے پکڑے ہوئے ہو۔ حوریہ ان دونوں کے ملاپ کا یہ خوب صورت منظر دلچسپی اور عقیدت سے دیکھ رہی تھی۔ مومنہ کی پکار پر چونکی اور کچھ جھجک کر اس طرف آگئی۔

مومنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا اور حازم سے بولی۔ "ابھی ہم دونوں تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔"

"اوہ اچھا..." اس نے مومنہ سے نظریں بچا کر حوریہ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ سیاہ اور نیلے کنٹراس کے لباس میں وہ عجیب مہکی مہکی شام کا حصہ لگ رہی تھی۔

"ارے... کچھ خاص نہیں بس یوں ہی پھپھو کو چھیڑ رہی تھی۔" وہ گھبرا کر جلدی سے بولی۔ مبادا مومنہ وہ مغرور والی بات نہ کر دیں۔ مومنہ اس کی گھبراہٹ پر مسکرا دی پھر بولی۔

"دراصل اس دن میں نے تم سے حوریہ کا ٹھیک سے تعارف نہیں کرایا تھا۔"

"ان کا تعارف تو نانا جان نے بہت اچھی طرح کروا دیا ہے۔ مجھ سے اور پاپا سے بھی... اور پاپا تو انہیں دیکھ کر پہچان گئے تھے کہ یہ آپ کے پلو سے بندھی کوئی چیز ہیں۔"

اس کا انداز نیم مزاحیہ تھا۔ عجیب خوش گواریت اس کے لہجے میں اتری ہوئی تھی۔ شاید یہ ایک ماں کے سینے سے لگنے کا اعجاز تھا۔ مومنہ حیرانگی سے ہنس پڑی۔

"اچھا... پاپا... نے تعارف بھی کروا دیا۔ چلو اچھی بات ہے۔"

حوریہ حازم کے انداز اور نگاہوں سے خفیف سی ہو کر رہ گئی تھی۔ بظاہر سنجیدہ نظر آنے والے شخص سے مذاق کی اسے توقع نہیں تھی۔

"ارے... یہیں بیٹھے بیٹھے ساری باتیں کریں گے کیا۔ چلو اٹھو۔" مومنہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ گئی۔ حازم بھی ان کے ساتھ اٹھا مگر ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں یہیں روکتا ہوا ہلکے سے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔

"مما... آپ پاپا سے ایک بار مل لیں۔ فقط ایک بار... بس..." مومنہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا مگر گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ "میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کوئی رشتہ نہیں ہے آپ کے اور پاپا کے درمیان میں... مگر..."

"جب جانتے ہو پھر کیوں اس طرح کی بات کر رہے ہو۔" وہ اپنے اعصاب ایک بار پھر بکھرتے محسوس کرنے لگی۔

"پاپا کی کنڈیشن کے پیش نظر میں انہیں بھی ہرٹ نہیں کرنا چاہتا۔"

"وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے حازم' جبکہ میرا ان سے کوئی رشتہ ہے' نا تعلق۔ ہم دونوں بہت پہلے ہی دو الگ الگ راستوں پر نکل گئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں مما۔۔۔ مگر آپ انہیں انجان شخص سمجھ کر مل لیں۔ بلکہ یوں سمجھ لیں کے اپنے بیٹے کے کسی جاننے والے سے ملنا ہے آپ کو۔ جو اجنبی ہے۔"

"نہیں حازم۔۔۔" وہ یک دم بکھر گئی۔

"وہ اجنبی نہیں ہے میرے لیے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ ماضی ہے میرا۔ ایک تلخ اور تکلیف دہ ماضی۔۔۔"

مومنہ اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ حازم مضطرب انداز میں ان کے سامنے جھکا۔

"اگر میں کہوں۔"

"حازم۔۔۔ تمہاری مما ٹھیک کہتی ہے۔ میں ایک تکلیف دہ ماضی ہوں' جسے کھول کر وہ نئے سرے سے اذیت سے دوچار ہی ہوں گی۔" عباد گیلانی کی آواز ابھری تو حازم نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لاؤنج کے دروازے پر کھڑے تھے۔ پھر اسٹک کے سہارے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اندر آیا۔ مومنہ نے بے اختیار عباد گیلانی کی طرف دیکھا تھا۔

"تم شکوہ کرنے میں حق بجانب ہو۔ میں مدت سے منتظر تھا کہ کوئی مجھ سے گلہ کرے۔ میرے کردہ گناہوں کا مجھ سے حساب مانگے۔ سنگ ملامت برسائے مجھ پر۔۔۔"

مومنہ نے جلدی سے نظریں پھیر لیں اور گناہ عظیم سمجھتے ہوئے رخ بھی موڑ لیا اور بے مہر لہجے میں بولی۔ "میں شکوہ نہیں کر رہی ہوں۔ کیا حق رکھتی ہوں شکوے کا۔ یوں بھی حقیقتوں کی تلخیوں کو برتتے برتتے اتنا وقت گزر چکا ہے کہ ہر شے بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔" وہ کرب سے مسکرائی۔

"آہ۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے سب کچھ لٹا دینے' کھو دینے کا دکھ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔" عباد گیلانی' مومنہ کو ماضی کے تناظر میں دیکھ رہے تھے۔ انہیں لگا ماضی کا دریچہ ان کے سامنے وا ہو گیا ہو۔ جب وہ تتلی تھی اور وہ پیچھے بھاگتے دوڑتے جا رہے تھے۔ اور پھر وہ تتلی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس تتلی کے رنگین پروں کی ملاحت اور حسن سے لطف اٹھاتے۔ وہ اس کا ایک ایک رنگ نوچ کر پھینکتے چلے گئے۔

مگر۔۔۔ وہ بکھر کر بھی سمٹے ہوئے تھی اور وہ خود سمٹ کر بھی بکھر گیا تھا۔

مجھے تھا زعم' میں بکھر گیا محسن
وہ ریزہ ریزہ تھا وہ اپنے اختیار میں تھا

وہ گہری اور تھکی تھکی سی سانس بھرتے ہوئے چلتے ہوئے مومنہ کے دائیں طرف آکر رک گیا۔

"کیا تم مجھے چند لمحے دے سکتی ہو۔ میں احسان مند رہوں گا تمہارا۔" اس کا لہجہ ملتجی تھا۔ مومنہ نے اس کی طرف رخ نہیں کیا اور اس کی بات سنی ان سنی کرتی یہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھانے لگی کہ حازم نے ان کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

"مما۔۔۔ اسے آپ پاپا کی نہیں۔ میری التجا سمجھ لیں۔" مومنہ نے تڑپ کر حازم کو دیکھا تھا۔

"سوری مما۔۔۔ میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر پاپا۔۔۔ حقیقتاً" نادم ہیں۔ وہ ایک بوجھ لے کر یہاں تک آئے ہیں۔ کیا آپ میری خاطر ان کے کندھوں سے یہ بوجھ نہیں اتار سکتیں۔"

عجیب جان سوز ساعتیں تھیں۔ ایک طرف عمر کو رائیگاں کر دینے والا۔ مجرم' قاتل دوسری طرف برسوں کے بعد ملی اولاد۔ اس نے حازم کی طرف اسے دیکھا جسے کوئی قتل ہونے والا آخری ساعتوں میں اپنے قاتل کو دیکھتا

ہے۔ حازم ان کو دلی کیفیت سے بے خبر تھا۔ اس کے پیش نظر اس وقت شاید اس کے باپ کی ملتجی نظریں تھیں۔
وہ معافی کے چند سکوں کی بھیک مانگ رہے تھے اور یہ ہی بات حازم کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے اپنے باپ کو کبھی اس طرح گڑگڑاتے۔ ٹوٹتے، بکھرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے اعصاب کی یہ توڑ پھوڑ، خستہ حالی اسے اذیت دے رہی تھی۔
وہ اپنے باپ کو اس قدر چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے باپ کے لیے بھیک تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اپنے باپ کے لیے اپنی ماں کے پیروں میں بھی بیٹھ جاتا۔ مومنہ کو اس کی شدت سے اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کے دل کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ سا گیا۔
"مجھے نہیں پتا تھا حازم کے تم فقط اپنے باپ کے ہمدرد، دوست اس کے رفیق بن کر یہاں تک آئے ہو۔ اس کی راہوں کو آسان کرنے کے لیے مجھے محض استعمال کرنے۔" اس نے بظاہر نرمی سے حازم کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔ مگر اس نرمی میں بلا کی سرد مہری تھی۔
"نہیں.... مومنہ.... حازم تم سے بہت محبت کرتا ہے۔" عباد جلدی سے بولا۔
مومنہ پھیکے انداز میں ہنس دی.... "محبت.... ایسی ہی محبت جیسی برسوں پہلے تم نے کی تھی مجھ سے...." اس کا لہجہ استہزائیہ یا تمسخرانہ نہیں تھا، بلکہ ملول اور یاسیت زدہ تھا۔ اپنی مرضی میں ملفوف محبت.... "نہیں حازم.... غرض کو محبت کا چولا پہنا دینے سے وہ محبت نہیں بن جاتی۔"
وہ حازم پر ایک متاسفانہ نظر ڈال کر رخ موڑ گئی۔ حازم تڑپ کر رہ گیا۔ وہ بے ساختہ حوریہ کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کی ماں کیا کہہ رہی تھی اور کیوں؟
"میری محبت بے شک تمہارے لیے آزار بن گئی، مگر حازم کے جذبات پر تم شک مت کرو۔ بے شک وہ تم سے دور رہا ہے۔ مگر دور رہنے سے رشتہ ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ خون ہے تمہارا۔ تمہیں اپنے خون پر شک نہیں ہونا چاہیے۔"
"وہ میرا ہی نہیں۔ آپ کا بھی خون ہے۔ اس کی رگوں میں آپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ وہ آپ کی تربیت میں رہا ہے۔"
"پھپھو.... پلیز.... یہ.... یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ.... خود کو سنبھالیں.... عباد انکل کا غصہ.... حازم پر کیوں نکال رہی ہیں۔" حوریہ.... ان کے نزدیک آئی۔
یاور علی دروازے تک آئے تھے، مگر پھر پلٹ کر واپس جا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عباد اور حازم اپنی جنگ خود لڑیں۔ وہ خود کو ان کے درمیان میں نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ہاں حوریہ کا حازم کے لیے بولنا۔ انہیں جانے کیوں اچھا لگا۔ مومنہ صوفے پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ لیا۔
"میں تمہارا مجرم ہوں۔ تم مجھے معاف کرو نہ کرو۔ یہ تمہاری اپنی مرضی ہے، مگر حازم تمہاری امانت تھا میرے پاس.... میں نے اسے تمہاری طرف کا راستہ دکھا دیا ہے۔ بلکہ پہنچا دیا ہے اب تم اپنی ملکیت کو قبول کرتی ہو یا نہیں۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔"
"ہاں.... تم نے حق ادا کر دیا۔" مومنہ جیسے پھٹ پڑی۔
"بیس سال کے بعد میری امانت مجھے لوٹانے کا خیال آ گیا تمہیں۔ وہ بھی اس لیے کہ.... تمہیں تمہاری زندگی پر اعتبار نہیں رہا۔ موت کی آہٹیں تمہیں اپنے نزدیک محسوس ہو رہی ہیں۔ واہ.... عباد گیلانی.... واہ.... تم نے بڑا اچھا حق ادا کر دیا۔ مجھے میری امانت لوٹانے کا.... اسے راستہ دکھانے کا۔ یہ احسان تم نے بڑی جلدی ادا کر دیا۔" اس کا لہجہ بکھر گیا۔

"چلے جاؤ۔ خدا کے لیے تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے اب کسی کی بھی محبت پر اعتبار نہیں کرنا۔" وہ غصے سے بول رہی تھی۔

"میں عادی ہو گئی ہوں۔ اسی طرح جیتے رہنے کی۔ کسی کی ضرورت نہیں رہی مجھے۔ چلے جاؤ حازم... تم بھی چلے جاؤ یہاں سے... حوریہ... حوریہ پلیز... انہیں کہو... یہ چلے جائیں یہاں سے..."

وہ ہانپ گئی' پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یاور علی کے کمرے میں موجود عادل بھائی اور رقیہ بھابھی مومنہ کے اس طرح رونے بلکنے پر پریشان سے ہو کر اپنی جگہ سے اٹھے۔ مگر یاور علی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں کمرے سے باہر جانے سے روک دیا۔

"نہیں... عادل... اسے اکیلا چھوڑ دو۔ اسے رونے دو۔ اس کا یہ رونا بہت ضروری تھا۔ تمہیں تو پتا ہے۔ یہ برسوں بعد روئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دل میں دبا غم' غصہ' وہ آگ جو برسوں سے بھری پڑی ہے ان آنسوؤں کی صورت بہہ جائے۔ بہہ جانے دو یہ سب لاوا۔" عادل بے ساختہ ایک سانس کھینچ کر کرسی پر ڈھیلے انداز میں بیٹھ گیا۔

یاور علی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ برسوں بعد روئی تھی۔ یہ دھواں نکلنا ضروری تھا۔ یہ آگ اسے اندر ہی اندر جھلساتی رہی تھی۔ یاور علی کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"میں عباد کو یہاں آنے سے اسی لیے روک نہیں رہا تھا' میں چاہتا تھا وہ ایک بار ضرور آئے' اپنی غلطیوں کی معافی مومنہ سے ضرور مانگے۔ وہ معاف کرے نہ کرے' مگر اس کے بے قرار دل پر قرار کے چھینٹے ضرور گریں گے۔ اس کی بے چین زندگی میں یہ احساس سکون بن کر ضرور اترے گا کہ عباد نے اس کی قدر کی۔ آخری لمحوں میں ہی سہی' مگر کی تو... یہ رونا اس کے لیے سودمند ہے۔ اسے کھل کر رونے دو۔"

وہ اپنی اسٹک کے سہارے ادھر ادھر کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے جیسے خود سے بول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی کی چادر دبیز ہو رہی تھی۔

✡ ✡ ✡
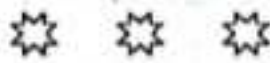
فضا دن بھر بابر سے رابطہ کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ شام کو کہیں جا کر اس نے اس کا فون ریسیو کیا۔ چھوٹتے ہی بولا۔

"کیا مصیبت ہے۔ کیا ایک ہی کام رہ گیا ہے تمہاری کالز ریسیو کرتا رہوں۔ یا میسج پڑھتا رہوں۔" وہ برافروختہ ہو رہا تھا۔

فضا کے دل پر تیر سا کھب گیا۔ یہ اس کا لہجہ اس کے محبوب کا لہجہ تو نہ تھا' وہی محبوب جو اس کی آواز پر دلکش شعر پڑھتا تھا۔ اس سے ملنے کو بے قراری دکھاتا تھا۔ محبت' ہوس کا چولا پہننے کے بعد کس طرح فنا ہو گئی تھی۔

ہاں... مگر اس نے محبت ہی کب کی تھی۔

محبت بھلا کب مرتی ہے۔

"اب بول بھی دو کیوں فون کیے جا رہی ہو۔" اس کی خاموشی پر وہ چڑ کر بولا۔

"بابر... تم نے حوریہ سے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ اتنی ہرٹ ہوئی ہے۔ اتنا غصہ آ گیا تھا اسے..."

"اوہ... ہو... تو تمہیں یہ پریشانی ہے۔" وہ یک دم ہنسا۔

"اپنی اسی پاکیزہ نیک نام دوست سے ہی پوچھ لو۔ میرا سر کیوں کھا رہی ہو۔"

"بابر... پلیز کیا ہو گیا ہے' تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو۔"

"دیکھو فضا... اس وقت میں بہت بزی ہوں۔ آفس میں بیٹھا ہوں اور میرے آگے بہت ضروری فائلز کھلی پڑی ہیں۔ جنہیں میں دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھے ان فضول باتوں میں الجھاؤ مت۔"

"میں بھی تو صبح سے تمہیں کال کیے جارہی ہوں۔ تم ریسیو ہی نہیں کررہے تھے۔" "فارغ نہیں تھا۔ یہ بتاؤ بس یہ ہی پوچھنے کے لیے کال کررہی ہو۔" وہ ذرا سا نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"میں ملتا ہوں تم سے... پھربات کرتے ہیں؟" فضا کا چہرہ کھل اٹھا۔

"کب... کب مل رہے ہو۔"

"کل..."

"وعدہ کرو..." اس کا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔

"وعدہ بھئی... کل تم کو کالج سے پک کرتا ہوں۔ اوکے' اب فون بند کروں۔"

"اوکے... بائے۔" فضا سرشار ہو کر بولی۔ اور موبائل آف کرکے جوں ہی پلٹی اپنے پیچھے کھڑی جہاں آرا کو دیکھ کر چکرا گئی۔

"کھوج تو میں لگا ہی چکی تھی تیرے ان کرتوتوں کی۔ آج تو رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔"

"کک... کیا... کیا مطلب آپ کا۔"

"مطلب بھی بتاتی ہوں۔ پہلے ذرا تم اس بابر شابر کا اتا پتا بتادو۔ جس سے ملے بغیر تمہیں چین نہیں آتا۔" وہ دم سادھے رہ گئی۔

"سب پتا کرایا ہے بڑی سی سفید گاڑی میں آتا ہے۔ بہت مال دار ہے اور تمہارے موبائل سے میں نے اس کا نمبر بھی لے لیا ہے۔ اب تم خود ہی شرافت سے سب کچھ اگل دو۔ اسی میں تمہارا بھلا ہے۔"

جہاں آرا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زور سے کھینچ کر مسہری پر اپنے پاس بٹھالیا اور آنکھیں چڑھا کر اسے گھورنے لگی۔

فضا مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بابر' فضا کے فون کے بعد اپ سیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کھولی ہوئی فائل بند کی اور سگریٹ سلگا کر ریوالونگ چیئر کی بیک سے لگ کر دھیرے دھیرے سگریٹ پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اب فضا سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ حوریہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ انفارمیشن حاصل کرنا چاہتا تھا اور اب یہ خواہش روز بروز زور پکڑتی جارہی تھی۔ تھپڑ کا وہ سلگتا احساس اسے اب اپنے گال پر نہیں دل پر محسوس ہو رہا تھا۔

حازم آفس میں داخل ہوا تو بابر کو خلاف معمول دیکھ کر حیران ہوا۔ مگر یہ حیرانگی خوش گوار تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"ویری گڈ... تمہیں یہاں اس چیئر پر بیٹھا دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔" حازم کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکا۔

"اوہ..." وہ سیدھا ہو بیٹھا اور سگریٹ ایش ٹرے میں دبا کر بجھا دی۔

"میں نے سوچا' تم آج کل پاپا کو فل ٹائم دے رہے ہو تو میں تمہاری کچھ ہیلپ کردوں۔ کیا کہتے ہیں وہ... ہاں کام میں ہاتھ بٹانا۔" حازم دھیرے سے مسکرایا اور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تو ٹائم دے ہی رہا ہوں' مگر تھوڑا تم بھی ان کے لیے وقت نکال لیا کرو۔ یہ ذمہ داری ہے تمہاری۔" اس کے لہجے میں بڑا بھائی ہونے کے ناطے تنبیہہ تھی۔

"مما بتا رہی تھیں کہ پاپا کل گھر میں شفٹ ہو رہے ہیں میں نے سوچا وہیں ان کو ویل کم کروں گا۔" وہ بولا تو حازم فقط ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

"اچھا یہ بتاؤ... یہاں اتفاقیہ نظر آرہے ہو یا مستقل جوائن کرنے کا ارادہ ہے۔"

"آج تو اتفاق ہی سمجھ لو۔" وہ ہنسا' پھر بولا۔ "یہ شبیر صاحب نے دماغ کھپا دیا میرا۔ کیسے کیسے آدمی رکھے ہوئے ہیں پاپا نے اس آفس میں۔ دو دن میں چھٹی کردوں میں تو ان سب کی۔" حازم نے یکلخت سنجیدگی کی لپیٹ میں آتے ہوئے اسے دیکھا اور تنبیہہ لہجے میں بولا۔

"ایسی کوئی بھی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب بہت کام کے آدمی ہیں۔ سنا نہیں تم نے۔ اولڈ از گولڈ۔"

بابر نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ نکال کر لبوں کے باہم دبائی اور لائٹر کا شعلہ دکھایا۔ دوسرے پل سگریٹ کی ٹاپ پر ننھا بے ضرر سا شعلہ چمکنے لگا۔

"اولڈ ہی اولڈ نظر آتے ہیں مجھے تو... اینی وے..." بابر ایک سانس کھینچ کر ٹیبل کی سطح پر ہتھیلیاں جما کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اب نکلوں گا۔ آج کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔" وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔ پھر پلٹتے ہوئے جیسے کچھ یاد آیا تو... حازم کی طرف رخ موڑا۔

"اوہ... مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ کونگریجولیشن۔" وہ مبہم انداز میں مسکرایا۔ حازم نے نا سمجھ آنے والے انداز میں بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔

"تمہاری رئیل مدر سے تمہاری ملاقات کا سن کر دلی مسرت ہوئی۔ مما بتا رہی تھیں مجھے کہ پاپا کی بیوی آئی مین ایکس وائف یعنی تمہاری مام سے تم ملنے لگے ہو۔"

حازم کے اعصاب پر ایک لمحے ایسا اثر ہوا جیسے وائلن کے سخت تنے ہوئے تاروں پر کوئی کھٹ سے ہاتھ مار دے۔ دوسرے پل وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

"تھینک یو..." وہ یہ کہہ کر اپنے آگے رکھی فائل کو کھینچ کر کھولنے لگا۔ وہ اس موقع پر کسی قسم کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"پاپا سے مل آؤ تو اچھا ہے وہ تمہیں مس کر رہے ہیں" اور ہاں۔ انہیں یہ خبر بھی دینا کہ تم آفس جانے لگے ہو۔" بابر یک دم ہنس پڑا۔

دل کی تسلی کو غالب یہ خیال اچھا ہے
کہ بابر آفس جانے لگا ہے

حازم نے ابرو اچکا کر اسے مصنوعی پن سے گھورا وہ ہنستا ہوا پلٹا۔

"او کے بائے۔" سگریٹ موبائل اور گاڑی کی چابی ٹیبل سے سمیٹ کر وہ۔ اڑنچھو ہو گیا۔

حازم نے ایک گہری سانس کھینچی۔ اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

اسے بابر پر کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ اسے وہ ایک نا سمجھ اور لاپروا سا بچہ محسوس ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ آہستہ آہستہ سمجھ دار ہو جائے گا۔

☆ ☆ ☆

حازم آفس سے نکل کر عباد گیلانی کے پاس آیا تو وہ اسے دیکھتے ہی بولے۔

"تم صبح سویرے میرے پاس کیوں نہیں آئے۔" ان کے انداز میں کھوج تھی۔ وہ چپ چاپ دیوار سے لگے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور وضاحتی لہجے میں بولا۔

"آفس کے کچھ معاملات دیکھنے تھے۔ دو دن سے آفس بھی نہیں جاسکا تھا۔"

"نہیں۔ جھوٹ' تم مومنہ کے رویے سے پریشان ہوگئے ہو۔ میں جانتا ہوں۔" عباد جلدی سے بولے۔

"تم نے میرے لیے اس کو ہرٹ کردیا ہے۔"

"پاپا۔ ہم اب اس ٹاپک پر بات نہ کریں تو بہتر نہ ہوگا۔" اس کا لہجہ بے مہر تھا۔

"حازم وہ ماں ہے تمہاری۔ محض بے کار ٹاپک نہیں۔ جس پر ہم ڈسکس کررہے ہیں۔" وہ الجھ کر عباد گیلانی کی طرف دیکھنے لگا۔

"پاپا۔ میں حقیقتاً" الجھ گیا ہوں۔ بٹ میرے پاس ایسا کوئی سولوشن (حل) نہیں ہے۔" میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ۔ ان کا رویہ۔ درست تھا یا غلط۔"

عباد نے بیڈ سے اتر کر کھڑکی کھولتے ہوئے ایک نظر حازم کو دیکھا۔

وہ حقیقتاً" الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ پھر وہ فضا میں پھیلی تاریکی کو گھورتے ہوئے بولے۔

"تمہارا اپنا دل کیا کہتا ہے کہ اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے تھا۔"

حازم اٹھ کر ان کے نزدیک چلا آیا۔ اور دھیرے سے بولا۔

"شاید۔ ٹھیک ہی تھا۔ وہ اپنی جگہ درست ہیں۔ مگر پاپا میں آپ کو بھی۔۔۔"

"حازم" عباد ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس کے رویے پر کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی۔ میں ہرٹ نہیں ہوا ہوں۔ بلکہ یقین کرو حازم۔ مجھے ایک طرح سے سکون ملا ہے' میری بے چینی' اضطراب کو قرار آگیا ہے۔ اسے تو مجھ پر برہم ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو ایک بے ضرر سا غصہ تھا جو اس نے نکالا۔ میں تو اس سے بھی زیادہ کی توقع کررہا تھا۔ اسے تو مجھے دھکے دے کر باہر نکال دینا چاہیے تھا۔ مجھ سے نفرت کا کھلا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ میں۔۔۔ حازم میں تو اس سے زیادہ ڈیزرو کرتا ہوں۔"

"نہیں پاپا۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ بس اس چیپٹر کو کلوز کردیں۔ جس طرح یہ پہلے بند تھا۔" اس کے لہجے میں ناگواری یا غصہ نہیں تھا' یاسیت تھی' اداسی تھی۔

"بند کردوں۔" عباد گیلانی نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ انہیں کوئی سخت سزا سنا رہا ہو۔

"ہاں پاپا۔۔۔ اس باب کو بند کردینا ہی اچھا ہے۔"

"نہیں حازم۔۔۔ یہ تو وہ باب ہے' جو کبھی بند ہوا ہی نہیں' یہ میری روح' میری سانس سے جڑا ہوا ہے۔ وہ میرے مرنے کے ساتھ ضرور بند ہوسکتا ہے حازم۔ وہ مجھے معاف کرے نہ کرے' یہ اس کی مرضی۔۔۔ مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں' مگر مجھے لگتا ہے اس سے اپنے تمام کردہ گناہوں کی معافی مانگ کر مجھے انوکھا سکون ملا ہے۔ یوں جیسے اندر آگ کے بھڑکتے الاؤ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے ہوں۔ جیسے بے قرار روح کو قرار آگیا ہے۔"

ان کا بدن کمزور پڑنے لگا۔ حازم نے انہیں تھام کر نزدیکی کرسی پر بٹھادیا۔ اور خود ان کے سامنے رکھی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

"مجھے نہ آپ کی سمجھ آتی ہے' نہ ماما کی۔"

"چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں حوریہ کیسی لگی۔" عباد گیلانی یکسر موضوع بدلتے ہوئے بولا اور حازم کو بغور دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے کمزور ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے بولے۔ "حوریہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"حوریہ۔۔۔" حازم نے الجھ کر انہیں دیکھا۔
"ہاں۔۔۔ پتا ہے حازم میں ساری رات ایک ہی بات سوچتا رہا ہوں۔"
"کیا۔۔۔؟" وہ حیران سا باپ کا چہرہ تکنے لگا۔
"حوریہ سے تمہاری شادی۔۔۔"
"واٹ۔۔۔" وہ یک دم کھڑا ہو گیا۔
"ہاں حازم۔۔۔ میں نے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ یہ بچی تمہارے لیے ایک بہترین شریک حیات ثابت ہو سکتی ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ تم۔۔۔ تمہارے ذہن میں لائف پارٹنر کا کیا تصور ہے "مگر۔۔۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ایک بہترین جوڑ ہے۔"
"پاپا۔۔۔" وہ بے ساختہ ہنسا۔
"آپ جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں اچھی اچھی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔"
"کیا تمہیں اچھی نہیں لگی حوریہ۔۔۔" عباد گیلانی نے اس کی تمام باتوں کو یکسر سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ حازم ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ باپ کی نظروں سے نظریں ملیں تو یک دم نگاہیں پھیر لیں۔
"کیا ہو گیا ہے پاپا آپ کو۔۔۔" اب کے اس کا لہجہ پست تھا۔
"میں نے تم سے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" اسی پل حازم کے جیب میں پڑے موبائل کی رنگ ہونے لگی۔ عباد گیلانی ایک ہلکی سی سانس بھر کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ حازم نے ایکسکیوز می کہہ کر ان سے کچھ دور ہٹ کر موبائل ریسیو کیا۔ دوسری طرف حوریہ تھی۔ وہ چھوٹتے ہی بولی۔
"آپ حازم بول رہے ہیں۔"
"جی۔۔۔ آپ کون۔۔۔" وہ قطعی نہ پہچان پایا تھا۔
"حوریہ۔۔۔ حوریہ عادل۔۔۔ آپ کی کزن۔۔۔"
"اوں۔۔۔" اس نے بے ساختہ عباد گیلانی کی طرف دیکھا تھا۔ پھر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔
"جی پہچان لیا۔" وہ راہ داری کی ریلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ مستعجب تھا کہ حوریہ نے اسے کیوں کال کی ہے۔
"مجھے آپ سے ایک ریکوئسٹ کرنی ہے۔"
"جی فرمائیے۔۔۔" وہ حیران ہوا۔
"آپ برائے مہربانی مومنہ پھپھو کے پاس ملنے مت آیئے گا۔ آپ نے انہیں بے حد ہرٹ کیا ہے' وہ نئے سرے سے ٹوٹ گئی ہیں۔ آپ کو کیا حق پہنچتا تھا کہ آپ انہیں اپنے پاپا کے لیے ہرٹ کریں۔"
"جی۔۔۔" حازم اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ جذباتی اور خفگی سے کہہ رہی تھی۔
"آپ کو اس کی تکلیف کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہے۔ آپ صرف نام کے بیٹے ہیں۔ یاد رکھیے گا حازم صاحب۔۔۔ محض محبت کے دو لفظوں سے کسی کے دل میں جگہ پیدا نہیں ہو جاتی۔ یہ عملی ثبوت مانگتی ہے اور آپ نے اپنے باپ سے محبت کا عملی ثبوت دیا ہے۔ ماں سے نہیں۔"
"مائی گاڈ۔۔۔" حازم کے اعصاب پر ضرب پڑی تھی۔ اس نے ہلکی سی سانس کھینچتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دوسری طرف سے لائن ڈس کنکٹ (منقطع) ہو چکی تھی۔ حازم نے اپنے موبائل کو یوں دیکھا جیسے وہ کوئی انوکھی چیز ہو۔

ایک لمحے اس کا دماغ ماؤف ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ یوں کوئی لڑکی اسے کھڑے کھڑے اس کی غلطی کا احساس دلا دے۔ یوں حملہ کرے کہ وہ اپنے دفاع میں لفظ بھی نہ کہہ سکے۔ اسی نے ریلنگ سے لگ کر ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے ذہن کی طنابوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اپنے اعصاب نارمل کرنے کی شعوری کوشش کرنے لگا۔ سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لگانے لگا۔

حوریہ کے الفاظ پر وہ کچھ دیر غور کرتا رہا۔ پھر سگریٹ ختم کی اور سر جھٹک کر عباد گیلانی کے کمرے میں چلا آیا۔

اس کے اعصاب اب مکمل کنٹرول میں تھے وہ ہنوز اسی زاویے سے بیٹھے اس کے منتظر تھے۔

"جی پاپا... آپ خاصے فریش لگ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے کل کی بجائے آج ہی گھر چلتے ہیں۔" وہ کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا حازم... تم نے جواب نہیں دیا۔" حازم بے ساختہ ایک ہنکارا بھر کر پیچھے ہو کر کرسی کی بیک سے پشت لگالی۔

"تمہیں حوریہ... پسند ہے۔ کیا اس سے شادی کرو گے۔" عباد گیلانی کی نظریں حازم پر ٹکی تھیں۔ وہ ایک بار پھر اپنا سوال دہرا رہے تھے۔

"دیکھو... میں زبردستی اپنا فیصلہ مسلط نہیں کرتا ہوں... نہ کرنا چاہوں گا۔ تم اس سلسلے میں آزاد ہو... مگر... بس یہ میری خواہش ہے اور میری عمر بھر کا تجربہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ ایک بہتر فیصلہ ہوگا۔ آگے تمہاری مرضی..." حازم پر خیال انداز میں ابرو کو جنبش دی۔ اس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ پھیلی۔

"اگر میں آپ کا فیصلہ دل سے مان لیتا ہوں تو کیا یہ فیصلہ یا در علی کے گھر والوں کو قبول ہوگا۔ آئی مین... حوریہ کے لیے قابل قبول... ہوگا۔" عباد گیلانی کی آنکھیں فرط مسرت سے یک دم چمکنے لگیں۔ انہوں نے حازم کے ہاتھ جکڑ لیے۔

"ہاں... کیوں نہیں... تم میں... تم میں کیا کمی ہے، تم کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتے ہو۔ حوریہ کیوں ایکسپٹ (قبول) نہیں کرے گی۔"

"آپ حوریہ کو کتنا جانتے ہیں۔" وہ نرمی سے ان کا ہاتھ چھوڑ کر کرسی سے کھڑا ہو گیا اور گلاس ونڈو کے پاس جا کر باہر جھکنے لگا۔

"میں مومنہ کو تو جانتا ہوں نا۔ وہ... وہ مجھے بالکل مومنہ کا ہی عکس لگی ہے حازم... اس کا ہر انداز مومنہ جیسا ہے۔" حازم نے گردن موڑ کر باپ کا پر مسرت چہرہ دیکھا اور خفیف سی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"ہو سکتا ہے وہ بھی مجھے آپ کے تناظر میں دیکھیں... مجھ میں ان کو آپ کا عکس دکھائی دے رہا ہو۔" اس نے کہا تو عباد گیلانی نے اس کی طرف دیکھا، یکلخت ان کا چہرہ تاریک ہوا تھا۔ جیسے روشن کمرے کی اچانک بجلی چلی جائے اور کمرہ اندھیرے میں ڈوب جائے۔ ان کے چہرے پر ایسا ہی اندھیرا پھیل گیا۔ اور خفیف سے احساس شکست سے بیڈ کراؤن سے کمر ٹکالی۔

"ہاں... ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں میری ریپوٹیشن (شہرت) میرا کردار۔ تمہارے خوب صورت روشن کردار کے آگے آسکتا ہے۔"

"میرا... یہ مطلب نہیں ہے پاپا۔" حازم یکلخت شرمندہ ہو گیا۔ اسے اپنے کہے ہوئے الفاظ کی سختی کا احساس فوراً ہی ہو گیا تھا۔

"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عباد ہاؤس میں ان کی بیٹی کو کوئی خوشی نہ ملی تھی۔ تو وہ اپنی دوسری بیٹی کیسے بیاہ سکتے ہیں۔ انہیں تلخ تجربات ہوئے ہیں۔ وہ اس پر نہیں سوچیں گے۔" وہ عباد گیلانی کے نزدیک آیا۔ پھر ان کے

پژمردہ چہرے پر نگاہ ڈال کر بولا۔
"او کے... اس ٹاپک کو یہیں ختم کردیں۔ ہم پھر ڈسکس کرلیں گے۔ یہ کوئی اتنا بڑا ایشو بھی نہیں ہے۔ آپ ٹینشن نہیں لیں۔"
وہ انہیں تھپکنے لگا، مگر عباد گیلانی خاموش رہے اور آنکھیں موندلیں۔

☼ ☼ ☼

"قسم لے لو امی... جو میں اس سے ملتی ہوں۔ بس ایک بار ملی تھی۔ وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے میں نہیں۔"
فضا خود کو سنبھال کر جہاں آرا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرنے لگی۔ فوری طور پر اسے یہ ہی بات سمجھ میں آئی۔ جہاں آرا استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔
"ایک حسین امیرزادے کے پاس لڑکیوں کی اتنی کمی پڑ گئی ہے کہ وہ ایک کوارٹر نما گھر میں رہنے والی لڑکی کے پیچھے باؤلا ہوا ہے۔ یہ دھول تم میری آنکھوں میں نہیں جھونک سکتی فضا... دنیا دیکھی ہے میں نے... ایسے ہی عمر کی منزلیں طے نہیں کرلیں میں نے..."
"جو سچ ہے وہ میں نے کہہ دیا ہے۔ آپ جو بھی سمجھیں۔" وہ خود کو کمزور نہیں دکھانا چاہ رہی تھی۔ وہ مسہری سے کھڑی ہوگئی۔
"چلو مان لیں... تم بے قصور ہو اور وہ امیرزادہ۔ تم دو ٹکے کی لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا، تو تم اس کی گاڑی میں کیوں بیٹھیں۔ اس کے ساتھ کہاں گئیں اور اس سے مہنگی مہنگی چیزیں کیوں وصول کرتی رہیں۔ اب بول دو۔ یہ بھی وہ زبردستی پکڑا کر جاتا تھا۔" جہاں آرا کی آواز فضا کے سر پر ہتھوڑے کی طرح لگنے لگی۔ سب کچھ کھل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔
"آلینے دو تمہارا ابا کو... ساری باتیں اس کے سامنے رکھتی ہوں۔ پھر وہ جانے اور ان کی یہ پارسا بیٹی جانے..."
فضا کو اپنے اعصاب ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ نقاہت تو صبح سے ہی ہو رہی تھی۔ اس اچانک حملے سے وہ اعصابی طور پر بھی کمزور پڑنے لگی۔ وہ یک دم چکرائی۔ اس سے پہلے کہ گرتی جہاں آرا مسہری سے اٹھیں اور جلدی سے اسے تھام لیا۔
"اے فضا... فضا..." وہ اسے پکارنے لگیں، مگر وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔

☼ ☼ ☼

حوریہ نے ان کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے بیڈ پر چپ چاپ... سوچوں میں گم بیٹھی تھیں۔ وہ اندر آگئی۔
"پھپھو..." اس نے ان کے کندھے کو نرمی سے چھوا۔
"خود کو کیوں سزا دے رہی ہیں۔ کل سے گم صم اداس بیٹھی ہیں کمرے میں۔ سزا دینا ہے تو اسے دیجیے۔ جس نے آپ کو ہرٹ کیا۔ آپ کو تکلیف پہنچائی۔ خود کو کیوں دے رہی ہیں آپ..." مومنہ نے حوریہ کو دیکھا، پھر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے بیڈ پر بٹھالیا۔
"میں خود کو کوئی سزا نہیں دے رہی ہوں۔ میں بھلا کیوں ہرٹ ہوئی ہوں۔" وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔
"حازم نے آپ کو... ہرٹ کیا ہے پھپھو..."
"نہیں... مجھے حازم سے کوئی شکایت نہیں۔"
"کیا..." حوریہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"ہاں حوریہ... اس نے کچھ غلط نہیں کیا۔ اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس کے سامنے اس کا باپ موت اور زندگی کی کشمکش میں ہے۔ اس نے تو بس ایک فرماں بردار اولاد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔"

"پھپھو... اس نے آپ کا دل دکھایا ہے۔" حوریہ کا لہجہ احتجاج کرتا ہوا تھا۔ "آپ ہرٹ ہوئی ہیں۔" مومنہ یوں مسکرائی جیسے کسی بچے کی معصوم سی ضد پر مسکراتے ہیں۔

"نہیں حوریہ... وہ اس کا باپ ہے۔ یہ رشتہ کوئی معمولی اور بے معنی تو نہیں ہے اور مجھے تو حیرت یہ ہے کہ جس ماحول میں وہ پلا بڑھا ہے۔ جس شخص کے ساتھ زندگی گزارتا رہا ہے۔ گیلانی ہاؤس میں جوان ہوا ہے۔ وہاں رشتوں کے احترام' ایسی وفاداریاں... ایسی محبت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ عباد کا بیٹا ہو کر بھی میں نے اس کی آنکھوں میں رشتوں کا احترام دیکھا۔ رشتوں کا تقدس دیکھا۔"

"تو پھر... اس سے ناراض ہو کر' اسے ڈانٹا کیوں۔ اس پر غصہ کیوں کیا تھا اور کل سے کمرے میں بند ہو کر کیوں بیٹھی ہیں۔" مومنہ نے اس کی بات پر ایک خفیف سی تھکی ہوئی سانس بھر کر بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"اگر اسے رشتوں کے تقدس کا خیال ہوتا۔ وہ رشتوں کا احترام سمجھتا تو آپ سے بھی اسے محبت ہوتی۔ آپ کا خیال آتا' دل نہیں توڑتا۔ صرف باپ کا خیال نہیں کرتا۔" یاور علی دروازے پر آکر رک گئے تھے۔ حوریہ کی بات پر مسکرائے اور اسٹک کے سہارے اندر آگئے۔ حوریہ یاور علی کو دیکھ کر جذباتی انداز میں یاور علی کے پاس آگئی۔

"دیکھ رہے ہیں نانا ابو... پھپھو کل سے نہ کچھ کھا رہی ہیں' نہ بات کررہی ہیں۔ اتنی دکھی ہیں۔ ان کو حازم کے رویے سے تکلیف پہنچی ہے اور اب وہ حازم کی سائیڈ لے رہی ہیں۔ اس کا دفاع کررہی ہیں۔"

یاور علی نے مومنہ کو دیکھا۔ وہ خاموش دیوار پر نظریں ٹکائے بیٹھی تھی۔ بظاہر اس کے وجود پر سناٹا چھایا ہوا تھا' مگر یاور علی جانتے تھے اس جامد سناٹے کے اندر تندو تیز طوفان چھپا ہوا تھا' محبت کا۔ میٹھی میٹھی مہکار کا۔

"تم جذباتی ہو رہی ہو حوریہ... وہ مومنہ کا وقتی غصہ تھا۔ جو در حقیقت عباد کے لیے تھا۔ وہ عباد سے نالاں ضرور ہے' حازم سے نہیں ہو سکتی۔ اسے پتا ہے وہ عباد کا بیٹا ضرور ہے' مگر اس کی رگوں میں اس کی ماں کا خون بھی ہے۔ عباد کے ساتھ پلا بڑھا ضرور ہے' مگر چار پانچ سال وہ اس کی ماں کی کوکھ میں رہا ہے۔ ابتدائی عمر کے لمحات بچے پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔" حوریہ نے مومنہ کو دیکھا پھر بولی۔

"تو کیا... آپ حازم کو معاف کردیں گی۔" وہ جانے کیوں بوکھلا سی گئی۔ جیسے کوئی بڑا خوف دل پر دھمک پیدا کررہا ہو۔ مومنہ مسکرائی۔

"کس بات کی معافی... اس نے کوئی جرم نہیں کیا پگلی۔ وہ اگر اپنے باپ کو کوئی خوشی دینا چاہتا ہے۔ اس کی کوئی تکلیف کم کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کا جرم تو نہیں ہے نا۔"

"او مائی گاڈ..." حوریہ کو اپنے اعصاب ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

"ہاں... مجھے اس وقت بہت غصہ آیا۔ تکلیف بھی پہنچی۔ مگر جب میں نے سوچنا شروع کیا۔ تو مجھے اسی پر پہلے سے زیادہ پیار آنے لگا۔ مجھے فخر محسوس ہونے لگا۔ عباد ہاؤس میں رہنے والے کا دل جذبات اور نرم احساسات سے بھرا ہوا ہے۔ وہ رشتوں سے محبت کرنا اور انہیں نبھانا جانتا ہے۔" مومنہ کی بات پر یاور علی تائیدی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولے۔

"ہاں مومی... اس لیے کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔ تمہارا دل اس کے لیے وسیع ہونا فطری بات ہے۔ مگر میں نے اور عادل نے بھی یہ بات محسوس کی ہے کہ وہ عباد سے بالکل برعکس ہے۔"

یاور علی' مومنہ کے پاس بیٹھے کہہ رہے تھے اور ادھر حوریہ... یہ سوچ کر پریشان ہونے لگی کہ یہ اس نے حازم

کے ساتھ کیا کردیا۔ اسے فون کر کے بری طرح جھاڑا ہے۔ حتیٰ کہ اسے یہاں آنے تک سے روک دیا ہے۔ کتنے برے انداز سے اس نے اسے جھڑک دیا تھا۔ اب.... اب اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ وہ جانے کیا سوچ رہا ہوگا۔ مائی گاڈ.... اب وہ اس کا سامنا کیسے کرپائے گی۔ وہ بمشکل اپنے اعصاب کمپوز کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ٹیرس میں آکر بھی اسے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا ایک دم بند ہوگئی ہے۔ کچھ سوچ کر وہ کمرے میں آئی اور موبائل اٹھا کر حازم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ مگر دوسرے پل اس نے لائن ملتے ہی ڈس کنکٹ کردی۔ آخر وہ اس سے کہے گی کیا اگر کہے گی کہ بس غصہ آگیا تھا تو وہ ضرور پوچھ سکتا ہے کہ.... وہ کیونکر غصہ کرنے لگی۔ کیا حق رکھتی ہے غصہ دکھانے کا۔

"ہائے اللہ.... اب کیا کروں۔" اس نے دوسری بار بھی نمبر ڈائل کر کے لائن ڈس کنکٹ کردی۔ پھر موبائل پھینکنے کے انداز میں رکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆
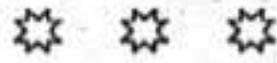
حازم نے اپنے موبائل پر دو مس کالز دیکھیں تو اس کے ہونٹ میکانکی انداز میں سکڑ گئے۔ کچھ سوچ کر اس نے یاور علی کے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ اس کے پاس مومنہ کے پرسنل نمبر نہیں تھے۔ فون رقیہ بھابھی نے اٹھایا تھا اور حازم کی آواز سن کر محبت سے سلام دعا کرنے لگیں۔ پھر حوریہ کو آواز دے کر بولیں۔

"حوریہ.... مومنہ سے کہو' حازم کا فون ہے۔" حوریہ کے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس بے اختیار پھسل کر فرش پر گرا۔ زوردار چھناکا ہوا۔ وہ خود بھی بوکھلا گئی۔

"کیا ہوا؟" رقیہ بھابھی وہیں سے بولیں۔

"کک.... کچھ نہیں.... گلاس گر گیا۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں.... اچھا حازم ہولڈ کرو۔ میں مومنہ کو بلاتی ہوں۔"

"ایکسکیوزمی.... پلیز...." وہ جلدی سے بولا۔ "آپ مجھے مما کے سیل فون کا نمبر بتادیں۔ میں خود ہی کرلیتا ہوں۔"

"ہاں.... یہ ٹھیک ہے۔ یوں بھی وہ اپنے کمرے میں ہے۔ ٹھہرو میں دیتی ہوں۔" رقیہ بھابھی نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھنے کی زحمت بھی نہ کی اور حوریہ کو پکارنے لگیں۔

"تم سن نہیں رہی ہو۔ ادھر آؤ حوریہ...." (اوف.... اب کیا مصیبت آگئی۔) وہ فرش پر جابجا بکھرے کانچ کے ٹکڑوں سے پیر بچاتی رقیہ بھابھی کی طرف آئی۔

"ذرا حازم کو مومنہ کے موبائل کا نمبر بتادو' مجھے تو یاد نہیں ہیں' ٹھیک ہے۔" انہوں نے یہ کہتے ہوئے حوریہ کو ریسیور پکڑا دیا۔

"برنر بھی کھلا چھوڑ کر آئی ہوں۔" وہ تیزی سے کچن کی طرف بھاگ لیں۔ ادھر حوریہ ریسیور پکڑے دم سادھے رہ گئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

www.Paksociety.com
تنظیر فاطمہ
نالائق
READING
Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

"ماموں! اماموں! اب میری باری مجھے جھولے دیں نا۔" آٹھ سالہ شیری خوش ہو کر اونچی آواز میں متعال سے کہہ رہا تھا' جو اس کی پانچ سالہ بہن مایا کو اس کے بازوؤں سے پکڑ کر گول گول گھما رہا تھا۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ بچوں کے ساتھ بچہ بنا ٹیرس پر کھیل رہا تھا۔ اس نے مایا کو احتیاط سے ٹیرس کے دائیں جانب رکھے ہوئے جھولے پر بٹھایا اور شیری کو بازوؤں سے پکڑ کر گول گول گھمانے لگا۔ مایا اور شیری چیخ چیخ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ ٹیرس کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔

"متعال! تم کیا میرے بچوں کو بگاڑ رہے ہو۔ ایسی چیخ و پکار مچا رہے ہیں جیسے کسی جنگل میں کھڑے ہوں۔ اسی وجہ سے میں یہاں کم کم آتی ہوں کہ یہاں آکر یہ دونوں تمہاری دُم بن جاتے ہیں اور اپنے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ خود تو تم نے ساری زندگی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا۔ اب میرے بچوں کو بھی اپنی راہ پر لگا لیتا۔" علینا (متعال کی بڑی بہن) نے اسے بے نقط سنائیں۔ ماں کو دیکھ کر دونوں بچے سر جھکا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ متعال اس کی ڈانٹ کے جواب میں سر کھجا کر رہ گیا۔

"اور تم دونوں ابھی چلو اندر۔" اس نے دونوں بچوں کو ٹیرس کے اندرونی دروازے کی طرف دھکیلا۔ بچے فوراً" اندر بھاگ گئے۔

"تم خود تو رہے نالائق کے نالائق' براہ کرم اب مجھ پر رحم کرو۔" علینا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے اور مڑ کر چلی گئی۔ متعال نے گہری سانس بھر کر سر جھٹکا اور جھولے پر بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆
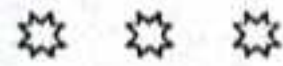
"بھائی! ایک منٹ' مجھے ڈراپ کر دیجیے گا پلیز۔ میری بائیک خراب ہے۔" متعال نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور عجلت میں اپنا لیپ ٹاپ بیگ اٹھا کر اپنے بڑے بھائی ابرار کے پیچھے ہو لیا۔

"تم اگر ہماری طرح دل لگا کر پڑھ لیا ہوتا تو آج تمہارے پاس گاڑی ہوتی اور تم یوں دوسروں سے لفٹ نہ مانگ رہے ہوتے۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ابرار نے اسے جلی کٹی سنائیں۔

"مگر آپ "کوئی دوسرے" نہیں میرے بھائی ہیں۔" متعال نے مسکرا کر اس کے لہجے کی تلخی کو اپنے اندر اتار لیا۔

"بس ہمیشہ بہن بھائیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر چلتے رہنا خود کچھ نہ کرنا۔ نالائق کہیں کا۔" باقی کا سارا راستہ ابرار نے ناک بھوں چڑھائے رکھا اور متعال ان کے انداز اور لہجے پر افسوس کرتا رہ گیا جن کے نزدیک مادی چیزیں ہی سب کچھ تھیں' رشتے کچھ بھی نہیں۔ وہ بہت بجھے ہوئے دل کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا جب اس کی کولیگ کم دوست' لیلیٰ نے اسے سلام کیا اور اپنا سامان اپنی ٹیبل پر رکھنے لگی۔

"وعلیکم السلام" اس نے بڑے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" لیلیٰ کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے مگر صبح صبح روح زخمی کروا آیا ہوں۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"کیا مطلب؟" وہ الجھی۔

"بائیک خراب تھی سو ابرار بھائی سے لفٹ لی اور سارے راستے نالائقی کے طعنے سنتا آیا۔ اس سے تو اچھا تھا پبلک ٹرانسپورٹ لے لیتا۔" اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی مایوسی آمیز پریشانی تھی اور لیلیٰ اس کی سچی دوست تھی جو اسے پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"چلو چھوڑو بھی' موڈ ٹھیک کرو اور یہ پریزنٹیشن فائنل کرو۔ احمد صاحب کو ساڑھے گیارہ بجے تک فارورڈ کرنی ہے۔" لیلیٰ نے اس کے ساتھ زبانی ہمدردی کرنے کی بجائے اسے کام میں الجھا دیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اگر کوئی کسی بات پر پریشان ہو تو اسے اتنا مصروف کر دو کہ اسے وہ بات سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس کی یہ

حکمت عملی کامیاب رہی تھی۔ دو گھنٹے کی مغز ماری کے بعد وہ دونوں فارغ ہوئے تو متعال کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ صبح کتنا ڈپریس تھا۔

"یار! اچھی سی کافی پلاؤ۔ دماغ ہل گیا اس کو فائنل کرتے ہوئے۔" اس نے ریلیکس سے انداز میں لیلیٰ کو مخاطب کیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ماما؟ آج پھر چائنیز' کبھی تو میری پسند کا بھی خیال رکھا کریں۔" رات کو متعال کو شدید بھوک لگ رہی تھی وہ کھانے کی ٹیبل پر آیا تو چائنیز دیکھ کر اس کی بھوک اڑ گئی۔ وہ پاکستانی کھانوں کا شیدائی تھا اور ان کے گھر میں یہ کھانے کبھی کبھار ہی بنتے تھے۔ ورنہ چائنیز اور تھائی کھانوں کے نام پر نہ جانے کون کون سے ملغوبے ہی نظر آتے ہیں۔

"کیوں؟ تم تو جیسے ہر معاملے میں ہماری پسند کو مد نظر رکھتے آئے ہونا۔ چپ کر کے کھاؤ ورنہ باہر سے کچھ منگوالو۔" ماما کے انداز پر وہ غصے سے اٹھ کر چلا گیا۔

"نالائق کہیں کا۔" بابا نے غصے سے سر جھٹکا۔ ابرار آرام سے یوں کھانا کھانے میں مصروف تھا جیسے اسے کچھ سنائی اور دکھائی نہ دیا ہو۔

"بہو! اسے کھانا تو کھا لینے دیتیں۔ کبھی کبھی تو مجھے شک گزرتا ہے کہ متعال تم لوگوں کی سوتیلی اولاد ہے۔" دادی اپنا پرہیزی کھانا سامنے رکھے ہوئے تھیں۔ انہیں اس کا یوں اٹھ کر جانا بہت برا لگا تھا سو وہ بولے بغیر نہ رہ سکیں۔ پورے گھر میں صرف متعال ہی تھا جسے ان کی بہت پروا تھی باقی سب تو جیسے گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ بھاگتے تھے۔ کسی کے پاس دوسرے کے لیے وقت ہی نہ تھا۔

"بس کریں اماں! آپ کے لاڈوں کی وجہ سے ہی بگڑا ہے یہ۔" بہو سخت لہجے میں جواب دے کر کھانے میں مصروف ہو گئی۔ دادی افسوس سے سر ہلا کر کھانا زہر مار کرنے لگیں۔

☆ ☆ ☆
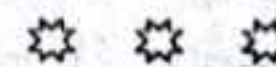
متعال کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ بہت ذہین و فطین خاندان میں اوسط درجے کی ذہانت لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کے خاندان میں ڈاکٹرز' انجینئرز اور بیوروکریٹس کی بہتات تھی' حتیٰ کہ ایک دو ریسرچ سائنٹسٹ بھی تھے۔ اللہ نے اس کے ددھیال اور ننھیال میں (اس کے امی ابا چچازاد تھے۔) ذہانت کے اعلا شاہکار پیدا کیے تھے۔ خود اس کے اپنے بہن بھائی بھی بہت لائق فائق تھے اس کی سب سے بڑی بہن علینا کیمسٹری میں پی ایچ ڈی گولڈ میڈلسٹ تھی اور ایک انٹرنیشنل ادارے میں بطور ریسرچ سائنٹسٹ کام کر رہی تھی۔ اس سے چھوٹا ابرار سی اے کرنے کے بعد چارٹرڈ اکاؤنٹنسی میں ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔

لیکن وہ سب سے چھوٹا تھا اور اپنے بہن بھائیوں کی طرح ذہین و فطین نہیں تھا نہ ہی اسے سائنس وغیرہ میں کوئی دلچسپی تھی۔ کھینچ تان کر میٹرک سائنس کے ساتھ کیا اور ایف ایس سی میں لگاتار فیل ہونے اور گھر والوں کے جوتے کھانے کے بعد ایف اے کیا۔ اس کے بعد بی اے' پھر ایم اے انگلش کر کے کمپیوٹر کے حوالے سے کئی چھوٹے بڑے کورسز کیے۔ آج کل وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر بزنس ڈویلپمنٹ کے پی اے کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس کی لینگویج اسکلز حیرت انگیز طور پر بہت اچھی تھیں۔ اس کے بابا ریٹائرڈ بیوروکریٹ تھے۔ اتنے عزت دار اور عہدوں والے خاندان میں کسی فرد کا پی اے کی جاب کسی گالی سے کم نہ تھی۔

لہٰذا وہ اپنے پورے خاندان میں "نالائق" مشہور تھا۔ اس کا کوئی کزن اس کے ساتھ تعلق رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ پہلے وہ خود ان میں زبردستی گھس جاتا تھا' مگر ان کا رویہ دیکھ کر وہ ان سب سے جیسے کٹ سا گیا تھا۔ اس کے بہن بھائی اور کزنز مل کر مختلف پروگرام ترتیب دیتے اور اسے کسی اچھوت کی طرح الگ رکھا جاتا۔ رشتہ دار اور بہن بھائی تو ایک طرف اس کے تو ماں باپ بھی اس کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ کوئی ملنے آتا تو بابا بڑے فخر سے اپنے دو

بچوں کا ذکر کرتے اور اس کا نام تک لینا بھول جاتے۔ اگر سامنے والے کو یاد ہوتا کہ متعال بھی ان کا بیٹا اور وہ اس کے بارے میں پوچھ لیتا تو بابا۔

"اس نالائق کی تو بات ہی رہنے دیں۔" کہہ کر موضوع بدل دیتے۔ ماں جسے اپنے سارے بچے جان سے پیارے ہوتے ہیں' وہ بھی ہر موقع پر اسے اس کی اوقات یاد دلانا نہیں بھولتی تھیں۔ سارے خاندان میں لے دے کر ایک دادی ہی تھیں' جو ہمیشہ اس کی ڈھال اور سہارا بن رہیں۔ اس لیے ان پر الزام آتا تھا کہ متعال کو انہوں نے ہی بگاڑا ہے حالانکہ اگر دادی کا وجود نہ ہوتا تو وہ نہ جانے کن راستوں کا مسافر بن جاتا۔ اس کے گھر والے یہ بات ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے اور ہر ایک کا نصیب بھی۔ اور کسی ایسی چیز کے لیے کسی انسان کو معتوب ٹھہرانا' جس پر اس کا کوئی اختیار ہی نہ ہو' سراسر ظلم تھا اور وہ سب مل کر اس پر مسلسل یہ ظلم ڈھا رہے تھے۔

متعال بھلے اپنے بہن بھائی جتنا "تعلیم یافتہ" اور "کامیاب" نہیں تھا اور نہ ہی ان کے جتنا کماتا تھا' مگر اس کے اندر ہر کسی کے لیے احساس تھا۔ وہ سب کی مدد کرنے کو تیار رہتا تھا۔ دادی کو کب ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا' کب دوائی دینی ہے؟ ان کی کون سی دوائی ختم ہے؟ کون سی دوائی لانی ہے؟ ان سب باتوں کا دھیان صرف وہی رکھتا تھا۔ گھر کے مالی سے لے کر آفس کے چپڑاسی تک ہر کوئی اپنے مسائل بے دھڑک اس سے شیئر کرتا اور وہ حسب توفیق ان کے مسائل حل کرتا۔ اس کی یہ خوبیاں بھی گھر والوں کا دل جلاتیں کہ یہ ہمیشہ اپنے سے کم حیثیت لوگوں سے دوستی کرتا ہے' جس سے ان کے اسٹیٹس پر حرف آتا ہے۔ وہ ان سب کے ساتھ ایک گھر میں رہنے کے باوجود "ان جیسا" نہیں تھا۔

اسے بچوں سے بہت پیار تھا۔ علینا آتی تو وہ اس کے بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتا' انہیں خوب انجوائے کرواتا۔ بچے بھی اپنے اس ماموں سے بہت پیار کرتے تھے' مگر اس کا یہ پیار بھی سب گھر والوں کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا خصوصاً" علینا تو کوئی مروت رکھے بغیر اپنے بچوں کو اس کے سائے سے بھی بچاتی تھی' مگر بچوں کو تھوڑا سا موقع بھی ملتا تو ماموں کے پاس جا گھستے اور علینا کا پارہ ہائی ہو جاتا۔ متعال کی باقاعدہ کلاس لگتی اور ہر کوئی اسے برا بھلا کہہ کر اپنے دل کا غبار نکالتا۔

☼ ☼ ☼

متعال گھر سے نکل کر بائیک بے مقصد ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔ ابھی تک وہ بھوکا تھا۔ آج نجانے اسے اپنی ماں کی باتوں سے زیادہ تکلیف کیوں پہنچی تھی۔ وہ بوجھل ذہن کے ساتھ بائیک چلا رہا تھا جب اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے بائیک سائیڈ پر روک لی۔ لیلیٰ کی کال تھی۔

"ہیلو!" اس نے فون کان سے لگایا۔

"کہاں ہو بھئی؟ امی نے بریانی اور کوفتے بنائے ہیں اگر موڈ ہو تو آجاؤ مل کر انجوائے کرتے ہیں۔" دادی کے بعد ایک لیلیٰ ہی تھی جو اس کی کیفیات اور احساسات کو سمجھتی تھی اور جب بھی وہ ڈپریس ہوتا وہ ہاتھ پکڑ کر اس کو اس فیز سے نکال لیتی تھی۔

"اوکے' میں آتا ہوں۔" آدھے گھنٹے بعد وہ تینوں مل کر ڈنر انجوائے کر رہے تھے۔

"شکریہ آنٹی! اتنا شاندار ڈنر کروانے پر۔" متعال نے لیلیٰ کی امی کو مخاطب کیا۔

"اچھا جناب! اور میرا شکریہ؟ فون تو میں نے کیا تھا نا۔" لیلیٰ نے مصنوعی گھوری ڈالی۔

"تمہارے ساتھ تو حساب کتاب چلتا رہتا ہے۔" وہ مسکرایا۔ لیلیٰ کو اپنا یہ دوست بہت عزیز تھا۔ اگر اس کی سپورٹ نہ ہوتی تو ان ماں بیٹی کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے ابو کی بیماری کے دوران اس نے جس طرح ان کی مدد کی تھی اور اب تک جیسے ان کا سہارا بنا ہوا تھا' کوئی خونی رشتہ دار بھی ہوتا تو شاید ایسا نہ کرپاتا۔

لیلیٰ کے امی ابو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور باقی رشتہ داروں کے پاس اتنا وقت اور احساس نہیں تھا

کہ اس کے ابو کی بیماری کے دوران ان ماں بیٹی کی کوئی مدد کرسکتے۔ لیلیٰ آفس' گھر اور اسپتال کے درمیان گھن چکر بن جاتی۔ ایسے میں ہر موقع پر متعال اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ اکثر رات کو اسپتال میں رک جاتا۔ جہاں ان کو کوئی مشکل پیش آتی وہ ان کی ڈھال بن جاتا۔ لیلیٰ کی امی کو بھی یہ پرخلوص جوان بہت پسند تھا۔ وہ اکثر کہا کرتیں کہ ان کا سگا بیٹا بھی شاید اتنا نہ کرسکتا جتنا اس نے لیلیٰ کے ابو کے لیے کیا تھا۔

لیلیٰ اس کے حالات سے واقف تھی سو جب بھی وہ ڈسٹرب ہوتا' تو جہاں تک ممکن ہوتا وہ اس کو اس صورت حال سے نکال لیتی۔ آج بھی لیلیٰ نے دادی کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا تھا تو انہوں نے اسے سارا واقعہ بتایا سو لیلیٰ نے اسے ڈنر کی دعوت دے کر اس کا موڈ بحال کردیا تھا۔ دادی کو لیلیٰ بہت پسند تھی وہ اسے متعال کی سب سے اچھی دوست کے حوالے سے جانتی تھیں۔ بلکہ وہ تو بہت آگے تک کی سوچ بیٹھی تھیں۔ ان کے خیال میں لیلیٰ ہی تھی جو ان کے متعال کو خوش رکھ سکتی تھی۔ سو وہ چاہتی تھیں کہ ان دونوں کی شادی ہوجائے' مگر ابھی یہ خیال صرف ان کے دل میں ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

"بیٹا میں اس کی شادی کرنے کا سوچ رہی ہوں۔ اگر تمہاری نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتانا۔" آج متعال لیلیٰ کی امی سے ملنے آیا تھا جب انہوں نے اس سے بات کی۔ ان کی بات سن کر اس کے سینے پر جیسے بہت بھاری بوجھ آن گرا تھا۔ وہ اور لیلیٰ جدا ہوسکتے ہیں یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ لیلیٰ غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر بے چینی کے تاثرات بہت واضح تھے۔ وہ زیرلب مسکرادی کہ اس کی پسندیدگی یک طرفہ نہیں تھی۔

"گھنا میسنا بھی جو ہوا لگنے دی ہو کہ اس کے دل میں کیا ہے؟" لیلیٰ نے دانت پیس کر دل ہی دل میں بولی۔

"امی! آپ بھی نا' کس سے کہہ رہی ہیں' یہ کام اس کے بس کا نہیں ہے۔ کیوں متعال؟" لیلیٰ نے اس کی حالت سے حظ اٹھایا۔ وہ ضروری کام کا بہانہ کرکے نکلتا چلا گیا۔

"لیلیٰ! کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟" ویک اینڈ کے بعد آفس آنے پر سلام کے بعد پہلی بات یہی سوال تھا۔ لیلیٰ سے دوری کے خیال نے اسے ساری رات سونے نہیں دیا تھا۔ وہ اتنے ڈائریکٹ سوال پر گڑبڑا سی گئی۔ اسے جواب سمجھ میں نہیں آرہا تھا سو وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ اس کی خاموشی پر متعال کے چہرے پر بہت طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

"شادی اور تم جیسے نالائق سے' یہی سوچ رہی ہونا تم؟" اس کا لہجہ حد سے زیادہ طنزیہ تھا۔ لیلیٰ نے نا سمجھی سے بھنویں اچکائیں۔ متعال کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو دیکھ کر اس نے عود کر آنے والی اپنی فطری جھجک پر ایک منٹ کے اندر قابو پایا اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"یہ کس نے کہا؟" اس نے غصے سے سوال کیا۔

"سب کہتے ہیں۔" وہ پلٹ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے اپنے اوپر قابو پا کر خود کو لیلیٰ کا انکار سننے کے لیے تیار کرلیا تھا۔

"مگر میں ان سب میں شامل نہیں ہوں۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ اس کی ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ کر اس کو گھورنے لگی۔

"اچھا... ا... ا؟" متعال نے اچھا کو کھینچ کر گویا لیلیٰ کی بات کا مذاق اڑایا۔ اسے اپنا سوال گول کردیا جانا بہت محسوس ہوا تھا۔

"تو پھر میرے سوال کا جواب تو دو' چاہے انکار ہی کرو' مگر بولو تو سہی۔" متعال نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں' لہجے میں ابھی بھی طنز تھا۔

"تم نے یہ سوال ایسے پوچھا ہے جیسے کہہ رہے ہو آئس کریم کھاؤگی؟ یا کافی پیوگی؟ بندہ کسی ڈھنگ سے بات کرتا ہے۔ آتے ہی پتھر کی طرح سوال پھینک دیا' مجھ سے شادی کروگی؟" آخر میں لیلیٰ نے اس کی نقل

اتاری۔

"سوال سمجھنے کی مہلت تک نہیں دی۔ دل تو میرا یہی چاہ رہا ہے کہ تمہارے اس انداز پر میں سچ مچ انکار کردوں، مگر کروں گی نہیں۔ میں اتنی آسانی سے تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی، سمجھے؟" وہ ٹیبل پر ہاتھ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی اور متعال اس کی اتنی لمبی بات کے آخر میں کیے جانے والے اقرار کو سن کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

"او! ریئلی؟" اس نے باچھیں پھیلائیں تو لیلیٰ مضحکہ خیز صورت بنا کر پلکیں جھپکنے لگی۔

☆ ☆ ☆
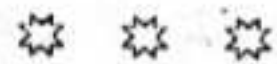
متعال نے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو صرف دادی کو خوشی ہوئی باقی سب پر تو جیسے بم پھٹا تھا۔

"شادی؟ کون تم سے اپنی بیٹی کی شادی کرے گا۔ ہمارے سرکل میں تو تمہاری شادی ہو نہیں سکتی۔" ابرار نے سنگدلی کی انتہا کردی۔ آج کل اس کی شادی کی بات ایک بیوروکریٹ پلس صنعت کار گھرانے میں چل رہی تھی۔ متعال اس بات سے لاعلم تھا۔ ابرار کو لگا جیسے وہ اس کا مقابلہ کررہا ہے اس لیے بھڑک اٹھا تھا۔ ماما بابا اس کی بات پر یوں خاموش تھے جیسے ابرار کی باتوں سے سو فی صد متفق ہوں۔

"اچھا ہے بابر، دونوں بیٹوں کی شادی اکٹھی کردو۔" دادی نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔

"مگر اس کے لیے لڑکی کہاں سے آئے گی؟" ماما نے لب کھولے۔

"لڑکی میں نے پسند کرلی۔ آپ لوگ فکر مت کریں۔" متعال نے چائے کے کپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی بات پر چائے کا سپ بھرتے بابا اور ابرار کو بڑے زور کا اچھو لگا۔

"ہمیشہ کی طرح تم نے یہاں بھی ہمیں لیٹ ڈاؤن کرنے کا منصوبہ ہی بنایا ہوگا۔ یقیناً" کسی غریب غربا کے خاندان سے ہی رشتہ جوڑنے چلے ہوگے تم۔" بابا کو غصہ آگیا۔

"پاپا پلیز! زندگی میں نے گزارنی ہے تو....."

"تم نے گزارنی ہے تو جاؤ کرلو شادی، ہمیں بتانے کی کیا ضرورت ہے؟" اب کے ماما نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی۔

"ایک بات اور کان کھول کر سن لو ہم کسی گلی محلے میں ہرگز نہیں جائیں گے۔" ماما نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"اب تم لوگ زیادتی کررہے ہو۔ بچے کی خوشی خراب مت کرو۔ میں ملی ہوں لیلیٰ سے، بہت اچھی بچی ہے اور اچھے پڑھے لکھے مہذب لوگ ہیں۔" دادی نے مداخلت کی۔

"اوہ! تو یہاں بھی اسے آپ کی شہ حاصل ہے۔" ماما نے دادی کی طرف طنزاً اچھالا۔

"بس، دیکھتے ہیں۔ ابھی لڑکی والوں سے مل لیتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں۔" بابا نے ہاتھ اٹھا کر بات ختم کی۔

"اچھا ہے، اس نکمے نے اپنے لیے خود ہی لڑکی پسند کرلی ہے۔ ورنہ نہ جانے ہمیں کہاں کہاں ذلیل ہونا پڑتا۔" سب کے اٹھ جانے کے بعد بابا نے ماما کی طرف اطمینان سے دیکھا۔

"مگر ایک بات ذہن میں رکھیے گا۔ متعال اور ابرار کی شادی ایک ساتھ نہیں ہوگی۔" ماما نے فیصلہ سنایا اور بابا نے سرہلا کر اس کی تائید کی۔

☆ ☆ ☆

ابرار کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ اس کی شادی سے فارغ ہو کر ماما بابا نے لیلیٰ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ ڈیفنس سے اٹھ کر ایک مڈل کلاس سوسائٹی تک جانا، ماما بابا کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ دونوں لیلیٰ کی ماں سے بڑے کروفر سے ملے۔

"اگرچہ آپ کی بیٹی اور ہمارے بیٹے نے مل کر خود ہی سب کچھ طے کرلیا ہے اس لیے ہم لوگ یہاں صرف دنیا دکھاوے کو آئے ہیں۔" ماما نے لیلیٰ کی امی سے تذلیل آمیز لہجے میں بات کی۔

"بہو!" دادی نے تنبیہی انداز میں پکارا تو وہ منہ بنا

کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

"بیٹا! لیلیٰ کو بلاؤ۔" دادی نے لیلیٰ کی امی کو باہر بھیجا۔

"تم دونوں یہاں تک آہی گئے ہو تو ڈھنگ سے بات کرو۔ دوسروں کی بھی عزت ہوتی ہے۔" دادی نے کڑے لہجے میں کہا۔ ماما نے لیلیٰ کے ہاتھ میں ہلکی سی انگوٹھی پہنا کر بات پکی کی۔ شادی کی تاریخ چھ ماہ بعد کی رکھی گئی۔ ماما بابا کو ویسے بھی اس کی شادی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ سب کچھ دادی نے اپنے زیر نگرانی کروایا۔ ابرار جتنی نہ سہی، مگر دادی نے متعال کی شادی خاصی دھوم دھام سے کروائی۔

"لیلیٰ! میں تمہیں بہت سارا پیسہ اور آسائشات نہیں دے سکوں گا، مگر میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا اور ہر طرح کے حالات میں اپنی پوری سپورٹ کے ساتھ تمہارے ساتھ کھڑا رہوں گا۔" شادی کی رات اس نے لیلیٰ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"میں جانتی ہوں۔ آپ کے پاس احساس کی دولت ہے اور آپ کبھی مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ جانتے ہیں محبت کا دعوا ہر شوہر کرتا ہے، مگر اپنی بیوی کا احساس کرنے والے شوہر بہت کم ہوتے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کا شمار احساس کرنے والے شوہروں میں ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ، ہماری زندگی بہت خوش گوار ہوگی۔" لیلیٰ نے دل کی گہرائی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ تمہیں میرے گھر والوں کا....." اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"میں جانتی ہوں اور یہاں مجھے کس طرح رہنا ہے یہ بھی مجھے معلوم ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔" لیلیٰ نے اس کے خدشوں کو ہوا میں اڑا دیا۔

"یہ تم مجھے آپ، آپ کیوں کہہ رہی ہو؟" متعال کو خیال آیا تو اس کو ٹوک گیا۔

"کیوں کہ یہ آپ کا حق ہے کہ میں آپ کی عزت کروں اس لیے، شروع میں تھوڑی مشکل ہوگی، لیکن ہو جائے گا۔" وہ مسکرائی۔

"اچھا جی؟" متعال نے شرارت سے کہا۔

"ہاں جی۔" لیلیٰ نے اسی کے انداز میں جواب دیا تو دونوں کی ہنسی ایک ساتھ گونج اٹھی۔

☼ ☼ ☼

چند ہی دنوں میں لیلیٰ کو اس گھر میں اپنی حیثیت کا اندازہ ہو گیا تھا، مگر وہ پریشان نہیں تھی کیوں کہ متعال اور سب سے بڑھ کر دادی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ اس کی رہنمائی کرتیں اور اس کا حوصلہ بڑھاتی رہتی تھیں۔ ابرار کی بیوی سسرال میں کم ہی رہتی تھی، مگر جب کبھی وہ یہاں آتی تھی لیلیٰ سے اچھے طریقے سے بات کرتی تھی۔ بہت امیر ہونے کے باوجود وہ خاصی سلجھی ہوئی تھی۔ بابا اسے اس وقت مخاطب کرتے جب انہیں چائے یا کافی کی طلب ہوتی اور سامنے کوئی نوکر نہ ہوتا۔

"بی بی! یہ مڈل کلاس والی حرکتیں چھوڑ دو اب' یہ کام کرنے کے لیے ہمارے گھر میں نوکر موجود ہیں۔" ماما اس کی کسی بھی خدمت کے بدلے میں سڑا ہوا انداز اختیار کرتیں۔

دادی البتہ اس سے بہت خوش تھیں۔ دادی کے وہ سارے کام جو پہلے متعال کی ذمہ داری تھی اب لیلیٰ کرتی تھی۔ وہ دن کا زیادہ تر حصہ دادی کے ساتھ گزارتی تھی۔ گھر میں کرنے کو کچھ خاص نہیں ہوتا تھا۔ وہ بری طرح بور ہو گئی کہ اسے فارغ رہنے کی عادت نہیں تھی۔ سو دادی کے مشورے پر اس نے دوبارہ سے آفس جوائن کر لیا۔ دونوں ساتھ جاتے اور ساتھ واپس آتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے سنگ بہت خوش تھے۔

☼ ☼ ☼

علینا اپنے ادارے کی طرف سے فیملی سمیت پانچ سال کے لیے لندن جا رہی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگلے ہفتے ان کی فلائٹ تھی۔ آج اس سلسلے میں دعوت تھی۔ علینا کی پوری فیملی یہاں موجود تھی۔ لیلیٰ صبح سے

نوکروں کے ساتھ مل کر انتظامات کررہی تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر علینا کے شوہر نجم نے 'لیلیٰ کی بنائی ہوئی کسی ڈش کی بے ساختہ تعریف کی تو اس کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی کہ اتنے دنوں میں پہلی بار اس کے کام کو سراہا گیا تھا۔ علینا سے اس کی یہ خوشی برداشت نہ ہوسکی۔

"کھانا اچھا نہیں بنائے گی تو اور کیا کرے گی۔ اس کا بروٹ اپ (پرورش) ہی ایسا ہے۔ شادی کرو' بچے پیدا کرو' مزے مزے کے کھانے بناؤ اور بوڑھے ہو کر مرجاؤ۔ سونے پہ سہاگہ دونوں میاں بیوی کی سوچ کنوئیں کے مینڈکوں جیسی ہے۔" وہ سب کی موجودگی میں اس کو اچھا خاصا سنا گئی۔ خفت کے مارے لیلیٰ کا رنگ اڑ گیا۔

"آپا! آپ زیادتی کررہی ہیں۔" متعال سے رہا نہ گیا۔

"اس میں غلط کیا ہے' اپنے جیسے نالائقوں کی فوج ہی تیار کروگے نا تم دونوں۔" علینا نے حد کردی۔

"علینا!" دادی نے غصے سے پکارا۔ کچھ بھی تھا' مگر سب دادی کا لحاظ کرتے تھے۔ نجم نے علینا کو گھورا تو وہ ہونہہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ متعال نے غصے سے چمچہ پلیٹ میں پھینکا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ لیلیٰ فوراً" اس کے پیچھے گئی۔

"تم لوگ اسے جینے کیوں نہیں دیتے۔ اسے خوش دیکھ کر تم سب کو کیا بے چینی شروع ہوجاتی ہے۔" دادی نے سب کو ایک ساتھ لتاڑا' جو اطمینان سے کھانا کھارہے تھے۔ نجم اور دادی دونوں کھانا چھوڑ چکے تھے۔ لیلیٰ بھاگ کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ہٹو تم بھی سامنے سے۔" وہ اسے سائڈ پر دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔

"متعال! میری بات سنیں۔" اس نے دوبارہ اس کا راستہ روک لیا۔

"کیا بات ہے؟ تم بھی مجھے ان لوگوں کی طرح نالائق سمجھتی ہو جو ڈاکٹر یا انجینئر نہ بن سکا' جسے ذرا عقل نہیں ہے اور جو بالکل بے کار ہے۔" وہ غصے میں حواس کھو رہا تھا۔

"میں ایسا کیوں کہوں گی۔۔۔" وہ اس کی بات سنے بغیر سائڈ سے نکلتا چلا گیا۔

رات کو وہ دیر سے گھر آیا۔ لیلیٰ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک روتی رہی تھی سو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ متعال نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"کچھ کھانے کو ملے گا؟" وہ بیڈ کے کنارے ٹک کر پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرنے لگا۔ لیلیٰ خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور کھانے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔

"تم نے کھانا کھایا؟" متعال نوالہ منہ تک لے جاکر رک گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔ لیلیٰ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ادھر آؤ میرے پاس" اس نے صوفے پر اپنے دائیں جانب جگہ بنائی۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"چلو کھانا کھاؤ۔" وہ بے دلی سے لقمے لینے لگی۔ برتن وغیرہ سمیٹ کر وہ دو کپ چائے بنا کر لے آئی۔

"آئم سوری لیلیٰ! میں غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔" اس نے لیلیٰ کے کندھوں پر بازو رکھ کر اسے خود سے قریب کیا۔

"ایک بات بتائیں میں آپ کو ایسا کیوں سمجھوں گی' جیسا سب آپ کو کہتے ہیں۔ آپ میرے سر کا سایہ ہیں' میرا مان اور سب سے بڑھ کر میری محبت ہیں۔ آپ میرے لیے' بہت محترم اور اہم ہیں۔ آپ خود کو کیوں انڈرایسٹیمیٹ کرتے ہیں۔ آپ بہت پیارے' بہت کیئرنگ ہیں۔ آپ کے بہن بھائی بہت لائق سہی' لیکن سب کے سب بے حس سے ہیں۔ ان سب میں صرف آپ ہیں جنہیں دوسروں کے احساسات کی پرواہوتی ہے' جو دوسروں کو انسان سمجھتا ہے۔ جو دوسروں کے غم اور خوشی میں شریک ہوتا ہے۔ آپ ان سب سے بڑھ کر ہیں۔" اتنے دنوں میں وہ اتنا تجزیہ تو کرہی چکی تھی۔

"آپ جانتے ہیں احساس اس دنیا کی مہنگی ترین

چیزوں میں سے ایک ہے اور یہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ اس نفسانفسی کے دور میں آپ کے پاس احساس جیسی دولت ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کر کے متعال کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"لیلیٰ! بے حس رشتے بہت اذیت دیتے ہیں اور میں اٹھائیس سالوں سے یہ اذیت برداشت کر رہا ہوں۔" اس کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

"زندگی کی خوب صورتی رشتوں سے ہے اور یہ رشتے تب ہی قائم رہتے ہیں جب ہم اپنوں کی غلطیوں اور تلخ رویوں کو نظر انداز کر دیں۔ آپ پریشان مت ہوں ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" لیلیٰ نے متعال کا حوصلہ بڑھایا۔

علینا کے لندن جانے کے دو ماہ بعد ابرار نے بھی رخصت سفر باندھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے امریکا سیٹل ہونے جا رہا تھا۔ اسے بھی پاکستان میں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ ماما بابا دونوں کے لیے یہ ایک شاکنگ نیوز تھی، مگر وہ خاموش رہے۔ جانتے تھے کچھ کہنا لاحاصل ہوگا۔ ان کے آشیانے کے دو پنچھیوں نے اڑنا سیکھ لیا تھا، سو وہ ان سے دور اپنا الگ آشیانہ بسانے جا رہے تھے۔

✲ ✲ ✲

"متعال! متعال!" ماما کی گھبرائی ہوئی چیخ نما آواز پر متعال اور لیلیٰ گھبرا کر کمرے سے باہر آئے۔

"تمہارے بابا... جلدی آؤ۔" ادھوری بات کر کے وہ پلٹ گئیں۔ متعال بھاگ کر ان کے کمرے میں آیا۔ بابا واش روم میں گرے ہوئے تھے۔ وہ انہیں اٹھا کر اسپتال بھاگا۔

"ان کا بی پی شوٹ کرنے کی وجہ سے ان پر پرالسز (فالج) کا اٹیک ہوا ہے جس کی وجہ سے ان کی رائٹ سائڈ متاثر ہوئی ہے۔" ایمرجنسی ٹریٹمنٹ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا اور مختلف ٹیسٹ لکھ دیے۔ جب تک بابا اسپتال میں رہے۔ متعال ان کی پٹی سے لگا رہا۔ اس کے بہن بھائی کو اطلاع کی گئی تو سب نے ایک ایک فون کال کر کے اپنا فرض ادا کر دیا۔ جب جب ماما نے ابرار اور علینا سے آنے کا کہا تو دونوں نے اپنی مجبوریاں گنوا کر معذرت کر لی۔

بابا گھر آ گئے تھے، مگر ان کی رائٹ سائڈ بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ خود کھانے پینے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ایسے میں متعال ان کا سایہ بن گیا۔ صبح وہ جلدی اٹھتا، بابا کو فریش کر کے چینج کرواتا۔ پھر اپنے ہاتھوں سے ان کو ناشتا کرواتا، اس کے بعد آفس جاتا اور واپس آ کر پھر بابا کے ساتھ لگا رہتا۔ لیلیٰ بھی ماما کی ڈھارس بندھانے کے ساتھ ساتھ بابا کا پورا خیال رکھتی تھی۔ دادی کی ذمہ داری تو ویسے ہی اس کے سر تھی۔

"متعال! میں سوچ رہی ہوں کہ تمہارے بابا کی دیکھ بھال کے لیے ایک کل وقتی ملازم رکھ لوں۔" رات کو متعال جب اپنے کمرے میں جانے لگا تو ماما نے اسے روکا۔

"کیوں ماما؟ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟" وہ مڑا۔

"نہیں تم بھی تھک جاتے ہو اس لیے۔" وہ پست لہجے میں گویا ہوئیں۔

"نہیں ماما! وہ میرے بابا ہیں، میں ہرگز نہیں تھکتا۔ ان کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں میں سب مینیج کرلوں گا۔ میرے آفس جانے کے بعد اختران کی دیکھ بھال کرلیتا ہے، بس کافی ہے۔" اس نے ماں کو یقین دلایا جو ہلکی سی شرمندگی کے تاثرات چہرے پر سجائے واپس کمرے میں چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

زندگی بالکل ایک درخت کی طرح ہے۔ رشتے اس درخت کی جڑیں اور مال و دولت اس کا پھل ہیں۔ درخت پھل کے بغیر ہرا بھرا رہ سکتا ہے، لیکن جڑوں کے بغیر سوکھ جاتا ہے۔ بابا بھی جڑوں سے محروم درخت کی طرح سوکھ ہی جاتے، اگر جو متعال کی صورت میں ان کی ایک جڑ، ان کے ساتھ جڑی نہ رہتی۔ بابا کو بیمار ہوئے ایک سال ہوگیا تھا، مگران کے بڑے دونوں بچوں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ بیمار باپ سے ملنے آجاتے۔

اس ایک سال میں متعال نے بابا کی اتنی خدمت کی تھی کہ انہیں اپنے اس بیٹے پر فخر ہونے لگا تھا۔ بڑا بیٹا پیسے بھیج کر اپنا فرض ادا کردیتا تھا حالانکہ روپے پیسے کی یہاں بھی کمی نہیں تھی۔ ایسے میں ایک متعال ہی تھا جس نے ہر طرح سے بابا کو سہارا دیا تھا۔ وہ انہیں وہیل چیئر پر گھمانے لے جاتا۔ ان کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتا۔ انہیں اخبارات پڑھ کر سناتا۔ اس کی اتنی توجہ سے بابا بولنے اور خود بیٹھنے کے قابل ہوگئے تھے۔

"بابا! سوپ پی لیں۔" متعال نے سوپ سے بھرا چمچہ ان کے منہ کے سامنے کیا۔ بابا کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔ پچھلے ایک سال میں متعال کے سامنے ایسا پہلی بار ہوا تھا سو اس کا پریشان ہونا فطری تھا۔

"بابا! آر یو آل رائٹ؟ (بابا! آپ ٹھیک ہیں نا)" وہ سوپ کا پیالہ رکھ کر ان کے ہاتھ سہلانے لگا۔ بابا نے سر ہلا کر اپنے ٹھیک ہونے کی تصدیق کی۔

"میں اتنے سالوں تک تم سے سوتیلوں جیسا سلوک کرتا رہا، مگر وقت پڑنے پر تم نے میری خدمت کو اپنا ایمان بنالیا اور وہ جنہیں میں سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا ان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ وہ مجھ سے ملنے آجائیں۔" ان کا لہجہ یاسیت سے پر تھا۔

"بابا! آپ جانتے تو ہیں باہر کی زندگی کی مشکلات اور تقاضوں کو، چلیں آج میں اسکائپ پر آپ کی ان سے بات کروادوں گا۔ اور رہی بات آپ کی خدمت کرنے کی، تو مجھ نالائق کے پاس وقت ہی وقت ہے، اگر میں نے یہ آپ کو دے دیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟" اس کے انداز پر بابا تڑپ اٹھے۔

"نہیں میرے بچے! مجھے معاف کردینا، میں تم سے شرمندہ ہوں۔" انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے گال پر رکھا۔

"بابا پلیز!" متعال نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبالیا۔ بابا نے ہاتھ چھڑا کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا اور متعال کو لگا جیسے وہ تپتے ہوئے صحرا سے نخلستان میں آگیا ہو۔

"یہ بات سو فی صد درست ہے کہ برا وقت ایک شفاف آئینے کی مانند ہوتا ہے جو بہت سے چہروں کی اصلیت ظاہر کردیتا ہے، میں ہمیشہ اس بھول کا شکار رہا کہ اصل کامیابی زیادہ روپے کمانا ہے۔ میں غلط تھا، بالکل غلط، اب مجھ پر یہ حقیقت کھلی ہے کہ جو انسان اپنے رشتوں کو مادی چیزوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا ہے، وہی حقیقی معنوں میں کامیاب ہے۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ رشتے چاہے خون کے بھی ہوں اگر ان میں احساس نہ ہو تو اپنی اولاد بھی اجنبی ہوجاتی ہے۔ میری اولادوں میں سے فقط تم ہی ہو جس میں احساس ہے جو دوسروں کی تکلیف محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جو ماں باپ کی بے اعتنائی کے باوجود ان پر جان دیتا ہے۔" بابا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ متعال نے ان کو تسلی دے کر سوپ پلایا اور ان کو آرام کرنے کا کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور بابا کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر سوچ رہے تھے اگر ان کا یہ بیٹا "نالائق" نہ ہوتا تو.....؟

☆ ☆

مکمل ناول

انیلا کرن علی

"السلام علیکم امی!" ناصرہ کچن میں کھڑی شام کی چائے کی تیاری کر رہی تھیں۔ جب شہروز تین چار بڑے بڑے شاپنگ بیگ اٹھائے کچن میں داخل ہوا۔ آج بلا کی گرمی تھی اور صبح سے ہی لو چل رہی تھی ایسے میں بازار جانا اور وہ بھی امی کی بنائی ہوئی لسٹ لے کر جن پر صرف چیزوں کے نام ہی نہیں وہ جگہیں بھی درج ہوتی تھیں۔ جہاں سے وہ چیزیں خریدی جانی ضروری تھیں۔ جوئے شیر لانے کے مترادف تھا اور ماں کے لیے دودھ کی یہ نہر شہروز کے سوا کوئی بھی کھودنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ صرف وہی تھا۔ جس کے لیے ماں کی کہی ہوئی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ حالانکہ اس کی بے حد مصروف روٹین تھی اور عام دنوں میں وہ صبح کا گھر سے نکلا شام ڈھلنے کے بعد ہی واپس آیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا چھٹی کا واحد دن بھی آرام کی بجائے گھر کے ان کاموں میں صرف ہو جاتا تھا۔ جو اس کی مصروفیت اور اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں کی لاپروائی کی وجہ سے التوا میں پڑے رہتے تھے۔

"وعلیکم السلام بیٹا! جیتے رہو۔"

امی نے محبت بھری نظریں اس کے چہرے پر ڈال کر دعا دی اور اس کے قریب چلی آئیں۔ جو تمام شاپر سلیقے سے کچن میں پڑے چھوٹے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔

"اپنی چیزیں چیک کرلیں۔ جو لسٹ آپ نے دی تھی۔ اس کے مطابق سارا کچھ لے آیا ہوں۔"

وہ اب فریج سے اپنے لیے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ اپنے زیادہ تر ذاتی کام وہ خود ہی کرنے کا عادی تھا اور بہت کم کسی دوسرے سے یہ توقع کرتا تھا کہ وہ اس کا کوئی کام کرے۔

"کھانا گرم کروں بیٹا؟"

وہ پانی پی چکا تھا۔ اور اب کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے امی کی طرف دیکھ رہا تھا جو باری باری سارے شاپر کھول کر دیکھنے کے بعد مطمئن ہو کر اب اس سے کھانے کا پوچھ رہی تھیں۔

"جی امی ضرور! بہت بھوک لگی ہے۔"

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ وہ باہر سے کچھ بھی کھانے کا عادی نہیں تھا۔ اس لیے جتنے بجے بھی گھر آتا۔ کھانا گھر آکر ہی کھاتا تھا۔ عام دنوں میں وہ دوپہر کے لیے کھانا گھر سے لے کر جاتا تھا۔ اور رات کا کھانا گھر آکر کھاتا تھا۔

"تم جاکر فریش ہو جاؤ میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔" امی نے فریج سے آٹا نکالتے ہوئے اسے ہدایت کی تو وہ سرہلاتا ہوا کچن سے باہر نکل آیا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے پہلے اے سی آن کیا۔ پھر کپڑوں کی الماری کھول کر اپنے لیے کپڑے نکالنے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ نہانے جاتا۔ اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ کسی انجان نمبر سے کال آرہی تھی۔ مگر وہ چونکہ یونیورسٹی میں وزیٹنگ استاد ہونے کے ساتھ ساتھ شہر کی سینٹرل لائبریری کا انفارمیشن آفیسر بھی تھا۔ اس لیے اسے اکثر ہی مختلف لوگوں کے فون آتے رہتے تھے۔ اس لیے وہ ہر فون ہی اٹینڈ کرنے کا عادی تھا۔

"ہیلو! ہیلو شہروز!" ابھی اس نے یس کا بٹن دبایا ہی تھا۔ جب دوسری طرف سے بہت بے تابی سے اس کا

نام پکارا گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے دھک سے رہ گیا۔ چار سال پورے چار سال کے بعد وہ اس آواز کو سن رہا تھا اور ایک لمحے میں اس نے اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ اور اس ایک لمحے میں ہی اسے نہ جانے کیا کچھ ایسا یاد آ گیا تھا کہ اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں حالانکہ اس آواز سے صرف تلخ ہی نہیں کچھ ٹھنڈی میٹھی یادیں بھی جڑی تھیں۔ اس لیے یہ آواز سن کر اس کے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی تھی۔

"ہیلو! شہروز۔ یہ تم ہی ہو ناں۔"

اس کی خاموشی نے دوسری طرف کی بے تابی کو کچھ اور بڑھا دیا تھا۔

"جی بات کر رہا ہوں۔"

وہ بے حد خشک اور اجنبی لہجے میں بولا تھا۔ دوسری

طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہ اس کی اجنبیت کی کبھی عادی نہیں رہی تھی۔ اس لیے اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی اس کے خشک اور اجنبی لہجے کو قبول نہیں کرپائی تھی۔ اس لیے جب دوبارہ بولی تو اس کے لہجے میں بے تابی کی بجائے پسپائی اور کپکپاہٹ تھی۔

"شہروز! میں سیبن بول رہی ہوں۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں؟" اس نے رک رک کر آہستگی سے پوچھا تھا۔

"جی پہچان لیا ہے۔ فرمائیں کوئی کام ہے آپ کو مجھ سے۔" اس کا لہجہ پہلے سے بڑھ کر اجنبی ہو گیا تھا۔

"شہروز پلیز! مجھ سے اس طرح تو بات نہ کرو۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ منت بھرے انداز سے بولی تھی۔

"لیکن میں آپ سے ملنا نہیں چاہتا۔ براہ مہربانی آئندہ آپ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔" شہروز پر اس کے منت بھرے انداز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"شہروز پلیز۔" وہ رو دی۔ "میں مانتی ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ غلطی ہو گئی تھی مجھ سے پلیز مجھے معاف کر دو۔"

"غلطی؟" تلخی سے بولتے ہوئے اس کا وجود جیسے شعلوں کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ "کسی کی زندگی کو تباہ کر دینا اس سے جینے کا مقصد چھین لینا۔ تم اسے غلطی کہتی ہو۔ صرف ایک غلطی۔"

وہ پھٹ پڑا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے روتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت وہ کچھ بھی کہہ لیتی اس کا فائدہ نہیں تھا۔ اس کا جرم اتنا چھوٹا نہیں تھا جو یوں کہنے سننے سے معاف ہو جاتا۔

"تم شاید سوچ بھی نہیں سکتی کہ تمہاری وہ ایک غلطی میری زندگی پر کس طرح سے اثر انداز ہوئی تھی اور اس ایک غلطی نے میرے اندر سے کیا کچھ بدل ڈالا ہے۔" آج وہ اس کے آنسوؤں سے بھی نہیں پگھل رہا تھا۔

"تم مجھ سے صرف ایک بار مل لو۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ پھر تم جیسے چاہو گے وہی ہو گا۔"

سیبن کو آج بھی امید تھی کہ وہ اس کے روبرو بیٹھ کر بات کرے گی تو اسے منا لے گی۔ جیسا کہ چار سال پہلے وہ اس سے اپنی ہر بات منوا لیا کرتی تھی۔

"میں تم سے نہیں مل سکتا۔ میری زندگی اور میرے دل میں تمہارے لیے اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

سرد لہجے میں کہہ کر اس نے کال کاٹی اور موبائل کو سوئچ آف کر کے بیڈ پر پھینک دیا۔ اس وقت اسے دنیا کی ہر چیز بری لگ رہی تھی۔ وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے کپڑے واپس الماری میں ٹھونسے اور لائٹ بجھا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد امی اس کے لیے کھانا لے کر آئیں۔ تو وہ آنکھوں پر بازو رکھے چت لیٹا ہوا تھا۔

"شہروز! اٹھو بیٹا کھانا کھا لو۔" امی نے اسے آواز دی تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آنکھوں سے بازو ہٹا کر ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"امی! مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ آپ کھانا کچن میں رکھ دیں میں تھوڑی دیر بعد خود ہی کھا لوں گا۔"

خود کو بمشکل کمپوز کرتے ہوئے اس نے امی کو ٹالا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ امی کو اس کی حالت میں کوئی تبدیلی محسوس ہو اور پھر سوال و جواب کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اس لیے نیند آنے کا بہانہ کر دیا۔

"کمال ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تمہیں بہت بھوک لگی تھی اور اب نیند ہر چیز سے بڑھ کر پیاری ہو گئی۔"

کھانے کی ٹرے واپس لے جاتے ہوئے امی نے ذرا خفگی سے کہا تھا۔ اس نے ان کی بات سنی ضرور مگر خود کچھ بولے بغیر کمرے کی چھت پر نظریں گاڑے لیٹا رہا۔ اس وقت وہ شدید ذہنی الجھن اور پریشانی کا شکار تھا۔ اس کی زندگی جو پچھلے کچھ ہی عرصے سے بہت مشکل سے دوبارہ نارمل ہوئی تھی اسے ایک بار پھر مدوجزر کا شکار ہوتی نظر آ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آم، جامن اور کھجور کے بے شمار درختوں میں گھری سینٹرل لائبریری کی شاندار عمارت کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی اس کا دفتر تھا۔ وسیع وعریض اور قدیم طرز تعمیر کا شاہکار یہ عمارت اس طرح سے بنائی گئی تھی۔ کہ باہر جون کی شدید گرمی کے باوجود اندر کا ماحول بے حد پرسکون اور ٹھنڈا تھا۔ اس لیے سینٹرل لائبریری کا عملہ اس بلا کی گرمی میں بھی چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔ صرف ایک شہروز تھا۔ جو پیر کی اس صبح بھی تھکا تھکا اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے روزمرہ کے معمول کے برعکس اس نے نہ تو آج لائبریری کا معمول کا وزٹ کیا تھا۔ اور نہ ہی ان اخبارات کا مطالعہ کیا تھا۔ جو ہر روز کی طرح اس کے آفس ٹیبل پر موجود تھے اور جب گیارہ بجے کے قریب فاطمہ کسی کام سے اس کے آفس آئی تو اس نے اس کی آمد کا بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ حالانکہ فاطمہ کی اپنے آس پاس موجودگی پچھلے کچھ عرصے سے اس کے لیے کافی اہمیت کی حامل ہو چکی تھی۔

"شہروز! کیا ہوا ہے آپ کو طبیعت تو ٹھیک ہے۔" فاطمہ نے اس کی جامد خاموشی سے پریشان ہو کر پوچھا تھا۔ باتونی تو وہ خیر کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ مگر آج تو بالکل ہی چپ کا روزہ رکھے ہوئے تھا۔ اس لیے فاطمہ کو تشویش ہوئی تھی۔

"ہوں..." اس نے تھوڑا سا چونک کر فاطمہ کا چہرہ دیکھا۔ ہلکے سبز رنگ کا سفید پرنٹ والا لان کا سوٹ پہنے اور سبز کناری والا سفید دوپٹا اوڑھے وہ ہمیشہ کی طرح کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ سنہری رنگت اور چمکدار سیاہ آنکھوں والی فاطمہ بہت باتونی اور شوخ و شنگ تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ شہروز کے دل کے قریب ہوتی جارہی تھی۔

"شہروز..." اسے گم صم انداز سے اپنی طرف دیکھتے پاکر فاطمہ نے اس کی آنکھوں کے آگے اپنا ہاتھ لہرایا تھا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو کس کے خیالوں میں گم ہیں۔ کہیں سبین کی یاد تو نہیں آرہی۔"

وہ سبین کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی اور پہلے بھی کبھی کبھار اس کا نام لے کر شہروز کو چھیڑ لیا کرتی تھی۔ مگر آج اس کا ذکر کر کے اس نے انجانے میں شہروز کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا وہ بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"فاطمہ! مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔ وہاں ایک اہم میٹنگ ہے مجھے دیر ہو جائے گی۔" ٹیبل سے اپنی ضروری چیزیں اٹھاتے ہوئے اس نے فاطمہ کی طرف دیکھے بغیر عجلت بھرے انداز سے کہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ فاطمہ کچھ بولتی وہ دفتر سے باہر نکل آیا۔ مگر یونیورسٹی کی طرف جاتے ہوئے وہ سارا راستہ سبین اور فاطمہ کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔

یونیورسٹی کا مین کیمپس چونکہ سینٹرل لائبریری سے کافی دور تھا۔ اس لیے لائبریری سائنس ڈیپارٹمنٹ تک پہنچتے پہنچتے گھنٹہ بھر لگ گیا۔ مگر چونکہ اس کی کوئی میٹنگ نہیں تھی۔ اس لیے اسے جلدی بھی نہیں تھی۔ پارکنگ میں کار لاک کر وہ مین لائبریری کی بیس منٹ میں چلا آیا۔ یادوں کا ایک ریلا تھا جو طوفانی انداز سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ریفرنس سیکشن میں چلا آیا اور صرف اس وجہ سے کہ کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ وہ انسائیکلوپیڈیا کے دو تین والیم اپنے سامنے کھول کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اس وقت اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں کے آگے دھند سی چھا رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی انسائیکلوپیڈیا کی دھندلی نظر آتی تحریر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اور اس کے ذہن کی اسکرین پر کچھ پرانے مناظر کے عکس بن بن کر مٹ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اسے شروع سے ہی کتابوں سے بہت محبت تھی۔ اسکول اور پھر کالج میں بھی کلاسز کے علاوہ جو بھی وقت بچتا۔ وہ سارے کا سارا لائبریری میں گزارتا۔ کتابیں پڑھنے کا تو اسے جو شوق تھا سو تھا مگر کتابوں میں گھرے رہنا کچھ زیادہ ہی پسند تھا اور اس کا یہ شوق لائبریری میں

ہی پورا ہو سکتا تھا۔ اس لیے اسے وہاں بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اسی لیے جب یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا وقت آیا تو اس نے لائبریری سائنس کے سوا کہیں اور فارم جمع نہیں کروایا' بیچلر میں اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے آسانی سے لائبریری سائنس میں ہی داخلہ مل گیا۔

اکتوبر کے آخری ہفتے میں اس کی کلاسز شروع ہوئیں۔ اس نے پہلے دن سے ہی باقاعدگی سے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا۔ شہروز نا صرف ہر روز یونیورسٹی جاتا بلکہ جو بھی کلاس ہوتی وہ دلجمعی سے ٹیچر کا لیکچر بھی سنتا اور سوالات بھی کرتا۔ اس لیے چند ہی دنوں میں وہ اساتذہ اور ساتھی طلبا کی نظروں میں آگیا تھا۔

وہ اس کی کلاس کا پندرھواں دن تھا۔ جب پوائنٹ سے اتر کر ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے ایک لڑکی نے اشارے سے روکا۔

"جی فرمائیں۔"

وہ رک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا تو لڑکی نے ہاتھ سے اسے ٹھہرے کا اشارہ کیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی نوٹ بک پر کچھ لکھنے لگی۔ وہ منتظر کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد لڑکی نے عبارت لکھ کر نوٹ بک اس کے سامنے کی۔

"میں بول نہیں سکتی۔ پلیز مجھے لائبریری سائنس ڈیپارٹمنٹ کا رستہ بتادیں۔"

"اوہ..." عبارت پڑھ کر بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا تھا اس نے ترحم بھری نظروں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اچھی خاصی خوب صورت بلکہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ سفید رنگت غلافی آنکھیں اور نازک سراپا اتنی خوب صورتی اور اس کا گونگا پن اسے حقیقت میں افسوس ہوا تھا۔

"آپ میرے ساتھ آجائیں۔ میں بھی لائبریری سائنس کا ہی اسٹوڈنٹ ہوں اور میں ڈیپارٹمنٹ ہی جا رہا ہوں۔" اس نے ہمدردی سے کہا تھا۔ لڑکی نے اثبات میں سرہلایا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

سارے راستے وہ بار بار تاسف بھری نظروں سے اس لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ مگر اس لڑکی کو جیسے اپنی اتنی بڑی محرومی سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خوشی خوشی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جارہی تھی۔ یونیورسٹی کی دیگر لڑکیوں کی طرح اس نے بھی جدید تراش خراش کا کاسنی لباس پہن رکھا تھا۔ ساتھ میں میچنگ شوز اور ہلکی پھلکی جیولری کا اہتمام بھی کیا ہوا تھا۔

"بے چاری کتنی بہادر ہے۔"

ڈیپارٹمنٹ پہنچنے کے بعد جب لڑکی نے ایک بار پھر نوٹ بک پر لکھ کر اس سے ڈیپارٹمنٹ کے ایڈمن آفس کا پوچھا اور اس کے وہاں تک لے جانے کے بعد لکھ کر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ مسکرا کر اپنی کلاس کی طرف بڑھ گیا۔ کلاس شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس لیے وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہنے کے بعد ایک بار پھر باہر نکل آیا اور خود بخود ہی اس کے قدم ایڈمن آفس کی طرف اٹھ گئے۔ ایڈمن آفس کی بڑی سی کھڑکی کھلی تھی اور سامنے وہی لڑکی بیٹھی اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھ رہی تھی یقیناً" وہ ایڈمنسٹریشن والوں سے لکھ لکھ کر بات کر رہی تھی۔

"بے چاری کو چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے بھی کتنی مشکل اٹھانا پڑتی ہوگی۔ کاش یہ بول سکتی۔ بے شک اتنی خوب صورت نہ ہوتی۔" اس نے بڑے دکھ سے سوچا تھا اور کتنی ہی دیر اس پیاری سی لڑکی کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا دل دکھی ہوتا رہا' پندرہ دنوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے نہ تو توجہ سے کوئی لیکچر سنا اور نہ ہی کسی ٹیچر سے کوئی سوال کیا۔ بلکہ خاموش اور پژمردہ سا بیٹھا اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔

دو روز تک وہ لڑکی اسے بار بار یاد آتی رہی اور تیسرے روز جب وہ اسے بھولنے لگا تھا تو اچانک ہی وہی لڑکی اسے اپنی کلاس میں نظر آگئی۔ وہ لڑکیوں والی رو میں سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی اور ٹیچر کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اپنی نوٹ بک پر آڑی

ترچھی لائنیں لگا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور اداسی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ شہروز کلاس میں ٹیچر کی موجودگی کو بھلا کر بے اختیار ہی اسے دیکھے گیا۔ اور چونکہ وہ باقاعدہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے فوراً ہی پروفیسر عباس کی نظروں میں بھی آگیا۔

''شہروز۔'' انہوں نے سرزنش کرنے والے انداز سے اس کا نام پکارا تو نا صرف وہ چونک کر سیدھا ہوا بلکہ کئی دوسرے اسٹوڈنٹ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اس کے سیدھے ہوتے ہوتے کئی ایک نے نوٹ کر لیا کہ وہ لڑکیوں والی رو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوراً ہی کلاس میں دبی دبی سرگوشیاں اور کھی کھی شروع ہو گئی۔ شہروز کو بے حد خفت ہوئی پچھلے سترہ روز سے کلاس میں اس کا جو امیج بن گیا تھا۔ وہ اس ایک بے اختیاری حرکت کی وجہ سے خراب ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس لمحے اس نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھے گا اور سارا دن اس نے اس ارادے پر عمل بھی کیا اور کلاس میں اور کلاس کے باہر بھی ایک بار بھی اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔

مگر اسی شام جب وہ کافی وقت لائبریری میں گزارنے کے بعد پوائنٹ سے گھر کی طرف جا رہا تھا تو وہ لڑکی اسے فرید گیٹ کے باہر کچھ دوسری لڑکیوں کے ساتھ گول گپے کھاتی نظر آئی۔ ساری لڑکیاں خوب شور مچا رہی تھیں جبکہ وہ مسکراتے ہوئے چٹخارے لے لے کر گول گپے کھا رہی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ اداسی اور سنجیدگی جو سارا دن اس کے چہرے پر چھائی رہی تھی۔ اس وقت بالکل ندارد تھی۔ شہروز کو نہ جانے کیوں اسے خوش دیکھ کر ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہوا اور دل سے کوئی بوجھ سا سرکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جتنی دیر پوائنٹ فرید گیٹ پر رکا رہا۔ وہ سارا وقت مسلسل اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ جو ہنستی کھلکھلاتی اور اٹکھیلیاں کرتی ہوئی اسے بہت اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ لائبریری میں بیٹھا بہت انہماک سے نوٹس بنا رہا تھا.... جب ایک بے حد مترنم آواز نے اسے چونکایا۔ اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اوپر دیکھا۔ اس کے بالکل سامنے وہی گونگی لڑکی کھڑی تھی وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ اس لڑکی کے سوا آس پاس کوئی دوسری لڑکی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ کلاسز کے بعد کا وقت تھا اور اس وقت لائبریری میں کم ہی لوگ ہوتے تھے۔ شہروز کو نوٹس بنانے کے لیے یہی وقت سب سے بہتر لگتا تھا۔

''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

اسے ٹکر ٹکر اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ گونگی لڑکی پوچھ رہی تھی شہروز کی آنکھیں حیرت کی شدت سے کچھ اور پھیل گئیں۔ وہ واقعی بول سکتی تھی۔

''جی جی بیٹھیے۔'' بغیر اس پر سے نظریں ہٹائے اس نے کچھ بوکھلا کر کہا تھا۔ لڑکی متانت سے مسکرائی اور اس کے بالکل سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''میرا نام یسین ہے۔ میں آپ کی کلاس فیلو ہوں۔ شاید آپ نے مجھے کلاس میں دیکھا ہو۔ ویسے تو میں کلاس میں بالکل بھی ایکٹو نہیں ہوں۔ سب سے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھتی ہوں۔ اور کسی بھی ٹیچر سے کوئی سوال نہیں کرتی۔ اور سوال کروں بھی کیسے؟ مجھے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا پتا نہیں یہ کیسا سبجیکٹ ہے۔ ساری عجیب عجیب سی چیزیں ہیں۔ خاص طور پر یہ کلاسیفکیشن اور کیٹلوگنگ ان دونوں کی تو مجھے ایک لفظ کی سمجھ نہیں آتی۔ اور میں دراصل آئی بھی اسی لیے ہوں۔ کہ آپ سے درخواست کروں کہ ان دونوں کی اسائنمنٹ بنانے میں آپ میری کچھ مدد کر دیں۔''

اس کا بولنے کا انداز بہت دلکش اور پراعتماد تھا اور وہ یقیناً بہت لمبی بات کرنے کی عادی تھی۔ شہروز بنا پلکیں جھپکائے اسے بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ پچھلے دنوں وہ اس خوب صورت لڑکی کے ''گونگے پن'' کا سوچ سوچ کر کس قدر دکھی ہوتا رہا تھا۔

"آپ.... آپ بول سکتی ہیں؟"

وہ لڑکی خاموش ہو کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تو اس نے بے اختیار ہی سوال کیا تھا۔ لڑکی نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"ظاہر ہے بول سکتی ہوں تو بول رہی ہوں۔ یہ کیسا سوال ہے؟"

"نہیں وہ شہروز کچھ گڑبڑا گیا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ گونگی نہیں ہیں؟" اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہے اس لیے جو منہ میں آرہا تھا۔ وہ بولے جارہا تھا۔

"میں کیوں گونگی ہونے لگی؟" وہ بے حد برامان کر بولی تھی۔

"وہ اصل میں اس دن آپ مجھے ملی تھیں۔ جب آپ پہلے دن یونیورسٹی آئی تھیں۔ آپ نے مجھ سے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھا تھا۔ تو آپ لکھ لکھ کر بات کررہی تھیں۔"

شہروز نے جلدی سے وضاحت کی۔ اسے خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں وہ لڑکی وہاں سے اٹھ کر ہی نہ چلی جائے۔

"ارے ہاں" وہ کھلکھلائی تھی۔ "اس روز آپ ہی سے تو بات ہوئی تھی میری اور میں آپ کے ساتھ ہی تو ڈیپارٹمنٹ آئی تھی۔" وہ پہلے دن کا واقعہ یاد کر کے محظوظ ہو رہی تھی۔

"دراصل اس دن میرا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ اور میری آواز بہت مشکل سے اور بہت بری نکل رہی تھی۔ اس لیے میں بول نہیں رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میری ایسی آواز سن کر میرا مذاق اڑائے۔ اس لیے تو بعد میں بھی کچھ دنوں تک یونیورسٹی آئی بھی نہیں تھی۔"

"لیکن آپ تو کلاس میں بھی بالکل چپ رہتی ہیں۔ ٹیچر سے سوال نہ سہی۔ آپ کسی لڑکی سے بات تو کر سکتی ہیں ناں۔ میں نے تو آج تک آپ کو بولتے نہیں دیکھا۔"

شہروز کی حیرت کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

"کلاس کی کوئی بھی لڑکی مجھے پسند نہیں ہے۔" سبین نے نخوت سے منہ بنایا۔ "اس لیے میرا ان سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ البتہ ہاسٹل میں میری کچھ لڑکیوں سے اچھی دوستی ہو چکی ہے۔ میں ان کے ساتھ باتیں بھی خوب کرتی ہوں اور باہر گھومنے پھرنے بھی جاتی ہوں۔ دراصل میرا ایک مسئلہ ہے۔ مجھے آسانی سے کوئی پسند نہیں آتا اور جو لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے میں ان سے بات نہیں کرتی۔"

اپنی عادت کے عین مطابق وہ اسے بہت تفصیل سے جواب دے رہی تھی اور اپنے انداز کی خودپسندی اور نخوت کے باوجود وہ شہروز کو بہت اچھی لگ رہی تھی اور اس خیال سے بھی اس کا دل سرشار ہو رہا تھا کہ سبین کو پوری کلاس میں وہی سب سے موزوں نظر آیا ہے۔ تبھی تو وہ یوں لائبریری میں بیٹھی اس سے باتیں کررہی تھی۔

"اب آپ میرا انٹرویو ہی لیتے رہیں گے یا میری کچھ مدد بھی کریں گے؟" اسے اچانک ہی اپنے وہاں آنے کا مقصد یاد آیا تھا۔

"جی بتائیں۔ آپ کو کون سا اسائنمنٹ ملا ہے۔"

شہروز کو اس کا دھونس بھرا انداز بھی اچھا لگا تھا۔ سبین اپنی فائل سے کاغذات نکال کر اس کو اپنے اسائنمنٹ کے بارے میں بتانے لگی۔ جو اسائنمنٹ اس کو بہت مشکل لگ رہا تھا شہروز کے لیے وہ بچوں کے کھیل جیسے تھے۔ اس روز وہ شام تک وہیں بیٹھا اس کا اسائنمنٹ بناتا رہا۔ اور سبین اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس کے اس قدر باتونی ہونے کی وجہ سے شام تک وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔

وہ صادق آباد کی رہائشی تھی اور اس کے ابو بینک میں ایک درمیانے درجے کی پوسٹ پر کام کرتے تھے امی اسکول ٹیچر تھیں اور سبین کی ایک بڑی بہن تھی۔ جس کا نام امہنہ تھا اور سب سے چھوٹا ایک بھائی تھا۔ اسے دیگر لڑکیوں کی طرح ملبوسات زیورات اور بننے سنورنے کا بہت شوق تھا اور اس کے علاوہ وہ سیرو تفریح کی بھی دلدادہ تھی۔ پڑھائی سے اس کی دلچسپی واجبی

تھی۔ مگراپنی امی کے اصرار پر اس کو ماسٹرز کرنے کے لیے یہاں آنا پڑا تھا۔

اس روز شام تک سبین کے ساتھ بیٹھے رہنے کا یہ اثر ہوا تھا کہ جب وہ وہاں سے اٹھ کر گھر کے لیے روانہ ہوا۔ تو وہ اس کے حواسوں پر پوری طرح سے چھا چکی تھی۔ اچھی تو وہ اسے پہلے بھی لگتی تھی۔ مگر اتنا وقت اس کے ساتھ گزارنے کے بعد تو اسے سبین کے علاوہ جیسے کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے چند ہفتوں میں وہ اور سبین تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ شہروز کو تو خیر سبین پہلے دن سے ہی اچھی لگی تھی۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی پسندیدگی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ خود سبین بھی جب سے اس سے بات چیت کرنے لگی تھی۔ اس کی اسیر ہوتی جارہی تھی اور کلاس یا یونیورسٹی میں وہ واحد لڑکی نہیں تھی۔ جو شہروز کو اتنا پسند کرتی تھی۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت ساری تھیں۔ جو شہروز کی اچھی پرسنالٹی ذہانت اور رکھ رکھاؤ سے متاثر تھیں اور اس کے قریب آنے کے بہانے ڈھونڈتی تھیں۔ مگر وہ سلام دعا سے آگے کسی سے بھی بات نہیں کرتا تھا۔ صرف ایک سبین تھی جس سے باتیں کرنا اس کے پاس بیٹھنا اور اس کی دلکش گفتگو سننا اسے بہت اچھا لگتا تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔

سبین کی کلاس میں چونکہ کسی سے بھی دوستی نہیں تھی اور خود شہروز بھی شروع دن سے ہی کلاسز کے بعد کا سارا وقت لائبریری میں گزارنے کا عادی تھا۔ اس لیے اب ان کا بیشتر وقت اکٹھے گزرنے لگا تھا۔ شہروز پڑھائی میں بھی اس کی اچھی خاصی مدد کردیا کرتا تھا۔ اسے مختلف ٹاپک سمجھانے اس کے ساتھ اس کی اسائنمنٹس بنانے کے علاوہ وہ اسے اپنے نوٹس بھی کاپی کروا کر دینے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے کلاس میں سبین کی پوزیشن کافی بہتر ہوگئی تھی اور پہلے سمسٹر کا اس کا رزلٹ بھی کافی اچھا آیا تھا۔ جس پر وہ بہت خوش تھی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے شہروز! ورنہ سچ کہوں تو مجھے کسی چیز کی سمجھ ہی نہیں آتی تھی۔ اگر تم نہ ہوتے تو یقیناً "میں فیل ہی ہوجاتی۔"

رزلٹ دیکھنے کے بعد اس نے فراخ دلی سے اعتراف کیا تھا۔ شہروز مسکرادیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"پھر تو تمہیں چاہیے کہ تم ہروقت میرے ساتھ ساتھ رہو تاکہ زندگی میں کسی بھی مقام پر تم ناکام نہ ہو۔ بولو رہوگی ناں میرے ساتھ۔" اس کا لہجہ گمبھیر تھا اور اس کے دیکھنے کا محبت بھرا انداز سبین کو لمحے بھر کے لیے خود پر رشک آیا وہ ایسا ہی تھا۔ ٹوٹ کر محبت کرنے والا اور اپنی ہر کمٹمنٹ نبھانے والا۔ سبین کو اس سے وعدہ لینے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ساتھ چلنے کا کہہ رہا ہے تو اپنے اس وعدے کو نبھائے گا بھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ اس لیے اس نے بس مسکرا کر اثبات میں سرہلادیا اور ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر جو رنگ اترے تھے۔ وہ شہروز کو مسحور ہی کر گئے۔ وہ اسے تکتا رہ گیا۔

"سبین میں تمہیں اپنی امی سے ملوانا چاہتا ہوں۔" چند لمحوں تک اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد شہروز نے کہا تھا۔ سبین تھوڑا سا گھبراگئی۔

"اتنی جلدی۔" بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا۔

"جلدی کہاں مجھے تو لگتا ہے کہ تم مجھے بہت دیر سے ملی ہو اور اب میں تم سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہنا چاہتا۔" وہ جیسے کسی طلسم میں قید ہوکر بول رہا تھا۔ سبین کو اس کی باتوں سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

"پلیز شہروز! ابھی ایسی باتیں نہیں کرو۔ کچھ عرصہ ٹھہرجاؤ پھر میں تمہاری امی سے ملنے بھی چلوں گی۔ اور اپنے گھر میں بھی تمہارے بارے میں بات کروں گی مگر اتنی جلدی نہیں ابھی تو ہماری پڑھائی کا بھی ڈیڑھ سال رہتا ہے۔ اگر میں نے ابھی گھر میں تمہارا ذکر کردیا تو گیا

پتا امی اس بات پر ناراض ہو کر مجھے یہاں آنے سے ہی روک دیں اور اگر میں ان سے ابھی بات نہیں کر سکتی تو تم بھی کچھ عرصہ رک جاؤ پھر اپنی امی سے ہمارے رشتے کا ذکر کرنا۔" وہ اسے رسان سے سمجھا رہی تھی اور چونکہ اس کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ اس لیے شہروز بغیر بحث کیے مان ہی گیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے مگر یہ دھیان رکھنا کہ تمہاری اس پلاننگ اور احتیاط کے باعث کوئی اور ہمارے درمیان نہ آجائے میرا مطلب ہے کہ کہیں تمہارے گھر والے تمہارے لیے کسی کو منتخب نہ کرلیں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں اپنی بہن سے ابھی بات کرلوں گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور میرا ساتھ دے گی۔" سیین نے اسے یقین دلایا تھا۔

☆☆☆

خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ایک دوسرے کی قربت میں سرشار ڈیڑھ برس کا عرصہ کیسے گزر گیا پتا ہی نہیں چلا اور ان کے آخری سمسٹر کا بھی اینڈ آگیا۔ پیپرز ہونے والے تھے۔ اور پیپرز کے بعد ظاہر ہے کہ سیین کو اپنے شہر لوٹ جانا تھا۔ اس خیال سے شہروز اگر اداس تھا' تو اسے اس بات کی خوشی بھی تھی کہ اب جدائی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔

اپنے گھر میں تو وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں امی کو سیین کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اور امی کے ردعمل سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کی خوشی میں خوش ہیں۔ بس انہیں اس کی اچھی جاب لگنے کا انتظار تھا۔ اس کے فوراً" بعد وہ اس کی شادی اس کی پسند سے کردینے پر راضی تھیں۔ ویسے بھی وہ گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ بٹی ان کی کوئی تھی نہیں اور معاشی لحاظ سے بھی وہ لوگ اگر بہت کھاتے پیتے نہیں تھے تو تنگ دست بھی نہیں تھے ۔ اس لیے شہروز کی جلدی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی' دوسری طرف سیین بھی اپنی بہن سے بات کرچکی تھی اور اس کی بہن نے اس کی مدد کرنے کا پورا یقین دلایا تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ ان کی شادی آسانی سے ہو

جائے گی۔ اور کوئی رکاوٹ سامنے نہیں آئے گی۔

ان کے پیپرز ابھی شروع ہونے میں ایک ماہ باقی تھا۔ جب اچانک ہی سیین کی بڑی بہن کی شادی طے ہو گئی اور اسے پندرہ دن کے لیے گھر جانا پڑا۔ امینہ اس کی اکلوتی بہن تھی اس لیے اس کی شادی کے موقع پر بہت سے ایسے کام تھے۔ جن کی تکمیل کے لیے سیین کی وہاں موجودگی ضروری تھی۔ ویسے بھی اس کی پیپرز کی کافی تیاری ہو چکی تھی۔ اور جو رہتی تھی۔ وہ اس نے شادی کے بعد کے پندرہ دنوں میں کرنے کا فیصلہ کیا اور گھر چلی گئی۔

یہ پہلی بار ہوا تھا کہ سیین اتنے سارے دنوں کے لیے اس سے الگ ہوئی تھی۔ شہروز کے لیے یہ وقت کاٹنا عذاب ہوا جارہا تھا۔ یونیورسٹی جانا تو اس نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ گھر پر ہوتا تو بھی دل نہ لگتا۔ سو سو طریقوں سے خود کو بہلانے کی کوشش کرتا مگر کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ کھانے پینے' گھومنے پھرنے' پڑھائی کرتے غرض یہ کہ ہر چیز سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ سیین اس کے لیے کتنی ضروری تھی۔ اس کا صحیح معنوں میں ادراک اسے ان ہی پندرہ دنوں میں ہوا تھا۔

وہ اسے فون پر اپنی بے تابیوں کے بارے میں بتاتا تو وہ خوب ہنستی اور اسے چھیڑتی۔ شہروز کے برعکس وہ چونکہ اپنی بہن کی شادی جیسے پر رونق موقع پر اس سے الگ ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اس کی طرح اداس نہیں تھی۔ شہروز اسے یاد تو بہت آتا تھا۔ مگر وہ بے چین اور بے کل نہیں ہوتی تھی۔

پندرہ روز کے بعد وہ واپس آئی تو شہروز اس روز اس سے ملنے کے لیے یونیورسٹی پہنچ گیا۔

"شہروز! کیا ہوا ہے تمہیں' بیمار رہے ہو۔" اس پر نظر پڑتے ہی سیین نے تشویش سے پوچھا تھا۔

"بیمار نہیں" شہروز نے تصحیح کی اور مسکرا کر بولا۔

"اداس رہا ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارے بغیر یہ دن میں نے بہت مشکل سے گزارے ہیں۔ کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن اب تم آگئی

ہو۔تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ بنا پلکیں جھپکائے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ سبین گلابی ہونے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔" اس نے نظریں چرا کر پوچھا تھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ بہن کی شادی سے تمہارے چہرے پر اتنا نکھار آگیا ہے۔ تو اپنی شادی کے بعد کتنا آئے گا۔" وہ اس کے یوں شرمانے پر محظوظ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"شہروز تم بھی ناں۔" سبین سے کوئی بات نہیں بن پائی تو شرما کر ذرا سا رخ پھیر لیا۔ شہروز ہنس پڑا۔

"چلو آؤ کینٹین چلتے ہیں۔ تم نے یقیناً" ناشتا بھی نہیں کیا ہو گا اور اب تو لنچ ٹائم ہو رہا ہے۔"

اسے مزید تنگ نہ کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تو سبین نے بھی مسکراتے ہوئے اس کی تقلید کی تھی۔

پیپرز کے بعد سبین نے ہوسٹل سے کلیئرنس لی اور واپس اپنے آبائی شہر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼
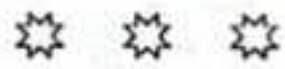
"سبین! تمہیں نہیں لگتا کہ تم نے شہروز سے شادی کا فیصلہ بہت جذباتی ہو کر کیا ہے۔"

وہ اتوار کا دن تھا اور امینہ پورے دن کے لیے میکے آئی ہوئی تھی صبح سے وہ دونوں بہنیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ان دونوں کی شروع سے ہی بہت دوستی تھی۔ جس میں گزرتے وقت کے ساتھ مزید مضبوطی آئی تھی حتیٰ کہ امینہ کی شادی کے بعد بھی اس دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ دونوں ہر معاملے میں ایک دوسرے کی ہمراز تھیں۔ اسی وجہ سے امینہ شہروز کے بارے میں بھی سب ہی کچھ جانتی تھی۔ اور کچھ عرصہ پہلے تک ان دونوں کی شادی کروانے کے معاملے میں بہت پرجوش بھی تھی۔ مگر جب سے اس کی اپنی شادی ہوئی تھی۔ شہروز کے معاملے میں اس کا انداز تھوڑا سا سرد ہو گیا تھا۔

اب وہ پہلے کی طرح توجہ اور محبت سے سبین کے منہ سے شہروز نامہ نہیں سنتی تھی، بلکہ اس کا ذکر آنے پر اکثر بات بدلنے لگی تھی۔ جس کو سبین نے تھوڑا سا محسوس تو کیا تھا مگر زیادہ توجہ اس لیے نہیں دی کہ امینہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور قدرتی طور پر ہی اس کی ہر بات اپنے شوہر سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔ مگر آج جب اس نے کھل کر شہروز اور سبین کی شادی کے بارے میں کچھ کہا تو سبین حیرت زدہ رہ گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس میں جذباتی پن کہاں سے آ گیا۔"

حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر اس نے ذرا ناگواری سے کہا تھا۔ مگر امینہ نے اس کی ناگواری کا ذرا سا بھی برا نہیں مانا بلکہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"صرف محبت کے سہارے زندگی نہیں گزرتی سبین! بلکہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے کھلا پیسہ اور آسائشیں محبت سے زیادہ ضروری ہیں۔" اس کے انداز میں اعتماد تھا۔ خود اس کی شادی کافی امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ اور جب سے وہ بیاہ کر اپنے سسرال گئی تھی۔ تب سے اس کی باتوں میں دولت اور آسائشوں کا زیادہ ہی ذکر آنے لگا تھا۔

"فضول باتیں نہ کرو امینہ! میں صرف شہروز سے ہی شادی کروں گی۔ چاہے اس کے پاس پیسہ ہو چاہے نہ ہو۔" سبین کا انداز اٹل تھا۔ اس بار امینہ نے کچھ نہیں کہا۔ بس پراسرار انداز سے مسکراتی رہی۔ مگر اس ایک مرتبہ کی گفتگو کے بعد اس نے وطیرہ ہی بنا لیا۔ جب بھی دونوں بہنیں اکٹھی ہوتیں یا فون پر بات کرتیں تو وہ شہروز کے ساتھ اس کے شادی کرنے کے فیصلے کو احمقانہ قرار دیتی۔

"امینہ! تم میرے ساتھ اس طرح کی باتیں کیوں کرنے لگی ہو۔ تمہیں اچھی طرح سے پتا ہے کہ میں صرف اور صرف شہروز سے ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ پھر تم کیوں مجھے اس سے بدظن کرنے پر تلی رہتی ہو۔"

ایک روز وہ زچ ہو کر امینہ سے الجھ پڑی۔

"میں تمہیں اس سے بدظن نہیں کر رہی سبین! میں تو صرف تمہیں زندگی کی حقیقتیں بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔" امینہ آج اسے نئے انداز سے سمجھا رہی تھی۔

"بس تم مجھے کچھ نہیں کہا کرو۔ میں تمہاری ایسی باتیں سن کر پریشان ہو جاتی ہوں۔"

سبین اکتا کر بولی وہ اس وقت کچھ بھی سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی امینہ کی طرف سے بار بار ایک ہی بات کے ذکر سے اسے الجھن ہونے لگی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے اپنا موڈ خراب مت کرو۔" امینہ نے فوراً" ہی ہتھیار ڈالتے ہوئے صلح جوئی کی راہ اختیار کی تھی۔

"ایسا کرو تم اپنی پیکنگ کر لو۔ تم کچھ دنوں کے لیے ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔ امی سے میں نے اجازت لے لی ہے۔"

"کہاں؟" سبین نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

"پہلے میرے گھر پھر دو تین روز تک ہم شمالی علاقہ جات جا رہے ہیں اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی۔ نعیم کے بہن بھائی بھی جا رہے ہیں۔" امینہ نے جواب دیا تو سبین خوش ہو گئی۔ ان کے چھوٹے سے شہر میں گھومنے پھرنے کی جگہیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اور سبین کو سیر و تفریح کا بہت شوق تھا۔ اس لیے وہ خوشی خوشی امینہ اور اس کے شوہر' دیور اور دو نندوں کے ساتھ سیر کے لیے روانہ ہو گئی۔ اور یہ اس کی زندگی کا یادگار ٹرپ تھا۔ امینہ کا شوہر اور اس کے بہن بھائی بہت دوستانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اس لیے اس نے ان کی کمپنی کو خوب انجوائے کیا۔ پھر کھلا پیسہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے دل کھول کر ہر طرح کی تفریح کی اچھے ہوٹلوں میں قیام کیا۔ اور امینہ نے اسے ڈھیر ساری شاپنگ بھی کروائی۔ پندرہ روز کے بعد وہ لوگ واپس آئے تو سبین بے حد خوش تھی۔

"سچ میں امینہ! میں نے بہت انجوائے کیا۔ اتنا مزے کا وقت میں نے زندگی میں کبھی نہیں گزارا تھا۔" سبین واقعی بہت خوش تھی۔ امینہ مسکرا دی۔

"تم نے اگر شہروز نام کا ڈھول اپنے گلے میں نہ لٹکایا ہوتا تو میں اپنے دیور سے تمہاری شادی کروا دیتی۔ اور تم ساری زندگی مزے میں گزارتی۔"

اپنے ہیروں کے لاکٹ کو ہاتھ سے گھماتے ہوئے اس نے کہا تھا اور ایسی باتوں پر ہمیشہ ناراض ہو کر الجھ پڑنے والی سبین پہلی بار کچھ نہیں بولی۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں رقص کرنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ان کا رزلٹ آیا تو شہروز نے توقع کے عین مطابق ٹاپ کیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ رزلٹ آنے کے کچھ روز بعد ہی فیڈرل پبلک کالجز کی کچھ سیٹیں اناؤنس ہوئی تھیں اور اس میں ان کا سبجیکٹ بھی شامل تھا۔ شہروز نے فوراً" اپلائی کر دیا۔ سبین کو اس نے فون پر بہت خوشی سے اس جاب کے بارے میں بتایا تھا۔ مگر وہ بجائے پرجوش ہونے کے تھوڑا سا بجھ گئی۔

"لیکچرر شپ اور وہ بھی کالج میں۔ یونیورسٹی کی ہوتی تو اور بات تھی۔"

اس نے بجھے بجھے انداز سے تبصرہ کیا تھا۔ ان دنوں امینہ کے گھر اس کا آنا جانا کافی بڑھ گیا تھا اور وہاں کا لائف اسٹائل دیکھ دیکھ کر اسے بھی شوق ہو گیا تھا کہ وہ بھی مستقبل میں ایسی ہی زندگی گزارے جیسی امینہ گزار رہی تھی۔

"یار! یہ جاب کوئی حرف آخر تھوڑی ہے۔ یہ تو میں اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ ایک بار ڈھنگ سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو جاؤں۔ تاکہ امی' ابو کو تمہارے گھر بھیج سکوں ورنہ مستقبل میں تو میں آگے پڑھنا اور اس سے اچھی جاب حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تو پروفیسر انصاری نے ایک پرانے اسٹوڈنٹ کے توسط سے مجھے کویت کے ایک کالج سے بھی جاب کی آفر آئی ہے وہاں سیلری بہت اچھی ہے۔ مگر میں ملک سے باہر جا

نہیں سکتا۔" سبین کو سمجھاتے سمجھاتے اس نے یونہی اس آفر کے بارے میں بتایا تھا۔ مگر سبین کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کیوں جانا کیوں نہیں چاہتے۔ اتنا اچھا موقع مل رہا ہے۔ تمہیں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے فوراً" ہی کہا تھا۔

"کیسے جا سکتا ہوں یار! یہاں تم ہو امی ابو اور میرے بھائی ہیں۔ میں کیسے سب کو چھوڑ کر ملک سے باہر جا کر بیٹھ جاؤں۔ میں نہیں رہ سکتا وہاں۔" اس نے فوراً" ہی انکار کیا تھا۔

"دیکھو شہروز! ایسے مواقع بار بار نہیں ملتے۔ تم صرف چند سال کے لیے باہر چلے جاؤ۔ تمہاری زندگی سنور جائے گی۔"

"پلیز سبین!" وہ تھوڑا سا ناراض ہوا۔ "میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ زندگی صرف باہر جا کر ہی سنواری جا سکتی ہے اور ویسے بھی میں گھر کا بڑا بیٹا ہوں۔ میں یوں اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

وہ پہلی بار سبین پر ناراض ہوا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے چپ سی ہو گئی۔ مگر اس نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ ہر صورت شہروز کو قائل کرے گی اور اسے ملک سے باہر بھیجے گی۔ کیونکہ فی الحال یہی ایک راستہ تھا۔ جس پر چل کر وہ امینہ جیسا طرز زندگی حاصل کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے بحث کرنے کی بجائے بات بدل دی۔

"چھوڑو اس ذکر کو میں دو دن بعد اپنا DMC (ڈی ایم سی) لینے آ رہی ہوں پھر آمنے سامنے بیٹھ کر بات کریں گے۔" اس نے اپنا لہجہ نرم کر کے کہا تھا۔ شہروز اس کے آنے کے ذکر سے خوش ہو گیا۔ جب سے وہ اس کی زندگی میں آئی تھی۔ تب سے وہ پہلی بار اتنے دنوں کے لیے الگ ہوئے تھے۔ اس لیے اب اس سے ملاقات کا خیال ہی اسے سرشار کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
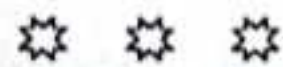
"سبین! فہیم تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم سے بات کر کے تمہاری رضا مندی معلوم کروں تاکہ پھر وہ باقاعدہ رشتے کے لیے ممی پاپا کو بھیج سکے۔" وہ دو دن کے لیے بہاولپور جا رہی تھی اور ابھی اپنی پیکنگ مکمل کر کے فارغ ہوئی ہی تھی جب امینہ کا فون آ گیا اور اس نے رسمی علیک سلیک کے بعد پہلی بات یہی کی تھی۔

"کیا؟" سبین حیرت زدہ رہ گئی۔ "پھر تم نے اسے کیا کہا۔"

"میں نے کیا کہنا تھا۔" امینہ نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔ وہ زچ ہو گئی اور ناراضی سے بولی۔

"تم نے اسے بتا دینا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ تمہیں پتا تو ہے کہ میری کمٹمنٹ شہروز کے ساتھ ہے۔ ایسا کرو تم اب اس کو منع کر دو یا پھر میں اسے فون کر کے منع کر دوں۔"

"اتنی جلد بازی مت کرو۔" امینہ نے تنبیہہ کی تھی۔

"ایسے فیصلے سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں ورنہ بعد میں انسان پچھتاتا ہے زندگی بار بار ایسے مواقع نہیں دیتی۔ ذرا تم ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر سوچو۔ شہروز اور فہیم کا موازنہ کرو اور پھر فیصلہ کرو۔ فہیم ہر لحاظ سے شہروز سے بہتر ہے۔ اس کے ساتھ رہو گی تو ساری زندگی ہنسی خوشی گزارو گی۔ جبکہ شہروز کے ساتھ رہ کر چھوٹی چھوٹی آسائشوں کو بھی ترسو گی۔"

امینہ اسے نرمی سے سمجھا رہی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی پھر بے بسی سے بولی۔

"مگر میں اس سے محبت کرتی ہوں امینہ! اس کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔" اس کا لہجہ کمزوری لیے ہوئے تھا۔ جس کو امینہ نے فوراً" ہی بھانپ لیا اور ذرا تلخی سے بولی۔

"محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ساری محبت ہوا ہو جاتی ہے۔ اور پیچھے بچتی ہیں صرف ذمہ داریاں۔ تم فہیم سے شادی کر کے کم از کم روپے پیسے کی تنگی تو نہیں دیکھو گی اور پھر میں بھی ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ہم دونوں بہنیں ہمیشہ

اکٹھی رہیں گی۔" اس نے بین کو لالچ دیا تھا وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"شہروز کو کویت سے ایک جاب کی آفر آئی ہے۔ اگر وہ باہر چلا گیا تو وہ بھی اچھا خاصا کما لے گا۔ اس لیے تم نعیم کو انکار کردو۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے امینہ کو حتمی جواب دیا تھا۔ پچھلے دو سال سے اس نے صرف اور صرف شہروز کے بارے میں ہی سوچا تھا۔ اس لیے یوں اچانک وہ اس کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتی تھی۔

"بہرحال! تم اچھی طرح سے سوچ لو۔ مجھے اگلے ہفتے تک بتا دینا۔" امینہ بھی اس کی بہن تھی۔ وہ بھی اپنے موقف سے ہٹنے اور ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔ بین نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کردیا۔ اور تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ بہاولپور جانے کے خیال سے جو خوشی وہ صبح سے محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت وہ جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"شہروز! تم مجھ سے محبت کا دعوا کرتے ہو اور میری اتنی سی بات نہیں مان سکتے۔" وہ دونوں یونیورسٹی کی لائبریری میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور بین، بہت مان بھرے لہجے میں اسے کہہ رہی تھی۔

"یار! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ اتنی سی بات نہیں ہے میں کیسے ہر چیز چھوڑ کر ملک سے باہر چلا جاؤں۔ ساری زندگی میں بھی چند دنوں سے زیادہ شہر سے باہر جا کر نہیں رہا۔ اب ایک دوسرے ملک میں کیسے رہ سکوں گا؟" شہروز اس کی مسلسل بحث سے عاجز آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہاں بیٹھے تھے اور اس ڈیڑھ گھنٹے میں بین نے شاذ و نادر ہی کوئی دوسری بات کی تھی۔ اس کی ساری کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ وہ شہروز کو ملک سے باہر جانے کے لیے کسی بھی طرح سے رضامند کر سکے۔

"اور لوگ بھی تو رہتے ہیں۔ اپنے اچھے مستقبل کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔" وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ رہی تھی۔

"پلیز بین! تم اس ذکر کو چھوڑ دو۔ میں اگر چاہوں بھی تو یہ نہیں کر سکتا۔ اپنی ذات کی حد تک میں اگر تمہاری خاطر قربانی دے بھی دوں اور پردیس کی مشقت کاٹنے پر رضامند ہو بھی جاؤں۔ تو بھی میں اپنے والدین اور بھائیوں کے دل نہیں توڑ سکتا۔ ان میں سے کوئی بھی اس بات پر رضامند نہیں ہے کہ 'میں ملک تو کیا شہر سے بھی باہر جاؤں۔ میں نے یہ آفر آنے پر گھر میں سرسری سا ذکر کیا تھا اور تم یقین کرو کہ میری ماں دو دن تک صرف اس خیال سے روتی رہیں کہ کہیں میں انہیں چھوڑ کر چلا نہ جاؤں اور میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔" وہ ابھی بھی اسے رسان سے سمجھا رہا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اپنے گھر والے مجھ سے زیادہ عزیز ہیں۔ تمہاری نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں۔" بین کو غصہ آگیا۔

"یہ کیسا سوال ہے۔ یار! ان کی اپنی جگہ ہے تمہاری اپنی جگہ۔" اس کے غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے ہلکے پھلکے انداز سے جواب دیا تھا۔ بین نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ بلکہ چہرے پر تناؤ اور آنکھوں میں غصہ لیے اس کو دیکھتی رہی۔

"خیر! تم یہ بحث چھوڑو۔ اور یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" شہروز نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا مخملیں کیس برآمد کیا اور کھول کر اس کے سامنے کیا۔ وہ وائٹ گولڈ کی بے حد نازک اور خوب صورت انگوٹھی تھی۔ جو شہروز نے بہت محبت سے اس کے لیے اپنی کمائی سے خریدی تھی۔ اور اس انگوٹھی کو خرید کر وہ اتنا خوش تھا کہ رات بھر اسے ہاتھوں میں لیے بیٹھا رہا تھا۔ پہلی بار اس نے بین کے لیے محبت اور استحقاق سے کچھ خریدا تھا۔ اور اسے ایسا کرنا بے حد اچھا لگا تھا۔

"کیسی ہے؟"

بین بنا کوئی ردعمل دکھائے خاموش اور سرد

نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ تو وہ تھوڑا سا بجھ گیا اور خود ہی پوچھنے لگا۔ اس کی وہ ساری خوشی جو وہ انگوٹھی خریدنے کے بعد سے محسوس کر رہا تھا۔ جھاگ کی طرح بیٹھنے لگی تھی۔

"اچھی ہے۔" سیین نے دل پر جبر کر کے بہت بے دلی سے کہا تھا۔ اس وائٹ گولڈ کی نازک سی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے اسے بے اختیار ہی امیمنہ کے ہاتھوں میں سجی ڈائمنڈ رنگز یاد آئی تھیں اور اسے ایک عجیب سی کم مائیگی اور احساس کمتری نے گھیر لیا تھا۔

"اچھی ہے تو پھر پہن لو۔" وہ اس کی بے دلی کو محسوس کر چکا تھا۔ اس لیے بہت بجھے ہوئے انداز سے بولا تھا۔

"نہیں شہروز! آئم سوری۔ میں یہ انگوٹھی نہیں لے سکتی۔" سیین کا انداز دو ٹوک اور فیصلہ کن تھا۔ شہروز پریشان ہو گیا "تم اگر چاہتے ہو کہ میں یہ انگوٹھی پہنوں اور ہمارا ساتھ برقرار رہے تو تمہیں میری بات ماننا ہو گی۔ ملک سے باہر جانا ہو گا۔ میں یوں ترس ترس کر زندگی نہیں گزار سکتی۔" اپنا فیصلہ سناتے ہوئے وہ شہروز کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ جس کا چہرہ اس کی بات سن کر دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"تم محبت کا موازنہ دولت اور آسائشوں سے کر رہی ہو۔" کئی لمحوں کے بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا بھی تو ایسے بولا کہ اپنی آواز خود اسے ہی اجنبی لگی تھی۔ مگر سیین پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور اجنبی انداز سے کہنے لگی۔

"تم جو چاہو سمجھ لو۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ میں ساری زندگی کے لیے اپنی ہی بہن کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہو کر رہوں۔ تم اچھی طرح سے سوچ لو۔ میں کل شام تک تمہارے فون کا انتظار کروں گی اگر تمہارا فون آ گیا اور تم نے باہر جانے پر رضامندی دے دی تو ٹھیک ورنہ پرسوں صبح میں اپنی بہن کے دیور کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں گی اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اس کے بعد تم میری بات مان بھی لو تو بھی مجھ تک آنے کا راستہ تمہیں نہیں ملے گا۔"

بے حد سفاکی سے کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے سے اٹھ گئی تھی۔ شہروز پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت بیٹھا سامنے پڑی انگوٹھی کو دیکھتا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ جاتی ہوئی سیین کو دیکھ سکتا۔ اس پر اسی وقت یہ خیال کسی الہام کی طرح اترا تھا کہ وہ اس وقت صرف لائبریری سے نہیں بلکہ اس کی زندگی سے جا رہی ہے۔

کتنی ہی دیر تک وہ نڈھال سا وہاں بیٹھا رہا پھر اس نے انگوٹھی اٹھا کر جیب میں ڈالی اور تھکے تھکے قدموں سے لائبریری سے باہر نکل آیا۔ باہر سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا دو گھنٹے پہلے وہ اندر جاتے ہوئے چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر اس کی نظروں کا زاویہ جیسے بدل چکا تھا سرسبز درخت اسے اب اجڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور آتی بہار کی ٹھنڈی نرم ہوا صرصر سے مشابہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ریت سی چبھ رہی تھی۔ اس لیے ان سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔

اس روز وہ رات گئے تک گھر نہیں گیا۔ بس خالی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ تکلیف سی تکلیف تھی۔ اس کے سارے ٹوٹے ہوئے خواب جیسے کانچ کے ٹکڑے بن کر اس کی راہوں میں بچھ گئے تھے۔ اور ان کانچ کے ٹکڑوں پر چلتے ہوئے وہ جیسے لہولہان ہوا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
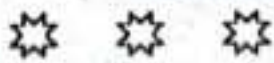
"شہروز! اٹھو بیٹا کھانا کھا لو۔" وہ کمرے میں اندھیرا کیے نہ جانے کب سے خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ جب امی نے آ کر کمرے کی لائٹ جلائی۔ اتنی دیر اندھیرے میں رہنے کے بعد ایک دم ہونے والی روشنی بہت شدت سے اس کی آنکھوں میں چبھی تھی۔ اس نے بے اختیار ہی آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے امی! آپ پلیز مجھے سونے

دیں۔"

"اگر تم سو رہے ہوتے تو ضرور سونے دیتی بیٹا!" امی بے چارگی سے کہتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

"تم تو اب راتوں کو بھی ڈھنگ سے نہیں سوتے دن میں کیا سوؤ گے۔ چلو اٹھو شاباش کھانا کھالو۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

انہوں نے نرمی سے اس کا بازو ہلایا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ امی ہی تھیں جو زبردستی اسے کچھ نہ کچھ کھلا دیتیں تو وہ کھا لیا کرتا تھا۔ ورنہ خود اسے تو کھانے پینے سمیت کسی بھی چیز سے رغبت نہیں رہی تھی۔

"دیکھو آج میں نے تمہاری پسند کا کھڑے مسالے کا قیمہ بنایا ہے۔ کتنے شوق سے کھایا کرتے تھے ناں تم۔"

اس نے بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔ مگر امی نے اسے نہیں ٹوکا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں وہ کھانے سے انکار ہی نہ کر دے۔ مگر بے اختیار ہی انہیں یاد آیا تھا کہ وہ بہت چھوٹے ہوتے سے ہی ہاتھ دھوئے بغیر کوئی چیز منہ میں نہیں ڈالا کرتا تھا اور یہ خیال ان کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔ جن کو پلکیں جھپک جھپک کر انہوں نے واپس دھکیلا تھا اور اس سے کہنے لگی تھیں۔ مگر آنسو اگرچہ انہوں نے آنکھوں سے باہر نہیں گرنے دیے تھے مگر نہ جانے کیسے ان کی آواز بھیگ گئی تھی۔ شہروز ان کی بھیگی آواز سن کر جیسے خواب سے جاگا تھا اور چونک کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا وہ نہ جانے کتنے عرصے کے بعد ماں کے چہرے کو یوں توجہ سے دیکھ رہا تھا وہ اسے پہلے سے کمزور نظر آئیں۔ اس کا دل دکھ سا گیا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ کہ وہ کیوں خود کو نہیں سنبھال پا رہا۔ کم از کم اپنی ماں کی خاطر ہی اس خود غرض اور بے وفا لڑکی کو بھول جائے۔ جس کی چاہت نے اسے جتنی خوشیاں دی تھیں۔ اس سے بڑھ کر غم اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔

"امی! مجھے ابھی بھی یہ کھانا بہت پسند ہے اور آپ کا بنایا ہوا تو ہر کھانا ہی مجھے بہت لذیذ لگتا ہے۔"

اس نے چھوٹے بچوں کی طرح ماں کا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی امی کے آنسو اس بار پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلے۔

"امی پلیز!" وہ کھانا چھوڑ کر ان کے آنسو صاف کرنے لگا۔ ماں کے آنسو آج جیسے اس کے دل پر گر رہے تھے۔

"تم کھانا کھالو بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔"

دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ نرمی سے بولیں اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ شہروز دل گیر سا وہیں بیٹھا بے دلی سے چھوٹے چھوٹے نوالے توڑتا رہا۔ ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ وہ مارے باندھے کھاتا' بہت مشکل سے کوئی بات کرتا اگر چوبیس گھنٹوں میں بمشکل چند گھنٹے سوتا تھا۔ سین کے بعد اس کے لیے زندگی کا مفہوم ہی بدل گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کسی چیز میں دلچسپی نہیں لے پاتا تھا۔ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اس کا احساس تو اسے اسی روز ہو گیا تھا۔ جس روز وہ اس سے انگوٹھی لیے بغیر ملے لائبریری سے اور پھر شہر سے ہی چلی گئی تھی۔ رہ رہ کر وہ اپنا فون اٹھاتا کہ اسے کال کرے اور کہہ دے کہ جیسا وہ چاہے گی وہ ویسا ہی کرے گا۔ بس وہ اس کی زندگی سے نہ جائے۔ مگر ہر بار ماں کی آنکھوں کے آنسو اور باپ کے جھکے ہوئے کندھے اسے ایسا کرنے سے روک دیتے۔ اور وہ نمبر ڈائل کرتے کرتے رہ جاتا۔ مگر اگلے روز رات تک اس نے ماں کی گود میں سر رکھ کر انہیں ساری بات بتا دی۔ اور اپنے دل سے جیسے سارا بوجھ اتار دیا۔ امی اس کی بات سن کر کچھ دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کچھ سوچتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"تم اس کی بات مان لو بیٹا! باہر چلے جاؤ۔"

"کیا کہہ رہی ہیں امی!" اس نے حیرت سے گردن گھما کر امی کی طرف دیکھا۔ "آپ نے خود ہی تو مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کبھی ملک سے باہر جانے کی بات بھی نہیں کروں گا۔" وہ انہیں یاد دلا رہا تھا۔ امی پھیکے

پن سے مسکرادیں۔

"میں تمہیں اپنے وعدے سے آزاد کرتی ہوں بیٹا! میرے لیے اپنی خوشی تمہاری خوشی سے بڑھ کر نہیں ہے اور میں جانتی ہوں کہ اگر بیین نے تمہیں چھوڑ کر اپنی بہن کے دیور کو اپنا لیا تو تم کبھی بھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ تمہارے لیے اس کے بغیر خوش رہنا بہت مشکل ہوگا اور میں تمہیں ایسے کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم خوش رہو۔"

وہ بہت نرمی اور محبت سے کہہ رہی تھیں اور شہروز کا دل ماں کی عظمت کے سامنے جھکا جارہا تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ مگر جب اپنے کمرے میں آکر اس نے خوشی خوشی بیین کا نمبر ملایا تاکہ اسے یہ خوشخبری سنا سکے۔ تو دوسری طرف سے اس کا نمبر دیکھ کر کال کاٹ دی گئی۔ اس نے بے اختیار ہی وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے بارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے اور بیین نے اسے آج شام تک کی مہلت دی تھی۔ لیکن وہ اتنی سخت کیسے ہوسکتی تھی کہ اپنی مہلت میں چند گھنٹوں کا اضافہ بھی نہ کرتی۔ اس نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا مگر اس بار اس کا موبائل ہی بند جارہا تھا۔ ساری رات وہ وقفے وقفے سے اسے کالیں کرتا رہا مسیج سینڈ کرتا رہا۔ مگر اس کا موبائل ایک منٹ کے لیے بھی آن نہیں ہوا۔ صبح کے قریب تھک کر اس کی آنکھ لگ گئی مگر دس بجے کے بعد جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی اس نے پہلا کام بیین کو کال کرنے کا ہی کیا۔ اس بار موبائل آن جارہا تھا مگر چند گھنٹوں کے بعد جب دوسری طرف سے کال ریسیو ہوئی تو بیین کی بجائے اس کی بہن امہنہ کی آواز سن کر وہ بجھ سا گیا۔

"بیین سے میری بات کروادیں پلیز۔" اس نے بہت کوشش کر کے خود کو کمپوز کیا تھا۔

"وہ آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ اور آئندہ آپ اسے کال نہ کریں۔ اس کی منگنی میرے دیور سے ہو رہی ہے آپ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اب۔"

وہ بہت سپاٹ انداز سے اسے اطلاع دے رہی تھی۔ شہروز کا دل دھک سے رہ گیا۔

"دیکھئے پلیز! آپ ایک بار میری اس سے بات کروا دیں۔" اس بار وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ بیین کو کھو دینے کا خیال ہی اس کے جسم سے جان نکال رہا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا ناں وہ آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی آپ کو میری بات کی سمجھ نہیں آرہی۔" اس بار وہ بہت سخت لہجے میں بولی تھی۔

اور فون بند کردیا۔ شہروز چند لمحوں کے لیے فون کو گھورتا رہا پھر بے چین سا ہو کر دوبارہ نمبر ملانے لگا۔ اس بار کال فوراً" ہی اٹینڈ ہوگئی۔ اور اٹینڈ کرنے والی بھی بیین تھی۔

"بیین! میں....." اس کی آواز سنتے ہی شہروز نے بولنا چاہا مگر بیین نے اس کی بات کاٹی اور سخت لہجے میں بولی۔

"میں تمہاری کوئی بھی بات سننا نہیں چاہتی۔ آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ویسے بھی اس کال کے بعد میں یہ سم توڑ کر پھینک دوں گی اس لیے دوبارہ کال کرو گے تو اپنا وقت ہی ضائع کرو گے۔ جیسے میں نے تمہارے ساتھ دو سال ضائع کیے۔"

تلخی سے بول کر اس نے فون بند کردیا۔ شہروز کو کچھ بھی بولنے کا موقع نہیں دیا اور اپنے کہے کے مطابق شاید اس نے واقعی اپنی سم توڑ کر پھینک دی تھی۔ اس لیے بعد میں اس نے جتنی بار بھی کال کی اس کا نمبر بند ہی ملا وہ اسے یکسر بھلا چکی تھی۔ مگر شہروز بہت کوشش کر کے بھی اس کا خیال اپنے ذہن سے نہیں نکال پایا تھا۔ کئی ماہ گزر چکے تھے مگر وہ خود کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ جاب تو اس نے بہت دن پہلے ہی چھوڑ دی تھی۔ اور فیڈرل کالج کی جاب کے لیے ٹیسٹ کی کال آئی تو وہ ٹیسٹ دینے بھی نہ گیا۔

حتیٰ کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر کی آسامی آئی تو اس کے ٹیچرز اسے فون کر کر کے اپلائی کرنے کے لیے کہتے رہے مگر اس نے اپلائی ہی نہیں کیا اس کا سارا

دن آوارہ گردی کرتے یا پرانی یادوں میں کھوئے ہوئے ہی گزر تا تھا۔ گھر کے لوگوں سے بھی وہ بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔ مگر آج ماں کو یوں روتے دیکھ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔

اس نے کھانا ختم کیا اور برتن لے کر کچن میں آگیا۔ امی وہیں تھیں اور ایک کرسی پر بیٹھی اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ اس نے برتن سلیب پر رکھے اور ان کے قدموں میں آبیٹھا۔

"مجھے معاف کر دیں امی! میں آپ کا بہت دل دکھاتا ہوں۔ مگر آپ میرا یقین کریں۔ کچھ بھی میرے بس میں نہیں ہے میں بالکل بے اختیار ہوں۔" ان کی گود میں سر رکھتے ہوئے وہ بہت بے بسی سے بولا تھا۔ امی کا دل کٹ سا گیا۔ وہ ان کا سب سے فرمانبردار اور ہونہار بیٹا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

"بیٹا! تم کوشش تو کرو۔ تم نے تو بالکل ہی ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اپنا نہیں تو کم از کم ہمارا ہی خیال کرلو۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر ہمارے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ کچھ اس کا ہی احساس کرو۔"

اس کے گھنے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا امی! آپ بس میرے لیے دعا کریں۔" ان کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے اس نے ان سے زیادہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔

☆ ☆ ☆

امی سے وعدہ کرنے کے بعد اس نے اس وعدے کو نبھانے کی پوری کوشش بھی کی تھی۔ اور کچھ ہفتوں کے بعد ہی اس نے ایک دوسرے پرائیویٹ کالج میں جاب بھی شروع کر دی تھی۔ تھوڑی بہت روٹین ٹھیک ہوئی تو وہ سنبھلا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے گھر والوں کے لیے یہی بہت تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح دنیا سے مکمل طور پر کٹ کر نہیں رہ رہا تھا۔ البتہ ابھی تک اس نے اپنا کیریئر بنانے کے لیے جدوجہد شروع نہیں کی تھی۔ بس کالج جاتا اور واپس آکر سارا وقت اپنے کمرے میں آکر لیٹا رہتا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ اب وہ خود کو سبین کو یاد کرنے سے روکنے کی شعوری کوشش کرنے لگا تھا۔ اور اس میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو رہا تھا۔

تقریباً" ایک سال تک اس کی یہی روٹین رہی۔ پھر اس میں تبدیلی آنے لگی اور وہ دوبارہ سے اپنی کتابوں اور نوٹس کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ انہی دنوں شہر کی سینٹرل لائبریری میں انفارمیشن آفیسر کی سیٹ کے لیے بھرتی کا اشتہار آیا تو وہ جی جان سے اس پوسٹ کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اور بڑے عرصے کے بعد اس نے دوبارہ یونیورسٹی جانا شروع کر دیا۔ وہاں وہ لائبریری میں بیٹھا دیر تک اپنے ٹیسٹ اور انٹرویو کی تیاری کرتا رہتا اور اگر ضرورت محسوس ہوتی تو اپنے ٹیچرز سے مدد بھی لے لیتا۔ اس جاب کے لیے تیاری کرنے کے سلسلے میں اس نے کالج سے چھٹیاں بھی لے لی تھیں۔ اس کا ٹیسٹ توقع سے زیادہ اچھا ہوا تھا۔ اور اس نے تمام دیگر امیدواروں سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔ اس کامیابی نے اس کے اعتماد میں اضافہ کیا۔ اور اس کا انٹرویو بھی بہت اچھا ہو گیا۔ اور اسے یہ جاب مل گئی۔

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ وہ بہت عرصے کے بعد دل سے خوش ہوا تھا اور اس سے زیادہ اس کے گھر والے خوش تھے۔ کیونکہ بالاخر وہ زندگی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی پہلے جیسی زندہ دلی تو واپس نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی بھی زیادہ تر کھویا کھویا اور اداس ہی رہتا تھا۔ مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کی ایک اچھی روٹین بنالی تھی اور گھر کے معاملات میں بھی کسی حد تک دلچسپی لینے لگا تھا۔ دفتر میں تو خیر وہ خوش ہی رہتا تھا کیونکہ اسے یہ جاب بہت پسند تھی ہر وقت کتابوں اور علم کے شوقین لوگوں میں گھرے رہنے سے اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑ رہا تھا۔

پھر انہی دنوں اس کے ڈیپارٹمنٹ میں وزیٹنگ

ٹیچرز کے لیے آسامیاں نکلیں تو اس نے وہاں بھی اپلائی کر دیا۔ یہ کلاسز شام کی تھیں۔ ابتدا میں اسے ہفتے میں اوسطاً "آٹھ کلاسز ملیں مگر پھر جیسے جیسے اس کا طریقہ تدریس اسٹوڈنٹس میں مقبول ہونے لگا ویسے ویسے کلاسز کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور اسی حساب سے اس کی آمدن میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کچھ عرصہ جاب کرنے کے بعد اس نے قسطوں پر اپنی کار بھی خریدلی اور ان کے گھر کے حالات بھی پہلے سے بہت اچھے ہو گئے۔ بس ایک اس کا دل تھا جو اتنا عرصہ گزرنے اور اتنی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد بھی اداسی کی لپیٹ میں تھا۔

امی چاہتی تھیں کہ وہ اب شادی کرلے تاکہ اس کی زندگی میں بھی خوشی آئے۔ مگر اسے شادی کرنے میں فی الحال کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ ہر بار صاف انکار کر دیتا تھا۔ اسے لڑکیوں میں اب کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ اب اسے کبھی کوئی لڑکی اچھی نہیں لگے گی مگر اس کا یہ خیال فاطمہ عبدالوہاب نے غلط ثابت کر دیا۔ وہ خوشبو کے معطر جھونکے کی طرح اس کی زندگی میں بالکل اچانک داخل ہوئی اور غیر محسوس انداز میں اس کے حواس پر چھاتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ عبدالوہاب جب انٹرویو کے لیے پہلی بار اس کے سامنے آئی تھی انہیں چلڈرن سیکشن کے لیے ایک لائبریری اسسٹنٹ کی ضرورت تھی اور وہ اس جاب کے لیے آئی تھی۔ اس نے ایف اے کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بی ایس ایل کیا ہوا تھا۔ انٹرویوز شہروز کر رہا تھا۔ فاطمہ انٹرویو دینے کے لیے اس کے کمرے میں آئی تو پہلی نظر میں شہروز کو اس میں کوئی بات خاص نہیں لگی تھی۔

وہ شدید گرمیوں کے دن تھے۔ اور موسم کی مناسبت سے اس نے لان کا پرنٹڈ کاسنی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور دوپٹا بہت سلیقے سے اوڑھا ہوا تھا۔ وہ خوش شکل مگر شہروز کے لیے ایک عام سی لڑکی تھی مگر جب اس نے بولنا شروع کیا تو وہ شہروز کو چونکا گئی وہ بے حد باتونی اور پر اعتماد تھی۔ شہروز نے اس سے جتنے بھی سوال کیے اس نے نہایت اطمینان سے ان کے بے حد تفصیلی جواب دیے جو ٹیکنکل کم اور اس کی ذاتی تشریحات پر زیادہ مشتمل تھے۔ بلکہ اس کے بعض جواب تو ایسے تھے کہ شہروز کے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

"سر! مجھے یہ جاب مل جائے گی ناں۔ اصل میں مجھے جاب کی سخت ضرورت ہے۔"

انٹرویو کے اختتام پر شہروز نے اسے جانے کے لیے کہا تو اٹھتے اٹھتے نہایت لجاجت سے پوچھنے لگی۔ شہروز نے حیرت سے اس کے لان کے قیمتی لباس، ہلکی پھلکی مگر مہنگی جیولری اور برانڈڈ بیگ کی طرف دیکھا۔ وہ کہیں سے بھی ضرورت مند نہیں لگتی تھی۔

"کیوں؟" وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھا۔ اور اس کے اس ایک لفظی سوال کا یہ اثر ہوا کہ وہ جو اٹھ چکی تھی دوبارہ بیٹھ گئی۔ اور نہایت معصومیت سے بولی۔

"میں اپنے آپ کو منوانا چاہتی ہوں سر۔" اس کا انداز نہایت پر اعتماد تھا۔ شہروز کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

"گیارھویں سکیل کی جاب کر کے؟" وہ خود کو بولنے سے نہیں روک سکا تھا۔ جواب میں اس نے نہایت متانت سے سر ہلایا۔

"جی سر! اصل میں میں پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں اور وہ بھی سب سے چھوٹی۔ اوپر سے میرے تین شادی شدہ بھائیوں کے بھی بیٹے ہی ہیں۔ بیٹی کسی کی نہیں ہے۔ اس لیے میری تو سمجھ لیں ہر وقت شامت آئی رہتی ہے۔ میں نہ اکیلی کسی دوست کے گھر جا سکتی ہوں اور نہ ہی گھر کے کسی کونے میں دو منٹ کے لیے بھی اکیلی بیٹھ سکتی ہوں۔ میں دو منٹ کے لیے چپ ہو جاؤں تو سارا گھر میرے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ مجھے ہوا کیا ہے۔ مجھے کس نے کچھ کہا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر اس نادیدہ ہستی کا سر پھاڑنے اور ٹانگیں توڑ دینے کا

اعلان بھی کرتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے میں خاموش بیٹھی ہوتی ہوں۔

آپ نہیں جانتے سر ان کے اس بے حساب لاڈ پیار کی وجہ سے میری کوئی سہیلی نہیں بن سکی۔ وہ ہر وقت میرے آس پاس رہنا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ میں اسکول اور پھر کالج میں پڑھتی تھی تو ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ادارے کی دیوار پھلانگ کر اندر آجائیں۔ اور خود اپنی آنکھوں سے جائزہ لیں کہ کہیں کسی نے مجھے وہاں کچھ کہنے کی جسارت تو نہیں کی۔ اس وجہ سے.... اسی وجہ سے سر میں نے ایف اے کے بعد ریگولر کالج جانے کی بجائے اوپن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔"

وہ نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھی اور شہروز بے بسی کی تصویر بنا اس کی گفتگو سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کون سے دو منٹ ہوتے ہوں گے جب یہ لڑکی خاموش ہو کر بیٹھی ہو گی۔

"تو اس سارے چکر میں اپنا آپ منوانے والی کیا بات ہے؟" وہ مزید بولنے کے لیے منہ کھول رہی تھی جب شہروز نے جلدی سے سوال کر ڈالا۔

"اسی طرف تو آرہی تھی سر" وہ تھوڑا سا برا مان کر بولی۔ "اب دیکھیں ناں خود ہی میرے بھائیوں نے مجھے ہر وقت ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا۔ اور اب میں جاب کرنا چاہتی ہوں تو میرا مذاق اڑاتے ہیں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں کہ میں جاب کروں گی بلکہ زیادہ ہنسی تو انہیں اس بات پر آتی ہے کہ مجھے جاب ملے گی کیسے۔ بس سر اب تو میری عزت آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر مجھے یہ جاب مل گئی تو میری واہ واہ ہو جائے گی۔ سر مجھے یہ جاب مل جائے گی ناں۔" حسب عادت لمبی چوڑی تشریح کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر لجاجت سے پوچھ رہی تھی۔

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا مس فاطمہ! پلیز اب آپ جائیں، جو بھی فیصلہ ہو گا آپ کو اس سے مطلع کر دیا جائے گا۔" شہروز نے جلدی سے جواب دے کر انٹر کام اٹھایا اور اگلے امیدوار کو اندر بھیجنے کا کہہ دیا تو ناچار فاطمہ کو اٹھ کر جانا پڑا۔

"پلیز سر! دھیان رکھیے گا۔"

دروازے سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر کہا اور غڑاپ سے باہر نکل گئی شہروز بے اختیار ہی مسکرا دیا۔ اس لڑکی کی وہ باتیں جو کچھ دیر پہلے اسے بے تکی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا موڈ بے حد خوشگوار کر دیا تھا۔

اس روز شام تک اسے فاطمہ کی باتیں یاد آتی رہیں۔ اور بار بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی رہی اور اس نے جو دو نام فائنل کیے ان میں سے ایک نام فاطمہ کا بھی تھا۔ اب یہ فاطمہ کی خوش قسمتی تھی کہ سلیکشن میں دوسرے نمبر پر ہونے کے باوجود جاب اس کو مل گئی کیونکہ جس امیدوار کو اس سے پہلے آفر لیٹر دیا گیا اس نے مقررہ تاریخ تک جاب جوائن ہی نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

جس روز فاطمہ جوائننگ کے لیے آئی۔ اس کے ساتھ اس کے دو بڑے بھائی بھی تھے۔ وہ دونوں اچھی خاصی عمر کے اور بہت ڈیسنٹ قسم کے آدمی تھے۔ بڑے فیضان علی پینتالیس چھیالیس سال کی عمر کے تھے اور ایڈیشنل سیشن جج کے عہدے پر کام کر رہے تھے ان سے ایک دو سال چھوٹے ارسلان علی نیورو سرجن تھے۔ یعنی کہ فاطمہ ایک بہت پڑھی لکھی اور ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی تھی جیسا کہ انٹرویو والے دن شہروز نے اس کے لباس اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ لگایا تھا۔ چونکہ چلڈرن سیکشن براہ راست شہروز کے انڈر تھا۔ اس لیے فاطمہ کو بھی اس کے ساتھ کام کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دونوں بھائی بھی اس سے ملنے آئے تھے۔

"دیکھئے شہروز صاحب! فاطمہ بہت لاابالی قسم کی بچی ہے۔ جاب تو ایک طرف اس نے آج تک کوئی بھی کام ذمہ داری سے نہیں کیا۔ ہر چیز سے یہ بہت جلد اکتا جاتی ہے۔ ہم نے تو اسے بہت منع کیا کہ یہ جاب وغیرہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر اس نے ہماری ایک نہیں سنی۔ دراصل یہ وہی کرتی ہے جو اس کا دل

چاہتا ہے۔" فیضان علی شہروز کو فاطمہ کے بارے میں بتا رہے تھے اور فاطمہ برے برے سے منہ بناتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بھائی! یہ غلط بات ہے۔ میں ہمیشہ ہر کام آپ سے پوچھ کر کرتی ہوں۔" اس سے رہا نہ گیا تو اس نے بڑے بھائی کو ٹوک دیا اس کے بھائی نے محبت بھری نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دوبارہ شہروز کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

"یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ ہر کام ہم سے پوچھ کر کرتی ہے لیکن اس کے پوچھنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے۔ کہ اگر ہم کسی بات سے انکار کریں تو وہ اس کو سنائی ہی نہیں دیتا۔ اس لیے جو کام یہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے اتنی بار اجازت مانگتی ہے کہ ہمیں ہاں کرنا ہی پڑتی ہے۔" انہوں نے بہت بے چارگی سے بتایا تھا۔ شہروز کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جس پر اس نے فوراً" ہی قابو پا کر ان سے پوچھا۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"صرف اتنا کہ یہ اگر یہاں کوئی نقصان کر دے۔ کسی بھی قسم کی گڑبڑ کر دے تو پلیز اس کو کوئی ڈانٹے نہیں۔ ہم ہر نقصان کا ازالہ کر دیں گے۔ اس نے بس کچھ ہی عرصہ یہ جاب کرنی ہے۔ پھر اس کا دل بھر جائے گا۔" اس بار جواب ارسلان علی کی طرف سے آیا تھا۔

"میں کوئی بچی نہیں ہوں، جو یہاں چیزوں کی توڑ پھوڑ کروں گی" فاطمہ نے برا مانتے ہوئے احتجاج کیا تھا۔

"آپ لوگ بالکل بے فکر رہیں۔ ان کو یہاں کوئی پرابلم نہیں ہو گا۔ میں پورا خیال رکھوں گا۔" شہروز ان دونوں بھائیوں کا پرابلم سمجھ چکا تھا۔ وہ بس اس چیز سے پریشان تھے کہ ان کی لاڈلی بہن کو کسی مسئلے یا جاب کے دوران کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ فاطمہ واقعی اپنے بھائیوں کی ہتھیلی کا چھالا تھی۔ اسی لیے اس نے مسکرا کر ان کو دلاسا دیا تھا۔ وہ لوگ تھوڑے سے مطمئن ہوئے تو شہروز سے اس کا نمبر لے کر اور اپنے نمبر اسے دے کر فاطمہ کو ڈھیروں ہدایات دے کر رخصت ہو گئے۔

"سر! آپ میرے بھائیوں کی باتیں دل پر نہ لیں۔ میں بالکل بھی لاابالی نہیں ہوں۔ آپ دیکھئے گا میں کتنی اچھی طرح سے کام کروں گی۔"

اپنے بھائیوں کے جاتے ہی فاطمہ نے بہت عزم سے کہا تھا۔ سیاہ رنگ کے کاٹن کے کڑھائی والے سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی تازگی اور معصومیت ٹھٹکا دینے والی تھی اور اس پر اس کا بولنے کا خوب صورت انداز۔ شہروز کو وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ بہت اچھی طرح سے کام کریں گی۔ اب آپ آئیں میں آپ کو چلڈرن سیکشن دکھا دوں اور آپ کو آپ کا کام ایک بار سمجھا دوں۔"

اس نے فاطمہ کو مزید بولنے سے روکنے کے لیے کہا تھا۔ فاطمہ نے اثبات میں سر ہلایا اور فوراً" ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"سر! میں اندر آ جاؤں؟"

وہ بہت توجہ سے نئی آنے والی کتابوں کے بلز چیک کر رہا تھا جب فاطمہ نے دروازے پر رک کر پوچھا۔ شہروز نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کھلے ہوئے گلابی اور ہلکے نیلے کنٹراسٹ کے سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ اسے جاب کرتے ہوئی مہینہ بھر ہو چکا تھا۔ اور ابھی تک تو وہ اس جاب سے نہیں اکتائی تھی۔ بلکہ بڑے شوق سے وہ عین ٹائم پر دفتر آتی اور ٹائم پورا ہونے کے بعد جاتی۔ البتہ دن بھر وہ اپنی سیٹ پر کم بیٹھتی اور ادھر ادھر زیادہ پھرتی تھی۔ خصوصاً" شہروز کے کمرے کے تو وہ کئی چکر لگاتی تھی۔

"آ جائیں..... اسے اندر آنے کا کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جبکہ فاطمہ اطمینان سے اندر آ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور ارد گرد کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔

"جی فاطمہ! کوئی کام ہے؟" کچھ دیر تک وہ کچھ

نہیں بولی تو شہروز نے خود ہی پوچھ لیا۔
"جی سر!" اس نے نہایت شدومد سے اثبات میں سر ہلایا اور پوری سنجیدگی سے بولی۔
"میں یہ بتانے آئی تھی سر! کہ باہر موسم بہت اچھا ہو رہا ہے بادل چھائے ہوئے ہیں اور ہوا بھی چل رہی ہے۔ شاید بارش ہو جائے۔"
وہ ہمیشہ ہی شہروز کی توقع کے خلاف بات کرتی تھی۔ اور وہ ہر بار ہی حیران رہ جایا کرتا تھا۔ اس بار بھی یہی ہوا تھا۔
"تو۔۔۔" وہ حیرت بھرے لہجے میں یہی کہہ سکا تھا۔
"تو یہ کہ سر! ایک تو آپ کو چاہیے کہ آپ یہ بورنگ کام چھوڑیں اور باہر لان میں ذرا چہل قدمی کریں۔ اس سے آپ کا موڈ بہت اچھا ہو جائے گا اور دوسرے یہ کہ مجھے بھی باہر جانے کی اجازت دے دیں۔"
"میں بہت مصروف ہوں۔ البتہ آپ ضرور جا کر چہل قدمی کر آئیں۔" اس کے مشورے سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا تھا۔
"ٹھیک ہے سر!" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "مگر آپ کو سوچنا چاہیے۔ یہ دنیا کے کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان کے پیچھے آپ کو ایسا موسم انجوائے کرنے سے خود کو محروم نہیں رکھنا چاہیے۔"
اس نے بڑی بوڑھیوں کے انداز سے نصیحت کی تھی۔ شہروز مسکرا دیا مگر کچھ بولا نہیں اور دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"سر!" وہ عادتاً" دروازے کے قریب پہنچ کر رکی تھی۔ شہروز نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"وہ میں کہہ رہی تھی کہ میں گول گپے کھا آؤں۔ بہت دل کر رہا ہے۔" وہ بڑے منت بھرے انداز سے پوچھ رہی تھی۔ شہروز کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے۔ وہ ہمیشہ دنیا سے نرالی بات ہی کرتی تھی۔
"ہرگز نہیں۔ آپ لائبریری سے باہر نہیں جائیں گی۔" اس نے سختی سے انکار کیا تھا۔

"ٹھیک ہے سر!" وہ مایوسی سے بولی۔ "لیکن وہ جگہ زیادہ دور نہیں ہے۔" اپنی عادت کے عین مطابق وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھی شہروز کو سچ میں غصہ آ گیا۔
"میں نے آپ سے ایک بار کہا ہے ناں کہ باہر نہیں جانا۔ آپ کو میری بات کی سمجھ نہیں آتی۔" اس نے شاید پہلی بار فاطمہ کو جھڑکا تھا۔ فاطمہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور ایک پل میں اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔
اس کے جانے کے بعد شہروز نے دوبارہ کام کرنا چاہا مگر نہیں کر پایا بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے فاطمہ کا دھواں دھواں چہرہ اور پرنم آنکھیں آ رہی تھیں اور اسے عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے جا کر ایک دفعہ دیکھ آئے کہیں وہ رو ہی نہ رہی ہو مگر خود پر جبر کیے وہ بیٹھا رہا لیکن جب بے چینی کسی طور دور نہ ہوئی تو آفس سے باہر نکل آیا۔ پہلے فاطمہ کی سیٹ کی طرف گیا وہ وہاں نہیں تھی اس لیے وہ بھی بلڈنگ سے باہر نکل آیا۔ وہ مزے سے درختوں کے درمیان پھر رہی تھی اور کچے آم کچر کچر کر کے کھا رہی تھی۔
"سر! آپ آ گئے۔" شہروز کو دیکھتے ہی وہ چہکی۔ اور اس کے قریب چلی آئی۔ اس کے چہرے پر کچھ دیر پہلے والے تاثرات کا شائبہ تک نہیں تھا۔ شہروز کو اطمینان سا محسوس ہوا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ موسم بہت اچھا ہے۔ دیکھیں ذرا کتنی اچھی ہوا چل رہی ہے اور بادل کتنے خوب صورت ہیں۔" وہ اپنے ہمیشہ والے انداز سے چہک رہی تھی۔
"فاطمہ! بارش ہونے والی ہے۔ آپ اندر جائیں۔ مجھے ایک کام سے ذرا باہر جانا ہے میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔" شہروز کو اپنی پوزیشن کا بھی خیال تھا۔ اس لیے اس نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔ حالانکہ باہر جانے والی 'اس نے بات ہی بنائی تھی مگر وہ فاطمہ کو یا کسی دوسرے اسٹاف ممبر کو یہ تاثر نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے لان میں آیا تھا۔

"جی سر!" بارش واقعی ہونے والی تھی۔ اس لیے وہ فرماں برداری سے کہہ کر اندر کی طرف مڑ گئی۔

"فاطمہ!" شہروز نے پیچھے سے آواز دی تھی۔ وہ رکی اور مڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اگر گول گپے کھانے کو بہت دل کر رہا ہے تو کسی اٹینڈنٹ کو بھیج کر یہیں منگوالیں۔ مگر میں آپ کو اکیلے باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

اس نے بہت نرمی سے کہا تھا۔ فاطمہ کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے۔ اس نے ظاہر نہیں کیا تھا مگر شہروز کی ڈانٹ سے وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔ اس لیے اب اس کے لہجے کی نرمی اسے بہت اچھی لگی تھی۔

"جی سر!" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

☼ ☼ ☼
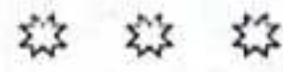
چلڈرن سیکشن کے لیے نئی کتابیں آئی تھیں۔ شہروز نے ان کتابوں کے بل اور کتابیں فاطمہ کے ہینڈ اوور کیں اور اسے بہت اچھی طرح سے سمجھایا تھا کہ وہ کیسے ان کتابوں کا اندراج اپنے اسٹیشن رجسٹر میں کرے اور فاطمہ نے یہ کام کیا بھی بہت توجہ سے تھا۔ مگر بعد میں جب شہروز نے رجسٹر چیک کیا تو کتابوں کی قیمتیں الٹ پلٹ لکھی گئی تھیں۔ شہروز نے چیک کرنے کے بعد فاطمہ کو بتایا تو وہ بری طرح سے پریشان ہو گئی۔ کیونکہ شہروز نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ قیمتوں کا اندراج بہت دھیان سے کرے۔ کیونکہ آڈٹ کے دوران سب سے زیادہ توجہ سے کتابوں کے ٹائٹل اور ان کی قیمتیں ہی چیک ہوتی تھیں۔ اس لیے فاطمہ کا پریشان ہونا فطری تھا۔

اس کا خیال تھا کہ اب اسے شہروز کی طرف سے زوردار قسم کی ڈانٹ پڑے گی۔ مگر اس وقت وہ صحیح معنوں میں حیران ہوئی جب شہروز نے اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور اس کا خراب کیا ہوا کام بہت توجہ سے احتیاط سے ٹھیک کرنے لگ گیا۔

شہروز کی پوری توجہ اپنے کام کی طرف تھی اور سامنے بیٹھی فاطمہ کی اس کی طرف یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شہروز کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ اچھا تو وہ اسے ہمیشہ سے ہی لگتا تھا مگر آج اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنے احساسات پہلی بار تبدیل ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اور وہ نرم مزاج خاموش طبع اور خوب صورت انسان اس کے دل میں اپنی جگہ بنا تا جا رہا تھا۔

"کیا ہوا فاطمہ! اتنی خاموش کیوں بیٹھی ہو۔" انہیں ایک ساتھ کام کرتے ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ اس لیے شہروز اب اس سے قدرے بے تکلفی سے مخاطب ہونے لگا تھا۔

"سر! میں ایک بات سوچ رہی تھی۔" شہروز کے پوچھنے پر وہ بولی تھی۔

"کیا۔" اسے دوبارہ سوال کرنا پڑا۔ کیونکہ وہ ایک بار پھر چپ ہو چکی تھی اور اتنے عرصے میں شہروز نے پہلی بار اسے اتنی دیر تک خاموش دیکھا تھا۔

"یہی کہ سر! آپ بہت اچھے ہیں۔"

اس نے آہستگی سے کہہ کر پلکیں جھکائی تھیں۔ اس نے شہروز کی تعریف پہلی بار نہیں کی تھی۔ مگر آج اس کا لہجہ کوئی نیا رنگ لیے ہوئے تھا۔ جسے پہچاننا شہروز کے لیے اتنا بھی مشکل نہیں تھا وہ سن سا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ کا بڑا بھتیجا اس کے لیے ناشتا لے کر آیا تھا۔ اور اس کے آنے پر فاطمہ اتنی ناراض ہوئی تھی کہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ اس کا بھتیجا بھی یقیناً" اس کا مزاج آشنا تھا۔ اس لیے ناشتا اس کے ٹیبل پر رکھ کر خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور آرام سے گیم کھیلنے لگا۔ وہ فاطمہ سے چند ہی سال چھوٹا تھا اور اس سے بہت بے تکلف بھی تھا۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟"

پندرہ منٹ کے بعد وہ واپس آئی تو اسے براجمان دیکھ کر زچ ہوتے ہوئے بولی۔

"مما نے کہا تھا کہ آپ کو ناشتا کروا کر آنا ہے۔

ایسے ہی چلا گیا تو دوبارہ بھیج دیں گی' اس لیے نہیں جا رہا۔" وہ کندھے اچکا کر بے پروائی سے بولا تھا۔

"پھر بیٹھے رہو سارا دن۔" وہ تنگ کر بولی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر خواہ مخواہ ہی ایک رجسٹر کھول لیا۔ وہ کچھ دیر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا مگر جب بات بنتی نظر نہیں آئی تو مجبوراً" پاپا کو میسج کر دیا۔ اس کا میسج پڑھتے ہی پریشان حال فیضان نے شہروز کو کال کر ڈالی۔

"فاطمہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ وہ ہم سب سے ناراض ہے۔ میرا بیٹا اس کے لیے ناشتا لے کر اس کے دفتر میں بیٹھا ہے مگر وہ کچھ نہیں کھا رہی آپ کی بات وہ مان لیتی ہے۔ آپ اس سے کہیں کہ وہ ناشتا کر لے۔" فاطمہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ اپنی عمر' پوزیشن اور رتبہ ہر چیز بھول جایا کرتے تھے۔ وہ انہیں اتنی ہی پیاری تھی۔

"اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ اسے بھوک نہیں ہو گی۔ جب بھوک لگے گی تو خود ہی کچھ کھا لے گی۔" اس نے رسان سے کہا تھا۔ وہ تو ان دنوں خود فاطمہ سے چھپتا پھر رہا تھا وہ اسے کیسے سمجھاتا۔ اس لیے فیضان علی کو ٹالنا چاہتا تھا۔ مگر وہ بھی کہاں ٹلنے والے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہو گئے۔

"نہیں نہیں اسے بھوک تو ضرور لگی ہو گی۔ میں نے کہا ناں کہ وہ ناراض ہے۔ اسی وجہ سے اس نے بھوک ہڑتال کر دی ہے۔"

"ناراض کیوں ہے اور وہ بھی اتنی زیادہ کہ کھانا ہی چھوڑ دیا۔" وہ کچھ حیران ہوا تھا۔ فاطمہ جیسی لاابالی اور نٹ کھٹ لڑکی سے اسے ایسے رد عمل کی امید جو نہیں تھی۔ اسے تو جو بات بری لگتی۔ موقع پر ہی وہ سامنے والے بندے کو اچھی خاصی سنا کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیا کرتی تھی مگر ناراض نہیں ہوتی تھی۔

"دراصل...." فیضان علی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے تھے۔ "اس کے لیے ایک رشتہ آیا تھا۔ آتے تو پہلے بھی رہتے ہیں مگر یہ رشتہ بہت اچھا بھی تھا اور لوگ بھی ہمارے جانے پہچانے تھے۔ اس لیے میں نے ان کو گھر بلا لیا۔ اب دیکھیں ناں' ہمارے والدین تو رہے نہیں۔ اس لیے یہ کام ہم نے ہی کرنا تھا۔ مگر فاطمہ کو پتا چلا تو وہ بہت ناراض ہوئی اور کھانا پینا چھوڑ کر کمرے میں بند ہو گئی۔ ہم نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ہماری بات ہی نہیں سنتی۔ آفس آنے کے لیے پتا نہیں وہ کیسے باہر نکل آئی۔ ہم نے بھی نہیں روکا کہ باہر نکلے گی تو شاید موڈ بہتر ہو جائے۔" انہوں نے بالآخر اسے تفصیل بتا دی تھی۔

وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔" اس نے فیضان علی کو تسلی دے کر فون بند کیا اور اٹینڈنٹ کو بھیج کر فاطمہ کو اپنے آفس بلوا لیا۔ وہ فوراً" ہی آ گئی۔ پیلے کپڑوں میں ملبوس روٹھی روٹھی سی وہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ شہروز مسکرا دیا۔ فاطمہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے بلاتمہید اسے فیضان کے فون کے بارے میں بتا دیا۔

"وہ تمہارے بڑے ہیں فاطمہ! تمہارے لیے کچھ اچھا ہی سوچیں گے۔ تمہیں یوں ان سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے نرمی سے فاطمہ کو سمجھایا تھا۔

"مگر مجھے وہاں شادی نہیں کرنی جہاں وہ چاہتے ہیں۔" وہ تیزی سے بولی تھی۔

"پھر کہاں کرنی ہے۔" شہروز نے روانی میں پوچھا۔ مگر بعد میں پچھتایا وہ جن نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے جواب کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے اختیار ہی نظریں چرا گیا۔

"مجھے آپ سے شادی کرنی ہے۔" اسے نظریں چراتے دیکھ کر وہ ناراضی سے بولی تھی۔

"اور یہ بات آپ بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" وہ بہت اعتماد سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شہروز جز بز ہو کر رہ گیا۔

"فاطمہ! پلیز ایسی باتیں نہیں کرو۔ میرا اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔"

خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے نرمی سے کہا تھا۔ مگر وہ بری طرح سے چڑ گئی۔

"کیوں جوڑ نہیں ہے۔ آخر کیا کمی ہے۔ مجھ میں اور اگر ہے بھی تو میں آپ کی خاطر خود کو بدل لوں گی۔"

"کمی تم میں نہیں، مجھ میں ہے۔" وہ آزردہ ہوا تھا۔

"مجھے آپ ہر کمی کے ساتھ قبول ہیں۔" وہ لجاجت سے بولی۔ "مگر پلیز میری محبت کو نہ ٹھکرائیں۔ میں واقعی آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ آج تک سب مجھ سے محبت کرتے آئے ہیں۔ میں نے اپنے لیے بہت چاہتیں دیکھی ہیں۔ مگر پہلی بار مجھے کسی سے محبت ہوئی ہے۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی شہروز سر۔" اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ شہروز کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"اچھا روؤ تو مت!" اس نے نرمی سے ٹوکا۔ "ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم جا کر ناشتا کرو اور اپنے بھتیجے سے کہنا کہ جاتے ہوئے مجھ سے مل کر جائے۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ تم نے ٹھیک سے ناشتا کیا ہے یا نہیں۔" وہ اس وقت صرف اسے ٹالنا چاہتا تھا۔ فاطمہ نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ وہ چاہتا بھی تو اس کا کوئی مثبت جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اور صورت حال ایسی تھی کہ منفی جواب دے کر وہ اسے مزید ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے سر!" وہ اس کے اتنے سے التفات سے ہی خوش ہو گئی اور فوراً ہی دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ شہروز پریشان سا بیٹھا اس کی خالی کی ہوئی کرسی کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شہروز صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" اگلے دن وہ ابھی لائبریری پہنچی ہی تھی جب سرکولیشن کلرک نے اسے بتایا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کل رات ہی تو اس نے فیضان بھائی کو شہروز کے لیے اپنی پسند کے بارے میں آگاہ کیا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق انہیں اس کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ بے حد خوش خوش دفتر آئی تھی۔ اور اس نے عزم کر رکھا تھا کہ اب وہ شہروز کو منا کر ہی چھوڑے گی۔ مگر یہاں آتے ہی اسے یہ خبر سننے کو مل گئی۔

"کہاں ہیں وہ.... کیسے ہیں؟" اس نے دھڑکتے دل سے سرکولیشن کلرک سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہیں اپنے گھر پر ہی ہیں۔ زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔ مگر کچھ دن آرام کریں گے۔ ہم تو کل شام ہی ان سے مل آئے تھے۔" اس نے تفصیلی جواب دیا تھا۔ فاطمہ بے چینی سے انگلیاں چٹخاتی الٹے قدموں باہر نکل آئی۔ پہلے ڈرائیور کو فون کر کے واپس بلایا پھر فیضان بھائی کو فون کر کے صورت حال بتائی اور شہروز کے گھر جانے کا کہہ کر ڈرائیور کے آتے ہی اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ شہروز گھر پر ہی تھا اور اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ ابو اپنے آفس اور بھائی یونیورسٹی جا چکے تھے۔ اس لیے دروازہ امی نے کھولا۔

"السلام علیکم آنٹی! میں فاطمہ ہوں۔ مجھے شہروز سر کے بارے میں ابھی پتا چلا تو میں ان کی طبیعت پوچھنے آ گئی۔" وہ ایک ہی سانس میں بولی تھی۔ امی مسکرا دیں۔ وہ شہروز سے اس کا ذکر بہت بار سن چکی تھیں اور وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسا شہروز بتاتا تھا۔

"اندر آ جاؤ بیٹا!" انہوں نے شفقت سے کہا اور اسے ساتھ لے کر شہروز کے کمرے کی طرف چلی آئیں۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ سر، بازو اور ایک پاؤں پر پٹی بندھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی فاطمہ تیر کی طرح اس کی طرف آئی تھی۔

"سر! یہ کیسے ہو گیا۔ آپ دھیان سے کار نہیں چلا رہے ہوں گے ناں۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں ہی آپ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی رہتی ہوں۔" امی کی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ شروع ہو چکی تھی شہروز نے خفت بھری نظروں سے امی کی طرف دیکھا تو وہ چائے لانے کا بہانہ کر کے وہاں سے کھسک لیں تو وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"فاطمہ! بیٹھ جاؤ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ معمولی سی چوٹیں ہیں اور یقین کرو ان کے لگنے میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ بس تم چپ کر جاؤ۔" اس نے تھوڑا

ساڈانٹنے والا انداز اختیار کیا تھا۔ فاطمہ کان دبا کر بیٹھ گئی۔ پھر ڈرتے ڈرتے پوچھنے لگی۔

"زیادہ درد تو نہیں ہو رہا سر؟" شہروز مسکرا دیا۔ وہ چپ بیٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔

"نہیں' بالکل بھی درد نہیں ہے۔ میں نے کہا ناں معمولی سی چوٹیں ہیں۔ چند روز میں ہی ٹھیک ہو جائیں گی ان شاء اللہ۔" اس بار وہ نرمی سے بولا تھا۔ فاطمہ متانت سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔ پھر امی چائے لے کر آگئیں تو وہ ان سے باتوں میں مشغول ہو گئی۔ ان کو فاطمہ بے حد اچھی لگی تھی۔ اس کے آتے ہی گھر میں جیسے رونق سی ہو گئی تھی اور انہوں نے اس بات کا فوراً" اظہار بھی کر دیا تھا۔

"شکریہ آنٹی! آپ بہت اچھی ہیں۔ جو ایسے کہہ رہی ہیں ورنہ شہروز صاحب کو تو ہر وقت میرے بولنے پر اعتراض ہی رہتا ہے۔" اس نے فوراً" شکایت لگائی تھی۔ امی ہنس پڑیں اور محبت سے بولیں۔

"اس کی باتوں پہ نہ جایا کرو یہ تو ایسا ہی ہے۔ اچھا میں اب کھانا پکالوں تم شہروز سے باتیں کرو اور کھانا کھا کر جانا۔" انہوں نے اسے پورے خلوص سے کہا تھا اور وہ بھی کہاں خلوص کو ٹھکرانے والی تھی۔ فوراً" ہی اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"میں تو اب شام کو ہی جاؤں گی آنٹی! جب بھائی' سر سے ملنے آئیں گے تو ان کے ساتھ ہی واپسی ہو گی۔"

"تم نے اپنے بھائی کو بھی بتا دیا؟" امی کے جاتے ہی شہروز نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"ہاں سارا کچھ بتا دیا۔" وہ روانی میں بول گئی۔ پھر خیال آیا تو نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"کیا سارا کچھ؟" شہروز نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

"یہی کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں اور....." وہ خاموش ہو گئی تو شہروز ڈپٹ کر بولا۔

"اور کیا؟" اسے اس وقت فاطمہ کے بچکانا پن پر سخت غصہ آرہا تھا۔ اسے اپنے امیج کی فکر تھی کہ فاطمہ کے بھائی اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔

"اور یہ کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ آہستگی سے بولی تھی۔ شہروز کا دماغ الٹ گیا۔

"شٹ اپ فاطمہ" وہ دانت پیس کر غرایا تھا۔ "تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ میرے بارے میں۔" شہروز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالے۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ فاطمہ بری طرح سے ڈر گئی۔ ایک لمحہ لگا تھا اور اس کی آنکھوں سے سیلابی ریلے کی طرح آنسو بہہ نکلے تھے۔

"میں نے آپ کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ صرف اپنا بتایا ہے کہ مجھے آپ اچھے لگتے ہیں اور میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپاتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی شہروز کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا اسے اچھی طرح سے پتا بھی تھا کہ وہ اس کی ناراضی برداشت نہیں کرتی پھر بھی اسے یوں ڈانٹ دیا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔

"فاطمہ! پلیز روؤ تو مت۔" اس نے نرمی سے کہہ کر اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تھے۔

"دیکھو! اگر امی کو پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں رلایا ہے تو وہ مجھے بہت ڈانٹیں گی۔"

اس کی گلابی پڑتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ جیسے ہار کر بولا تھا۔ فاطمہ کے بہتے آنسو اس کی ایک نظر سے تھم سے گئے تھے۔

"سر آپ....." اس کے ہونٹ کانپے تھے۔ "میں آپ کو اچھی کیوں نہیں لگتی۔" وہ بہت بے چارگی سے پوچھ رہی تھی۔ شہروز نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

"ایسی بات نہیں ہے فاطمہ! تم بہت اچھی ہو۔ بس مجھے اپنا آپ تمہارے قابل نہیں لگتا۔"

اس نے فاطمہ کی طرف دیکھے بغیر آہستگی سے جواب دیا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے آپ ہر کمی کے ساتھ قبول ہیں۔ آپ کو میری بات پر یقین کیوں نہیں آتا۔"

اس کی آنکھیں ایک بار پھر پانیوں سے بھرنے لگی

تھیں۔ اور شہروز کو اس کے آنسوؤں سے بہت خوف آتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک پل میں ہتھیار ڈال دیے۔

"مجھ سے کوئی رشتہ بنانے سے پہلے تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ کہ تم میرا ماضی جان لو میں تمہیں کسی اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ فاطمہ میں کسی اور سے محبت کرتا رہا ہوں۔ ہر چیز سے زیادہ ہر رشتے سے بڑھ کر میں نے ایک لڑکی سے محبت کی ہے۔" وہ اسے اپنے اور سبین کے بارے میں ایک ایک بات بتاتا چلا گیا اس کے ساتھ گزرے چاہت بھرے لمحے۔ اس کا چھوڑ کر چلے جانا اور اس کے جانے کے بعد اٹھائی گئی ایک ایک اذیت اس نے فاطمہ سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا اور وہ بھی ایک لفظ بولے بغیر خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہیں۔ حتیٰ کہ جب شہروز خاموش ہو گیا تب بھی وہ کچھ نہیں بولی۔

"اب تو تمہیں پتا چل گیا ناں فاطمہ! کہ میں اندر سے ایک خالی انسان ہوں۔ محبت کا ڈسا ہوا اور محبت سے ڈرنے والا۔" اس کی چپ سے وہ تھک گیا تو ایک بار پھر بول اٹھا۔ فاطمہ اس بار بھی خاموش رہی اور پلکیں جھکائے بیٹھی رہی اور شہروز اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ معصومیت اور تازگی لیے آنسوؤں سے دھلا ہوا شفاف چہرہ۔ مگر شاید وہ اس کے نصیب میں نہیں تھا اس نے گہری سانس لے کر نظروں کا زاویہ بدلنا چاہا مگر اس وقت فاطمہ نے اپنی بھیگی پلکوں کی جھالر اٹھا دی تھی۔

"شہروز!" اس نے پہلی بار اسے یوں مخاطب کیا تھا شہروز کا دل عجیب سی لے پر دھڑکا۔

"اب وہ انگوٹھی کہاں ہے۔ جو آپ نے سبین کے لیے خریدی تھی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ شہروز نے کچھ کہے بغیر سائڈ ٹیبل کی دراز کھول دی۔ بالکل سامنے ہی وہ مخملی کیس پڑا تھا۔ فاطمہ نے اسے اٹھایا کھول کر دیکھا اور انگوٹھی نکال کر شہروز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پہنا دیجیے۔"

اپنا موی ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ شہروز نے خواب کے سے عالم میں اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ سبین کو تو پتا نہیں وہ پوری آتی یا نہ آتی مگر اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں وہ بالکل فٹ آئی تھی۔

"میں اور کوئی بات نہیں کرتی شہروز! صرف اتنا کہتی ہوں کہ میں آپ سے اتنی محبت کروں گی۔ کہ آپ میری محبت سے محبت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔" انگوٹھی کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر اس نے مدھم آواز میں کہا تھا شہروز نم آنکھوں سے مسکرایا اور کھلے دروازے کی طرف دیکھنے لگا جس کے بیچوں بیچ امی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ بالآخر ان کے لاڈلے بیٹے کا امتحان آج ختم ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سبین! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

وہ شام کے وقت پچھلے صحن میں سیڑھیوں پر بیٹھی آسمان کی وسعتوں میں نہ جانے کیا کھوج رہی تھی۔ جب امیمہ نے اس کے قریب آکر پوچھا۔ اس نے ایک اکتائی ہوئی نظر امیمہ کے میک اپ زدہ چہرے پر ڈالی اور بے زاری سے بولی۔

"اور کہاں بیٹھوں؟"

وہ ایک بار پھر اپنے پرانے شغل میں مصروف ہو چکی تھی اور امیمہ کو یکسر نظر انداز کر چکی تھی۔ امیمہ کچھ دیر سامنے کھڑی اس کو دیکھتی رہی۔ اس کی رنگت کملا گئی تھی اس میں پہلے جیسی چمک دمک اب مفقود تھی۔ اس کا لباس ملگجا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ امیمہ نے گہری سانس لی اور اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ سبین نے اس کے یوں بیٹھنے کا بھی نوٹس نہیں لیا تھا اور لاتعلق یوں بیٹھی رہی جیسے وہاں بالکل اکیلی ہو۔

"سبین! تم مجھ سے کیوں ناراض رہتی ہو۔ اگر فہیم نے باہر جا کر اس انگریز لڑکی سے شادی کر کے تم سے

منگنی توڑدی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو اسے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا نا۔" سبین کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔

سبین نے نظروں کا زاویہ بدل کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ آج بھی ہیروں کا سیٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کا لباس بھی ہمیشہ کی طرح بہت قیمتی تھا۔ مگر اب سبین کو اس پر رشک نہیں آتا تھا۔ کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ امیمہ کے پاس صرف پیسہ ہے۔ محبت اور عزت دونوں ہی نہیں ہیں۔ اس کا امیر کبیر شوہر اس کی آنکھوں کے سامنے دوسری عورتوں سے تعلق لڑاتا تھا اور وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ بات بے بات امیمہ کو بے عزت کرنا اور اس پر ہاتھ اٹھانا اس کے لیے معمولی سی بات تھی۔

"تمہارا قصور یہ ہے امیمہ! کہ تم نے دولت مندوں کی صرف خوبیاں ہی بتائیں۔ ان کی خامیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے میرے دل میں دولت کے لیے محبت پیدا کی۔ اپنی دولت اور آسائشوں کی نمائش کر کر کے مجھے اس کی طرف مائل کیا۔ اور تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے مجھے شہروز سے دور کیا۔ میرے دل میں اس کے خلاف نفرت کے بیج بوئے اور پھر ان کی آبیاری کر کر کے انہیں تناور درخت بنا دیا۔ انہیں اتنا تناور کر دیا کہ میری محبت ان کے تلے دب کر رہ گئی۔" سبین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"سارا الزام مجھے مت دو سبین! کچھ قصور تمہارا بھی ہے۔ تم مان لو کہ تمہیں بھی دولت کی چاہت تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو میں خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لیتی۔ تم شہروز کو چھوڑ کر فہیم سے منگنی نہ کرتیں۔"

امیمہ نے تڑخ کر کہا تھا۔ چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا فہیم کو سبین سے منگنی توڑے۔ مگر اس کا سوگ ہی ختم نہیں ہو تا تھا۔ ہر چیز کا الزام وہ امیمہ کے سر پر تھوپ کر خود مظلوم بن جاتی تھی۔ اس لیے آج امیمہ نے اسے آئینہ دکھا ہی دیا تھا۔

"ہاں شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" امیمہ سے بحث کرنے کے بجائے اس نے فوراً" ہی ہتھیار ڈالتے ہوئے یاسیت سے کہا تھا۔

"میرا بھی برابر کا قصور ہے بلکہ شاید میرا ہی زیادہ قصور ہے۔ کتنا چاہتا تھا وہ مجھے کس قدر خیال رکھتا تھا میرا اور بعد میں تو میری خاطر ملک سے باہر جانے کو بھی تیار ہو گیا تھا مگر میں نے کسی چیز کا خیال نہیں کیا۔ اس کا دل توڑ دیا بلکہ بار بار توڑا۔ مجھے اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا پھر بھی میں نے اسے اکیلا چھوڑ دیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کو یوں روتے دیکھ کر امیمہ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور وہ اس کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے اسے چپ کروانے لگی۔

"اس چیز کی سزا ملی ہے مجھے۔ جو وہ اب مجھے کسی پل نہیں بھولتا۔ منگنی مجھ سے فہیم نے توڑی ہے مگر یاد مجھے شہروز آتا ہے اور دن رات آتا ہے۔"

ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ خود کلامی کر رہی تھی امیمہ ترحم بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"سبین! تم ایک بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش تو کرو۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ابھی شادی نہ کی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں معاف کر دے۔ آخر وہ تمہیں اتنا چاہتا تھا۔"

جو بات وہ پچھلے کئی روز سے سوچ رہی تھی وہ آج اس نے سبین کے گوش گزار کر ہی دی تھی۔ سبین اس کی بات سن کر تھوڑا چونکی اور کہنے لگی۔

"وہ مجھے معاف کر دے گا؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا اس کے بعد وہ مجھے کیسے معاف کر سکتا ہے۔" اس کے انداز میں مایوسی تھی۔

"تم کوشش تو کرو۔ کیا پتا تمہاری قسمت یاوری کر جائے۔"

سبین اسے اکسا رہی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی اور کئی دن سوچنے کے بعد اس نے بالآخر قسمت آزمانے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کر کے اسے شہروز کا نیا نمبر بھی مل گیا اور اس کے بارے میں مکمل

معلومات بھی حاصل ہوگئیں۔ اور پھر ایک روز بہت ہمت کر کے اس نے شہروز کو فون کر ہی ڈالا۔ مگر دوسری طرف شہروز کا انداز اس کی توقع سے زیادہ سخت تھا مگر اس کی سختی سے مایوس ہو جانے کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری اور اس کے روبرو بات کرنے کے لیے اس کے شہر جا پہنچی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ کے زندگی میں آنے کے بعد شہروز کے لیے زندگی ایک بار پھر سے خوب صورت ہو چکی تھی۔ وہ ان دنوں بہت خوش اور سرشار سا رہنے لگا تھا۔ اس کے گھر والوں نے تو خیر بہت خوشی سے فاطمہ کو قبول کر لیا تھا۔ مگر فاطمہ کے گھر والے بھی اس رشتے سے کم خوش نہیں ہوئے تھے حالانکہ مالی لحاظ سے وہ لوگ شہروز اور اس کی فیملی سے کہیں زیادہ مضبوط تھے۔ مگر دولت مند ہونے کے باوجود وہ دولت سے محبت کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ اور خود فاطمہ بھی بہت سادہ مزاج تھی۔ اس لیے فاطمہ یا اس کے گھر کے کسی بھی فرد کے انداز سے کسی بھی قسم کا احساس برتری ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

شہروز کو فاطمہ کے بھائی تو پہلے ہی بہت پسند کرتے تھے اور اب جب سے انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ فاطمہ اپنے دل میں اسے خاص مقام دے چکی ہے تو ان کی پسندیدگی پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

ان کی باقاعدہ منگنی نہیں کی گئی تھی۔ بس رسمی طور پر بات چیت کرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا تھا کہ جیسے ہی آنے والا موسم گرما ختم ہو گا ان کی شادی کر دی جائے گی۔ لائبریری میں بھی سب کو ان کا رشتہ طے ہونے کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے وہاں اب فاطمہ کا احترام پہلے سے زیادہ کیا جانے لگا تھا۔

وہ اپنی سیٹ پر اب بھی کم بیٹھتی تھی مگر اب ادھر ادھر کے چکر لگانے کی بجائے اس کا زیادہ وقت شہروز کے آفس میں گزرتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ سارا دن وہیں بیٹھی رہتی۔ حالانکہ شہروز زیادہ باتیں ابھی بھی نہیں کرتا تھا۔ مگر فاطمہ کے لیے اس کی نرم خوئی پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اس کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ فاطمہ کو خود پر رشک آنے لگتا تھا۔ البتہ محبت کی بات وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ فاطمہ اگر خود اس سے محبت کا اظہار کرتی بھی تو وہ بس مسکرا دیا کرتا تھا۔ اس بارے میں کچھ کہتا نہیں تھا اور فاطمہ دل چاہنے کے باوجود اس سے اظہار محبت کے لیے تقاضا نہیں کرتی تھی۔

زندگی مطمئن اور خوش گوار گزر رہی تھی۔ موسم گرما ان دنوں اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ دونوں طرف گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ جب ایک سہ پہر اچانک ہی بین کا فون آگیا۔ وہ شہروز سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر اب شہروز کو اس سے ملنے کی کوئی آرزو نہیں تھی۔ اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا مگر اسے انکار کر دینے کے باوجود وہ بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا اسے بین پر، خود پر اور کائنات کی ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ اپنا آپ اسے ایک ایسے کھلونے کی طرح بے وقعت لگ رہا تھا جس کو بین جب چاہتی توڑ ڈالتی اور جب چاہتی دوبارہ جوڑ کر طاق پر سجا لیتی اور وہ اس کے سامنے بے بس تھا۔

اسے دنیا کی کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی اور معاملہ ایسا تھا کہ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا۔ اسے خود ہی جھیلنا تھا خود ہی برداشت کرنا تھا۔ وہ بین سے دوبارہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنا موبائل زیادہ تر بند رکھنے لگا تھا اور اگر آن ہونے پر بین کی کال آجاتی تو وہ اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ روز تک ایسا کرے گا تو وہ اسے کال کرنا چھوڑ دے گی۔ مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک سہ پہر وہ اس کے دفتر آ پہنچی۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو وہ اس کے کمرے میں بیٹھی تھی۔

"تم یہاں؟" اسے سامنے پا کر وہ صرف حیران ہوا تھا خوشی اور سرشاری کا معمولی سا احساس بھی اسے نہیں ہو رہا تھا۔ دوسری طرف بین تھی جو اسے

سامنے پاکریوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنی آنکھوں کی صدیوں کی پیاس بجھا رہی ہو۔ وہ ویسا ہی تھا بلکہ پہلے سے زیادہ فریش اور ہینڈسم ہو گیا تھا۔ جبکہ وہ مرجھائی ہوئی اور بے حد اداس تھی۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔" وہ بہت اجنبی انداز سے پوچھ رہا تھا۔

"شہروز! میں... میں تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔" سبین کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ شہروز کا اپنے لیے اجنبی انداز اس کی برداشت سے باہر تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو اس کا چہرہ یوں محبت اور عقیدت سے دیکھا کرتا تھا کہ اسے خود پر رشک آنے لگتا تھا۔

"کس بات کی معافی۔" شہروز کو غصہ آ گیا "معافی غلطیوں کی ہوتی ہے۔ جو جرم باقاعدہ پلان کر کے کیے جاتے ہیں۔ ان کی معافی نہیں سزا ہوتی ہے۔ اور تم نے سب کچھ پلاننگ کے تحت کیا مجھ سے دور جانے کے لیے ایسی چال چلی کہ میں کچھ سمجھ ہی نہیں پایا۔"

"شہروز! پلیز مجھے معاف کر دو۔ بھول جاؤ سب کچھ، میں زندگی میں دوبارہ کبھی تمہارا دل نہیں دکھاؤں گی۔"

"کیسے بھول جاؤں؟" اس بار اس کا لہجہ دھیما تھا۔ "وہ سب کیسے بھول جاؤں جس کا تصور آج بھی مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ میں نے کتنی منتیں کی تھیں تمہاری کہ تم میرا ساتھ نہ چھوڑو ہم جو چاہو گی میں وہی کروں گا، مگر تمہیں ایک بار بھی مجھ پر ترس نہیں آیا پھر آج تم کس منہ سے مجھ سے معافی مانگ رہی ہو۔ تم نے مجھے اس چند گھنٹوں کی دیر کے لیے معاف کیا تھا جو تمہیں معاف کر دوں۔"

"نہیں کیا تھا۔" وہ دکھ سے بولی۔ "اسی لیے تو پچھتا بھی رہی ہوں اور یقین کرو شہروز بعد کا پچھتانا بہت اذیت دیتا ہے۔"

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شہروز اس بار کچھ نہیں بولا بس خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

"پلیز شہروز! ایک بار صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری زندگی خوشیوں سے بھر دوں گی۔" اس کی آنکھوں میں شاید کوئی نرم تاثر اترا تھا، جسے دیکھ کر سبین کو تھوڑی سی امید ہوئی تھی۔

"اب یہ ممکن نہیں ہے سبین، میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ تھک کر بولا تھا۔ "میری زندگی میں کوئی اور لڑکی آ چکی ہے، اور کچھ عرصے کے بعد میری اس سے شادی ہو رہی ہے۔"

"کیا؟" سبین کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔
"تم سچ کہہ رہے ہو" اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ شہروز نے منہ سے کچھ بولے بغیر آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سبین ویران چہرہ لیے کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"کون ہے وہ؟"

☆ ☆ ☆

رات کو کافی دیر سے گھر پہنچا تو امی اس کے انتظار میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

"امی! کیا بات ہے۔ آپ پریشان لگ رہی ہیں؟" اپنی پریشانی کو بھول کر وہ بے کل سا ان کے قریب آ بیٹھا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں تم بتاؤ کھانا کھاؤ گے؟" انہوں نے صاف اسے ٹالا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ مگر اس وقت وہ اتنا تھکا ہوا اور ذہنی طور پر الجھا ہوا تھا کہ ان سے اصرار بھی نہیں کر سکا۔

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"شہروز!" وہ دروازے کے قریب پہنچا تھا جب امی نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

"جی امی!" وہ رک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"سبین آئی تھی تم سے ملنے؟" وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"فاطمہ نے بتایا۔"

"فاطمہ نے؟" وہ بے چین ہو کر واپس پلٹا اور ان کے قریب آبیٹھا۔

"اس کو کیسے پتا چلا میں نے تو اسے نہیں بتایا۔"

"سبین اس سے خود ملنے گئی تھی۔ وہ چاہتی ہے کہ فاطمہ تمہاری زندگی سے نکل جائے۔ اس نے فاطمہ کو اس بات کا یقین دلا دیا ہے۔ کہ تم اسے چھوڑ کر فاطمہ سے شادی کر لو گے تو کبھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ کیونکہ تم فاطمہ سے نہیں اس سے محبت کرتے ہو۔" امی بتا رہی تھیں اور اس کا وجود جیسے شعلوں کی زد میں آتا جا رہا تھا۔

"اور فاطمہ کا تو تمہیں پتا ہی ہے کہ، تمہیں کتنا چاہتی ہے تمہاری خوشی کی خاطر تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہارے اور سبین کے درمیان سے ہٹ جائے گی آج شام کو وہ میرے پاس آئی تھی اور یہ انگوٹھی واپس کر گئی ہے۔"

وائٹ گولڈ کی نازک سی انگوٹھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ رو دی تھیں۔ شہروز ساکت و صامت بیٹھا اس انگوٹھی کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے کمرے میں آکر اس نے فاطمہ کو فون کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر کمرے میں گھٹن ہونے لگی تو باہر لان میں جا کر بیٹھ گیا۔ پوری رات اس نے یونہی بے چینی اور بے قراری کے عالم میں گزاری اور صبح ہوتے ہی تیار ہو کر بغیر ناشتا کیے دفتر روانہ ہو گیا حالانکہ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ آج دفتر آئے گی بھی یا نہیں۔ مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج اگر وہ نہ آئی تو وہ اس کے گھر چلا جائے گا۔ مگر وہ نا صرف اپنے پورے ٹائم پر لائبریری آگئی بلکہ اس کے چہرے پر کسی قسم کی اداسی یا پریشانی بھی نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ بہت پرسکون نظر آرہی تھی۔ شہروز نے دفتر کی کھڑکی سے اسے آتے دیکھا تو فوراً ہی اٹینڈنٹ کو بھیج کر بلوا لیا۔

"آپ نہ بلواتے تو بھی مجھے آپ کے آفس آنا ہی تھا۔ میں جاب سے ریزائن کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ بہت سکون سے بولی تھی۔

"ہاں، بہت بڑی ہو گئی ہو ناں تم۔ ہر فیصلہ خود ہی کر سکتی ہو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا تھا۔ فاطمہ نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولی۔

"میں نے جو کچھ بھی کیا۔ آپ کی خاطر اور آپ کی محبت میں کیا، میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ خوش رہیں۔ آپ کی خوشی میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔"

"اور تم یہ کیسے جانتی ہو کہ میری خوشی کس چیز میں ہے۔" وہ بھڑک اٹھا تھا۔

"شہروز!" فاطمہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ سبین سے محبت کرتے ہیں اور اب وہ لوٹ آئی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ میں ہی آپ کی خوشی ہے۔ اور اگر آپ اپنی خوشی سے صرف اس لیے منہ موڑنا چاہتے ہیں کہ میں ہرٹ نہ ہوں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں بالکل بھی ہرٹ نہیں ہوں گی۔ بلکہ آپ خوش رہیں گے تو میں بھی خوش رہوں گی۔"

چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنگامہ کر دینے والی بات بے بات رو پڑنے والی فاطمہ اتنی بڑی بات اتنے سکون سے کر رہی تھی۔ وہ سحر زدہ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ جبکہ آفس کے دروازے کے قریب پہنچ کر اسی وقت رکنے والی سبین پر یہ بات سن کر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اسے اپنی منزل اب بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ مگر شہروز بولا تو اس کے خوابوں کے محل کو ایک پل میں چکنا چور کر گیا۔

"میری خوشی صرف اور صرف تمہارے ساتھ میں ہے فاطمہ! تم سے دور ہوا تو میں کبھی خوش نہیں رہ سکوں گا۔" وہ پہلی بار اس کے سامنے اعتراف کر رہا تھا۔

"مگر شہروز! سبین آپ کی محبت ہے۔ اسے مایوس لوٹا کر آپ خود بھی ہمیشہ بے سکون رہیں گے۔"

شہروز کے اعتراف سے اس کی آنکھوں میں جگنو سے اترے تھے مگر اگلے ہی لمحے پتا نہیں کیا خیال آیا کہ جگنو بھی بجھ گئے اور اس کا چہرہ بھی اور وہ ایک بار پھر سبین کی وکالت کرنے لگی۔

"مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ میں سبین سے محبت کرتا تھا۔ اتنی محبت کرتا تھا کہ اس محبت کی گہرائی کا میں خود بھی کبھی اندازہ نہیں لگا پایا۔ مگر اس نے کیا کیا۔ اس نے میرا دل توڑا میری محبت کی توہین کی اور کس لیے صرف اور صرف دولت کے لیے' آسائشوں کے لیے۔ میرے اور اس کے بیچ دنیا یا دنیا والے نہیں آئے تھے فاطمہ خود اس کی بے جا خواہشیں آئی تھیں۔ جنھوں نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ تم خود سوچو کیا وہ اعتبار کے قابل ہے اگر میں سب کچھ بھول کر اسے اپنا بھی لوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل کو اپنی کس خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ مجھے چھوڑ کر چلی نہیں جائے گی۔ نہیں فاطمہ! میں اب اس پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ کسی صورت نہیں کر سکتا۔" وہ بہت تلخی سے بول رہا تھا اور باہر کھڑی سبین کے جسم سے جیسے جان نکلتی جا رہی تھی۔

"پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ کل کو آپ پچھتائیں۔" فاطمہ نے جیسے آخری کوشش کی تھی۔ اس بار اس کا لہجہ کمزور تھا۔ شہروز اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا اور نرمی سے بولا۔

"اس کے لیے تو کبھی نہیں پچھتاؤں گا۔ ہاں اگر آج میں نے تمہیں اپنی زندگی سے جانے دے دیا تو ضرور عمر بھر پچھتاتا رہوں گا۔" وہ فاطمہ کے خوب صورت چہرے کو بہت محبت اور توجہ سے دیکھ رہا تھا اور فاطمہ اس کی ان نظروں سے گلاب ہوئی جا رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا۔ وہ شخص اس کی محبت تھا۔ فاطمہ نے اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ اور اسے خواہ اس کی خوشی کی خاطر ہی کسی اور کے حوالے کر رہی تھی۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

"مگر مجھ سے تو آپ کو محبت نہیں ہے۔" پلکیں اٹھائے بغیر وہ ناز سے بولی تھی۔

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ نہیں ہے۔"

"آپ نے کبھی کہا جو نہیں۔" اس بار اس کے انداز میں تھوڑی سی شکایت تھی۔

"پہلے مجھے بھی اس بات کا علم نہیں تھا۔ مگر کل جب تم انگوٹھی واپس کر گئیں اور رات کو امی نے مجھے ساری بات بتائی تو مجھے احساس ہوا کہ تم میرے لیے کس قدر قیمتی ہو چکی ہو۔ تمہارے بغیر رہنے کے تصور نے ہی مجھے اس قدر خوف زدہ کیا کہ میں ساری رات نہیں سو سکا فاطمہ! میں اور کوئی بات نہیں کہتا صرف اتنا کہتا ہوں کہ مجھے تمہاری محبت سے واقعی محبت ہو گئی ہے۔ تمہاری محبت میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر قیمتی ہے۔ اگر میں نے اسے کھو دیا تو میں بالکل خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔" وہ بہت واضح لفظوں میں اس سے محبت کا اعتراف کر رہا تھا اور فاطمہ کے چہرے پر گلاب سے کھلتے جا رہے تھے۔ جبکہ باہر کھڑی سبین کو

یقین ہو چکا تھا کہ وہ یہ بازی اب ہار چکی ہے شہروز کے دل میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو اتنی کم کہ فاطمہ کے سامنے وہ اب شہروز کو کبھی نظر نہیں آسکتی تھی۔ اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا اور واپسی کے لیے مڑ گئی اب اسے امینہ کو فون کر کے بتانا تھا کہ وہ فہیم کو معاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ جو دو روز پہلے ہی واپس آیا تھا۔ اپنی انگریز بیوی کو طلاق دے کر اور اب سبین سے معافی کا طلب گار تھا۔ اسے دوبارہ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

"میرے پاس اب تو اور کوئی آپشن نہیں رہا امینہ! میں واپس گھر آرہی ہوں۔ تم امی سے بات کر لو میں فہیم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" امینہ کو ساری بات بتا کر اس نے تھکے تھکے انداز سے کہا اور سر جھکائے اسٹاپ کی طرف چلنے لگی۔ ایک روز اس نے محبت کو ٹھکرایا تھا اور اپنے لیے دولت کا انتخاب کیا تھا۔ آج محبت نے اسے ٹھکرا دیا تھا اور دولت نے اسے اپنا لیا تھا۔ اور اسے ادراک ہو چکا تھا کہ اب اسے اپنی ساری زندگی یونہی گزارنی ہے۔ دولت اور آسائشوں کے ساتھ مگر محبت کے بغیر۔

شہروز نے گلابی آنچل کو دروازے کے سامنے لہراتے اور پھر اسے وہاں سے ہٹتے دیکھ لیا تھا۔ اسے ایک عجیب طرح کے سکون کا احساس ہوا تھا اس نے اپنی جیب سے انگوٹھی نکالی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر فاطمہ کے قریب چلا آیا۔

"یہ انگوٹھی صرف انگوٹھی نہیں ہے فاطمہ! یہ میری محبت کا اظہار ہے۔ آئندہ اسے اپنی انگلی سے نہ اتارنا۔ ورنہ مجھے لگے گا کہ تم میری محبت کو ٹھکرا رہی ہو۔"

اس کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا اور اس کے لہجے میں نہ غصہ تھا نہ کسی قسم کی تنبیہہ صرف اور صرف نرمی تھی۔ فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"آئم سوری شہروز! مجھے معاف کر دیں۔ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔ کبھی آپ کا دل نہیں دکھاؤں گی۔"

"دکھا تو رہی ہو۔ یوں آنسو بہا کر۔" وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔ فاطمہ نے جلدی سے آنسو صاف کر ڈالے۔

"چلو آؤ اب تمہارا ریزائن لکھتے ہیں۔" وہ واپس اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"ریزائن کیوں۔ اب تو میں جاب نہیں چھوڑ رہی۔" وہ جلدی سے بولی تھی۔

"آپ جاب چھوڑ رہی ہیں میڈم۔ کیونکہ میں آج ہی امی کو تمہارے گھر شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے بھیجنے والا ہوں۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی گھر کو ٹائم دینے کی بجائے جاب کرے۔ اور ویسے بھی تم ایک بہت بری اسسٹنٹ ہو۔ سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے اور تمہیں ابھی تک ڈھنگ سے کام کرنا نہیں آیا۔ اس لیے میں اب اس سیٹ پر کسی ذمہ دار شخص کو اپائنٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ کاغذ نکالتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے ہنس دی اور محبت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ جو اب نظریں کاغذ پر جمائے، بہت توجہ سے اس کا ریزائن لکھ رہا تھا۔

"میں کبھی کبھار تو یہاں آسکوں گی ناں۔ مجھے اس جگہ سے محبت سی ہو گئی ہے۔"

ریزائن پر سائن کرتے ہوئے اس نے شہروز سے پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں۔ میرے ساتھ تم ہر اس جگہ جا سکو گی جہاں تم جانا چاہو۔ مگر یاد رکھنا صرف میرے ساتھ۔ کیونکہ تم میرے لیے، بہت قیمتی ہو۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور اس کے چہرے پر محبت کے اتنے رنگ بکھرے تھے کہ فاطمہ کو خود پر رشک آنے لگا تھا۔

☆ ☆

www.Paksociety.com
عابدہ احمد
کتنے دور کتنے پاس
READING
Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

تاروں بھرے آسمان کے نیچے پُرسکون بہتی نیلی ندی' تاروں کے پانی میں پڑتے عکس اور للّی کے سفید پھولوں سے بھری بڑا پُرلطف نظارہ دے رہی تھی۔ ندی کی سطح پہ تیرتی سرخ اور سفید پھولوں سے لدی کشتی میں آمنے سامنے بیٹھے دو نفوس ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ارد گرد سے بے نیاز ایک دوسرے کی سنگت کی خوشی میں مگن تھے کہ یکایک جیسے ندی میں بھونچال آگیا۔

"میں کہتی ہوں سمیرا! کچھ ہوش کر نکمی لڑکی۔"

دادی کی صور اسرافیل کو مات دیتی آواز اس کے کانوں کے پردے چیرتی دوسرے کان سے نکل کر ہوا کے سفر پر نکل چکی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر جاگی تھی۔ سرما کی بدن کو تھپکیاں دیتی دھوپ میں بیٹھی جانے کیسے وہ نیند کا کمبل اوڑھے خواب کے طلسم کدے میں پہنچ چکی تھی؟

دادی' جو کب سے ساتھ والی چارپائی پہ بیٹھی اسے آوازیں دے رہی تھیں' نے اس کی خوابوں کی کشتی کو پانی میں ڈبو دیا تھا۔ اسے بڑا افسوس ہوا۔ ابھی تو خواب کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ابھی تو اپنے من کے راجہ کا چہرہ بھی صحیح سے دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا کہ دادی نے بیچ میں کود کر سارا مزا کرکرا کر دیا اور اس نے یہ سب سوچتے ہوئے منہ بھی ایسا ہی بنایا تھا جیسے واقعی کوئی بد مزا چیز کا ذائقہ زبان نے چکھ لیا ہو۔ دادی کو سنائی کم دیتا تھا دکھائی نہیں۔ بڑے غور سے اس کے تاثرات نوٹ کیے اور پھر ان کا ہوا میں اٹھا ہاتھ دھپ سے اس کی کمر پر پڑا تھا۔

"امی ی ی ی۔" بلبلی احتجاج نما چیخ۔

"بکواس بند کر اور ماں کی بات سن۔ کب سے تجھے آوازیں دے رہی ہیں۔ تیرا کوئی حال ہے مزے سے خراٹے لے رہی ہے۔ نہ وقت کا اندازہ نہ جگہ کا ہوش۔" امی کون سا کوس دور تھیں۔ وہیں صحن میں مشرقی طرف بنے کچے چولہے پہ دیسی گھی کے پراٹھے بنا رہی تھیں۔

"لاڈلا جو آنے والا تھا۔" اس نے ناک بھوں چڑھائی اور دادی نے اپنی چپل کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

"کیا ہے؟" وہ روہانسی ہوئی تھی۔

"ایک تو سب میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔" کہیں سے کھینچ کھانچ ایک چنا منا سا آنسو بھی لے ہی آئی آنکھ میں۔ جسے دونوں ہستیوں نے مختلف تاثرات سے دیکھا امی نے "دمگروں لتھ" والے انداز میں سر جھٹکا اور دادی۔ (جو کہ اس کی ازلی دشمن تھیں۔ اس کے خیال میں) نے اپنی بڑی آنکھوں کو مزید بڑا کر کے۔

"آہو! تیرے پیچھے ساری بلائیں پڑی رہتی ہیں۔ وڈی نجام دین (نظام الدین اولیاء) کی پوتی" دادی چمک کر بولی تھیں۔

"تو اور کیا! آپ کسی بلا سے کم ہیں؟" وہ بڑبڑائی تھی۔

"کیا منہ میں جنتر منتر پڑھ رہی ہے؟" دادی کو اس کے ہلتے لب بخوبی نظر آئے تھے۔ سنائی نہیں دیا' اس لیے فوراً اس نے اپنے کانوں میں ٹھونسا آلہ سماعت مزید کان میں گھسایا۔

"کم بخت یہ پرزہ بھی اس لڑکی کی طرح نکما ہے۔ مجال ہے جو کام کی بات سن جائے۔ کہتی ہوں دستگیر سے مجھے نیا پرزہ منگوا دے شہر سے۔" دادی آلہ سماعت کانوں میں مختلف زاویوں سے گھماتیں مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"سمیرا! جاؤ دادی کے لیے ان کا پیالہ لے کر آؤ۔" امی نے آخری پراٹھا بڑی سے چنگیر میں اتارا تو اس کے منہ میں پانی آگیا کیا خستہ' کرارا بھورا سا تھا۔

امی نے اسے یونہی کھڑے دیکھ کر سر موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی نظروں کا حریص پن ان کی نظر میں کنکر کی طرح چبھا تھا۔

"خبردار! دستگیر کے کھانے پر نظر لگائی تو" نگاہوں کی وارننگ کو ناکافی گردانتے ہوئے زبان سے بھی ارشاد کر دیا گیا۔ اس نے پاؤں پٹخے۔ صبح فجر کی نماز کے

بعد وہ ڈٹ کر ناشتا اور پھر مالٹوں کی پوری ٹرے اکیلے ہڑپ کر چکی تھی اب تو دوپہر تک کچھ بھی چکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ امی اور دادی نہ کبھی بے وقت خود کھاتی تھیں اور نہ ہی اسے چرنے دیتی تھیں۔ وہ خوب خوب خار کھاتی تھی ان کے اس بے تکے فلسفہ خوراک سے۔

"رہتے پنڈ میں ہیں اور کھانے پینے کے اصول شہر والوں جیسے۔" باآواز بلند امی تک اپنے خیالات پہنچائے اور باورچی خانے کی طرف جاتی سمیرا کی پشت تک امی کا چمٹا پہنچ گیا تھا۔

"آوچ" اس نے بے اختیار کمر مسلی تھی۔

"ظالم ماں" مڑ کر امی کو شکوہ کناں نظروں سے مخاطب کیا۔ امی نے پاس پڑی لکڑی اٹھائی تھی۔ وہ جھپاک سے باورچی خانے میں گھس گئی۔

شام کے سائے گہرے ہوتے ہی دادی کو اپنی درجن بھر چہیتی مرغیوں کی فکر ستانے لگتی۔ جب تک آخری مرغی بخیر و عافیت سے اپنے "کھڈے" یعنی ڈربے میں نہ پہنچ جاتی دادی کے پیروں کا چکر اور زبان' جہاز کی سی رفتار سے چلتی رہتی اور وہ جلتی کڑھتی یہاں سے وہاں دوڑا کرتی۔ اب بھی سب "سوکنوں" (وہ انہیں سوکنیں ہی کہتی تھی کہ دادی کی جان تو ہر وقت مرغیوں میں اٹکی رہتی تھی اور ان کے پیچھے وہ اس کی جان ناتواں ہلکان کیے رکھتیں) کو ڈربے میں دھکیل وہ اپنا اکھڑا سانس درست کرتی صحن میں بنی سیڑھیوں پر دھپ سے آبیٹھی۔

"اف! کتنی ٹھنڈی ہیں؟" اسے بیٹھتے ہی جھرجھری سی آئی تھی اور اپنی بے بسی پہ رونا بھی۔

"سب کتنے مزے سے اندر انگیٹھی کے سہانے بیٹھے ہیں اور مجھ غریب کو۔۔۔" گھر کے بڑے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے اس کی پلکیں بھیگ سی گئیں۔ وہ ہمیشہ خود کو اپنی ہی عینک سے دیکھتی تھی۔ اکلوتی تھی۔ شادی کے آٹھ سال بعد پیدا ہونے والی واحد اولاد۔ خود کو نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی لاڈلی سمجھنے میں حق بجانب تھی۔ لیکن اماں اور دادی ذرا اور ہی مزاج کی واقع ہوئی تھیں۔ ویسے تو دادی کو امی بھی کچھ خاص پسند نہ تھیں۔ (محض اس کا خیال) لیکن اس سے تو اینٹ کتے کے بیر والی بات تھی (یہ بھی اس کا خیال ہی تھا) سارا دن اور رات کا کچھ حصہ جب تک وہ سو نہ جاتی اس کی گوشمالی جاری رہتی۔ اس کی سستی اور کام چوری پہ تو دونوں ساس بہو ایکا کر کے لٹھ بھی نہیں بلکہ ہنٹر لے کر اس کی خوب شامت بلاتیں۔ لیکن ایک بات میں اسے بھی ملکہ حاصل تھا کمال کی ڈھیٹ۔ خود پہ' خود ساختہ مظلومیت کی چھاپ لگائے گھنٹوں منہ پھلائے گھوما کرتی لیکن جہاں کوئی کام کرنے کی بات آتی اس کے ہونٹ لٹک کر ٹوٹنے کے قریب پہنچ جاتے۔ ہاتھ اور پاؤں کی تال میل سلوموشن سے بھی سلو ہو جاتی اور پھر جو اس کے ساتھ ہوتا وہ کم تھا۔

"ہائے کاش کہ ابو ہی زندہ ہوتے۔ کوئی تو میرے بھی آنسو پونچھتا۔" اس نے سسکاری لیتے ہوئے سوچا تھا۔ ابو تو اس کے بچپن میں ہی زمینوں پر کسی زہریلے سانپ کے ڈسنے سے چل بسے تھے ان کا کوئی خاکہ' کوئی یاد تک ذہن میں نہیں تھی لیکن باپ کا لفظ ہی بڑا جان افزا ہوتا ہے اور یہ صرف یتیم ہی سمجھ سکتے ہیں۔

"ہائے! لوگ (امی اور دادی) یتیموں پہ کیسا کیسا ظلم کرتے ہیں۔ کاش ابو کی جگہ یہ دادی۔۔۔" آگے کچھ بھی سوچنے کی ہمت نہ ہوئی کہ لاکھ دادی سے اختلاف سہی ان کی تھوڑی سی محبت بہر حال دل میں کہیں موجود تھی۔ ٹھنڈی سیڑھیوں پہ بیٹھی یہ سب سوچتے ہوئے زار زار آنسو بہاتی سمیرا اشرف کو بیرونی دروازے سے اندر آتے دستگیر نے پہلے تو اچنبھے اور پھر گہری آہ خارج کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اسلام علیکم!" گلا کھنکار کر سلام کیا تو اس نے سرخ ناک اپنی شال کے پلو سے رگڑ کر مزید سرخ کی اور اسے گھور کر دیکھا۔

سلام کا جواب ندارد۔ اس نے ایک اور گہری سانس بھری۔ "جانے یہ کب بڑی ہوگی۔" اس کے

لمبے دبلے وجود کو نگاہوں میں بھر کر افسوس کیا۔
"اب کیا ہو گیا؟" وہ ایک قدم چل کر اس کے پاس فاصلہ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ جس پہ اسے مزید غصہ آیا۔
"ڈھکن ہے پورا مولوی دستگیر عارف۔" اندر ہی اندر خود کلامی کی۔ لوگ تو منگیتروں سے ملنے اور تھوڑا قریب ہونے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور ایک یہ پڑھا لکھا ملا ہے۔ کبھی بھی احساس نہیں ہونے دیتا کہ میں شرم وحیا سے دہری ہوتی کیسی لگوں گی۔ اپنی انگلی پکڑانا تک گناہ سمجھتا ہے پتھر" خود میں سوچتی سمیرا کی طویل خاموشی سے وہ اکتا سا گیا۔
"رو کیوں رہی ہو؟ دادی یا خالہ نے کچھ کہا ہے۔" ایک بار پھر سے نرم لہجے میں اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔
"یہ دونوں خواتین کب کچھ نہیں کہیں۔ مجھے تو شاید کسی میلے سے پکڑ کر لائی تھیں۔ دوسروں کی اولادوں کو سر پر اٹھائے پھرتی ہیں۔" بھرائی آواز میں بھڑاس نکالی۔
"دوسروں کی اولاد۔" کا اشارہ وہ بخوبی سمجھ گیا تھا۔ لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ دوڑی۔ اپنی مرحوم خالہ کے اس بیٹے سے وہ باوجود اپنا منگیتر ہونے کے کئی باتوں سے چڑتی تھی۔ ان میں ایک امی اور دادی کا جھکاؤ اور التفات بھی تھا اس کی طرف۔ یہ برابر میں ہی اس کا گھر تھا جہاں وہ اپنے والد سمیت رہائش پذیر تھا۔ خالہ کی وفات 'کینسر جیسے موذی مرض سے بھری جوانی میں ہی ہو گئی تھی' تب سے خالو دوسری ماں کے عفریت سے خوف زدہ اپنے کمسن بیٹے کو لے کر اپنی خالہ (دادی) کے ساتھ والے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔ کھانا' پرونا غرض کے ان باپ بیٹوں کو گھر میں عورت نہ ہونے کا کبھی دادی اور امی نے احساس تک نہ ہونے دیا۔ خالو کی اپنی چلتی ہٹی تھی ایک خاموش معاہدے کے تحت خالو اور دستگیر نے ان تین جانوں کے اپنے جان پر سارے قرض اٹھائے ہوئے تھے یوں دونوں گھروں کی سانجھ 'سمجھ سے سب بڑا رواں دواں تھا۔
"اچھا چلو اندر تو آؤ۔ یہاں ٹھنڈ میں بیمار نہ پڑ جانا کہیں۔" اپنے ہی غم میں ڈوبی سمیرا نے غور ہی نہ کیا کہ اس کی آنکھوں سے 'اس کے لیے کیسی عزت بھری گرمی جھلک رہی تھی۔
"ہونہہ! آئے بڑے عبدالستار ایدھی۔" وہ منہ کو ربڑ کی طرح کھینچتی وہاں سے اٹھی تھی اور دھپ دھپ کرتی بڑے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے کھڑے دستگیر نے ایک اور گہری سانس خارج کی تھی۔
"یہ کب سدھرے گی۔" اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا سوائے وقت کے۔

☼ ☼ ☼

پچھم کی طرف سے آنے والی آندھی بڑی زوردار تھی۔ امی اور دادی' اسے صحن میں ادھر سے ادھر بھگا رہی تھیں۔
"چولہا تسلے سے ڈھانپ دے پہلے۔ نہیں تو اگر بارش آگئی صبح گارے کی طرح پڑا ہو گا۔" امی کی آواز۔
"میری جائے نماز سوکھنے کے واسطے ڈالی تھی وہ اتار پہلے۔" دادی کا حکم۔
"اور مرغیوں کا ڈربا اچھی طرح سے ڈھانپ۔ کہیں بارش اندر جانے سے بیمار ہی نہ ہو جائیں۔" پھر دادی کا حکم۔
وہ بوکھلائی پھر رہی تھی جب دستگیر بھینسوں کا چارہ اٹھائے گھر میں داخل ہوا۔ اس کا سر منہ' کپڑے اس گرد و غبار والی آندھی سے اڑنے والی مٹی سے بھر چکے تھے۔
"بھوت" صحن میں پڑی چیزیں اٹھاتی سمیرا نے شرارت سے باآواز بلند کہا وہ تو ہنستے ہوئے چارہ صحن میں بنی پرچھتی کے نیچے رکھنے لگا اور صحن کے دوسری طرف احکامات صادر فرماتی خواتین کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔
"نہ بھوت کون ہے' تو خود کسی چڑیل سے کم ہے کیا؟" یہ آواز سوائے دادی کے اور کس کی ہو سکتی تھی۔
"چھوڑیں دادی! مذاق کر رہی ہے۔ آپ برا نہ

منائیں۔" اپنے بال اور کپڑے جھٹکتا دستگیر ان کے پاس چلا آیا جو ایک ہاتھ کمر پر جمائے اسے کھڑی گھور رہی تھیں۔

"جا' پانی کی موٹر چلا۔ دستگیر گرم پانی سے منہ ہاتھ دھولے۔ انگیٹھی پہ چائے بنا رہی ہوں۔ ساتھ انڈا ابال دیتی ہوں۔" امی نے اسے اور دستگیر کو بیک وقت مخاطب کیا۔

"صدقے واری جائیں اس کسان کے۔" بڑبڑاہٹ اس نے قصداً" بلند رکھی تھی تاکہ وہ صحن میں ہی کھڑا تھا سن لے اور اس نے سن بھی لیا۔ اس کے لب یک دم بھینچے تھے۔ ایک یہی طعنہ اس پیشے سے متعلق اسے کھلتا تھا ورنہ تو وہ اس کا بچپنا سمجھ کر ہر بات نظرانداز کر دیتا تھا۔

"ایک بات میری آج سمجھ لو کہ اگر یہ کسان اپنا پسینہ خون کی طرح بہا کر تمہاری زیست کا ساماں نہ کرتا تو تم آج یوں اپنے پورے قد کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑی ہونے کے قابل نہ ہوتیں۔ تمہارے لیے میں نہ اپنا پیشہ بدلوں گا نہ خود کو۔ بہتر ہے تم اپنا منگیتر بدل لو یا اپنے خیالات۔ فیصلہ تمہارا ہے۔" بڑی سنجیدگی سے چہرے کے تنے عضلات لیے اسے کہتا وہ حیران پریشان کھڑی امی کی طرف مڑا تھا۔ جبکہ وہ پتھر بن چکی تھی۔

"خالہ جی! چائے کو رہنے دیں میری آج رات دعوت ہے اپنے دوست کے ہاں میں اب وہیں جا رہا ہوں۔" امی سے بڑی خوش اسلوبی سے معذرت کرتا وہ خدا حافظ کہتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ امی اور دادی اسے روکتی ہی رہ گئیں۔

اور وہ چلتی آندھی میں کھڑی چہرے کی زبان کو کوسنے لگی کہ پتا تھا اب وہ بھرپور اجنبی بن جائے گا' پہلے بھی وہ کون سا اس کے آگے پیچھے گھومتا تھا لیکن اس کا من چاہا تھا۔ اپنے سب عیوب (اس کی نظر میں) سمیت۔

☼ ☼ ☼

اس کا مزاج کچھ عجیب سا تھا۔ دیکھنے میں وہ جتنی اچھی تھی۔ اخلاق اور کام چوری میں اپنی مثال آپ تھی اسی وجہ سے امی اور دادی کی نظر میں نہ سمائی۔ بارہ جماعتیں گاؤں کے واحد سیکنڈری اسکول سے پاس کروانے کے بعد آگے شہر جا کر پڑھنے کی ضد کا جواب۔

"گھر بیٹھ کر بی۔ اے کی تیاری کرو۔ دستگیر امتحان دلوانے کے لیے تم وہیں لے جایا کرے گا شہر۔ پورا ہو جائے گا یہ شوق بھی تمہارا۔" امی کی بے رخی سے زیادہ ان کی بات میں رچی بے اعتباری کی بو نے اس کا دماغ متعفن کر دیا تھا۔ کتنا ارمان تھا اسے شہر جا کر پڑھنے کا' رہنے کا۔

"تو میں نے کون سا شہر جا کر کسی کے ساتھ بھاگ جانا ہے' جو آپ کو اتنی فکر لاحق ہو رہی ہے۔" وہ چیخی تھی۔

"ہر وقت تو یہ نہ بیٹھی رہا کر۔ بات کو سن کر سمجھا کر پھر جواب دیا کر۔ ہر بات کا فوری جواب فرض نہیں ہے تجھ پر۔" امی کو اس کا یہ باغیانہ لہجہ بڑا کھلتا تھا سو انگلی اٹھا کر وارن کیا وہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ کچھ زیادہ ہی اپنے آپے سے باہر ہوتی جا رہی تھی اس لیے اسے بروقت روک لینا چاہتی تھیں قبل اس کے کہ وقت کا چابک اس کی کمر پر بے رحمی سے پڑتا۔

☼ ☼ ☼

اس گاؤں سے تو اسے نفرت کی حد تک چڑ تھی' لیکن باقی سب اس کی راگنی' کسی بے سرے گلوکار کا بے سرا گیت قرار دے کر رد کر دیتے تھے۔ پھر وہ دستگیر کے سر ہو جاتی کہ شہر جا کر کوئی کالج کی جاب ڈھونڈ لے۔ ایم۔ اے ایگریکلچر تھا۔ وہ بھی گولڈ میڈلسٹ کہیں بھی با آسانی ایڈجسٹ ہو جاتا بلکہ وہ تو اسے شہر چھوڑ با ہر جاب اپلائی کرنے پہ بھی اکساتی رہتی تھی۔ لیکن اس معاملے میں وہ بالکل اکھڑ جٹ تھا۔ بس ایک "نہیں"۔

"کیوں نہیں۔" وہ چیخ پڑتی۔

"وہ اس لیے کہ میں نے یہ ڈگری لی ہی اسی لیے

تھی تاکہ زمین کو جان سکوں۔ اس کے سینے سے کب کیا اور کتنا نکلوانا ہے۔" اس نے رسان سے سمجھایا۔

"وفنی! کیا منطق ہے۔ زمین نہ ہوئی بیوی ہو گئی جس کی نفسیات سمجھنا ضروری ہے۔" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"تم نہیں سمجھو گی۔" اس نے اس چکنے گھڑے کی عقل پہ افسوس کیا۔

"تو پھر ایم۔ اے کی ڈگری کیا طاق میں سجانے کے لیے لی تھی۔ جب یہی دہقان گری ہی کرنی تھی؟" پھر سے وہی سوال بدلحاظی کبھی کبھی ناقابل برداشت بن جاتی ہے لیکن وہ یہ کڑوی گولی جیسی بات بھی نگل گیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں سارا سارا دن جو اچھے اور خالص بیج کی تلاش میں مارا مارا یہاں سے وہاں پھرتا ہوں اور زمین پہ تن تنہا کام میں لگا رہتا ہوں وہ کس لیے ہے؟" اس نے سینے پر ہاتھ لپیٹتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ اتنا دماغ کہاں تھا اس کا جو گہرائی میں جاتی۔

"دماغ کا خلل ہے اور کیا۔ زمینوں پہ رکھیں مزاروں کو اور خود کوئی جاب ڈھونڈ لیں تاکہ ہمارا بھی معاشرے میں کوئی اسٹینس ہو۔" کندھے اچکاتے ہوئے بے تکے پن سے بے تکا جواب دیا۔

"تم لوگ جو روز کیمیائی اجزا سے پاک خوراک کھاتے ہو وہ اسی تعلیم کی بدولت ہے۔ جس سے مجھے شعور ملا۔ لاکھوں لوگ جو اندھا دھند اپنے پیٹ میں خوراک کے نام پہ انڈیل رہے ہیں اور مختلف بیماریوں کا گڑھ بن چکے ہیں۔ اس سے کم از کم خود کو اور اپنے پیاروں کو بچالوں۔" پتا نہیں اتنا تحمل وہ کہاں سے لے آتا تھا اس سے بات کرتے ہوئے، ورنہ جتنی بدتمیز وہ تھی امی اور دادی تو جوتا ساتھ میں اٹھا کر اسے شرف گفتگو بخشا کرتی تھیں۔

"لو یہ بھلا کیا بات (چول کہنے سے بمشکل زبان کو روکا تھا) ہوئی اب کھانے میں کون سا کیمیائی اجزا پیدا ہونے لگ گئے۔ صدیوں سے لوگ یہی کچھ کھاتے آرہے ہیں۔ آپ بھی وہی چیزیں اگا رہے ہیں۔ میں نے تو کبھی گھر میں آپ کی زمین اگا کوئی من و سلویٰ نہیں آتے دیکھا۔" اپنے ذہن کے مطابق فوراً حماقت سے بھرپور جواب اس کی طرف سے آیا تھا۔

"دیکھو! بات سمجھنے کی ہے۔ میں نے ڈگری پڑھ کرلی۔ سمجھ مجھے زمین کا سینہ چیرتے ہوئے آئی کہ اس کا بھی ہم پر فرض ہے کہ خالص بیج اس کے سینے میں بوئے جائیں ورنہ فصل تو زمین اب بھی دیتی ہے۔ لیکن ناراض ہے ہم سے۔ فرٹیلائزرز کے نام پر زمین کی کوکھ اجاڑ دی ہم نے۔" سونے میں تولنے لائق بات کی تھی اس نے ایک پتھر سے، سوائے خاک سمجھ آتی اب بھی ناک چڑھائی۔

"پتا نہیں کیا فلسفہ بولتے رہتے ہو سارا دن۔" کہتی اکندھے اچکا کر رہ گئی۔ اور وہ اسے دیکھ کر۔

☼ ☼ ☼

"ہائے لکی! تو کیسے آج ادھر آنکلی بے مروت لڑکی۔" خوشی سے بھرپور چہکتی آواز میں وہ اپنی بچپن کی دوست فریدہ عرف لکی سے لپٹی کھڑی تھی۔

"ہاں بس اب ذرا شوگس سے فرصت ملی تو سوچا میکے کا ایک چکر لگا آؤں۔" نازک مزاجی سے بولتی لکی کے اوپری ہونٹ کا کونا سوکھے گال میں مدغم سا ہو گیا۔

"بیٹھ نا۔" بے قابو خوشی سنبھالتے اسے اپنے ساتھ دھپ سے چارپائی پہ گرانے والے انداز میں لے کر بیٹھ گئی۔ قریب بیٹھی دل جمعی سے چھلی مونگ پھلیاں پھانکتی دادی نے ہنکارا بھرا۔ انہیں اس کی یہ دوست ایک آنکھ پسند نہیں تھی۔ اسے وہ دیدہ ہوائی کہتی تھیں۔

سمیرا نے گھور کر دادی کو دیکھا کہ "نا کریں" پر دادی نے ناک سے مکھی اڑائی وہ سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لمبی سی لیمن کلر کی فراک پہنے اونچا جوڑا کیے اور شانوں پہ براؤن کیپ۔ وہ شدید متاثر ہو چکی تھی۔

"کتنی بدل گئی ہے نا تو شہر جا کر۔" بڑی حسرت تھی اس لہجے میں۔ دادی نے بخوبی اسے پٹڑی سے اترتے وقت نوٹس کیا اور کمر کس کر میدان میں اتر آئیں۔

"ہاں بی بی! کتنا بدل گئی ہے! کوا جب راج ہنس کی چال چلتا ہے نا تو بڑا اوپرا سا لگتا ہے۔ یہ کہہ کہ بڑی اوپری لگ رہی ہے بلکہ ہو چھی۔ (اوچھی)" یہ کھلا وار تھا دادی کا' مزے سے مونگ پھلی کے دانے چباتے ہوئے۔ لکی کے چہرے کے تاثرات ان لکی بندے جیسے ہو گئے۔

"دادی آپ مونگ پھلی کھائیں۔" قبل اس کے کہ لکی کچھ کہتی اس نے بات کو سنبھالا۔

"چھوڑو پرے بزرگ ہیں۔ اس عمر میں آکر کہاں دماغ قابو میں رہتا ہے۔" اپنے تئیں اس نے دانت نکوستے ہوئے سرگوشی کی تھی وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن یہ بھول گئی تھی کہ دادی کا آلہ سماعت جو کہ حال ہی میں دستگیر نے کسی آن لائن اسٹور سے پاکستان امپورٹ کروایا تھا۔ ہر قسم کی صوتی لہریں قابو کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا' سواب دادی سب سنتیں پوتی کی ہرزہ سرائی۔

"شاباش! اور نام روشن کر اپنے مرے ہوئے باپ کا' دادی ہوں تیری۔ تیرے باپ کی ماں۔ سمجھیں اور جو بھی کہتی ہوں تیرا اس میں بھلا ہی ہے نصقان (نقصان) نہیں۔ اور دماغ میرا خراب نہیں۔ تیری نیت اور کردار میں کھوٹ ہے جوایسوں کے پیچھے اپنی دادی کو ذلیل کر رہی ہے۔" دادی تو اچھی خاصی جذباتی ہو گئی تھیں۔ وہ گھبرا گئی اگر امی جو صحن میں کسی کے لیے چائے کا سامان کر رہی تھیں سن لیں تو میں اس کا سر گنجا ہو جانا تھا۔

"اچھا سوری دادی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" لکی کو بھول کر وہ دادی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ کون سا پہلی بار آئی تھی اس کے گھر بچپن کا ساتھ تھا' ہمسائیگی تھی۔ سو دادی کی خوب مزاج آشنا تھی اس لیے زیادہ اہمیت نہیں دے رہی تھی۔

"چل چھوڑ نا! دادی کی بات کا کیا برا ماننا۔ تو مجھ سے بات کر۔ مجھے ایک دو اور گھروں میں بھی جانا ہے۔" دادی کے کندھے دباتی سمیرا کو اس نے تھوڑا اکتا کر مخاطب کیا۔ یہاں تو شو مارنے آئی تھی اپنے سی کلاس ڈراموں اور ماڈلنگ کی۔ الٹا دادی نے اس کی شو کا ناس مار دیا تھا۔

"ہاں یار سوری! اچھا تو بتا کیا چل رہا ہے آج کل؟" وہ لپک کر اس کے ساتھ آبیٹھی۔ دادی اس کی تو تا چشمی خوب ملاحظہ فرما رہی تھیں۔

"ارے کیا بتاؤں! کتنی مصروفیت ہے ایک کے بعد ایک پراجیکٹ ویسے ایک بڑا فلم کا ڈائریکٹر میرے پیچھے پڑا ہے فلم کے لیے۔ دیکھو اب.... اسکرپٹ پڑھ کر اور سوچ کر ہی جواب دوں گی۔" اس کا پسندیدہ سوال وہ غلطی سے پوچھ بیٹھی تھی اور لکی صاحبہ لمبی لمبی چھوڑ رہی تھیں اس کی چھوڑی گئی لمبی باتوں کا خیالی گولا ایک ہاتھ سے بناتی دادی کی زبان پر پھر کھجلی ہوئی تھی۔

"اے بی بی! دیکھ لینا تھا کہیں کوئی بھوت کا بچہ نہ ہو کیونکہ انسان کا بچہ کسی چڑیل کے پیچھے پڑنے کی حماقت تو ہرگز نہیں کر سکتا۔" دادی جنگ کا میدان سجانے پہ جانے کیوں تلی ہوئی تھیں۔

"دادی آپ پلیز تھوڑی دیر کے لیے چپ کر جائیں۔" سمیرا عاجز آئی تھی۔ دادی بالکل بچوں کی طرح سے ان کی گفتگو میں لقمے دے رہی تھیں۔

"اچھا تو پھر دیر کس لیے کر رہی ہو اتنا گولڈن چانس ہے۔" لکی کے منہ کے زاویے بگڑ چکے تھے دادی کی باتوں سے۔

"بتایا تو ہے کہ سوچ کر ہی کروں گی۔ آخر کریڈیبلٹی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" بڑی فنکار تھی۔ اپنے اہمیت جتانے کو ڈینگیں مارتی لکی کی بات کو پھر سے دادی نے اچک لیا تھا۔

"اے بی بی! کیا شرم کا چولا بالکل ہی اتار پھینکا ہے؟ جدھر وہ تمہارا نکھٹو میاں ہنکاتا ہے تم بکری کی طرح وہیں منہ اٹھا کر چل دیتی ہو۔ خوب نام ڈبو رہی ہو اپنے پچھلوں کا اگلوں کو خوش کرنے کے لیے۔" وہ آگ لگا چکی تھیں اور لگ بھی گئی تھی۔ وہ تنتناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جا رہی ہوں میں اور دادی آپ کوئی آئے گئے کی تمیز سیکھ لیں تو زیادہ اچھا ہو گا۔ گھر آئے مہمان کی

عزت کرنا آپ پر فرض ہے۔"

"چل منحوس میراثن! مہمان... تو کہاں سے مہمان ہوگئی۔ شیطان کی چرخی۔ میری معصوم پوتی کا دماغ تو ہی خراب کرکے گئی ہے۔ جانے کیا کیا پھونکیں مارتی رہتی ہے اس کے کانوں میں۔" دادی کو کوئی نہیں ہرا سکتا تھا۔ اور اب تو حد ہی ہوگئی تھی۔ وہ انہیں روکتی ہی رہ گئی اور دادی نے بڑی اچھی طرح لکی کے آنے کا ہر راستہ بند کردیا تھا کوئی اتنی بے عزتی سہتا ہے؟

"ہونہہ! معصوم" جانے کو مڑتی لکی نے طنزیہ ہنکارا سا بھرا تھا اور ہاتھ نچا کر بولی تو جیسے کفن پھاڑا۔

"آپ کی معصوم پوتی اگر اتنی ہی معصوم ہے تو مجھے روز فون کرکرکے کیوں اپنے قیدی ہونے کے دکھڑے روتی ہے؟ گھر سے بھاگ جانے کو تیار ہے آپ کی یہ معصوم... پوچھیں ذرا اس سے کیسے ہیروؤں سے ملنے بلکہ بات چیت کے لیے میری منتیں کرتی ہے کہ کسی سے اس کی سیٹنگ ہوجائے تو جان چھوٹے اس کسان کی اولاد سے۔"

لکی کے دل میں اس کے لیے کتنا خلوص اور سچائی تھی یہ کھل کر سامنے آگیا تھا وہ سن کھڑی اپنی سب سے مخلص دوست کا بدلا ہوا روپ دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنے کے قابل ہی کہاں رہی تھی کیسے دادی کے سامنے اس نے اس کی بھرم اور رازداری کی چادر اتاری تھی۔ وہ حقیقتاً" صدمے میں تھی۔ اپنے بیک گراؤنڈ میں اس کے دفاع کے لیے لڑتی دادی کی کوئی بھی بات اس کے پلے نہیں پڑرہی تھی۔ وہ ٹوٹی تھی، لکی نے اعتماد کا کانچ کیسے زوردار پتھر مار کر توڑا تھا۔

وہ بڑی خیال پرست لڑکی تھی۔ خواب سجانے اور پہننے اوڑھنے والی۔ اسے اپنا گاؤں کبھی اتنا برا نہیں لگا تھا، لیکن جب سے اس کی گہری سہیلی فریدہ کی منگنی لاہور میں رہنے والے کسی بابو ٹائپ بندے سے ہوئی تھی اس کی ہوا اکھڑنے لگی تھی۔ ہروقت عظمت (منگیتر) کی عظمت کے گن گاگا کر اور شہری زندگی کا بالکل فلمی سا خاکہ کھینچ کر اس نے اس کچے ذہن کی ناشکری سی لڑکی کے ساتھ انجانے میں بڑی زیادتی کی تھی۔

شہر میں رہنا بسنا اس کا خواب بن گیا تھا اس کی باتیں سن سن کر اس کا جی چاہتا کہیں سے جادوئی چھڑی اس کے ہاتھ لگ جائے یا اس کے پر لگ جائیں کہ وہ اڑ کر شہر پہنچ جائے۔ گھر والوں کو بھی آہستہ آہستہ اس کی اس بے تکی خواہش کا ادراک ہوچکا تھا، لیکن بے وقوفی سمجھ کر کبھی پیار سے نصیحت سے یا اب جوتے سے اس کا منہ بند کردیا جاتا۔ اس کا منہ تو بند ہوجاتا، لیکن دل میں حسرتوں کے جہان کا دروازہ کھل جاتا وہ سب سے کٹی جلی بھنی رہتی، شہر میں جاکر پڑھنے کی ضد میں آکر اس نے دستگیر کی اس کے لیے لائی گئی بی اے کی بکس کو اٹھا کر بکسے میں پھینک دی تھیں۔ دستگیر جو اس کی سگی خالہ کا بیٹا اور اس کا منگیتر... چاہت کا پہلا پیامبر، عمر میں آٹھ سال بڑا، لیکن عقل میں وہ اس سے صدیوں کی مسافت پہ تھی، پھر بھی وہ اس کا من چاہا تھا، من کی مراد... سنجیدہ، باوقار، محنتی، لیکن اسے اس کی انہی خوبیوں سے چڑسی ہوگئی تھی۔ نئے لڑکوں والی کوئی شوخی، کوئی تھرل نہ اس کی ذات میں تھا اور نہ ہی زندگی میں۔ چہرے پہ سجی داڑھی اور زبان سے اچھائی، برائی کے جاری لیکچر اس کا دماغ گھمادیتے۔

"کیا ہے بھئی! اب اس دور میں ایسی داڑھی کون رکھتا ہے؟" وہ جھنجلاتی۔

"اگر رکھنی ہی تھی تو حمزہ عباس یا احسن خان جیسی رکھ لیتا... یہ کیا ستر سال کے بابے کی طرح شرعی داڑھی چہرے پہ لیے گھومتا رہتا ہے، بندہ کسی سے تعارف بھی نہ کرواسکے منگیتر کہہ کر الٹا انکل لگتا ہے میرا۔" اپنی رازداں دوست کے آگے رونے روئے جاتے وہ جلتی پہ تیل چھڑکتی اپنے ماڈرن منگیتر جو کہ شوہر بن چکا تھا کی شاندار پرسنالٹی کے طومار باندھتی اور وہ اس کی باتوں کی گرہ میں بندھ جاتی۔

اور جب سے لکی کے شوہر نے اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے اسے شوبز کی دنیا میں متعارف کروایا تھا اس کا بس نہ چلتا کہ لکی کے سنگ اس شہرت

کی پگڈنڈی پہ چھلانگیں لگاتی پھرے۔۔۔ اب اندر کی یہ کہانی کہ للی کا شوہر پرلے سے بھی پرلے درجے کا مفت خورا اور کاہل تھا۔ بیوی کو سستی شہرت کے نشے پہ لگا کر خود فکر معاش سے آزاد گھومتا تھا اور وہ بھی کون سا کوئی اے کلاس ایکٹرس تھی سی کلاس ڈراموں میں اکا دکا سائڈ رول اور گھٹیا میگزینز کے ننگے کورز ہی اس کی پہچان تھے، لیکن سمیرا کو کسی کو پہچاننے کی پہچان ہی کہاں تھی؟ یہی تو امی اور دادی سارا دن پیٹتی تھیں کہ وہ بالکل نالائق اور آنکھوں والی اندھی بن چکی تھی۔ بس ایک دستگیر تھا جو اسے کبھی سخت سست نہ سناتا بلکہ اس کی ٹارگٹ لسٹ کا پہلا اور آخری ٹارگٹ ہی وہ تھا۔

اس کی اپنے لیے عزت سے بھرپور محبت کو، وہ اس کا ترس پنا اور اس کے اپنی زمینوں پہ ایک مزدور کی طرح کام کرنے کو وہ جاہل کسان سمجھتی تھی، لیکن اس سمجھ کا ہی تو سارا قصور تھا جو کچھ سمجھ کے نہ دیتی پر جب سے للی اسے آئینہ دکھا کر گئی تھی اسے سب ٹھیک دکھنے لگا تھا سوائے اپنے آپ کے عقل کا فیوز بلب خوب روشن ہو چکا تھا۔ جیسے للی نے اس کی ایک سہیلی کے سامنے نکالے جانے والی بھڑاس کو غلط رنگ دے کر اس کی بے عزتی کی تھی دادی کے سامنے۔

"انسان جیسے اپنی باپ دادا کے نام سے پہچانا جاتا ہے ویسے ہی اپنے دوستوں سے بھی۔ حدیث میں اچھے دوست کی مثال خوشبو بیچنے والے اور برے کی مثال کوئلے سے بتائی گئی ہے اب دیکھ لگا گئی نہ تیرے منہ کالک۔" اس کے جانے کے بعد وہ دل مسوس کر بیٹھی تھی جب دادی نے بڑے پیار سے اسے اپنے شانے سے لگاتے ہوئے سمجھایا تھا نہ کوئی طعنہ نہ لعن۔ اس کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔

"ایک اور بات میری ہمیشہ یاد رکھیں۔ خواہش کرنا، خواب دیکھنا کوئی جرم نہیں، لیکن بے تکی خواہشوں کے اونٹ سے یاری لگانا ایسے ہی ہے جیسے کوئی بونا اپنے گھر کا سائز دیکھے بغیر اونٹ کو اندر گھسا لے۔ اب اونٹ کو کیا پتا کہ بونے کے گھر میں داخل ہو کر وہ اسے توڑ دے گا، تباہ کر دے گا اس کا خیال تو بونے کو رکھنا چاہیے نا۔" دادی اس کے آنسو پونچھتی جا رہی تھیں اور للی کی لگائی گئی گرہیں ایک ایک کر کے کھولتی جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم!" وہ ابھی زمینوں سے لوٹا ہی تھا کہ اس کے گھر کے کھلے دروازے سے وہ بھی اندر آن گھسی۔ وہ بے ساختہ آواز پہ گھوما تھا۔ کتنے لمبے عرصے بعد وہ اس کے گھر آئی تھی اور سلام۔۔۔ وہ خوش گوار حیرت میں گھر گیا۔

"وعلیکم السلام!" بظاہر سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے صحن میں دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی اس کے احترام میں بچھائی اور اپنے کندھے پہ پڑا صافہ لے کر اسے اچھی طرح جھاڑا۔ وہ بے پناہ شرمندہ ہوئی۔ ایسا عزت کرنے والا ہیرا وہ کھو دیتی تو۔۔۔

"کوئی کام ہے کیا؟" اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ محتاط انداز سے اندر سے پانی پانی کر رہا تھا۔

"وہ خالو جی کدھر ہیں۔" اور تو کوئی بات نہ سوجھی۔

"وہ اپنی ہٹی پر۔" جانے بوجھے سوال کا جانا سا جواب، تحمل بھرا۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر دیکھتی اپنی شال خواہ مخواہ سر پر مزید آگے کو کھینچتی رہی۔

"گھر میں بتا کر آئی ہو یہاں آنے کا؟"

"جی، دادی سے پوچھ کر آئی ہوں۔"

"یہ کون ہے بھئی؟ اتنی تمیز" حیرت کا جھٹکا تھا یہ اس کے لیے۔

"کیا یہ کہنے آئی ہو کہ تمہیں کیونکہ میرا پیشہ، میری داڑھی، میرا لباس، شخصیت پسند نہیں تو اس لیے میں خود کو بدل لوں ورنہ تم منگیتر بدل لوگی۔" اس کی مسلسل چپ اسے بولنے پر اکسا رہی تھی۔ اس کی پچھلی کہی باتوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔

"بائی گاڈ نہیں۔" اس کی بات بچھو کے ڈنک کی طرح اسے چبھی تھی۔ شرمندگی کا دوسرا نام اگر موت ہوتا تو وہ اس وقت مر ہی گئی ہوتی اتنی شرمندہ تھی وہ۔۔۔

"تو پھر۔۔۔" متانت بھری شرارت اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی، لیکن اس کی تو آنکھیں بھر آئی تھیں اس نے دیکھا نہیں بس بولنے لگی اس سے پہلے کہ مزید دیر ہو جائے۔

"میں آپ سے اپنی ہر بدتمیزی، دل آزاری اور برے سلوک کی معافی مانگنے آئی ہوں۔ اور۔۔۔" تیزی سے بولتی آنسوؤں کا گولہ گلے میں پھنسا تھا۔

"اور۔۔۔" اس کی جانب سے سوال۔

"اور یہ کہ مجھے آپ اپنی داڑھی، لباس، پیشے سمیت دل و جان سے قبول ہیں۔" زبان نے سو سو بل کھاتے ہوئے کہہ ہی دیا۔ وہ ایک دم سے ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔

"واقعی۔۔۔" حیرانگی۔

"جی۔" پسپائی۔

"کیا دادی نے ڈانٹ کر تمہیں یہاں بھیجا ہے؟" وہ مزید تسلی کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں! میں اپنے خوابوں اور بے لگام خواہشوں کو لتاڑ کر خود آئی ہوں۔" مختصر جواب اس سے زیادہ جامعیت لیے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

"اطاعت گزار عورت ایک بار دل میں داخل ہو جائے تو پھر اسے گھر میں لانے کے لیے بھی جلدی کرنا پڑتی ہے۔ اب میں مزید دیر نہیں کروں گا۔" وہ خود کلامی کر رہا تھا یا اس سے مخاطب تھا دونوں صورتوں میں وہ مطلب سمجھ گئی تھی۔ اپنی بھیگی پلکوں کو تیزی سے جھپک کر پیچھے آنے والے آنسوؤں کا راستہ روکا۔ وہ مسکرایا تھا۔ بے ریا شفاف ہنسی۔

"شکریہ۔" مسکراتے لب مزید پھیلے تھے اس نے ایک بار پھر سے اسے مان دے کر سرخرو کر دیا تھا۔

لڑکیاں محبت محبت کا راگ الاپتی عزت جیسی انمول نعمت گنوا بیٹھتی ہیں، لیکن وہ کیسی نادان تھی جو اپنی محبت کو عزت کی چادر دینے والے کے ساتھ بار بار جھٹک دیتی تھی۔ ایسے ہاتھ کو تو ہمیشہ سر پر رہنا چاہیے اور اب اس ہاتھ کی چھایہ تلے ہی اس نے سستانا تھا عمر بھر۔

☆ ☆

ام ایمان قاضی
میرے بدگمان سے
ناولٹ

"اے مگی کب سے تجھے کہہ رہی ہوں جاکے اپنی تائی کو دوائی کھلادے مگر ان سنی کیے بیٹھی رہے گی کیا۔" جمیلہ چچی نے تیسری بار کانوں سے واک مین لگا کر سنتی اپنی بیٹی کو مخاطب کیا' جو منہ بنا کر ناگواری سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہے اماں... اب تائی کی بیماری تو ایسی ہے کہ ایسے مریض سالوں بستر پر پڑے رہتے ہیں اور پھر زندگی کی طرف آنے کی بجائے اوپر کو ہی چل دیتے ہیں' تو اب میں کیا ساری عمر تائی کو دوائیاں کھلاتی رہوں گی کیا اور ویسے بھی تمہیں تو پتا ہی ہے اماں مجھے بیمار بندوں کے پاس جاتے ہوئے کتنی خار آتی ہے۔"

"کم بخت تجھ سے مجھے یہی امید ہے نامراد' تیری ماں بھی بیمار پڑے تو تو پاس نہیں بھٹکتی نامراد' پر یہ دیکھ مرلے کہ تیرے تایا کی جان بند ہے تیری تائی میں۔ دو تین ٹائم اس کے پاس نظر آئے گی اسے' تب ہی تیرے بارے میں سوچے گا بہو بنانے کے بارے میں... دو ٹائم کی دوائی جاکے تایا کے سامنے کھلادے گی تو موت نہیں آجائے گی تجھے۔"

"تو نوکر کس مرض کی دوا ہیں آخر..." اب کے وہ طوعا" کرہا" اٹھ تو کھڑی ہوئی مگر پھر بھی حجت سے باز نہ آئی۔

"وہ بھی تجھ سے بڑھ کر ڈھیٹ ہیں۔ کل کی دوائی دینا بھول گئی زرینہ اور وہ تو اچانک چلی گئی' میں کسی کام سے تمہاری تائی کے کمرے میں۔ گندگی سے وہ خود اور سارا بستر بھرا پڑا تھا۔ کم بخت کو ہر ماہ کے اتنے پیسے دیتے ہیں بھائی صاحب' پھر بھی ڈنڈی مار جاتی ہے۔ الگ سے پیسے دے کر دو لڑکیوں کو بلوا کر ان کے کپڑے بدلوائے' بستر دھلوایا۔ آج تو زرینہ آئے اس کی خیر نہیں ہے۔ وہ تو شکر ہے بھائی صاحب کو نہیں پتا چلا' ورنہ غضب ہی ہو جاتا اور اب جا بھی چکو۔ تمہارے تایا گھر پر ہی ہیں۔ ان سے سمجھ لو جاکے کہ کیسے دوائی دینی ہے تائی کو اور ہاں ان کے ہوتے ہی ذرا بازو اور ٹانگ کی مالش بھی کر دینا اپنی تائی کے فالج والے حصوں کی' ڈاکٹر نے کہا ہے روزانہ تین دفعہ مالش کرنے کو۔ تم ابھی کر دو' جب تک تمہارے تایا ہیں جب تک زرینہ بھی آجائے گی۔"

وہ کمرے میں پھیلی مختلف چیزیں سمیٹتی نگی کو تایا جی کی بہو بننے کے وہ گر بتا رہی تھیں جن پر عمل کرکے تایا اور ان کے بیٹے کے دل میں اتر سکتی تھی' ورنہ وہ اپنی بیٹی کی عادات اور طور طریقے جانتی تھیں جسے نہ تو کبھی گھرداری میں دلچسپی رہی تھی' نہ بیماروں کی تیمارداری میں کوئی دلچسپی تھی۔ وہ نگی کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر اس کی لاپروائی پر بڑبڑاتی رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"مہوین تم ایسا کرو' میرے ساتھ گھر چلو' اب انکل کی طبیعت بہت بہتر ہے۔ ڈاکٹرز نے ان کو خطرے سے باہر قرار دیا ہے مگر اپنی تسلی کے لیے ایک رات کے لیے اسپتال رکھنا چاہ رہے ہیں۔ دو لوگوں کی اجازت نہیں ہے یہاں۔ پھر اگر تم یہاں رہیں' خالہ جان گھر پر پریشان ہوتی رہیں گی۔ انکل سے ملوا کے چلو' میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" وہ ڈاکٹر سے مل کر کوریڈور میں اس کے انتظار میں ٹہلتی مہوین کے پاس آیا تھا۔

"مگر سعد' ابو کو اس طرح اس حالت میں چھوڑ کر جانے کو میرا دل نہیں کر رہا۔"

"اوہو... کیا ہو گیا ہے مہوین۔ تم ایسے کرو گی تو خالہ جان کا سوچو کیا حال ہو گا۔ کم از کم میری بات کا تو اعتبار کرو کہ وہ اب ٹھیک ہیں اور کل ان شاءاللہ گھر آجائیں گے۔"

اس کے وقت بے وقت نکل آنے والے آنسوؤں نے ٹھیک ٹھاک سعد کو جھنجلا کر رکھ دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے... میں ایک دفعہ ان کو دیکھ لوں پھر چلتے ہیں۔" اب کے بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"چلو..." وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

"اور ہاں... وہ رکا' یہ رونے دھونے والے سیشن سے پرہیز کرنا ہے وہاں۔ ڈاکٹرز نے کسی بھی قسم ٹینشن سے دور رکھنے کی سخت تاکید کی ہے انکل کو..." مہوین نے

جلدی جلدی اپنے بچے کھچے آنسو صاف کیے اور چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل کرنے لگی گویا ابو کو پتا نہ چلے کہ ان کی طبیعت خراب ہونے پر یہ دو دن ان پر کس قدر بھاری گزرے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اماں کیسی ہیں ابا جی!" ابتدائی سلام دعا کے بعد اس نے بے قراری سے اپنی ماں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ پچھلے دنوں ان پر ہونے والے فالج کے شدید حملے نے انہیں بستر کا کر دیا تھا۔ ایک ماہ اسپتال میں رہنے کے بعد اب وہ گاؤں میں تھیں' ڈاکٹرز کے مطابق یہ بیماری ایسی تھی جس کا علاج اور احتیاطی تدابیر طویل اور صبر آزما تھیں' پھر ہی کہیں جا کر وہ اٹھنے کے قابل ہو سکتی تھیں۔ اتنی چاق و چوبند اور ہمہ وقت کسی کام میں مصروف خاتون جو کہ ایک کی نصف بہتر اور دوسرے کی ماں تھیں' کو دیکھنا نہایت کٹھن مرحلہ تھا ان دونوں کے لیے.... دونوں ہی اس عورت سے شدید محبت کرنے کے باوجود اس کی پٹی سے لگ کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

حسین شاہ کا ایگری کلچر میں ایم فل کا کچھ عرصہ رہتا تھا جبکہ ابا ایک روایتی زمین دار تھے' جن کو گھر کے علاوہ بکھیڑے بھی بہت تھے۔ اگرچہ گھر کی خواتین نے ان کے سامنے تو کمر کس لی تھی۔ بیمار کی تیمارداری کی مگر مکینوں کی محبت' رواداری اور مروت کا پول بہت بار دونوں کے سامنے کھل چکا تھا۔

"وکیسی ہونا ہے اس بے چاری نے اگرچہ اب ٹوٹے پھوٹے لفظ ہی سہی زبان سے نکالنے لگی ہے مگر ایسی کڑی بیماری اور عورت ذات اس کی خدمت اور دیکھ بھال کی طرف سے میں سخت فکر مند ہوں حسین شاہ۔" فکر مندی اور پریشانی ان کے لفظ لفظ سے ہویدا تھا۔ ایک عورت کی بیماری نے ان کے گھر کا سارا نظام تلپٹ کر کر رکھ دیا تھا۔

"مگر آپ سے جب بھی فون پر بات ہوئی' آپ نے یہ ہی بتایا کہ چاچی اور نگی بہت خیال رکھتی ہیں اماں کا اور زرینہ اور بوا بھی تو ہیں نا۔" باپ کے چہرے اور باتوں سے جھلکتی فکر مندی اس سے پنہاں نہ رہ سکی۔

"میں تجھے پردیس میں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بھابھی جتنا بھی کہے مگر تم اور میں جانتے تو ہیں کہ وہ سدا کی نکمی اور پھوہڑ عورت ہے یہ تو تمہاری ماں تھی جس نے ساری حویلی کا کام اور ذمہ داری تن تنہا اپنے کندھوں پر سمیٹ رکھی تھی اور رہی نگی تو بیٹیاں ماؤں کا ہی پر تو ہوتی ہیں۔ ملازموں پر بھی جب تک نظر نہ رکھی جائے' فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کر جاتے ہیں۔ ایک بوا بے چاری پر ساری ذمہ داری آن پڑی ہے۔" انہوں نے ہولے ہولے حویلی کے شب و روز اس کے سامنے عیاں کر دیے۔

"اچھا آج تو شہر میں ایک دو کام نپٹانے تھے۔ زمین کے سلسلے میں ایک پارٹی سے ملنا تھا سو چا تم سے ملتا جاؤں۔ بہت دن ہو گئے تم نے چکر بھی نہیں لگایا تھا' پھر ایک عزیز دوست کی علالت کا علم ہوا ہے تو اس کے پاس بھی ہوتا جاؤں گا۔" چائے پیتے ہوئے ابا نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

"چلیں پھر میرا تھیسز کا تقریباً" کام مکمل ہے۔ دو تین دن ہیں میرے پاس۔ میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں آپ کے ساتھ اماں کو بھی ملنے اور دیکھنے کو بہت دل کر رہا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہوئی.... تمہاری اماں کی نظریں بھی ہر پل تمہیں دیکھنے کو ترستی ہیں۔ بیماری میں بندہ ویسے ہی زود رنج ہو جاتا ہے۔ روتی رہتی ہے بھلی لوک.... خوش ہو جائے گی اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھ کر...." سجاول شاہ تو خوش ہو گئے اس کی بات سن کر....

اسماعیل احمد ان کے دیرینہ دوستوں میں سے ایک تھے۔ شہر میں میٹرک تک ساتھ رہے تھے۔ پھر ابا کی تو شادی ہو گئی۔ والد کی علالت' شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں اور زمین داری نے انہیں مزید تعلیم جاری نہ رکھنے دی مگر۔ سال کے گزرتے چکر میں انہیں اپنے

چاہنے والے نہیں بھولے تھے۔ وہ جب بھی شہر آتے اسماعیل احمد کے پاس ضرور چکر لگاتا جو تعلیم مکمل کرنے کے بعد گریڈ سترہ کے سرکاری ملازم تھے۔ درمیان میں اپنے والد کی طویل بیماری اور وفات کے بعد کافی عرصہ ان کا رابطہ شہر سے منقطع ہوگیا تھا مگر جوں ہی زندگی کی گاڑی ہموار سڑک پر دوڑی' انہوں نے پھر سے بھولے بسرے رابطے دوبارہ استوار کیے تھے۔

اسماعیل احمد کی ایک ہی بیٹی تھی۔ وہ کبھی انہیں آفس میں ملتے تو کبھی گھر پر..... اکثر اوقات ہی مہوین سے ملاقات بھی ہوجاتی۔ پڑھی لکھی اور باادب مہوین سے مل کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ اس طرح اسماعیل خان کی اہلیہ بھی سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک تھیں۔ وہ ہمیشہ ان کے ہاں آکر خوشی محسوس کرتے۔ پھر حسین شاہ کی ماں کی بیماری کے باعث کچھ ماہ ان کا شہر رابطہ نہ ہوسکا۔ ہاں اسماعیل احمد خود فون کرلیتے تھے۔ آنا چاہتے تھے ان کی اہلیہ کی عیادت کو مگر اچانک سے ہونے والی دل کی بیماری نے کہیں کا نہ رکھا تھا اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد گھر پر ہی زیادہ وقت گزارتے تھے۔

بہت دنوں جب اسماعیل احمد کی طرف سے فون پر رابطہ نہ ہوسکا تھا تو انہوں نے خود سے کال کرکے ان کی خیریت پتا کرنا چاہی تھی۔ دوسری طرف اسماعیل احمد کے بجائے ان کی بیٹی نے بے حد پریشان لہجے میں بتایا تھا کہ وہ اسپتال میں تھے اور وجہ ان کو اچانک پڑنے والا دل کا دورہ تھا۔ **نتیجتاً** آج وہ شہر میں موجود تھے۔ راستے میں ہی انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ حسین شاہ سے بھی ملتے جائیں گے' سو اب وہ باپ بیٹا دونوں اسماعیل خان کے گھر تھے جو اسپتال سے کل ہی ڈسچارج ہوکر آئے تھے۔ حسین شاہ' اسماعیل احمد سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے شائستہ مزاج کے انسان تھے۔ بیماری نے ان کو بے حد نڈھال کر رکھا تھا۔ اسی طرح اسماعیل خان کو بھی اپنے دوست کے بیٹے سے مل کر بہت اچھا لگا تھا۔ وہیں ان کی ملاقات ایک خوش شکل نوجوان سے بھی

ہوئی تھی' جس کا تعارف اسماعیل احمد نے اپنی بیوی کے بھانجے کی حیثیت سے کراتے ہوئے کہا تھا کہ سعد نے ہر اچھے برے وقت میں ان کا ساتھ دے کر ان کا بیٹا نہ ہونے کی کمی کو دور کردیا تھا۔ شام گہری ہونے سے پہلے وہ لوگ گاؤں کے لیے روانہ ہوئے تھے کہ اسماعیل احمد نے اٹھنے ہی نہیں دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے بے حد حیرت سے ناشتے کی ٹرے لاتی اپنی چچازاد کو دیکھا جو سلام کے بعد ٹرے لاکر ٹیبل پر رکھ چکی تھی' اب بڑی بے تکلفی سے کمرے میں گھوم پھر کر جیسے معائنہ کررہی تھی۔

"اف اللہ..... حسین شاہ! جوان آدمی ہی نہیں دکھتے تم تو..... کوئی بوڑھی روح گھسی ہے تم میں..... یہ موٹی موٹی کتابیں شہر میں پڑھ پڑھ کر تھکتے نہیں ہو جو یہاں بھی لادلاتے ہوئے....." منہ بنا کر اس نے کہا تھا مگر حلق تک کڑوا حسین شاہ کا ہوگیا تھا۔ "ایک اور سلینہ خان....." اس نے کڑھ کر سوچا اور آگے بڑھ کر کتاب نگی کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ ٹیبل پر رکھ دی۔

"تم نے خوامخواہ ہی زحمت کی ناشتا لانے کی' میں ناشتا اماں کے کمرے میں کروں گا اور بوا کو میں بتا چکا ہوں اور علم کا تعلق جوانی' بڑھاپے یا عمر سے قطعی نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق شعور اور سمجھ بوجھ سے ہوتا ہے۔ جو کئی لوگوں میں عمریں گزارنے کے بعد بھی نہیں پیدا ہوسکتی اور کئی لوگ پڑھے لکھے بغیر بھی اسے پالیتے ہیں..... تم نہیں سمجھوگی ان باتوں کو..... اس لیے جاؤ اور دیکھو کہ بوا نے اماں کے کمرے میں ناشتا لگا دیا کہ نہیں..... میں بہت تھوڑے دن کے لیے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمام وقت ان کے ساتھ گزاروں....." اسے صوفے پر براجمان ہوتے دیکھ کر اس نے کہا۔

"مگر وہ تو بیمار ہیں۔" نگی کے منہ سے بے اختیار نکلا مگر حسین شاہ کے ماتھے پر پیدا ہونے والے بل دیکھ کر خود کو کوسا کہ کیوں اس کی ماں کی شان میں گستاخی کردی۔

"تو بیمار انسان نہیں ہوتے کیا۔۔۔ یا بیماری کے بعد ان کو انسان سمجھنا چھوڑ دیا جائے؟" اس کے کڑے استفسار پر نگی گڑبڑا گئی۔

"نن۔۔۔ نہیں میرا مطلب۔۔۔ میرا مطلب تھا شاید تم وہاں ٹھیک طرح سے ناشتا نہ کر سکو' بلکہ میں دیکھ کے آئی ہوں کہ ناشتا وہاں لگا کہ نہیں۔" اس کے تیور دیکھ کر نگی تیز تیز بولتی وہاں سے چلی گئی۔ حسین شاہ سر جھٹکتا ہوا اماں کے کمرے کی طرف آگیا' آج زرینہ غالباً" جلدی آگئی تھی' جب ہی اماں صاف ستھرے حلیے میں تھیں۔ رات وہ دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا تھا' پھر جب تک وہ نیند میں چلی نہ گئی تھیں وہاں سے اٹھا نہیں تھا۔ پھر چچی کی مسلسل کی گئی نصیحتوں کا اثر تھا کہ نگی بھی اماں کی خیریت معلوم کرتی رہی تھی۔

"ویسے بھائی جی! اب اپنے حسین بیٹے کی شادی کردینی چاہیے۔ بھابھی جی بھی بیٹے کی خوشیاں دیکھ کر بہتر محسوس کریں گی اور خیر سے گھر کو سنبھالنے والی بھی آجائے گی۔ کیا ہی اچھا وقت تھا جب بھابھی بیگم یہاں سے وہاں سے یہاں دن تمام کرتی نظر آتی تھیں۔ اب ان کو اس حالت میں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔" وہ بڑی مشکل سے آنسو لے ہی آئیں آنکھوں میں' نگی کے ہاتھ تائی کو تیزی سے دبانے لگے۔ چچی جمیلہ نے دزدیدہ نظروں سے خاموش آنسو بہاتی جیٹھانی کو پھر بے حد سنجیدہ بیٹھے جیٹھ کو دیکھا اور اڑتی پڑتی نظر حسین شاہ پر بھی ڈال لی تھی مگر وہ سائڈ ٹیبل سے دوائیاں اٹھا اٹھا کے نسخے کے ساتھ ملاتا' پھر دوبارہ رکھ دیتا۔

"میں خود بھی بہت دنوں سے یہی سوچ رہا ہوں بھابھی۔" دفعتاً" تایا جی کی بارعب مگر سنجیدہ آواز نے دونوں ماں بیٹی کے دل کی دھڑکن کو ایک دم بڑھا دیا۔ "یہ صرف ایک بیٹے کی شادی کا ارمان نہیں ہے بھابھی بیگم۔ یہ اب میرے گھر کی اشد ضرورت ہے۔ میں نہ تو چوبیس گھنٹے ادھر رہ سکتا ہوں' نہ حسین کی ماں کو اس حال میں چھوڑ کر باہر کہیں سکون سے رہ سکتا ہوں۔" حسین بھی اب ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ بھائی جی۔۔۔ اولاد کی شادی بھی بہت بڑا فرض ہے انسان پر۔۔۔ میں خود بھی نگی کی شادی کے بعد سکون سے بیٹھوں گی' ورنہ اس کی شادی کی فکر مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتی۔" چچی جمیلہ نے تایا جی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اشارتاً" اپنا مدعا بھی بیان کردیا۔ جبکہ نگی' جو ابھی مزید یہاں بیٹھی رہنے کی خواہش مند تھی' کو ماں کے اشارے نے اٹھنے پر مجبور کیا تو وہ منہ بناتے ہوئے اٹھ گئی۔

"شرما گئی ہے بچی۔" چچی نے خود ہی بتایا۔

"ہو جائے گا بھابھی۔۔۔ نگین بیٹی کا بھی بہت اچھا اور سوچ سمجھ کر کچھ کریں گے۔ آپ ذرا حسین کی ماں کا خیال رکھیں۔۔۔ میں ذرا زمینوں پر چکر لگا آؤں۔ کچھ لوگ آئے بیٹھے ہیں ساتھ والے گاؤں سے۔ حسین شاہ کو بھی ملوانا چاہتا ہوں سب سے "آخر کو یہاں آکر سب باگ دوڑ اسی نے سنبھالنی ہے۔" ان کے کہتے ہی حسین شاہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پر تین دن حسین شاہ نے سوائے ایک دو ضروری کاموں کے سارا وقت ہی ماں کی پٹی سے لگ کر گزارا تھا۔ نگی اور چچی جمیلہ کی فطرت سے تو آگاہ ہی تھی اسے مگر پھر بھی خود آنکھوں سے دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی تھی' دونوں صرف باتیں بنانے اور بڑے بڑے دعوے کرنے میں ماہر تھیں بس۔۔۔ تب ہی زرینہ کو بلا کر اپنی ماں کے بارے میں خصوصی ہدایات دی تھیں۔ اس کے سامنے تو وہ بھی فرماں برداری سے سر ہلا کر جی سائیں کہتی رہی تھی۔ مزید اس نے زرینہ کی نگرانی پر کہ وہ اماں کی صحیح دیکھ بھال کر رہی ہے یا نہیں بوا کو نگراں ٹھہرایا تھا۔ رات کو اپنی کتابیں وغیرہ سمیٹ ہی رہا تھا کہ دودھ لے کر آتی نگی کو دیکھ کر سخت بدمزہ ہوا۔

"کیا یاد کرو گے حسین شاہ' کیسی خیال رکھنے والی کزن ملی ہے تمہیں۔"

"خواہ مخواہ تکلیف کی تم نے۔۔۔ میں دودھ نہیں پیتا۔۔۔ بوا مجھے اس ٹائم چائے دے دیتی ہیں۔" نگی کو بوا پر سخت غصہ آیا کہ ابھی جب وہ کچن میں دودھ لینے گئی

تھی۔ وہ وہیں تھیں۔ ملازمہ سے برتن دھلوا رہی تھیں۔ بتا تو سکتی تھیں کہ وہ دودھ نہیں چائے پیتا ہے اس ٹائم بوا کی خبر لینے کا دل ہی دل میں پروگرام بناتے وہ بظاہر مسکرا کر بولی۔

"کوئی بات نہیں... آج تو یہ سوچ کر ہی پی لو کہ میں کتنے پیار سے لائی ہوں۔"

"یا وحشت..." وہ جھنجلایا۔ "جب میں نے کہا ہے کہ نہ تو مجھے دودھ پینا اچھا لگتا ہے، نہ ہی ایسی فضول گفتگو پسند ہے تو پھر بحث کا مطلب؟ یہ دودھ لے جاؤ' میں نے پیکنگ کرنی ہے ابھی۔"

اور نگی کو اس کا یہی اکھڑ انداز تو پسند تھا۔ وہ اس کی جھنجلاہٹ کو خاطر میں لائے بغیر کھڑی رہی۔

"ویسے حسین شاہ... میری ساری دوستوں کے منگیتر جب بھی شہر جائیں ان کے لیے ایسے پیارے پیارے گفٹ لے کر آتے ہیں... اور تم... تم تو رہتے ہی شہر ہو... تم تو کوئی بڑا گفٹ چھوڑ کر کوئی ایک چھلا تک نہیں لائے میرے لیے کبھی..." اٹھلا کر شکوہ کرتے وہ حسین شاہ کے چودہ طبق روشن کر گئی۔

"منگ... گیتر... کس نے خرافات بکی ہے کہ میں تمہارا منگیتر ہوں۔"

"کسی کے کہنے کی کیا ضرورت ہے پورے گاؤں کو پتا ہے۔" بے نیازی حد سے سوا تھی۔

"اور پورے گاؤں میں یہ فضول خبر تم نے پھیلائی ہوگی؟" وہ دھاڑا اب کے وہ بھی ذرا سہمی تھی مگر پھر بھی جواب دینا ضروری سمجھا۔

"ہاں تو ماں کہتی ہے کہ تائی نے جب میں پیدا ہوئی تھی کہا تھا کہ نگی تو میرے حسین کی دلہن بنے گی۔"

"ہاں تو کہا ہوگا مذاق میں' یا ویسے ہی... تمہیں کس نے کہا کہ حدیث سمجھ لو اس بات کو اور نشر بھی کردو پوری دنیا میں۔ کان کھول کر سن لو تم... پہلے تو میرا اپنی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے شادی کرنے کا ہر گز ارادہ نہیں تھا مگر اب اگر حالات کو دیکھ کر ہاں کرنی بھی پڑ رہی ہے تو میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جو پڑھی لکھی ہو۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم اچھی لڑکی نہیں ہو لیکن نگین اب وہ دور نہیں رہا ہے' جب وہ ٹھیکرے کی منگ جیسے فضول فیصلوں کے پیچھے زندگیاں رول دی جاتی تھیں' جبکہ ہمارا کوئی ایسا سلسلہ بھی نہیں ہے' پھر بھی تمہارے ذہن میں اگر ایسی کوئی بات ہے تو نکال دو پلیز... میں اب تم سے شادی کر بھی لوں تو ساری عمر نہ تو خود خوش رہ پاؤں گا' نہ تمہیں خوش رکھ سکوں گا۔"

وہ جو پہلے پہلے سخت غصے میں آ گیا تھا۔ اب رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں... میں خوش رکھ لوں گی تمہیں۔" نگی کے لجاجت سے کہنے پر اس کا دماغ گھوم گیا۔

"تم پاگل ہو گئی۔ شادی زندگی بھر کے ساتھ کا مسئلہ ہے۔ تم... تم جاؤ یہاں سے..." اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس بے وقوف کو کیسے سمجھائے سوائے بھیج کر خود سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شکر ہے اماں سو چکی تھیں۔ تب ہی اس نے مناسب لفظوں میں وہ سب کچھ ان کو بتا دیا۔

"نگین میری بھتیجی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی اور نہیں میرے لیے میں بھی ایسا ہی سوچتا' اگر جو اس میں کوئی ایک خوبی ایسی ہوتی جو اس گھر کی بہو کا تقاضا ہے' تو اس کو بہو بنانے میں ایک لمحہ بھی نہ لگاتا مگر وہ بنی بنائی جمیلہ بھابھی ہے جن کی عادات و فطرت سے بھائی مرحوم تمام عمر نالاں رہے' بھابھی نے اپنی عادات و خصلتیں ویسی کی ویسی اس میں منتقل کردی ہیں اور تمہاری ماں کے بچپن میں اسے بہو بنانے والی بات سراسر جمیلہ بھابھی کے ذہن کی اختراع ہے' ورنہ میرے علم میں ایسی کوئی بات ہرگز نہیں ہے۔ تمہاری ماں ہمیشہ یہی کہتی رہتی تھی کہ اپنے بیٹے کے لیے اسی کے پسند اور اسی کے مزاج کی کوئی لڑکی ڈھونڈوں گی۔ یہ بات بھابھی نے تب پھیلائی جب سے تمہاری ماں بیمار پڑی اور میں نے بارہا بھابھی کو بتایا ہے کہ حسین شاہ پر ہم کبھی بھی اپنی مرضی نہیں ٹھونسیں گے' وہ کسی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کا خواہاں ہے اور نگی نے پرائمری اسکول کا منہ بھی مشکل سے ہی دیکھا ہے۔ مگر نہ جانے ان ماں بیٹی نے کیا سوچ رکھا ہے۔

جمیلہ بھابھی کا بھائی اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے نگی کا بہت بار کہہ چکا ہے مگر وہ جمیلہ بھابھی کی نظر میں نہیں سما رہا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں حسین شاہ تمہارا باپ ابھی زندہ ہے' زندگی کے جھمیلوں سے نپٹنے کے لیے۔ جب آج تک ہم نے تمہیں خاندانی سیاست سے دور رکھا ہے تو اب بھی ایسا ہی ہوگا' تم اطمینان سے اپنی تعلیم پر دھیان دو۔ انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ وہ صرف شکر گزار نظروں سے اپنے باپ کو رہ گیا۔

"اور ہاں بیٹا...." انہوں نے جب وہ رخصت ہونے لگا' اسے روک کر کہا۔ "اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتاؤ۔ میں جلد از جلد یہ ذمہ داری نبھانا چاہتا ہوں۔ میرے گھر کو تمہاری ماں کو اشد ضرورت ہے' کسی مخلص انسان کی...."

"ارے ابا کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں سب سے پہلے آپ کو بتاتا.... میں نے بہت پہلے یہ حق اماں کو دے دیا تھا' ہاں اتنی خواہش ضرور کی تھی کہ لڑکی پڑھی لکھی ہو' میری سوچ کو' مجھے سمجھ سکے اور اب آپ کو یہ حق دے رہا ہوں کہ ایسی لڑکی ہو جو میری ماں کو اپنی ماں' جان کر اس کا خیال رکھ سکے۔ بس اس سے زیادہ کوئی فرمائش نہیں ہے میری۔" وہ مڑ کر آیا اور جس پل اس نے ابا سے یہ کہا۔ اپنی حد درجہ فرماں بردار اولاد کی بات سن کر ان کا دل خوشی اور فخر کے احساس سے لبریز ہو گیا وہ ایک جاگیردار کی اولاد تھا۔ اکلوتا تھا مگر کبھی بھی اس نے نہ تو عام بچوں جیسی شرارتیں کی تھیں' نہ کبھی کسی بات یا فرمائش کے لیے ان کو نہیں ستایا تھا۔ ساری زندگی ہوسٹلز میں رہنے کے باوجود اس میں کوئی اخلاقی برائی موجود نہیں تھی۔ بس ایک تعلیم حاصل کرنے کی لگن تھی جس نے اسے کسی بھی طرف دیکھنے نہیں دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
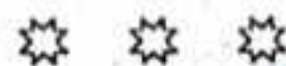
آج ہفتہ وار تعطیل تھی۔ دسمبر کی نرم گرم دھوپ جسم کو بھلی لگ رہی تھی۔ مہوین نے ابو کو باہر لا کر بٹھایا اور اخبار پڑھ کر سنانے لگی۔ امی بھی پاس والی کرسی پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں' جب سعد فروٹس کا شاپر لے کر چلا آیا اور سلام کرنے کے بعد فروٹس ٹیبل پر رکھ دیے۔

"کیا کرتی ہو لڑکی! اتنی مشکل سے انکل کی حالت سنبھلی ہے اور تم پھر خوف ناک خبریں سنا کر ان کے دل کو مشکل میں ڈال رہی ہو۔" وہ وہیں کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"ارے بیٹا! تم روز خیریت معلوم کر جاتے ہو۔ ہر مشکل گھڑی میں ساتھ نبھاتے ہو۔ یہی تمہاری بہت بڑی مہربانی ہے۔ یہ روز روز کا تکلف سچ پوچھو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اسماعیل احمد نے سعد کے سلام کا جواب دے کر ٹیبل پر رکھے فروٹس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

انکل اب تو میری ناراضی بنتی ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں اگر آپ کا بیٹا یہ سب لے کر آتا تو کیا آپ اسے بھی ایسا ہی کہتے۔ نہیں نا.... تو پھر مجھے بھی مت کہا کریں' یا تو یوں کہیں کہ آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتے' کیوں خالہ...." اس نے ان کی ہلکی پھلکی نوک جھونک مسکرا کر سنتی خالہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"ارے بیٹا! جیتے رہو۔ سچ ہی تو کہہ رہے ہیں تمہارے خالو' آج کل تو اپنی اولاد بھی اتنا نہیں کرتی جتنا تم نے ہمارا ساتھ دیا۔ میرا تو رواں رواں تمہیں دعائیں دیتا ہے۔" وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

"لو میں تو آپ کو اپنا ہمنوا بنانے لگا تھا' آپ بھی اپنے مجازی خدا کی ٹیم میں شامل ہو گئیں مگر مہوین میرا ساتھ دیتے ہوئے ابھی یہ فروٹس کچن میں لے جائے گی اور اچھی سی چائے بنا کر لے آئے گی۔ کیوں مہوین!" اس نے خاموش بیٹھی مہوین کو مخاطب کر کے کہا۔

"یس باس...." اس کے اس طرح کہنے پر وہ سب مسکرا دیے۔

"یہ لڑکی تو آپ کو پریشان کر رہی تھی' اخباری خبریں سنا کر۔ میں آپ کو اخبار کے بغیر ہی ایسی کمپنی

دوں گا کہ آپ کا کمزور دل منٹوں میں ہی پہلوانوں جیسی طاقت پکڑ لے گا۔" اور واقعی موہین کے چائے لے کر آنے تک وہ دونوں سعد کی باتوں اور چٹکلوں کو سن کر چہروں پر مسکراہٹ لیے بیٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر سے بہت الجھی سلجھی سوچیں لے کر آیا تھا۔ تھوڑی دیر ریسٹ کرنے کے بعد یونی ورسٹی جانے کا ارادہ کر کے لیٹا تھا کہ سلینہ خان کی ہمیشہ کی طرح بے وقت آمد اسے حد درجہ کوفت میں مبتلا کر گئی تھی۔

"ہیلو اینگری ینگ مین.... بغیر انفارم کیے چل دیتے ہو ہمیشہ.... کچھ اپنے چاہنے والوں کا بھی خیال رکھ لیا کرو جو تمہارے پل پل کی خبر رکھتے ہوں۔" دروازہ کھولتے ہی ایک ادا سے کہتی وہ اس کے ناگوار تیوروں کا نوٹس لیے بغیر اندر آئی تھی۔ دو سال ہو گئے تھے اس لڑکی کی ثابت قدمی کو، جسے وہ ہٹ دھرمی اور بے حیائی جبکہ سلینہ خان اسے محبت کا درجہ دیتی تھی جو اس کو دنیا سے بے زار اس بندے سے ہو گئی تھی جو اس کی نفرت، بے زاری، ڈانٹ پھٹکار کسی بھی عمل سے۔ کم ہونے کی بجائے بڑھی ہی تھی۔

"یار تم بھی اپنی طرز کے ایک ہی بندے ہو دنیا میں۔ خود سے چل کر آنے والی نعمت کو کون کافر ٹھکراتا ہے۔ وہ حسینہ خوب صورت بھی ہے۔ طرح دار بھی، دولت مند بھی، اب اگر خود ہی تیرے ساتھ ٹائم گزارنا چاہتی ہے تو تجھے کیا تکلیف ہے۔" اس کے فلیٹ کو جو دو لوگ شیئر کرتے تھے۔ ان دونوں کے کم و بیش یہی خیالات تھے اور کسی حد تک وہ دل ہی دل میں حاسد بھی تھے اس سے.....

"میرے لیے زندگی کی ترجیحات ویسی نہیں ہیں جیسی تم سمجھتے ہو۔ عورت بہت قابل احترام ہستی ہے میرے نزدیک.... جو ماں ہے، بہن ہے، بیٹی اور پھر بیوی.... میں اپنے آپ کو صرف ان رشتوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے باقی یہ سب خرافات ہیں جنہیں تم لوگ انجوائے منٹ تو کبھی تھرل اور کبھی ایڈونچر کا نام دیتے ہو۔"

پہلی بار جب سلینہ خان نے بھری کلاس میں اسے پھول پیش کیا تھا اور جہاں اس کی پیشانی عرق آلود ہوئی تھی، وہاں کلاس کے ہاہا کار مچانے، پر وہ اس پر تیز نظر ڈال کر فلیٹ میں چلا آیا تھا اور یہ اسی شام کی گفتگو تھی۔ اس کی یہ بات سن کر اسد اور نوید نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہنسے تو ہنستے ہی چلے گئے۔

"او بھئی مولانا صاحب! تو ماں، بہنیں، بیویاں کس کی نہیں ہوتیں یا تجھے کون کہہ رہا ہے اس کو بیوی بنا لے۔ بس کچھ دیر ٹائم پاس کر کے اپنا وقت بھی رنگین کر لے، اس کا بھی دل رکھ لے جس نے تیرے چلے آنے کے بعد سب کے سامنے اعتراف کیا کہ اسے تجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ ویسے بھی یہ چند دن کا ساتھ ہے، پھر سب نے بکھر جانا ہے یہاں وہاں اور یہی یادیں رہ جاتی ہیں۔" نوید بھی اسد سے کم نہیں تھا۔

"میں ایسی یادیں لے کر نہیں جانا چاہتا جو میرے ضمیر پر بوجھ بنی رہیں۔ پتا نہیں کیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو تعلیم حاصل کرنے کا مقصد لے کر گھروں سے آتی ہیں اور یہاں آکر تعلیمی اداروں کا تقدس خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا کتابیں کھولنے لگا تھا جبکہ نوید اور اسد ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیزی سے مسکرا دیے تھے، پھر آنے والے دنوں میں سلینہ خان کا التفات بڑھا یا حسین شاہ کی بے رخی بڑھی تھی۔ ساتھ میں صنف مخالف کے لیے اس کی دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے تھے۔ اب جب وہ اپنے تعلیمی سفر کے آخری مراحل میں تھے تو سلینہ خان کی جرأتیں بڑھی تھیں اور اس کے تمام تر سرد رویے اور گریز کے باوجود وہ ان کے فلیٹ میں بھی آ دھمکتی تھی۔ حسین بہت دفعہ سخت رویہ اور سخت الفاظ استعمال کر جاتا جن کے بارے میں اسے بعد میں سوچ کر افسوس ہوتا کہ اس کی تربیت ہرگز ایسی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی لڑکی سے ایسا نازیبا رویہ اختیار کرے مگر سلینہ خان کی باتیں اسے خود بخود غصہ دلاتیں۔

"مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے حسین شاہ' ورنہ ہزاروں سلینہ خان کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ میرے ایک اشارے پر میرے گارڈز تمہیں ایک لمحے میں بھون کر رکھ دیں مگر اپنے اس دل کے ہاتھوں مجبور ہوں جو مجھے تمہارے ساتھ کے لیے تمہارے سامنے خوار کروا رہا ہے۔" اس کے آزردگی سے کہنے پر وہ اور غصے میں آیا تھا۔

"تو خدا کے لیے چلی جاؤ ان ہزاروں کے پاس اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میری زندگی میں تم جیسی کسی لڑکی کی جگہ نہیں ہے۔ نہ آج' نہ کبھی آئندہ۔۔۔ تمہیں ہزار بار بتا چکا ہوں مگر پھر بھی تمہیں سمجھ نہیں آتی۔ تمہیں عادت ہوگی ایسی باتوں اور ایسے رویوں کی مگر خدا کے لیے مجھے ذلیل مت کرو۔۔۔ پروفیسرز اور اسٹوڈنٹس جب میری طرف اشارے کرتے ہیں تو دل کرتا ہے کہ ایک گولی تمہیں مار کر دوسری اپنے سینے میں اتار لوں۔" ایسے ہی کئی مکالمے ان کے درمیان کئی بار ہو چکے تھے کبھی سلینہ ہنس کر ٹال دیتی۔ کبھی افسردہ ہو جاتی کبھی تو بددعا بھی دے ڈالتی۔

"میں نے کئی لوگوں کا دل دکھایا حسین شاہ! ان ہی کی بددعا ہوگی جو مجھے تم جیسے سنگ دل سے محبت ہوگئی مگر میں بھی تمہیں بددعا دیتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے نہ سہی کسی ایسی لڑکی سے محبت ہو جائے جو ہرگز تمہارے آئیڈیل جیسی نہ ہو۔ تمہیں بھی ویسا ہی رویہ برداشت کرنا پڑے جیسا مجھے کرنا پڑتا ہے۔" اس کے جانے کے بعد وہ شکر کرتا کہ آج کے بعد وہ اس کے پیچھے پھر نہیں آئے گی مگر اس کی ناراضی کا وقفہ دو یا تین دن سے زیادہ نہ ہوتا۔

"کس چیز کی کمی ہے' مجھ میں حسین شاہ' خوب صورت ہوں' تعلیم یافتہ ہوں' دولت مند ہوں۔۔۔ پھر کیا ایسا چاہتے ہو تم جو مجھ میں پیدا ہو تو شاید میں تمہارے دل تک رسائی پا لوں۔۔۔" اس دفعہ اس کا رابطہ پانچ دن کے لیے ختم ہوا تھا اس سے۔۔۔ حسین شاہ نے بلا ٹلنے پر شکر ادا کیا تھا۔ جب چھٹے دن وہ یہ سوالات لے کر چلی آئی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا' پھر جب بولا تو لفظ نہیں آگ تھی جو اس کے الفاظ' لہجے اور انداز کہاں کہاں سے ہویدا نہیں تھی۔

"شرم و حیا کی کمی ہے تم میں۔۔۔ تربیت کی کمی ہے تم میں۔۔۔ عورت کا حسن اس کے ناز و ادا میں نہیں اس کے کردار میں ہوتا ہے۔۔۔ کس کس خامی کو خوبی میں بدلو گی تم۔۔۔ رہنے دو سلینہ خان۔۔۔ میری تربیت ہرگز ایسی نہیں ہے کہ میں کسی لڑکی سے ایسی اخلاق سے گری ہوئی بات کروں۔۔۔ مگر تم ڈیزرو کرتی ہو کہ تمہیں واشگاف الفاظ میں تمہاری اوقات بتائی جائے' تم حسین ہو' تمہاری نظر میں۔۔۔ تعلیم یافتہ؟ ہونہہ کیا فائدہ ایسی تعلیم کا جو اپنے کردار کی حفاظت کا شعور ہی نہ دے سکے اور دولت کو کبھی میں نے اہمیت ہی نہیں دی کہ میرے گھر کی باندی ہے یہ۔۔۔" غصے سے اس کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور ذلت سے سلینہ خان کا چہرہ زرد' خدا کے لیے حسین شاہ۔۔۔

مجھے میری نظر میں مت گراؤ' اتنا کہ میں جی ہی نہ سکوں' مجھے میری محبت کی ایسی بڑی اور کڑی سزا مت دو۔ میں نے اپنی زندگی اور اپنے دل کا ورق ورق کھول کر تمہیں دکھا دیا۔ کیا سرٹیفکیٹ ہے تمہارے پاس کہ تمہاری زندگی میں آنے والی لڑکی ایسی ہی خالص ہوگی جیسی تم چاہتے ہو اور خدا کرے ایسا ہو کہ تمہیں دل توڑنے کی سزا ملے اور تمہیں اندازہ ہو کہ محبت بہت رسوا کرواتی ہے' یہ کہیں کا نہیں چھوڑتی۔" پہلی بار وہ روتی ہوئی بھاگ گئی تھی۔

پہلی بار حسین شاہ کو اپنے الفاظ زیادہ سنگین لگے تھے۔ کیا مجھے یہ سب کہنا چاہیے تھا۔۔۔ ہاں اس کا دماغ پکار اٹھا۔ وہ لڑکی ایسے ہی سلوک اور ایسے ہی رویے کی حق دار تھی۔ ان ہی پراگندہ سوچوں میں اسے نگی یاد آئی تھی۔ ہونہہ۔۔۔ ایسی ہی ہوتی ہیں سب لڑکیاں۔۔۔ اس کے دل میں ایک زہریلی سوچ نے جنم لیا اور جا کر ایک کونے میں اپنا بسیرا کر لیا۔۔۔ نگی کے انداز اسے تب سے کھلے تھے جب سے سلینہ شاہ کی پیش قدمیاں بڑھی تھیں' ورنہ وہ ہمیشہ سے اسے ایک کزن والا التفات ہی سمجھتا رہا تھا۔ اس روز اس سے کوئی کام

نہیں ہو سکا تھا۔

✲ ✲ ✲

اسماعیل احمد کی طبیعت اب دھیرے دھیرے سنبھل رہی تھی کہ ایک بار پھر طبیعت کی خرابی نے ان کو ایک بار پھر ہسپتال کا منہ دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بار سجاول شاہ بروقت اسپتال پہنچے تھے۔ اسماعیل احمد کی حالت اگرچہ خطرے سے باہر تھی مگر وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ اس بار بھی سعد ہی ان کو لے آیا تھا اسپتال۔ مہوین بھی اس کے بے حد منع کرنے کے باوجود ساتھ ہی آئی تھی۔

"کیا بات ہے' اسماعیل ہمت پکڑو یار... بیماری' دکھ سکھ تو زندگی کے ساتھ ہیں۔ ایسے ہمت چھوڑ کے بیٹھو گے تو بھابھی اور اس بچی کا کیا ہو گا جس نے رو' رو کر اپنا حشر خراب کیا ہوا ہے۔" ان کی بے حد دل گرفتہ حالت دیکھ کر سجاول شاہ نے ان کو تسلی دی۔

"اسی... اسی کی فکر ہے جو مجھے نہ مرنے دے رہی ہے نہ جینے کا حوصلہ ہے شاہ میرے اندر اب... میں سکون سے مر نہیں پا رہا ہوں کہ میرے بعد میری بچی کا کیا ہو گا۔" وہ اتنا بولنے میں ہی ہانپ ہانپ گئے اور چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پھر اسی وقت سجاول شاہ نے ایک اچانک فیصلہ کیا تھا اپنے دوست کو خوشی دینے کا... حالانکہ ایک دو دفعہ ان کے دل میں پہلے بھی یہ بات آئی تھی کہ وہ مہوین کا ہاتھ حسین شاہ کے لیے مانگ لیں مگر جس طرح سے سعد کا ان کے ہاں آنا جانا تھا' پھر جس طرح سے اسماعیل احمد اس کی تعریف کرتے' وہ دل مسوس کر رہ جاتے کہ جب گھر کا اتنا اچھا رشتہ موجود تھا وہ کیوں باہر بیٹی دے گا... چاہے کتنا گہرا دوست کیوں نہ ہو... مہوین یونی ورسٹی میں پڑھ رہی تھی اور جس طرح سے وہ باپ کی خدمت کرتی اسے دیکھ کر ہر بار' ہر چکر پر سجاول شاہ اپنے خیال کو پختہ کرنے کا سوچتے مگر ہر بار یہی سوچ آڑے آ جاتی کہ سعد سے ہی اس قسم کا کوئی رشتہ نہ ہو ان کا پھر حسین شاہ کی رائے لیے بغیر وہ کب کوئی قدم اٹھانا چاہتے تھے۔ ان کے بکھرے اور بگڑے گھر کو بھی تو ایسی ہی سلجھی ہوئی' سنجیدہ اور سمجھ دار لڑکی کی ضرورت تھی جیسی مہوین تھی۔ پھر آن کی آن میں انہوں نے بیٹے کو بتائے اور پوچھے بغیر وہ فیصلہ کر لیا جو پتا نہیں کس قسم کی تبدیلی ان کی زندگیوں میں لانے والا تھا مگر ایک بات طے تھی کہ اس بات نے بیمار' نڈھال اور کمزور اسماعیل احمد کے اندر ایک نئی جان دوڑا دی تھی۔

"تم... تم سچ کہہ رہے ہو شاہ... اللہ تمہارا بھلا کرے... میں تمہارا احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔ میری بچی بہت اچھی ہے۔ بہت صابر' سنجیدہ اور معاملہ فہم۔" وہ تیز تیز بولنے کی کوشش میں تھک گئے جب سجاول شاہ نے انہیں ٹوک دیا۔

"تمہیں یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے' نہ ہی یہ میرا احسان ہے کسی پر' یہ میری خوشی اور میرے دل کا فیصلہ ہے۔ بس جلدی سے ٹھیک ہو کر گھر آؤ اور بیٹی کو رخصت کرنے کی تیاری کرو۔" سجاول شاہ نے خوش دلی سے کہا۔ جواباً" اسماعیل احمد نم آنکھوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

✲ ✲ ✲
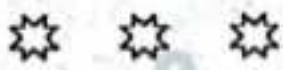
سلینہ احمد کو برا بھلا کہہ کر دو تین دن وہ احساس جرم میں رہا تھا' جب وہ اسے مسلسل کلاس میں نظر نہیں آئی تھی تب سوچا کہ کیا اس نے کچھ زیادہ تو نہیں کہہ دیا مگر جب اس کا رویہ اور باتیں یاد آئیں تو وہ خود کو شاباش دیتا کہ اس نے کچھ سخت الفاظ ضرور کہے ہیں مگر اس لڑکی سے پیچھا تو چھڑا لیا نا جو مسلسل اس کی نیک نامی کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھی۔ پھر ایک روز شام کو اسد نے اسے ایک خط دیا۔ ابا ہمیشہ اسے کال کرتے' پھر یہ کس نے...؟ اس نے سوچتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ موتیوں کی سی لکھائی میں وہ ایک خط تھا۔

حسین شاہ!

ہمیشہ خوش رہو اور وہ سب پانا تمہارے مقدر میں ہو جس کی امید رکھتے ہو۔ (آمین) کچھ لوگ زندگی میں ایسے ملتے ہیں جن کے بارے میں دل کرتا ہے جیسے ہم

انہیں چاہتے ہیں، وہ بھی ہمیں چاہیں اور ہم ان کی نظروں میں بہت بلند ہوں، بہت اونچے.... میری نظر میں.... میری زندگی میں تم بھی ایسے ہی شخص تھے جسے میں نے پورے دل سے چاہا اور جواب میں تم سے بھی وہی توقع رکھی.... مگر اچھا لگنا اور چاہنا تو دور کی بات، تم نے تو سلینہ خان کو اس کی نظروں سے ہی گرا دیا۔ میں جی نہیں پارہی ہوں سکون سے، یہ سوچ کر کہ تم مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھتے ہو۔

خدا کی قسم سلینہ خان کی زندگی میں اس کے دل پر ایک ہی شخص نے حکومت کی تھی اور وہ حسین شاہ تھا۔ میں شروع سے ہی مغرب میں رہی، انداز و اطوار اور لباس مغربی بے شک رکھا مگر اپنی عزت کے بارے میں ہمیشہ محتاط رہی۔ پھر ممی کی ڈیتھ کے بعد جب ہم پاکستان آگئے پاپا اور میں.... بوریت سے تنگ آکر میں نے ایم فل میں ایڈمیشن کی ٹھانی.... میرے پاپا کو مجھ پر اعتماد تھا، سو کبھی کسی قسم کی روک نہیں کی مگر تمہیں بتاؤں کہ تمہارا انداز، تمہارا بیک گراؤنڈ اور تمہارے خیالات جان کر میں نے مغربی ملبوسات کو اپنی زندگی سے ختم کردیا۔ تمہارا رویہ، تمہارا گریز، تم میں میری توجہ کو زیادہ کرتا گیا۔ میں نے تمہاری ہر سنگ دلی کے بعد خود پر پہرا بٹھانے کی بہت کوشش کی مگر دل جب ضد پر اڑ جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے سمجھا نہیں سکتی۔ میں نے سوچا تھا خود کو بدلتے بدلتے ایک روز تمہاری پسند میں ڈھل ہی جاؤں گی مگر تم نے کیا کیا۔ ہر بار میری محبت کے بدلے مجھے دھتکارا اور آخر میں بدکاری کی ٹھوکر لگادی۔ میں نے تمہاری آنکھوں، چہرے، زبان اور رویے کا ہر انداز برداشت کیا۔ تضحیک، بےزاری، بےرخی، نفرت بھی سہی مگر اب.... نہیں سہہ پارہی۔

خدارا میری طرف سے دل صاف کرلینا کہ سلینہ خان کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی، بس دل نے خوار کیا تھا۔ خدا نہ کرے جو تم بھی اس دل کے ہاتھوں مجبور ہو۔ تمہاری دنیا سے بہت دور دوبارہ مغرب کی فضاؤں میں لوٹ رہی ہوں جہاں ظاہر دیکھ کر کوئی باطن کی اچھائی برائی کا سرٹیفکیٹ نہیں تھماتا۔

خوش رہو۔

سلینہ خان....

ایک طویل سانس لیتے اس نے خط بند کرکے کتاب میں رکھا اور ابھی کچھ سوچنے کا موقع نہیں مل پایا تھا کہ ابا کی کال نے اسے متوجہ کرلیا اور دوسری طرف سے جو خبر انہوں نے سنائی اگرچہ غیر متوقع نہیں تھی مگر پھر بھی وہ اضطراری انداز میں کھڑا ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

نگی کا رو، رو کر برا حال تھا۔ جمیلہ چچی خود بھی بہت زیادہ پریشان تھیں۔ ہاتھ ملتے ملتے بار بار نگی کو کوسنے بیٹھ جاتیں۔

"مجھے تو کب سے تیرے تایا کی تیور بدلے بدلے نظر آرہے تھے کم بخت، کتنا کہا تجھے کچھ ہل جل لیا کر، اپنی تائی کے آگے پیچھے پھر.... زیادہ نہیں تو جب تیرا تایا گھر پر ہو تب ہی.... حالانکہ سارا کام تو بوا یا اس زرینہ نے سنبھالا ہوا ہے، صرف خیریت پوچھ لینے سے یا دو تین دفعہ اس غریب کے ہاتھ پاؤں دبا دینے سے مر نہیں جانا تھا تو نے۔ مالک بن جانا تھا اس گھر کا مالک.... اب بیٹھ کے روتی رہنا ساری زندگی۔" نگی کا رونا زیادہ شدت اختیار کرگیا۔

"یہ سارا کیا دھرا اس ذلیل انسان کا ہے۔ اسی نے رٹ لگائی ہوئی تھی، پڑھی لکھی لڑکی، پڑھی لکھی لڑکی، پھنسا لیا ہوگا کسی شہرن نے۔ تایا اب شرمندگی سے بیٹے کا نام تو نہیں لے رہا۔ دوست کی بیٹی والی بات خود ہی بنائی ہے اس نے۔ تم دیکھنا اماں میں اب میں حشر کروں گی اس حسین شاہ کا اور اس کی ہونی سوتی کا۔ مجھے ٹھکرایا ہے نا اس نے۔" نگی کا لفظ لفظ زہر میں بجھا ہوا اور نفرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں اور تنا ہوا چہرہ اس کے عزائم کا پتا بتا رہے تھے کہ اس نے دل ہی دل میں کچھ ٹھان لی ہے۔ تایا جی نے صبح ہی بتایا تھا کہ انہوں نے حسین شاہ کا رشتہ شہر میں اپنے دوست کی بیٹی سے طے کردیا ہے، سو اس سلسلے میں وہ

جلد ہی نگی اور جمیلہ چچی کو لڑکی اور گھر والوں سے ملوانے اور خریداری کے سلسلے میں لے جانے کی خواہش کا اظہار کر چکے تھے۔

"بھائی جی نگی بھی تو آپ کی ہی بچی ہے اور جب گھر میں رشتہ موجود ہو تو یہاں وہاں دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے آج تک اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہ سوچا' نہ کچھ کیا' سوچا یتیم بچی ہے۔ اپنا تایا ہی ہاتھ رکھ لے گا اور اپنی بہو بنا لے گا اور میں تو کتنی دفعہ اپنے میکے میں اس بات کا اعلان کر چکی ہوں کہ میری بچی اپنے ہی گھر میں رہے گی' ورنہ آپ کو تو پتا ہے کہ میرے بھرانے کتنی دفعہ نگی کے لیے ہاتھ پھیلایا تھا۔"

جمیلہ چچی کا پہلے تو تایا جی کی انتہائی غیر متوقع بات سن کر سکتہ ہی نہ ٹوٹا اور جب بات ان کی سمجھ میں آئی تو آخر اپنا مدعا بھی زبان پر لے ہی آئیں۔

بھابھی! میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ نگی کو میں نے بیٹی کہا ہی نہیں سمجھا بھی ہے۔ اس کی شادی بھی میری ذمہ داری ہے اور میں اپنی ذمہ داری نبھانا جانتا ہوں اور جہاں تک بات ہے حسین شاہ سے نگی کی شادی تو آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی کہ یہ وہ پرانا زمانہ نہیں رہا جب اولاد کو جس کھونٹے سے دل چاہتا تھا والدین باندھ دیتے تھے اور وہ بھی چپ چاپ اسی سے بندھے رہنے میں راضی برضا ہوتے تھے۔ آج کا زمانہ اور ہے' وقت بدلا ہے۔ وقت کے تقاضے بدلے ہیں۔ میرا بیٹا میرا بہت فرماں بردار سہی مگر اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ میں اس کی مرضی کے بغیر کرنے کے حق میں ہرگز نہیں ہوں۔ اس نے اپنی شریک حیات کے حوالے سے کسی بڑی خواہش کا اظہار نہیں کیا' بس یہی کہا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہو اور میرے خیال میں ایسی خواہش اس کا حق ہے۔ نگی میری بہو بنے اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی بات کیا ہوتی مگر اس نے تو پانچویں کے بعد پڑھ کے نہ دیا میری بہت خواہش اور کوشش کے باوجود بھی۔" جمیلہ چچی نے بے ساختہ پہلو بدلا۔ تایا جی کی بات اور نقطہ نظر بے حد واضح تھا۔

"آپ کے بھائی اب بھی نگی کے رشتے کے خواہش مند ہیں۔ اس پر غور کریں نہیں تو حسین شاہ کی شادی کے بعد ایک دو اور لوگوں نے کہا ہوا ہے رشتہ کے لیے۔ میں کچھ کرتا ہوں آپ فکر نہ کریں اور شہر چلنے کی تیاری کریں۔" اتنی دو ٹوک اور واضح بات کے بعد تایا جی نے کچھ اور چھوڑا ہی نہ تھا چچی جمیلہ کے پاس کچھ کہنے کو۔

ابا جی کا اتنی جلدی اس کی شادی کا فیصلہ لے لینا اسے عجیب سی الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ شہر پہنچ چکے تھے اور اب اسے لے جانا چاہتے تھے تاکہ ان کے ساتھ چل کر ایک دفعہ وہ لڑکی کو خود بھی دیکھ لے۔ حالانکہ وہ ایک دفعہ سرسری نظر سے اس کو دیکھ ہی چکا تھا اور ابا جی کے بتاتے ہی پل بھر ذہن کی اسکرین پر وہ خاموش اور جھکی نظروں والا چہرہ چمکا تھا جو ایک دو دفعہ اپنے والد کی طبیعت کا پوچھنے اور دوسری دفعہ چائے دینے کے لیے اندر آئی تھی مگر آج ابا جی اسے لے جا رہے تھے تو آج اس کی نظر کا زاویہ نظر اور تھا۔ اس دفعہ ان کا استقبال پہلے سے زیادہ شاندار ہوا تھا۔ انکل اسماعیل کی حالت سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس دن کی طرح آج بھی سعد ان کے گھر موجود تھا اور اسے وہ ملنسار اور پڑھا لکھا نوجوان اچھا لگا تھا جو مہوین کا خالہ زاد تھا' پھر کھانے کی ٹیبل پر وہ بھی گھبرائی شرمائی سی رہی۔ شاید اسے ان کی خصوصی آمد کا علم تھا جب ہی وہ کھانا کم کھا رہی تھی جبکہ پہلی بار جب وہ لوگ آئے تھے اس نے بغیر کسی تاثر کے ان دونوں کو سلام کیا تھا۔ اور آج بھی سلام تو کیا تھا مگر بے حد ہلکی آواز میں۔ پھر آنٹی کے ہی اشارے پر وہ وہاں سے جلدی اٹھ گئی تھی۔

"تو تم پڑھتی ہو حسین شاہ کے ساتھ.... ایسے تو نہیں اتاولے ہو رہے تایا اور حسین اس شادی پر... آخر ی تعلقات ہوں' تب ہی رشتوں تک بات آتی ہے' نہیں تو بچپن کی اتنی خوب صورت منگیتر کو کون چھوڑتا ہے۔" حسین کی چچی تو لیے دیے انداز میں بیٹھی تھیں' جب سے آئی تھیں۔ مہوین کی امی بے چاری ان کے ایسے رویے سے خواہ مخواہ شرمندہ

ہو رہی تھیں، جبکہ نگی سے صبر نہ ہو سکا اور ان سے مووین کا پوچھ کر سیدھی کچن میں آگئی۔ حالانکہ خود بھی اچھی خاصی تھی، مگر پھر بھی مووین کی خوب صورتی سے خائف ہوتے ہوئے فوراً" نتیجہ اخذ کیا کہ ضرور اس نے حسین شاہ کو اسی حسن سے پھنسایا ہو گا، جب ہی تابڑ توڑ اور کینہ توز سوالات کر کے اس کو بوکھلا ہی دیا۔ وہ جواں دو خواتین کی کیٹیلی نظروں سے بچ کر کچن میں آگئی تھی، پریشان ہی تو رہ گئی۔ حسین شاہ کے سنجیدہ اور وجیہہ چہرے نے کل سے جو سوچوں کو خوش رنگ پیرہن بخشا تھا فی الحال اس تیز سی لڑکی نے ان سوچوں کو وہیں پر آ کر جام کر دیا تھا۔

"دیکھیے۔۔۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے یونی ورسٹی میں ضرور پڑھا ہے مگر آپ کے چچازاد ہرگز میرے ساتھ نہیں پڑھتے، میں نے تو ان کو زندگی میں دوسری بار کل دیکھا ہے اور پہلی بار تو مجھے شاید وہ سرسری سی ملاقات یاد بھی نہیں ہے، جب وہ ابو کی عیادت کے لیے آئے تھے اور۔۔۔ اور۔۔۔ آپ کس منگنی کی بات کر رہی ہیں؟" دل ہی دل میں پریشان ہوتے ہوئے اس نے بظاہر رسان سے ہی دریافت کیا۔

"میں اور کون؟" نگی تڑخ کر بولی۔ "بچپن سے ہی رشتہ طے تھا ہمارا اب تو شادی ہونی تھی۔ نہ کوئی جھگڑا نہ کوئی تلخی بس پتا چلا کہ رشتہ کسی دوسری جگہ طے ہو گیا ہے، پتا نہیں تم شہری لوگ کیسے مزاج رکھتے ہو لڑکے کی اچھی شکل اور جائیداد کو ہی دیکھ کر ریجھ گئے۔ پتا تشا ہی بندہ کروا لیتا ہے کہ آنا" فانا" جو شادی پر اصرار ہے تو کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ بہرحال میرا فرض تھا بتانا، آگے تمہاری مرضی۔۔۔ یہ بتاؤ کہ فون شون پر بات تو ہوتی ہو گی۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ آج کل کے دور میں لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھے بغیر مان جائیں اور درمیان میں کوئی رابطہ بھی نہ ہو۔" دل کی ساری کھولن باہر نکال کر وہ اور طریقے سے ایک ہی بات اگلوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مووین جو حیران پریشان سی بس اس کی لن ترانیاں سنے جا رہی تھی کی

بے اختیار ایک طویل سانس نکل گئی۔

"دیکھیں یہ رشتہ خالصتا" میرے والدین۔۔۔"

"بس۔۔۔ بس۔۔۔ اب کتابی باتیں مت پڑھاؤ مجھے، سب پتا ہے۔" بدتمیزی سے اس نے مووین کی بات کاٹی۔ تب ہی سامان سے لدا پھندا سعد اندر چلا آیا۔ نگی کو مووین نے ساتھ دیکھ کر ٹھٹک گیا، پھر سلام کر کے اندر چلا آیا۔ پھر جیسے جیسے اس نے ٹرالی بنانے میں برتن نکالنے سے لے کر سیٹ کرنے میں مووین کی مدد کی ساتھ ہی ساتھ اپنے مخصوص انداز میں چٹکلے بھی چھوڑتا رہا۔ نگی کے تخریب کار ذہن نے ایک لمحے میں بہت دور تک کی سوچ لی اور اب تک جو تن کر بیٹھی خاصی تنقیدی نظروں سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہلکی پھلکی ہو کر بیٹھ گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان دونوں کو بھی ریلیکس کر دیا تھا۔

پہلے مووین اور بعد میں سعد بھی اس عجیب سی لڑکی کے عجیب و غریب انداز اور نظریں دیکھ کر الجھن سی محسوس کر رہے تھے۔ اب نگی کی نظر کرم سعد کے اوپر تھی۔ آخر کو تازہ تازہ بنائے گئے منصوبہ کی تکمیل کے لیے اسے پوری ہوشیاری سے کام لینا تھا۔

"ویسے ایسی محبت بہت کم کزنز میں دیکھنے میں نظر آتی ہے جیسے آپ دونوں میں نظر آ رہی ہے۔" وہ بظاہر مسکرا کر بولی۔

"ارے ایسی ویسی نگین بی بی۔۔۔ آپ کی ہونے والی بھابھی ایک ایسا تو تا ہیں جن میں ہمارے پورے گھرانے کی جان بند ہے، میں تو اس کی متوقع جدائی کا سوچ کر ایک دو دفعہ بے ہوش بھی ہو چکا ہوں۔ بس آپ سے اتنی گزارش ہے کہ اس کا بے حد خیال رکھنا ہے آپ نے۔" اور یہ بات تھی بھی ٹھیک، مووین اپنی عادات و حساسیت کے باعث دونوں گھرانوں یعنی اپنے اور سعد کے گھرانے کی پسندیدہ شخصیت تھی اور وہ جب سے رشتہ کی بات طے ہوئی تھی اسے بات بات پر اسے چھیڑتا رہتا تھا اور آج یہ سلسلہ نگی کے سامنے بھی جاری تھا، یہ جانے بغیر کہ ان کی معمول کے مطابق ہونے والی معمولی نوک جھونک ان کی آئندہ زندگی میں

کیا قیامت ڈھانے والی تھی۔

"پتا نہیں کیوں بھائی جی کے گھر کی ان دو خواتین کے تیور مجھے بے حد عجیب سے لگے اور باتوں باتوں میں انہوں نے اس رشتے پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا اور یہ بھی جتا دیا کہ حسین شاہ کی بات پہلے نگین سے طے تھی۔" رات کو اسماعیل احمد کی ٹانگیں دباتے ان کی نصف بہتر نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"ہاں مجھے بتایا تھا سجاول نے کہ ان کی بھابھی خواہش مند ہیں کہ ان کی بیٹی حسین شاہ کی بیوی بنے مگر حسین شاہ اپنی شریک حیات کے لیے کوئی پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی چاہتا ہے جو معاشرے میں اس کے ہم قدم تو چل سکے ساتھ ہی ساتھ اس کے بکھرے گھر کا شیرازہ بھی سنبھال سکے اور یہ بچی نگین ذرا لاابالی سی ہے اور تعلیم بھی واجبی سی ہے اس کی۔ جلد ہی سجاول کا اس بچی کی شادی کا ارادہ بھی ہے۔ سجاول شاہ کو اندازہ تھا کہ شاید ایسی ہی کوئی بات ان خواتین کی طرف سے نہ ہو' سو اس نے مجھے پہلے ہی ساری بات کھل کر بتا دی تھی۔ بس یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی' ورنہ سجاول کی بیگم کی حالت کا تو تمہیں پتا ہے ہی کہ بستر پر ہونے کے باعث ایک خاتون خانہ کا گھر اس کے بغیر کیسے متاثر ہو سکتا ہے۔" انہوں نے بتایا تو وہ کچھ مطمئن ہوئیں' ورنہ ان ماں بیٹی نے تو ان کو بے حد پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے چند دنوں میں ہی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ نگی کسی بے چین روح کی مانند یہاں سے وہاں پھرتی نظر آتی۔ اگرچہ مہوین کے دل میں شک کا ایک بیج وہ ڈال آئی تھی' مگر اب ویسی ہی بدگمانی کا ایک پودا حسین شاہ کے دل میں بھی اگانا چاہتی تھی' ہو سکتا ہے جو چیز قسمت اسے نہیں دینا چاہ رہی تھی وہ اس کی کوشش اسے دے دیتی لیکن حسین شاہ بات پکی ہونے کے بعد شہر سے ہی یونی ورسٹی چلا گیا تھا۔ اس کے ایم فل کے آخری تعلیمی مراحل تھے' سو وہ بری طرح مصروف تھا۔ مہوین بھی اس دن کے بعد بجھی بجھی سی تھی کہ جس شخص نے پہلی بار اس کے دل کی دہلیز کو چھوا تھا' اس کے بارے میں اس کی کزن نگین نے کیوں وہ سب کہا تھا جو وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر بار بار اس کے ذہن میں آکر وہ باتیں اس کی ذہنی پراگندگی کا باعث بنتی۔ ایک دن دل میں نہ جانے کیا آئی کہ ابو جی کے موبائل سے اس کا سیل نمبر لے لیا اور ابھی بات کیسے کرے گی اور کیا کہے گی جیسے بہانے سوچ ہی رہی تھی کہ وہ اپنے دوست کی بیوی کو ساتھ لے کر چلا آیا۔ باقی خریداری تو چچی اور نگی کر کے گئی تھیں۔ کچھ کرنے والی تھیں مگر شادی کا لباس وہ اپنی پسند سے لینا چاہ رہا تھا۔ سو اس کے لیے اسے پتا تھا اگر چچی اور نگی سے اگر کہے گا تو وہ اپنی عادت کے مطابق بات کا بتنگڑ بنا لیں گی' سو اویس کی ہی منت کی کہ بھابھی کو اس کے ساتھ بھیج دے۔ ابا جی سے وہ بات کر چکا تھا۔ انکل اور آنٹی نے بھی مسز اویس کو دیکھ کر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور مہوین کو ساتھ بھیج دیا تھا۔

نئے ہونے والے رشتے کا احساس تھا جب ہی ایک خوب صورت سی ڈور میں وہ دونوں خود کو ابھی سے بندھا محسوس کر رہے تھے۔ پھر اسی خوب صورت سے حصار میں قید دونوں نے اپنی شادی کے ڈریسز پسند کیے۔ مسز اویس خاصی سمجھ دار اور ہنس مکھ خاتون تھیں' جب ہی حسین شاہ خریداری کے بعد ان کو ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا تو کھانے کے بعد ہلکی پھلکی گپ شپ جب چل رہی تھی تو نہ جانے ان کو کوئی شناسا نظر آئی تھیں یا وہ ویسے ہی ان دونوں کو تنہائی کا موقع دے کر خود ہی اٹھ گئی تھیں۔ حسین شاہ نے دل ہی دل میں ان کا بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی سمجھ داری کو سراہا اور مہوین کی جانب متوجہ ہوا۔ ساری زندگی صنف مخالف سے دور بھاگنے والا حسین شاہ حیران تھا کہ اچانک اس کا دل کیسے اس ایک اجنبی لڑکی کا اسیر ہو گیا' جس سے اس کی شناسائی صرف دو سرسری سی ملاقاتوں تک محدود تھی۔ وہ سر جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو تکے جا رہی تھی۔ اس

کے کھنکارنے پر نگاہ اوپر کی اور اسے مسکرا کر خود کو دیکھتا پاکر خود ہی دوبارہ پلکوں کی چلمن گرادی۔

"آپ کا نام بہت خوب صورت ہے مہوین' بالکل آپ کی طرح یا شاید جو انسان دل کو بھا جائے اس سے متعلق ہر چیز ہی پیاری لگتی ہے۔" وہ نہ تو اتنا باتونی کبھی رہا تھا' نہ ہی بے باک مگر پتا نہیں کیسے یہ سب اس کے منہ سے نکل گیا۔ اے محبت کیا چیز ہے تو بھی۔ اس نے دل ہی دل میں محبت نامی جذبے کو مخاطب کرتے مہوین کے سرخ چہرے کو تکا۔

"ابو..... ابو نے رکھا تھا میرا نام....." کوئی اور بات نہ سوجھی تو اس نے آہستہ سے کہہ دیا۔

"میں ساری زندگی پیار محبت جیسے الفاظ کا مذاق اڑاتا رہا ہوں مہوین اور آج کل یہ لفظ میرا مذاق اڑاتے میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں' جب جب آپ کی تصویر آنکھوں میں آن ٹھہرتی ہے اور دل کی ہر دھڑکن آپ کا نام لیتی ہے..... حالانکہ محبت جیسی چیز کو کچھ دن پہلے تک میں خرافات کے نام سے جانتا تھا۔ اس لیے تمام عمر نہ تو کسی لڑکی میں دلچسپی لی' نہ ہی کبھی کسی کے حوالے سے کچھ خاص جذبہ محسوس ہوا۔ اس لیے تو اپنی شادی کا تمام اختیار اماں اور اب اباجی کو سونپ رکھا تھا۔" وہ مسکرایا۔

"نگی..... نگی بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ آپ کی کزن بھی ہے اور..... آپ نے اس سے کیوں.....؟" وہ جو ایک انوکھے احساس کے ساتھ اس کے دل نشین لہجے اور محبت کے احساس کو دل میں اتار رہی تھی کہ دل و دماغ کے دریچوں پر اونگھ میں پڑی نگی کی کچھ نوکیلی باتیں ٹکرائیں تو محبت کے خمار کے روپہلے احساس کو ہلکی سی چوٹ لگاتا شک کا کیڑا دھیرے سے جھانکا اور کب سے دل میں پلتے اندیشے اپنے اظہار کی راہ ہموار پاکر زبان سے ادا ہوگئے۔ حسین شاہ جو ایک البیلے احساس کے زیر اثر تھا' محبت کے جواب میں نہ سہی' ایک معنی خیز خاموشی سے ہی کچھ اخذ کیے بیٹھا تھا جیسے بدمزا ہوگیا۔

"یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟" تاہم اس نے اپنے لہجے کو ویسے ہی نرم رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بس ویسے ہی اچانک دماغ میں ایک بات آئی تو پوچھ لی۔" اس نے لہجے میں قصداً "لاپروائی سموئی' جیسے ویسے ہی کوئی آوارہ خیال کسی سے شیئر کرلیا جائے۔

"نگین' بہت اچھی لڑکی ہے مہوین۔ خوب صورت بھی مگر ہر انسان کا معیار خوب صورتی یا دولت نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک زندگی کی ترجیحات میں عورت کی شرم و حیا اس کا کردار اور اس کی تعلیم میٹر کرتی (معنی رکھتی) ہے۔ خدانا خواستہ نگین میں کہیں بھی کوئی کمی یا خامی نہیں ہے مگر وہ امیچور سی سوچ کی ایک لاپروا لڑکی ہے۔ تعلیم جس کی ترجیحات میں آخری نمبر پر بھی نہیں ہے' پھر یہاں بات میری اماں کی بھی آجاتی ہے' ان کی جو حالت اس وقت ہے اس کے لیے ایک سمجھ دار' میچور اور احساس ذمہ داری رکھنے والی بہو کی ضرورت ہے۔ ابا کا آپ کے گھر تب سے آنا جانا ہے جب ہم لوگ بہت چھوٹے تھے اور ان کا کہنا ہے کہ جو لڑکی اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے بیمار والد کی تندہی سے تیمارداری کرتی ہو وہ اپنی ساس کو بھی یقیناً "اپنی ماں کی جگہ پر رکھ کر سوچے گی۔" وہ جو اس کی ساری بات دھیان سی سن رہی تھی' ساس کہنے پر شرما گئی۔

پھر اس دن مہوین خوابوں کا دھنک رنگ آنچل اوڑھ کر گھر آئی تھی جس پر جا بجا حسین شاہ کی محبت کے جگنو جڑے جگمگ کررہے تھے۔ پھر گزرتے ہوئے مصروف دنوں میں حسین شاہ جیسے ہی یونی ورسٹی سے فارغ ہوکر گھر آیا۔ شادی کے فنکشنز شروع ہوگئے تھے۔ وہ اپنی تعلیم کو اپنے لوگوں' اپنی زمین کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں تھا۔ جب ہی وقت ضائع کیے بنا ابا کے ساتھ اپنی زمینوں پر رہتا۔ زمینوں کا جائزہ لے کر اس نے لائحہ عمل تیار کرلیا تھا کہ اپنے کسان اور اپنی زمین کو کیسے فرسودہ طریقوں سے نجات دے کر نئے طریقے اور نیا لائحہ عمل دینا تھا' جس سے وہ سب خوش حال ہوسکیں۔ ویسے بھی ان کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی' اباجی اس کی باتیں سن کر بہت خوش

ہوئے اور خوشی سے اس کا کندھا تھپتھپا کر اپنی پوری سپورٹ فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔

اس رات بھی وہ دیر سے واپس آیا تھا۔ حویلی میں لگی سارے دن کی خوب صورت گہما گہمی اب ماند پڑ چکی تھی۔ حسب معمول وہ پہلے اماں کے کمرے میں گیا۔ ابھی کل ہی تو وہ انہیں شہر ایک بار پھر ڈاکٹرز کو دکھا لایا تھا جن کی آج بھی اماں کے بارے میں وہی احتیاط اور علاج تھا جو پہلے دن تھا۔ مسلسل احتیاط، فزیو تھراپی اور دیکھ بھال سے ہی وہ ایک طویل عرصہ میں واپس اپنی ویسی حالت میں تو نہیں، بہرحال کچھ بہتر ہو سکتی تھیں۔ زرینہ (ملازمہ) اور بوا اماں کے پاس ہی تھیں جبکہ جب سے حسین شاہ کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی چچی جمیلہ جو پہلے اپنی غرض کے سلسلے میں ہی سہی جھانک لیتی تھیں، اس سے بھی گئی تھیں۔ سجاول شاہ اگر اپنے گھر کے بارے میں پریشان تھے تو ٹھیک ہی پریشان تھے اپنی بھابھی کی لاپروا فطرت و عادت سے آگہی تھی انہیں۔ گھر میں بوا کا وجود غنیمت تھا جس نے ان کے گھر کا انتظام و انصرام صحیح طور سے نہ سہی بہتر طریقے سے تو سنبھال ہی رکھا تھا۔

حسین شاہ آنے والے دنوں کے حسین خیالوں میں کھویا سونے کی تیاری میں تھا جب نگی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ بے اختیار چونک گیا۔ اس دن کی زبردست جھاڑ کے بعد اس کا آج اس سے سامنا ہو رہا تھا۔ اس کی وقت بے وقت ٹپک پڑنے والی عادت سے سخت چڑ تھی اسے، جب ہی ماتھے پر تیوریاں پڑ گئی تھیں۔

"کوئی کام تھا اس وقت...." وہ وال کلاک پر دانستہ وقت دیکھ کر بولا۔ اگرچہ گھڑی پر نو ہی بجے تھے مگر دیہات کے حوالے سے دیکھا جاتا تو آدھی رات تھی۔" وہ کچھ نہیں.... بس ویسے بہت دن بعد تم نظر آئے تو سوچا سلام دعا کر لوں۔"

"ٹھیک ہے، میں تھک گیا ہوں، آج آرام کرنا چاہ رہا ہوں۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کرتی جانا۔" وہ جھک کر جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے بولا۔

"خاصی خوب صورت ہے تمہاری ہونے والی بیوی، حسن سے متاثر ہونے والے تو تم ہو نہیں، پھر کس چیز پر ریجھ گئے اس کی۔" اس کی ہدایت کو خاطر میں لائے بغیر وہ صوفے پر ٹک گئی۔ حسین شاہ نے تیز نظروں سے گھورا تھا اسے۔

"اسے میں نے نہیں پسند کیا تھا۔ ابا کے دوست کی بیٹی ہے، انہوں نے رشتہ طے کیا ہے، بس؟ یا ابھی بھی کوئی انویسٹی گیشن باقی رہ گئی ہے۔" وہ تلخ ہوا۔

"تم بھی شہر میں وہ بھی شہر میں.... ملاقاتیں بھی خوب ہوتی ہوں گی۔"

"نگین!" وہ زور سے بولتا کھڑا ہو گیا۔ "ہزار بار تم سے کہا ہے کہ اپنی حدود میں رہ کر بات کیا کرو۔ اپنے ذہن کی فضول خرافات کو دوسروں پر لاگو کرنے کی کوشش مت کیا کرو۔ جاؤ اور آئندہ اس وقت میرے کمرے میں مت آنا۔ میں ایسی بے تکلفی ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

"ہاں تو سارے اصول و ضوابط اور شرافت کے سبق میرے لیے پڑھ رکھے ہیں تم نے، اپنی ہونے والی کے تعلقات اور انداز بھی کبھی تمہیں نظر آئیں گے اور جب نظر آئیں گے، تب تم صرف پچھتاؤ گے۔ کیونکہ جو بے تکلفی اور انداز تمہاری مہوین کا میں نے اس کے کزن سعد کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ اگر تم دیکھ لیتے تو...."

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ کیا دیکھا ہے تم نے....؟ بلند دھاڑ کے ساتھ اس کے الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ نگی کی بات پر ذرا برابر بھی یقین نہ ہوتے ہوئے بھی کوئی بات پن کی طرح زور سے چبھی تھی اسے، وہ اس کا بازو تھامے سرخ آنکھوں کے ساتھ اپنے سوال کا جواب مانگ رہا تھا۔

"محبت، جو ان دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے تھی، بے تکلفی جو ایک دوسرے کے رویے میں تھی۔ سعد نے کہا تھا مہوین تو تا ہے۔ جس میں اس کی جان بند ہے۔"

"بکواس کرتی ہو تم.... جھوٹ بولتی ہو...."

لڑکھڑاتے لہجے میں کہتے اس نے نگی کا بازو چھوڑ دیا۔ نگی کے دل میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگ کوئی پھوار سی برسا گئے۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں حسین.... میری پوری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ جیسے کہو گے ویسی بن جاؤں گی۔ اس لڑکی کو تم جانتے بھی نہیں اس کی عادت، خاندان، کردار....."

"بس اس سے آگے ایک اور لفظ مت کہنا۔" اس نے ایک تھپڑ مار کر اسے خاموش کرا دیا تھا۔ نگی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے خود کو گھورتے حسین شاہ کو دیکھا اور روتے ہوئے خود تو بھاگ گئی، زہریلی سوچوں کے کئی در حسین شاہ کے لیے وا کر گئی جو اس کی سنہرے اور خوش نما خوابوں کو بھی زہریلا کرنے والے تھے۔

☆ ☆ ☆

دو دن بعد اس کی شادی تھی اور آج وہ لڑکی مہوین کے لیے کیسی زہریلی فصل بو گئی تھی، جس کو آکر اس نے کاٹنا تھا۔ حسین شاہ کے لیے وہ رات جیسے بے حد طویل ہو گئی تھی۔ کبھی وہ نگی کی فطرت اور فضول گوئی کی عادت کے تناظر میں بات کو تولتا تو اسے سراسر جھوٹ لگتا سب کچھ.... پھر سوچتا کہ نگی جتنی بھی دیدہ دلیر سہی اتنی بڑی بات بغیر سنے یا دیکھے کیسے کر سکتی ہے۔ پھر سوچتا ہو سکتا ہے، صرف سعد کا رجحان بھی تو ہو سکتا ہے۔ مہوین کا بھی اگر ہوتا تو وہ اس دن اتنی خوش نظر کیوں آتی۔ نہ ہی اس کے والدین اتنے کنزرویٹو (قدامت پسند) تھے کہ اپنی پسند اپنی بیٹی پر ٹھونس دیتے۔ پھر اپنی سوچوں میں ڈوبے تمام رات گزر گئی تھی۔ نگی اسے پھر نظر نہیں آئی تھی اور ان ہی دنوں میں اس کی شادی کا دن آن پہنچا۔ اس کی اور اپنی پسند کے خوب صورت لباس میں خود کے لیے سجی سنوری مہوین کو دیکھ کر وہ ہر الجھن اور ہر پریشانی بھول گیا۔ یاد رہا تو صرف اتنا کہ وہ خوب صورت گڑیا جیسی مہوین اس کی ہے۔ وہ اپنی زندگی کا من پسند ساتھی پا کر بے حد مسرور تھا۔

"میں نے خود کو ہمیشہ اپنی شریک سفر کے لیے سنبھال کر رکھا۔ اپنی محبتیں، اپنی وفائیں سب کچھ، بدلے میں مجھے تم سے بھی ایسی ہی محبت، ایسی ہی وفا کی توقع ہے مہوین۔" وہ اس کے سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولا تھا۔ مہوین کا سر کچھ اور جھک گیا۔

"لڑکی کا پڑھا لکھا ہونا میری شرط تھی مگر تمہارا انتخاب ابا جی نے کیا تھا کہ یہی لڑکی ہمارے گھر کو سنبھال سکتی ہے۔ ان کے انتخاب کو ان کے فیصلے کو تم کتنا صحیح ثابت کرتی ہو، اب یہ تم پہ ہے۔" اس نے مزید کہا۔

"آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" آہستہ سے کہے گئے الفاظ حسین شاہ کو مسرور کر گئے تھے۔

اس رات کی صبح بہت ہی حسین تھی۔ مہوین کی آنکھ منہ اندھیرے ہی کھلی تھی۔ گہری نیند سوئے ہوئے حسین شاہ پر اس نے ایک چور نظر ڈالی، پھر خود ہی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے موبائل کی مدھر بیل پر اس کے حنائی ہاتھ اپنے گولڈن پرس کی طرف بڑھ گئے۔ وہ فون کی آواز ہی تھی جس نے حسین شاہ کی گہری نیند میں بھی خلل ڈالا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے پاس بیٹھی مہوین کو دیکھ کر کسی خوب صورت احساس میں گھر کر اس نے ذرا سا اٹھتے ہوئے اسے اپنے قریب کیا۔ مہوین محجوب ہوتے ہوئے دوسری طرف کی کال سننے لگی۔

"بالکل ٹھیک، تم سناؤ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"نہیں، ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ میری زندگی کے اس قدر خاص دن پر تم کہیں اور کیسے جا سکتے ہو۔" اب کے دوسری طرف کی بات سنتے ہوئے اس کے لبوں پر کھیلتی شرمیلی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

"انٹرویو بعد میں بھی دیا جا سکتا ہے۔ میری زندگی میں یہ دن بار بار نہیں آئے گا۔ تم نہ آئے تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔" حسین شاہ کی گرفت اس پر ڈھیلی پڑ گئی۔ اپنے والدین سے تو وہ اس لہجے میں بات نہیں کر سکتی تھی۔ تو کیا سعد؟ وہ اٹھ بیٹھا۔

"مجھے پتا تھا تم میری ناراضی برداشت نہیں کرسکتے۔" اب وہ مسکرا رہی تھی۔ اپنے ایک رات کے محبوب شوہر کو بھول کر وہ اپنے کزن میں مگن تھی' یہ جانے بغیر کہ حسین شاہ کی پیشانی شکنوں سے بھرتی جا رہی ہے۔ عام حالات میں شاید وہ اس بات چیت کو عمومی معنی میں لیتا مگر اس وقت نگی کے کہے الفاظ ایک بار پھر ذہن کی روشن اسکرین سے ٹکرا کر اس کے سارے خوش گوار احساسات کو ساتھ بہا کر لے گئے۔

واش روم کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا تو مہوین چونکی تھی۔ کب وہ اس کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا اسے پتا ہی نہ چلا۔ امی' ابو' خالہ' خالو اور سعد آج ولیمہ کی تقریب میں شرکت کے لیے تھوڑی دیر تک شہر سے گاؤں کی طرف روانہ ہونے والے تھے۔

حسین شاہ جب فریش ہو کر باہر آیا تو اس کا موڈ پہلے والے موڈ سے یکسر مختلف تھا۔ اب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال بنا رہا تھا۔ جب مہوین کی نگاہ اس کی جانب اٹھی۔

"میری بات کی کتنی اہمیت ہے تمہارے نزدیک۔" آئینے میں ہی اسے دیکھ کر خاصی سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔ مہوین الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھے گئی۔ شادی کے بعد کی اولین صبح یہ کیسا سوال تھا؟

"اگر ہے تو آئندہ تم کبھی موبائل استعمال نہیں کرو گی۔ اپنے ماں باپ کے گھر نہیں جاؤ گی' اگر بات انکل آنٹی سے کرنی ہوئی تو میں خود اپنے سیل سے کرا دیا کروں گا۔"

"مگر کیوں؟" اس کی عجیب و غریب خواہشات کے جواب میں بے ساختہ ہی مہوین کے منہ سے نکلا۔

"بس یوں سمجھو تمہاری محبت کا امتحان ہے یہ۔۔۔۔" طویل سانس لیتے اس نے کہا تو مہوین کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ شاید وہ یہ سمجھی تھی کہ وہ اتنی محبت کرنے لگا ہے اس سے کہ اس کا دور جانا برداشت نہیں کرے گا مگر موبائل کے استعمال پر پابندی؟ وہ الجھ گئی۔ دوپہر تک اس کے امی' ابو' خالہ' خالو اور سعد بھی پہنچ گئے تھے۔

"یار مہوین ایک ہی دن میں تمہارے بغیر ہم اداس ہو گئے تھے۔ اتنا عادی کر ڈالا ہے تم نے اپنا ہمیں۔" سب سے ملنے کے بعد جب سعد نے اس سے کہا تو حسین شاہ کے لب بے اختیار بھنچ گئے۔

"ہاں بیٹا! سعد واقعی ٹھیک کہہ رہا ہے' بیٹیاں جب تک اپنے گھروں کی نہ ہو جائیں تب بھی والدین کو ان کے نصیب کی فکر سونے نہیں دیتی اور جب اپنے دہلیز کی چوکھٹ پار کر جائیں تب بھی ساری رونق ساتھ سمیٹ کر لے جاتی ہیں۔" امی کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

"آپ بھی بیٹے کے سر پر سہرا سجا لیں۔" چچی جمیلہ نے خالہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ لڑکا مانے تب نا۔ جس دن اس نے ہاں کہہ دی اسی دن بات پکی کر کے آجاؤں گی۔ نہ خود کسی کا نام بتاتا ہے' نہ ہمیں کہیں پیش رفت کرنے دیتا ہے۔" وہ ماؤں والی مخصوص پریشانی سے بولیں۔

"کیوں بیٹا' کوئی لڑکی ہے تو بتا دو اپنی امی کو۔ ورنہ انہیں ہی کوئی لڑکی پسند کرنے دو۔ بڑے ارمان ہوتے ہیں ماؤں کے بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کے۔" اصل میں چچی جمیلہ کو سعد کسی اور مقصد کے لیے بھی پسند آیا تھا۔

"ارے نہیں آنٹی' ایسی کوئی بات نہیں' بس کچھ دن اپنے کیریئر کو دے کے پھر ہو جائے گی شادی بھی اور جہاں تک بات ہے لڑکی کی تو وہ تو۔۔۔ میری سہیلی مہوین ہی پسند کرے گی۔" اس نے مسکرا کر حسین شاہ کے پہلو میں بیٹھی مہوین کو دیکھا جو اسے کچھ الجھی سی لگی تھی۔ اس کی بات پر باقی سب تو مسکرا دیے' جبکہ حسین شاہ ایک جھٹکے سے اٹھا۔

"آپ لوگ باتیں کریں' میں ذرا ولیمہ کے انتظامات دیکھ لوں۔" نگی بھی کچھ دیر قبل ہی یہاں ملازمہ کے ہمراہ کھانے پینے کے کچھ لوازمات لے کر آئی تھی بموا کے کہنے پر بادل ناخواستہ ہی سہی مگر یہاں آکر گفتگو کا موڈ اپنی پسند کا دیکھ کر اس نے حسین شاہ کی

طرف ایک جتاتی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ اچھالی تھی' جس کی تاب نہ لاکر وہ یہاں سے چلا گیا تھا۔

مہوین کو تیار کرنے شہر سے بیوٹیشن آئی تھی۔ ولیمہ کی تقریب میں مردانہ اور زنانہ فنکشن الگ الگ تھا۔ سعد حسین شاہ سے آج مل کر حیران رہ گیا تھا جب اس کا بے حد کھنچا کھنچا سا رویہ دیکھا تھا اور رات کو تقریب ہو جانے کے بعد وہ لوگ فوراً" ہی واپس جانا چاہتے تھے جب سجاول شاہ کے اصرار پر انہیں ایک اور رات رکنا پڑا تھا۔

اگلی صبح وہ بہت حیران ہوئیں جب بیٹی کی بات سنی تو۔ "مگر بیٹا ولیمہ کے بعد دلہن کو میکے والے ایک دن کے لیے لے کر جاتے ہیں۔ یہ رسم ہے ہماری اور تمہیں جانا ہو گا ہمارے ساتھ۔ ایک دن ہی کی تو بات ہے۔ تمہاری ساس بہت دنوں سے بیمار ہیں' پہلے بھی تو ہو رہا تھا ان کا علاج اور تیمارداری ایک دن اور بھی ہو جائے گی۔ کیا حسین شاہ نے تمہیں منع کیا ہے؟" بولتے بولتے وہ شک سے بولیں تو مہوین گڑبڑا گئی۔

رات حسین شاہ نے ایک بار پھر اسے یاد دہانی کروائی تھی کہ اگر اس کے دل میں اس کے لیے ذرا برابر بھی جگہ ہے تو وہ اسے ایک پل کے لیے بھی چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ مہوین اسے اپنی خوش بختی سمجھی تھی اور اپنی محبت اور تعاون کا بھرپور یقین دلایا تھا اسے۔ پھر پتا نہیں کیا کیا دلائل دے کر اس نے امی کو قائل کر ہی لیا تھا کہ وہ اسے لے کر نہیں جائیں گی۔

محبت اور شک ایک ہی شخص کے لیے دل میں کیسی قیامت بپا کرتے ہیں' اسے یہ بات انہی دنوں پتا چل رہی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ مہوین کی طرف بڑھتا تو کبھی سلینہ خان کی بددعا یاد آتی' تو کبھی نگی کے طنزیہ و کٹیلے جملے۔ یوں کبھی شک کا پلڑا بھاری پڑ جاتا تو اس کا دل کرتا کہ مہوین کو جھنجوڑ کر اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دے۔ محبت بھی کیسے رسوا کرتی ہے۔ اسے آج کل بات بے بات سلینہ خان یاد آتی۔ جب جب مہوین کی طرف بڑھتا۔ "کیا تمہیں یقین ہے حسین شاہ کہ تمہاری زندگی میں آنے والی لڑکی ویسی ہی خالص ہو گی جیسی تم چاہتے ہو؟" اس کے لکھے گئے الفاظ اس کا منہ چڑاتے۔ وہ بے بسی سے مٹھیاں بھینچ کر رہ جاتا۔

☆ ☆ ☆

مہوین حسین شاہ کے دھوپ چھاؤں سے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کبھی وہ کسی مہربان بادل کی مانند پورا برس جاتا کہ وہ اس کی محبتوں سے پور پور سیراب ہو اٹھتی اور کبھی کسی چٹان کی مانند سخت ہو جاتا کہ اسے لگتا وہ اس چٹان سے سر پٹخ پٹخ کر مر جائے گی۔ ایسے میں اس پر بے پناہ ذمہ داریاں بھی تھیں۔ حسین شاہ کے گھر کو واقعی ایک سمجھ دار' سلیقہ مند عورت کی ضرورت تھی۔ چچی اور ان کی بیٹی کو صرف گھومنے پھرنے' گاؤں کی عورتوں کو جمع کر کے باتیں بگھارنے اور قصے سننے اور سنانے کے علاوہ کوئی کام ہی نہ تھا۔ بوا کا دم غنیمت تھا جو وہ ہر چیز اور کام دیکھتیں۔

اماں جی کی ذمہ داری اس نے تیسرے دن سے ہی سنبھال لی تھی۔ شادی کے دوسرے دن ہی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس لایا تھا۔

"اماں! یہ دیکھیں آپ کی بہو' آپ کی بیٹی اور آپ کے حسین شاہ کی دلہن' آپ کہتی تھیں میں اپنے حسین کی چاند سی دلہن لاؤں گی۔ دیکھیں تو میں نے آپ کی خواہش کو پورا کر دیا۔" ان کی بے بس آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں اور منہ سے کچھ بے معنی آوازیں نکلیں۔ مہوین خود ہی اس کا ہاتھ چھڑا کر اماں جی کے بے حد قریب آ گئی اور ان کا ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

"میں آ گئی ہوں نا اماں جی۔۔۔ آپ روئیں مت۔۔۔ میں اللہ سے دعا کروں گی کہ ہماری اماں جی کو صحت مند و تندرست کر دیں' جیسے وہ پہلے سے تھیں۔ اللہ سے جو دعا سچے دل سے مانگیں وہ سنتا ہے نا اماں جی۔۔۔" ان کی بے بسی نے اس کے اندر ایسا گداز پیدا کیا کہ ان کے ہاتھ تھامے وہ روتی گئی اور جو جذبات دل میں ابھرتے گئے انہیں لبوں سے ادا کرتی گئی۔ اماں جی کے آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر کنپٹیوں پر بہہ گئے تھے۔

حسین شاہ کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ پھر اسی دن سے مہوین نے اماں جی کی خدمت کے ساتھ ساتھ گھر کے بگاڑ کو بھی سدھارنے کا تہیہ کرلیا۔ اس دن بھی وہ ان کو زرینہ کی مدد سے کپڑے تبدیل کروا کے ان کے ہاتھ اور متاثرہ ٹانگ کی ورزش کروا رہی تھی جب حسین شاہ تیزی سے اندر آیا تھا۔ تندہی سے اور محبت سے اسے اماں جی کے ساتھ مصروف دیکھ کر اسے اس پر بے ساختہ پیار آیا تھا۔

"یہ لو بات کرو۔" اس نے موبائل مہوین کی طرف بڑھایا' مہوین نے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے موبائل تھام کر کانوں سے لگایا۔ دوسری طرف سے امی تھیں۔ جو اس طرح بھلا دینے پر اس سے شکوہ کررہی تھیں۔ اگرچہ حسین شاہ ان سے صبح شام اس کی بات کروا رہا تھا مگر پھر بھی وہ خفا تھیں کہ شادی کو پندرہ دن گزر جانے کے بعد وہ ایک دن بھی پلٹ کر میکے نہیں آئی۔

"آؤں گی امی' بہت جلد آؤں گی۔ آپ جانتی تو ہیں اماں جی کی حالت کو۔" اس نے پھر کہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد موبائل بند کرکے اسے پکڑا دیا تھا۔ اماں جی اب دوائیوں کے زیر اثر سوتی جارہی تھیں' جب حسین شاہ نے اسے چائے بنا کر اپنے کمرے میں لے آنے کو کہا۔ وہ ملازمہ سے چائے کا کہہ کر خود کمرے میں آگئی۔

"آج کیسے صاحب بہادر دن کی روشنی میں نظر آرہے ہیں۔" یہی سوچ کر وہ اندر آئی تھی مگر بے حد حیران رہ گئی جب اس نے بے حد نرمی سے اسے تھام کر ایک محبت بھری مہر اس کے ماتھے پر ثبت کی اور آہستہ سے تھینک یو میری جان کہا۔ مہوین اندر تک شانت ہوگئی۔

اس گھر کو اور مجھے' واقعی میں تم جیسی لڑکی ہی کی ضرورت تھی۔ جس طرح تم نے اماں جی کو اور......"

"بس کریں حسین؟ وہ نرمی سے اسے ٹوک گئی۔

"یہ میرا گھر ہے اور وہ میری ماں نہیں تو ماں جیسی ہیں۔ میں صرف اپنی ذمہ داری نبھارہی ہوں اور کچھ نہیں۔" اس کا اس طرح بولنا اسے بہت اچھا لگا' جب ہی مسکرا کر اسے سنتا رہا۔

"مگر ایک شکایت اب بھی ہے۔" اس نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

"وہ کیا......" وہ الجھی۔

"وہ یہ کہ آپ کی شادی کو ابھی پندرہ دن ہوئے ہیں' پندرہ سال نہیں' اس لیے مجھے ہر پل اپنی بیوی اپ ٹو ڈیٹ نظر آئے۔ تم نے تو شاید کپڑے بھی کل والے پہنے ہوئے ہیں۔ ایسا کرو دس منٹ میں تیار ہوکر آؤ۔"

وہ تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولا' پھر جلدی میں حکم صادر کرتا خود باہر نکل گیا' مہوین شرمندہ ہوگئی' واقعی وہ صرف پہلا ہفتہ ہی دلہنوں کی طرح تیار ہوکر رہی تھی۔ اس کے بعد صرف کپڑے تبدیل کرکے ہلکی سی لپ اسٹک ہی لگالیتی اور کبھی وہ بھی نہیں بھاری زیورات اسے ویسے پسند نہیں تھے۔ صرف گلے کی وہی چین جو حسین شاہ نے اسے شادی کی رات تحفہ دیا تھا۔ گلے میں رہنے دی تھی یا پھر بوا نے زبردستی کرکے جھمکیاں کانوں میں ڈلوائی تھیں کہ وہ سجاول شاہ کی اکلوتی بہو ہے اور ان کے ہاں کی دلہنیں تو کئی کئی بچوں کی مائیں ہوکر کئی سیر سونا لادے رکھتی ہیں اور وہ ہے کہ ایسے سونے کان اور کلائیاں لے کر گھومتی ہے۔ وڈی بی بی اپنے ہوش میں ہوتیں تو دیکھتیں تمہیں کیسے گڑیا کی طرح سجا کے رکھتیں۔ خود بھی ماشاء اللہ بہت شوقین تھیں کپڑے زیور کی۔ یہ بھر بھر کر کلائیاں چوڑیاں ڈالے رکھتیں۔ مہندی سے کبھی ہاتھ خالی نہ رہے ان کے۔ بوا اسے اس کی ساس کی باتیں سناتے ہوئے کہتیں تو وہ مسکرا دیتی۔ ہاں چچی جمیلہ نے ایسی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ بس تنقیدی نظروں سے جائزہ ہی لیتی رہتیں اگر جو کبھی گھومنے پھرنے سے فرصت مل جاتی تو۔ اسی طرح ان کی بیٹی کے مشاغل تھے۔ دوستیاں' گھومنا' پھرنا' کھانا اور سونا ان کی نظروں میں تو عجیب سا طنز اور کاٹ ہوتی تھی اس کے لیے......

پھر اسے کتنے دن بعد اس طرح تیار دیکھ کر وہ مبہوت رہ گیا۔

"کیا خیال ہے شہر جانے کا پروگرام ملتوی نہ کردیا

جائے۔" وہ سرگوشی کرتا اس کے قریب آیا۔ جبکہ شہر کا سن کر مہوین خوشی سے چیخ پڑی۔

"کیا ہم گھر جارہے ہیں۔ امی کے گھر جائیں گے نا؟" بے تابی بھرے لہجے پر حسین شاہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ اپنے خود ساختہ شک کی بنا پر پتا نہیں وہ صحیح کر رہا تھا یا غلط۔ بہرحال وہ دن ان کی زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ امی 'ابو ان کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے۔

"امی سعد کو کال کرکے بتائیں نا میں آئی ہوں۔" تھوڑی ہی دیر میں اس نے بے چینی سے کہا مگر اس بار حسین شاہ مطمئن بیٹھا رہ گیا۔ تاہم کچھ سنجیدہ ضرور ہو گیا تھا۔ اصل میں سعد جب سے مہوین کا نمبر بند تھا۔ تشویش میں مبتلا تھا اور گاہے بگاہے حسین شاہ کے نمبر پر کال کرتا رہتا تھا۔ اس نے انکل آنٹی سمیت سب کو کہا تھا کہ مہوین کا سیل ٹوٹ گیا ہے۔ وہ شہر جا کر جب تک اسے سیل نہیں دلاتا۔ اس کے نمبر پر بات کر لیا کریں۔ انکل آنٹی سے تو وہ خود ہی بات کرا دیتا تھا مگر سعد کی اس نے مہوین سے آج تک بات کی نوبت نہیں آنے دی تھی۔ کبھی وہ کہتا کہ وہ سو رہی ہے 'کبھی کہتا کہ وہ خود باہر ہے 'کبھی کیا تو کبھی کیا اور آج صبح ہی سعد نے کال کرکے کہا تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر جارہا ہے آج تو مہوین کی فرمائش پر وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لے کر آتا ہے باہر سے تو اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس بار اس کے لیے کیا لے کر آئے۔ حسین شاہ کو اس پل ان دونوں پر بے حد غصہ آیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا آنکھ مچولی کھیل رہے تھے مگر اگلے ہی پل اسے مہوین بے قصور نظر آئی تھی 'کیونکہ جتنی شدت اور والہانہ پن سعد کی طرف سے تھا اتنا اس نے مہوین میں نہیں دیکھا تھا یا شاید شادی کے بعد وہ محتاط ہو گئی تھی۔

"اسے کسی چیز کی ضرورت ہو گی تو میں دلا دوں گا' سعد آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" غصے سے کہہ کر اس نے کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔ پھر اس کے شہر سے باہر ہونے کا سوچ کر ہی وہ مہوین کو اس کے ماں باپ سے ملانے لے آیا تھا۔

"اس سے کہیئے گا میں سخت خفا ہوں اس سے۔۔۔ ایک دفعہ بھی کال نہیں کی 'اس نے اور بڑی محبتیں جتاتا پھرتا ہے۔" واپسی پر جب وہ امی سے مل رہی تھی تو انہوں نے سعد کے حوالے سے کچھ کہا تھا جس پر وہ چڑ کر بولی تھی۔ حسین شاہ جو انکل کو اباجی کی مصروفیات کا بتا رہا تھا 'ایک بار پھر بدمزا ہو کر رہ گیا اور آتے ہوئے وہ جیسے خوش تھا بار بار اس سے اپنی محبت اور وارفتگی جتا رہا تھا۔ واپسی میں اتنا ہی خاموش اور چپ تھا۔ مہوین پر آج ماں باپ سے ملنے کی فطری خوشی طاری تھی 'سو اس نے اس کی خاموشی کو زیادہ محسوس نہ کیا' واپسی بھی رات گئے ہوئی تھی ان کی۔

"میں اماں جی کو دیکھ لوں پہلے۔" مہوین کے اس طرح احساس کرنے پر اس کے تنے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے۔

"چلو میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔" آہستہ سے کہتا وہ اس کے ساتھ آگیا۔ کمرے میں اماں جی آرام سے سو رہی تھیں۔ جبکہ بوا ان کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنے کے لیے اٹھنے لگیں جب حسین شاہ نے نرمی سے منع کر دیا کہ وہ لوگ چونکہ تھکے ہوئے آئے ہیں سو آرام کریں گے۔ اب وہ بھی آرام سے سو جائیں۔

☆ ☆ ☆

"اور کون سا شہزادہ آئے گا تمہارے لیے جو ہر رشتے پر ایسے منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔ تیرے تائے کو پتا چل گیا تو ٹوٹے کر دے گا تیرے۔ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں ہمارے مرد' پر تو بھی جانتی ہے کہ کچھ معاملوں میں وہ بڑے سخت ہیں۔ یہ تو ہر بار میں کوئی بہانہ کرکے انکار کر دیتی ہوں۔ پر مجھے اس بار لگ رہا ہے کہ تیرا تایا میری ایک نہیں سننے والا۔"

"تو نئیں جانتی اماں! آگ لگی ہے میرے اندر۔ اس مہسنی شہرن کو دیکھا ہے کیسے دیوانہ بنا ڈالا ہے حسین کو۔ آگے پیچھے پھرتا ہے اس کے۔ تایا الگ تسبیح پڑھتا ہے اس کے نام کی۔ مجھ میں کیا کمی تھی۔" وہ

تڑخ کر بولی تھی۔ ویسے بھی جب سے ماں نے تایا کے پیش کردہ ایک رشتہ کا ذکر کیا تھا بپھری شیرنی بنی ہوئی تھی وہ۔

"چل چھوڑ بھئی نگی... نصیبوں کے کھیل ہیں سارے۔ ہم نے کوشش کرنی تھی سو کر کے دیکھ لی۔ تیرا ماما بھی کہہ رہا ہے مجھے طفیل کے لیے اور تیرے تائے نے بھی ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کے بیٹے کا کہا ہے کسی ایک کو تو ہاں کرنی ہے۔ اس بار تیرے تائے نے کوئی بہانا نہیں سننا۔" تائی جمیلہ بیٹی کو سمجھا رہی تھی، جس کے ذہن سے ابھی انتقام کا بھوت اترا نہیں تھا۔ خود کو ٹھکرائے جانے کا انتقام۔

"جاتے جاتے بھی ایک کوشش تو کر ہی جاؤں گی حسین شاہ، جب مجھے تم نہیں ملے تو تم کیوں من کی مراد پا کر خوشیاں پاؤ۔" نگی کے ذہن میں یقیناً کوئی اور منصوبہ تکمیل پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"زمینوں کی کاشت کاری کے حوالے سے کچھ جدید سامان ڈلیور کرانا ہے۔ یونی ورسٹی میں بھی رزلٹ کے حوالے سے ایک دو کام ہیں، شہر میں، ہو سکتا ہے کچھ دن لگ جائیں، چلنا ہے؟" تین دن بعد اس نے مہوین کو کہا تھا مگر اس نے سہولت سے فوراً ہی انکار کر دیا۔

"اماں جی کو ایسے کیسے چھوڑ کر جا سکتی ہوں امی، ابو سے روزانہ بات ہو جاتی ہے۔ بس ان کی خیریت پتا کر لیجیے گا۔ مجھے پھر کبھی لے کر جائیے گا۔ ابھی پرسوں ہی تو ہو کر آئی ہوں۔" کمرے کی چھوٹی موٹی چیزیں سمیٹتے اس نے جواب دیا۔

میرا نمبر تو ہے نا تمہارے پاس... لینڈ لائن پر رابطہ رہے گا۔ کوئی ضرورت ہو تو کال کر لینا اور ہاں میرے نکلنے تک تم نے اور کہیں نہیں جانا، یہیں میرے پاس رہنا ہے میرے سامنے۔" اسے باہر کے لیے نکلنے کا ارادہ کرتے دیکھ وہ تیزی سے اس کے پاس آیا اور سرعت سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، حسین مگر اماں جی کو دوائی دینی ہے۔ آج پچھلی سائڈ صاف کروانے کے لیے ملازمہ بھیجی ہے۔" وہ بسوری۔

"او میری پیاری سی الجھی سلجھی بیوی۔ یہ گھر مانا کہ آپ کے کاندھوں پر چل رہا ہے لیکن آپ کے شوہر کا حق سب سے زیادہ ہے آپ پر۔ اماں جی کی دوائی میں دے آیا ہوں۔ زرینہ کو ان کی ایکسرسائز پر بھی بٹھا آیا ہوں۔ اب ساری پریشانیاں چھوڑ کر پیاری سی مسکان ان پیارے لبوں پر لاؤ اور پیار سے اس پیارے میاں کو رخصت کرو۔" وہ ایسے پیار، پیاری کی تکرار کرتے ہوئے بولا کہ مہوین بے ساختہ مسکرا کر رہ گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ اماں جی کے پاس آ گئی۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھ میں پہلا تاثر خوشی کا ابھرتا تھا۔ اس نے زرینہ کو باہر بھیجا اور خود ان سے کئی بے معنی باتوں میں وقت بتانے لگی۔

پتا نہیں کیوں دل ابھی سے اداس ہو رہا تھا، کیونکہ وہ ویسے بھی زیادہ باہر ہی رہتا تھا مگر دوپہر کو ایک چکر ضرور گھر کا لگاتا تھا اور واپسی مغرب سے پہلے پہلے ہو جاتی تھی اس کی۔ ملازمہ نے تھوڑی دیر بعد اس کے فون کی اطلاع دی۔ فون پر وہی تھا۔

"کیسی ہو جان من؟" وہ مسکرا دی۔

"ابھی آپ پندرہ منٹ پہلے نکلے ہیں۔ ویسی ہی ہوں جیسی اس وقت تھی۔ ہاں اس وقت آپ پاس تھے تو کوئی احساس نہیں تھا۔ اب اداس ہو رہی ہوں۔"

"میں بھی... سوچ رہا تھا اتنے دن تمہارے بغیر کیسے گزریں گے۔" کسی کام سے گزرتی نگی نے زہر بھری نظروں سے اس کا گلرنگ چہرہ دیکھا تھا۔ ایک آدھ لفظ کانوں میں پڑا تو تصدیق بھی ہو گئی کہ لیلیٰ مجنوں ہی مخاطب تھے ایک دوسرے سے۔ ہونہہ کہتی وہ وہاں سے پلٹ گئی۔

غیر متوقع طور پر اگلے روز سعد کو اپنے روبرو دیکھ کر وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔

"تم؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"بس کرو بے وفا لڑکی... یہ منہ دیکھنے کی محبت... فون ملا ملا کر میرا انگلیاں ایک آدھ انچ تو گھس ہی گئی ہیں مگر محترمہ کو فون تک سننے کی فرصت نہیں اور اب دیکھو..." وہ سخت ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کے لیے بے شمار تحائف خود بھی لایا تھا۔ کچھ چیزیں اور موسمی کپڑے امی نے بھیجے تھے۔ شام کو ہی گلے شکوؤں اور کئی وعدے وعید کے ساتھ وہ رخصت ہوا تھا۔ رات کو جب سونے لگی اسے یاد آیا کہ دن میں پانچ چھ بار کال کرنے والے حسین شاہ نے ایک بار بھی کال نہیں کی تھی۔ اسی وقت وہ اٹھ کر ہال میں آئی۔ ریسیور اٹھاتے ہی گہری سانس نکل گئی۔ فون میں یا تو کوئی وقتی خرابی تھی یا کوئی سگنلز کا مسئلہ تھا۔ رنگ ٹون سے الگ ہی کوئی ٹون تھی۔ اگلے دن ابا جی کے موبائل پر بات ہوئی تھی۔ وہ اماں جی کے پاس تھی جب انہوں نے فون لاکر اسے دیا تھا۔ ان کی موجودگی میں بس مختصربات ہی کرپائی تھی وہ اور جس دن فون ٹھیک ہوا اور وہ اسے کال کرنے کا سوچ ہی رہی تھی جب وہ دشمن جان خود آن پہنچا تھا۔

"ویسے یار مہوین! شادی کے بعد ہر بندہ ہی بیوی کے پیچھے ایسے پاگل ہوجاتا ہے یا مجھ غریب کو ہی محبت نے اپنے شکنجے میں ایسے جکڑ لیا ہے۔" اس کے ایسا کہنے پر وہ ہنس پڑی تھی۔ چاہے جانے کا احساس ہی خوب صورت ہوتا ہے کجا کہ اس شخص کے منہ سے ایسا اعتراف جس کو آپ خود بھی جان سے عزیز رکھتے ہوں۔ مہوین اگلے دن حسب معمول اماں جی کو ناشتا کروا رہی تھی۔ حسین شاہ گیٹ سے باہر نکلتے ہی لگا تھا جب وہ اچانک ہی سامنے آئی تھی۔

"کیا اب بھی میری باتوں کو جھٹلاؤ گے...؟"

"کیا ہے نگین۔ بات کرنے کی تمیز ہی نہیں آئی آج تک۔ کیا بات ہے؟ کون سی باتیں۔" وہ جو اپنی جھونک میں تھا ناگواری سے اسے دیکھ کر بولا۔

"تمہاری موجودگی میں تمہاری بیوی تمہارا دم بھرتی ہے اور تمہارے شہر جاتے ہی فون کرکے اپنے کزن کو بلالیتی ہے۔ کیا بتایا اس نے تمہیں؟" اس کے اتنے یقین سے کہنے پر حسین شاہ کچھ لمحے کچھ بول ہی نہ پایا۔ "سعد آیا تھا یہاں؟ کب؟"

"مجھے پتا تھا اس نے تمہیں نہیں بتایا ہوگا۔ دل میں چور ہو تو تعلق اور ملاقاتیں بھی چھپائی جاتی ہیں۔" اس کے پوچھنے پر وہ آگ لگانے والے انداز میں بولی۔ "تمہارے شہر سے جانے کے اگلے دن ہی تمہاری بیگم نے فون کیا اگلے دو گھنٹوں میں وہ یہاں تھا۔ سارا دن گزار کر شام کو گیا اور اگلے تین دن گھنٹوں ٹیلی فون تھا۔ ڈیر کزن تھا اور تمہاری بیگم تھیں باقی ساری چیزیں حتی کہ تم بھی بہت پیچھے چلے گئے تھے۔" حسین شاہ کا خون رگوں میں ابلنے لگا۔ اس کی صرف ایک دن ہی بات لینڈ لائن پر مہوین سے ہوپائی تھی اگلے تین دن واقعی اسے انگیج ٹون سننے کو ملتی تھی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ فون خراب تھا۔ اور یہاں۔ غصے میں اسے کچھ اور نہ سوجھا تو وہ تن فن کرتا تیزی سے مہوین کی تلاش میں واپس گھر کے اندرونی حصے کی طرف آگیا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ کس کام سے باہر جارہا تھا۔ وہ اسے حسب معمول اماں جی کے کمرے میں ملی تھی۔ وہاں بوا اور زرینہ بھی تھیں۔

"تم ذرا کمرے میں آکر میری بات سنو۔" وہ مہوین کو کہہ کر فوراً اپنے کمرے میں آگیا وہ تین منٹ کا انتظار اس کی جان پر عذاب بن کر اترا تھا۔ پھر بڑی عجلت میں وہ اندر آئی تھی۔

"آپ گئے نہیں ابھی تک؟" صبح وہ اسے بتاکر نکلا تھا۔ سو پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ وہ کچھ بھول گیا تھا۔

"میرے جانے کے بعد یہاں کون آیا تھا؟" جارحانہ انداز میں اس کا بازو پکڑ کر اس نے غصے سے دریافت کیا۔ مہوین کب اس کے اس انداز کی عادی تھی۔

"کب' کون آیا؟ آپ... آپ۔ کس کی بات کررہے ہیں" آنسو بھری آنکھوں سے اس نے ہکلا کر پوچھا۔

"جب میں شہر مرنے گیا تھا؟" لفظ نہیں پتھر توڑ رہے

تھے اس نے مہوین کی سماعت پر۔ مہوین نے بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ دھرا۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' کوئی نہیں آیا تھا؟ اگر کوئی آتا.... "پھر وہ کہتے کہتے خود ہی چونک کر چپ ہو گئی۔

"سعد.... سعد آیا تھا بس اور تو کوئی نہیں آیا کیا آپ سعد کا پوچھ رہے ہیں۔" حسین شاہ نے جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا۔ مہوین لڑکھڑا گئی۔

"تمہاری میرے نزدیک اتنی اہمیت ہے کہ اتنی اہم بات بھی تم مجھ سے چھپا جاتی ہو اور محبت کے دعوے بڑے بڑے ہیں تمہارے۔

اس میں چھپانے والی تو کوئی بات نہیں تھی حسین۔ میں نے آپ کو بتانا چاہا تھا مگر۔"

"بس جب میں نے کہا تھا کہ میری اجازت کے بغیر نا تم کہیں جاؤ گی اور نہ کوئی آئے گا یہاں۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔ مہوین اس کی عجیب وغریب منطق پر پریشان ہو گئی۔ یہ یقیناً" اس کی محبت نہیں تھی۔ یہ کچھ اور تھا؟ لیکن کیا تھا؟ اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"میں نے آپ کی ہر بات مانی ہے حسین' کہیں بھی نہیں گئی لیکن میرے گھر سے کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے تو میں کیسے منع کر سکتی ہوں۔"

"کرو گی تم ہی منع کرو گی مہوین حسین شاہ۔ یہ میری آخری وارننگ ہے۔ اس کے بعد تم نے اگر مجھ سے چوری چھپے کسی سے کوئی رابطہ رکھا تو نتیجہ کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔" اس کو کندھوں سے تھام کر اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چبا چبا کر یہ الفاظ ادا کیے اور مہوین کو حیران پریشان وہیں کھڑا چھوڑ کر وہ نکلتا چلا گیا۔

"یا اللہ میں کیا کروں؟ کیا یہ حکم صرف سعد کے لیے ہے یا سارے گھر والوں کے لیے؟ اور ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ میں ساری زندگی اپنوں سے کٹ کر کیسے گزار سکتی ہوں اور اس نے کہا اگر میں نے ایسا کیا تو نتیجہ؟" یہ سوچ کر ہی اس کی روح فنا ہو گئی حسین شاہ کے بغیر جینا ایسے تھا جیسے سانسوں کے بنا زندگی۔ پہلے وہ اس کی اس فرمائش کو اس کی شدید محبت سمجھی کہ تخر میں مبتلا ہوئی تھی' پھر کچھ دن بعد اسے لگا کہ وہ اپنی ماں کی وجہ سے اس کو اس گھر تک محدود کرنا چاہتا ہے؟ وہ اس پر بھی راضی بہ رضا تھی۔ مگر آج اس نے کہا تھا کہ اس کے گھر سے بھی کوئی یہاں آیا تو نتیجہ وہ خود بھگتے گی۔ یا اللہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں۔" دکھتے سر کو تھامے وہ وہیں بیڈ پر گر گئی اس پل اسے گھر' اماں جی سب کچھ بھولا ہوا تھا یاد تھا تو اس کا سنگین لہجہ اور بے رخی کا وہ انداز جس نے اس کی جان نکال لی تھی۔ غصے سے بھرے ہوئے حسین شاہ کو نگی نے اندر جاتے پھر اسی ہی انداز میں باہر نکلتے دیکھا تھا اس کے لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ ورنہ روز جب وہ روانہ ہونے لگتا یا گھر واپس آتا۔ ان دونوں کے کھلتے چہرے' دبی مسکراہٹ اسے آگ ہی تو لگا دیا کرتی تھی۔ ویسے بھی اس نے کل اپنی ماں کو اپنے ماموں کے بیٹے کے لیے ہاں کر دی تھی۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی وہ حسین شاہ کو جتنا بھی بدگمان کر لیتی مہوین سے۔ وہ اسے چھوڑنے والا ہرگز نہیں تھا مگر وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ اور خوش دیکھ پاتی سوجاتے جاتے بھی کچھ زہر بھرے بیج حسین شاہ کے ذہن میں بو کر جانا چاہتی تھی تاکہ شک کا پانی ملنے پر وہ بدگمانی کے پودے بڑے ہوتے رہیں اور ان دونوں کو کبھی آسودہ نہ ہونے دیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے روئی روئی آنکھوں والی مہوین کو ملازمین کے سر پر کام کرواتے دیکھا تو آسودگی کا احساس کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا۔ گویا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی تھی ان کو الگ نہ کر سکی تو کیا ہوا بدگمانی اور شک جیسے جذبے کو ان دونوں کی محبت کے جذبے پر حاوی کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔

رات کو بھی وہ اس تنے تنے سے موڈ میں تھا۔ مہوین جو اس کے محبت بھرے رویے اور انداز کی عادی تھی اس کا ایسا انداز اسے پریشان کر رہا تھا۔ دودھ کا گلاس لا کر جس پل اس نے اسے پکڑایا وہ ایک کتاب

کے مطالعے میں بری طرح سے محو تھا۔ اسے دیکھے اور مخاطب کیے بغیر اس نے گلاس تھام لیا' مہوین کا دل دکھ سے بھر گیا۔ ایسا تو ان دنوں میں کبھی بھی نہ ہوا تھا کہ مہوین اس کے پاس ہو اور وہ کسی اور طرف متوجہ ہو۔ گزرے ان چند دن میں ایسا بھی پہلی بار ہوا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر فاصلے پر اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ مہوین نے اپنے آنسو چھپانے کو بے اختیار کروٹ بدلی۔ اسے تو ابھی تک اپنا قصور بھی سمجھ نہیں آسکا تھا۔ ایک سسکی لبوں سے نکلنے کی دیر تھی کہ ایک سلسلہ ہی بندھ گیا۔ پاس لیٹا وجود انجان تھا نہ بے حس بس اس کی بے تحاشا محبت کا دعویدار تھا تب ہی زیادہ بے رخی نہ برت سکا اور لمحوں میں ہی وہ اس کے مہربان وجود کی پناہوں میں تھی۔

"مہوین میرے ساتھ پھر کبھی ایسا مت کرنا۔ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ تمہاری کسی اور جانب ذرا سی بھی توجہ میری برداشت سے باہر کی بات ہے۔ یہ بات اچھی طرح اپنے دل و دماغ میں بٹھا لو تو ہم میں سے کسی ایک کو بھی پریشان ہونا پڑے نہ رونا پڑے۔"

وہ دھیرے دھیرے روتی ہوئی مہوین کو سہلا رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھنے یا نہ سمجھنے کی کیفیت میں سرہلائے گئی۔

اگلی صبح بے حد روشن تھی کہ گزری رات دونوں کے درمیان کی ساری کثافت اپنی تاریکی میں بہا کر ساتھ لے گئی تھی۔

"تمہارے ابو تمہیں یاد کررہے ہیں مہوین آج کل طبیعت ایک بار پھر کچھ گڑبڑ کررہی تھی۔ بھلا کرے اللہ سعد کا وہ ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ ایک دو ٹیسٹ مزید ہوئے ہیں۔ اب دیکھو رپورٹس آنے پر ہی آگے کا علاج تجویز ہوگا۔" حسین شاہ نے خود ہی ابو سے بات کروائی تھی اس کی۔ ابو نے تو نہیں امی نے بتا کر اسے تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ پریشانی سے وہ رونے ہی لگی۔

"ارے بیٹا روؤ تو مت' تمہاری شادی کے بعد تو بہت حالت سنبھل گئی ہے تمہارے ابو کی۔ بس کل اچانک ہی سانس لینے میں کچھ دشواری محسوس ہوئی تو سعد لے کے گیا انہیں۔ اب تو بالکل ٹھیک ہیں اللہ کا شکر ہے۔" امی اس کا رونا سن کر گھبرا گئیں۔ پھر ابو نے بھی اس سے بات کرکے اسے اپنی طبیعت کی طرف سے تسلی کروائی تب کہیں جاکر اس کی پریشانی کچھ کم ہوئی ورنہ دل کررہا تھا اڑ کر ابو کو دیکھ آئے۔ عام حالات ہوتے تو فوراً" حسین شاہ سے شہر چلنے کی فرمائش کرتی مگر کل والی بات کے بعد وہ خود ابھی اس الجھن کا سرا نہیں پکڑ پائی تھی۔ جس میں وہ خود بھی مبتلا تھا اور اسے بھی پریشان کررکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

تایا جی کی طرف سے ہاں ہوتے ہی نگی کو اس کے سسرال والے آکر انگوٹھی پہنا گئے تھے۔ دو تین دن اسی مصروفیت میں گزر گئے۔

"شہر جانے کا ارادہ ہے مہوین پتر میرا' آج کچھ کام بھی تھا اور تمہارے ابا سے بھی کب سے ملاقات نہیں ہوئی وہ بھی سوچتا ہوگا بیٹی لے کر دوست پکا سمدھی بن گیا ہے۔" وہ خوش گواری سے ناشتا کرتے ہوئے بولے۔ مہوین کا نوالہ گلے میں اٹک گیا۔ کتنے دن ہوگئے تھے ابو سے ملے ہوئے اگرچہ بات تقریباً" روزانہ ہوجاتی تھی۔

"میں تو کہتا ہوں تم بھی چلی چلو' شام تک آجائیں گے حسین کو بھی تو دو تین دن کے لیے ساتھ والے گاؤں جانا ہے۔ زمین کی فروخت کا کچھ کام ہے۔ کیوں بیٹا!" تایا جی نے ناشتے سے بھرپور انصاف کرتے بیٹے اور آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ بھرتی کسی سوچ میں گم بیٹھی بہو کو بیک وقت مخاطب کیا۔ وہ دونوں ہی چونک گئے۔

"نہیں انکل۔ آپ۔۔۔ آپ ہو آئیں۔ امی ابو کو سلام کہیے گا میرے' میں جلد ہی ان کے ساتھ چکر لگاؤں گی۔" اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی مہوین تیزی سے بول اٹھی۔

"جی ابا جی! ٹھیک کہہ رہی ہے مہوین آپ ہو آئیں' میں بھی اس کام سے نپٹ لوں پھر چکر لگاتے

ہیں شہر کا۔ چائے دو مہوین۔“ اس نے بھی ایک ساتھ دونوں کو بھگتایا۔

”چلو بھئی جیسے تم لوگ مناسب سمجھو۔ خوش رہو۔“ تایا جی اس کا سر تھپتھپا کر باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی حسین شاہ نے بھی رخصت سفر باندھ لیا۔

”اچھا بھئی مہوین۔ میں ان شاء اللہ فارغ ہو کے آتا ہوں تو شہر چلیں گے۔ انکل آنٹی سے بھی مل لیں گے اور تمہیں نگی کی شادی کے لیے اپنی شاپنگ بھی کرنی ہوگی۔“

”سچ میں آپ مجھے لے کے جائیں گے۔“ جھلملاتی آنکھوں سمیت اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”بالکل بھئی۔ میں لے کر جاؤں گا' لیکن تم نے وہاں جاکر رہنے کی ضد نہیں کرنی پتا ہے نا' میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ وہ اس کے قریب آکر بولا۔

”اور خود جو اتنے اتنے دن مجھے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔“ اس کے منہ بنا کر کہنے پر وہ ہنس پڑا۔

”مجبوری ہے میری جان۔ ابا جی نے بہت کام سنبھال لیا اب یہ سب کچھ مجھے ہی دیکھنا اور سنبھالنا ہے۔ میں رابطے میں رہوں گا۔ چلو اب مجھے اپنی خوب صورت سی مسکراہٹ دے کر رخصت کرو تاکہ جب بھی تصور کروں تو یہ رونی صورت نہ آئے سامنے۔“ اس کے شرارت سے کہنے پر وہ ہنس دی تھی۔ پھر یونہی ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان وہ اسے گیٹ تک رخصت کرنے آئی تھی۔ کمرے سے صحن تک کا وہ سفر جو انہوں نے اکٹھے مسکراتے ہوئے طے کیا تھا گویا کسی کے دل پر قدم رکھتے ہوئے گئے تھے۔ وہ دن ایسے ہی گزرے تھے اس کے۔ درمیان میں حسین اسے کئی بار کال کرتا اور اس دن ابھی وہ اس سے بات کر کے فارغ ہوئی تھی آج کل شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ بوا تین چار عورتوں کے سر پر کھڑے ہو کر لحافوں میں ڈورے ڈلوا رہی تھیں۔ وہ زرینہ کی مدد سے اماں جی کو باہر لے آئی تھی تاکہ باہر کی رونق بھی دیکھتی رہیں۔ فالج نے ان کی زبان اور جسم پر حملہ کیا تھا آنکھیں اور سماعتیں تو سلامت تھیں جب ہی ان کی آنکھوں کا ہر تاثر پہچان کر وہ ان کو خوش رہنے کی ہر سعی کرتی۔ ان کو تخت پر لٹا کر ان کا سر دو تکیوں کے سہارے تھوڑا اونچا کر دیا۔ بڑے سارے صحن میں چچی جمیلہ بھی بہت سی عورتوں کا جھرمٹ لیے نگی کا جہیز کھولے بیٹھی تھیں۔ جب ملازمہ نے اس کا فون آنے کی اطلاع کی۔

اف یہ بے تابیاں وہ حسین شاہ کی کال کا سوچ کر مسرور ہوتے ہوئے اندر آئی' مگر دوسری طرف تایا جی تھے۔ انہوں نے جو خبر سنائی اس نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔ ابو جی کو رات ایک بار پھر اٹیک ہوا تھا۔ وہ تو شکر ہوا تایا جی ان کے شدید اصرار پر وہیں تھے۔ سعد اور وہ ان کو اسپتال لے کر گئے تھے ساری رات ایمرجنسی میں رہنے کے بعد ان کی حالت اب خطرے سے باہر تھی اور ہوش میں آنے پر انہوں نے مہوین سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ تایا جی نے کہا تھا کہ وہ سعد کو بھیج رہے ہیں۔ وہ فوراً" ہی اس کے ہمراہ شہر آجائے۔

”مگر وہ حسین۔۔۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”میں نے پہلے اسے ہی کال کی تھی اس کا موبائل بند ہے۔“ وہ کہہ رہے تھے۔ مہوین نے جلدی جلدی بات ختم کر کے ایک بار خود ہی اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر نمبر واقعی بند تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو اس سے بات ہوئی تھی۔ ابو کی حالت کا سوچ کر روتے ہوئے وہ باہر آئی اور مختصرا" بوا کو سب کچھ بتایا تمام عورتیں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں ہر کوئی اپنے ہی انداز میں تسلی دینے لگی اسے۔ اتنے میں سعد کی بھی آمد ہو گئی تھی وہ بہت سنجیدہ تھا کے اور بیٹھے بغیر اسے ساتھ چلنے کو کہا تھا بوا ہی جلدی میں اپنی سمجھ کے مطابق ایک چھوٹا سا بیگ تیار کر کے لائی تھیں جس میں دو تین سوٹ اور ایک دو اور ضروری چیزیں ڈالی تھیں۔

”بوا! ان کا نمبر بند ہے۔ آپ کو بتا ہے سب بات۔ بتا دیجیے گا' میں پھر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کروں

گی۔" روتے ہوئے اس نے کہا تو ابو نے تسلی دیتے ہوئے اسے رخصت کیا تھا مسلسل سفر اور تیز ڈرائیو سے عام وقت سے وہ ذرا جلدی پہنچے تھے پھر بھی عصر کا وقت ہو ہی گیا تھا انہیں اسپتال پہنچتے پہنچتے۔

"ابو جی... میرے پیارے ابو جی۔" ان سے مل کر وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔

"ایسا مت کرو بیٹا! اللہ نے تمہاری دعاؤں سے ہی تمہارے ابو کو نئی زندگی بخشی ہے' ایسے رو کر اسے پریشان مت کرو۔" تایا جی نے اسے وہاں سے ہٹایا تھا۔ ابو جی کو ابھی مزید دو دن رکھنا تھا یہاں۔ امی اب سے کچھ پہلے تک یہیں تھیں' مگر تھوڑی دیر قبل خالہ اور خالو آئے تھے تو تایا جی نے ان کو زبردستی ان کے ساتھ گھر بھیج دیا تھا۔ اب وہ مصر تھے کہ مہوین بھی گھر جائے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر امی کے ساتھ واپس آجائے کہ مسلسل سفر کرنے اور رونے سے اس کی حالت خراب تھی' مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔

"مہوین چلی جاؤ بیٹا! میں ٹھیک ہوں اب۔" ابو جی نے بھی آہستہ سے کہا تھا' مگر اس کی گردن نفی میں ہل گئی تھی۔ آنسوؤں نے حلق اور آنکھوں پر دھاوا بول رکھا تھا۔

"وعلیکم السلام حسین بیٹا! کہاں ہو' تمہارا موبائل بند تھا۔" وہ چونکی۔ تایا جی اسی سے مخاطب تھے شاید۔ سعد ڈاکٹر سے ملنے گیا تھا۔

"اباجی میں بھی بات کروں گی۔" اس نے آہستہ سے کہا تو وہ جو دوسری طرف سے کچھ سن رہے تھے۔ چونک گئے اور فون اسے پکڑا دیا۔

"ہیلو! میں... وہ اباجی نے بتا دیا نا آپ کو... ابو..." ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی جب دوسری طرف سے وہ غرایا۔

"میں نے کہا تھا نا مت جانا میرے بغیر' میں خود لے کے جاؤں گا تمہیں۔ چاہے قیامت کیوں نہ آجائے۔ بس مہوین بی بی' میں یہ روز روز کا تماشا برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کھیل کو اب یہیں پر ختم کرتا ہوں۔ میرے دل اور گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند...." وہ پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا جب مہوین نے اپنی سماعتوں کو سن ہوتے محسوس کیا۔ موبائل اس کے ہاتھ سے پھسل کر اس کی گود میں گرا اور وہ خود بنچ پر لڑھک گئی۔ تایا جی بھاگ کے اس کے پاس آئے۔ سعد کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتی نرس بھی تیزی سے اس کے پاس لپکی۔

"اس لیے میں اسے کہہ رہا تھا کہ گھر چلی جائے۔ ایک تو پریشانی پھر مسلسل سفر۔" تایا جی تشویش سے کہنے لگے جبکہ سعد پریشان سا نرس کو اسے بنچ پر سیدھا لٹا کر ہوش دلانے کی کوشش کرتا دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک آگ تھی جس نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ کیوں آتا ہے وہ شخص جب جب میں گھر نہیں ہوتا کیوں وہ میری بات' میری ذات کی نفی کر رہی ہے مسلسل۔ اس کے من میں چور ہے اس لیے بس مہوین اسماعیل احمد' میں اب مزید تمہارے ہاتھوں بے وقوف نہیں بن سکتا۔ تمہاری بددعا قبول ہو گئی سلطنہ خان میری زندگی میں مجھے میرے جیسی خالص عورت نہیں ملی۔ مسلسل ڈرائیو کرتے وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھا۔ غصے میں اس نے اپنا موبائل آف کر کے ڈیش بورڈ پر اچھال دیا گھر جانے کو دل ہی نہیں تھا کہ کیا رکھا تھا وہاں اس بے وفا کی یادیں۔ "مہوین سعد کے ساتھ آگئی تھی شہر" صرف یہی ایک جملہ ذہن کی سلیٹ پر بہت گہرا ثبت تھا اس بات کے اسباب۔ پس منظر کچھ بھی تو اس کے دماغ نے قبول نہیں کیا تھا۔ شہر میں وہ اویس کی طرف آگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک بے حد خوب صورت اور سنہری خبر کو اس کی سماعتوں کا حصہ بنایا گیا تھا۔ پہلا پل اور احساس بے پایاں مسرت کا تھا' مگر دوسرے ہی پل اس ستم گر کی بات اور لہجہ یاد آتے ہی اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ امی اسے فوراً" گھر لے آئی تھیں۔ تایا

جی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ابو جی ڈسچارج ہو کر آچکے تھے، مگر ان خوشیوں بھرے منظر میں ایک پریشان کن بات یہ تھی کہ حسین شاہ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ تایا جی نے گھر بھی رابطہ کیا تھا۔ وہ دوسرے گاؤں سے اسی شام کو ہی روانہ ہو گیا تھا جب انہوں نے اسے اطلاع دی تھی مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ نہ تو اپنے گھر واپس پہنچا تھا نہ ہی یہاں شہر آیا تھا۔ وہ کبھی بھی اتنا لاپروا نہیں رہا تھا' ان کی فکر اب تشویش میں بدلنے لگی تھی۔ آج پورے دو دن ہو گئے تھے ان کو اس سے بات کیے ہوئے۔

"جی، جی انکل اس کا سیل گم ہو گیا ہے۔ شاید.... جی میرے پاس ہی ہے۔ شہر میں آکر ایک کام میں مصروف تھا بس بات کریں۔" اویس موبائل پر بات کرتا ہوا اندر آیا اور اسے پکڑا دیا۔ طویل سانس لیتے ہوئے اس نے موبائل کان سے لگالیا اور ایک شکوہ بھری نگاہ اویس پر بھی ڈالنا نہیں بھولا۔ اب ابا جی دوسری طرف اس پر شاید زندگی میں پہلی بار اتنے خفا ہو رہے تھے اور سخت سنائی تھیں اسے۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا تھا۔

"شرمندہ کروا دیا مجھے اسماعیل کے سامنے۔ کیا سوچے گا وہ کہ اکلوتا داماد۔ موت کے منہ میں جانے کا سن کر بھی دم سادھے بیٹھا رہا۔ اب اسے کیا پتا تمہارے مسائل کا۔ داماد بیٹے کی جگہ ہوتے ہیں۔ ارے جس جگہ تمہیں ہونا چاہیے تھا وہاں وہ سعد بے چارہ لگا رہا دن رات کا فرق مٹا کر۔" حسین کے ماتھے پر ناگوار لکیریں پڑ گئیں۔

"میں اگر تمہیں معاف کر رہا ہوں تو صرف ایک خبر کے واسطے۔ جس نے میرے دل کو ٹھنڈا کر دیا۔ تمہاری ساری خطائیں معاف ہو گئیں، مگر آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرنی۔ کام جتنے بھی ضروری ہوں اپنوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ابھی کے ابھی پہنچو میں شدت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور مہوین بیٹی بھی۔" ابا جی نے دس منٹ کی کال میں ناراضی اور غصہ بھی جتایا تھا۔ پھر خفگی معاف بھی کر دی تھی اور کچھ سنے بغیر آخر میں حکم بھی صادر کر دیا تھا۔

"یار خدا کے لیے کچھ بتانا بھی پسند کرو گے یا گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے رہو گے۔ تیسرا دن ہے پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں کہ آخر ہوا کیا اور آج انکل کی پریشانی دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔"

"کچھ نہیں بس کچھ دن اپنے آپ کے ساتھ گزارنے کو دل کر رہا تھا۔" وہ بے تاثر لہجے میں جوتے پہنتے ہوئے کہنے لگا۔ اویس طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"پل پل مرنے سے بہتر ہے میں ایک ہی بار تم سے چھٹکارا پالوں۔ مہوین اسماعیل خان کی مزید ایسا فریب اور دھوکا سہنے کا یارا نہیں ہے مجھ میں۔" اٹل فیصلہ کر کے وہ اویس سے مل کر باہر آگیا اگرچہ دل پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا' مگر دل تو پاگل ہوتا ہے۔ ایسے ہی ذلیل کرواتا ہے اور اب تک وہ دل ہی کی تو سنتا آیا تھا اب اور نہیں۔ جس پل اس نے وہاں اس دشمن جان کے گھر قدم دھرے شام اپنے سنہری پر لپیٹ کر رات میں بدلنے کی تیاری میں مصروف تھی۔

ابا جی نے انکل آنٹی کے سامنے ایک بار پھر اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"ارے بھئی بس کرو۔ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا تم تو تھے نا میرے پاس۔" انکل نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

"میں مہوین کو بلاتی ہوں اپنے کمرے میں ہے وہ۔" آنٹی کہتے ہوئے اٹھیں وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھا رہا جیسے اس بات سے کوئی سروکار نہ ہو کہ وہ کہاں ہے؟ مگر اسی پل خالہ' خالو سعد کے ہمراہ مٹھائی لے کر چلے آئے تھے۔

"منہ میٹھا کرو بھئی۔ سعد کی بات پکی کر آئی ہوں آج میں۔" خالہ نے خوشی سے مٹھائی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ بھئی مبارک باد۔ اس طرح اچانک۔" امی نے خوشی سے۔ بہن کو دیکھ کر کہا۔

"بس رہنے دیں خالہ ساری زندگی آپ کی بیٹی کی فرمائشیں پوری کرنے میں گزر گئی' بدلے میں ایک ہی فرمائش تھی ہماری کہ اپنے جیسی کوئی پیاری سی لڑکی

ڈھونڈ میرے لیے، مگر وہ تو دولہا بھائی کو ایسی پیاری ہوئیں کہ شکل دیکھنا تو ایک طرف اس کی آواز سننے کو ترس گئے ہم۔ اب تمام عمر کنوارا رہنے سے بہتر تھا کہ خود ہی کمر کس لی جائے۔" وہ مصنوعی غصے سے بولا تھا۔

"بالکل بھئی یہ گلہ تو ہمیں بھی مہوین سے ہے کہ شادی کے بعد سب کو بھول ہی گئی ہے حالانکہ کیا کیا پلاننگ کر رکھی تھی اس نے سعد کے رشتہ سے لے کر اس کی شادی تک کے لیے۔ اب وہ یہاں ہے بھائی صاحب بھی اللہ کے کرم سے ٹھیک ہیں تو یہی سوچ کر ہم نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ رکھا ہے۔ بیٹا' میں نے سعد کی شادی تک مہوین کو جانے نہیں دینا یہاں سے۔ ابھی سے ایسی مصروف ہے وہ پھر بچے کے بعد تو اس ایک آدھ چکر سے بھی جائے گی وہ۔" حسین شاہ اس ساری صورت حال اور بات چیت پر ہونق سا ایک ایک کا منہ تکنے لگا۔

خالہ نے ہی اسے بتایا کہ مہوین کی پیدائش کے بعد مہوین کی امی بے حد بیمار پڑ گئی تھیں' ہاسپٹلا ئزڈ ہونا پڑا تھا۔ سعد تب ڈیڑھ سال کا تھا۔ تب مہوین نے ان کا دودھ پیا تھا اور اگلے چھ سات ماہ جب تک ان کی بہن کی حالت سنبھل نہیں گئی تھی وہ ان ہی کے پاس رہی تھی۔ بھائی صاحب بھی جانتے ہیں خالہ نے اباجی کے بارے میں بتایا خالہ اس وقت کے تمام حالات تفصیل سے حسین شاہ کے گوش گزار کر رہی تھیں۔ سعد مہوین کو بلانے جا چکا تھا۔ شک کا زہر بھرا کانٹا اچانک سے خالہ نے کیا نکالا تھا حسین شاہ کو دنیا ہی روشن روشن لگ رہی تھی۔ انہوں نے تو باتوں باتوں میں اسے باپ بننے کی مبارک باد تک دے ڈالی تھی۔

دل ہی دل میں خدا کا لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے وہ شرمندہ بھی تھا کہ محض شک کی بنیاد پر اس نے اس معصوم پر کیسا کیسا سلوک روا نہ رکھا تھا اور اب بھی تو اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ اپنے ' کچھ دیر قبل کے فیصلے کو یاد کر کے وہ ایک پل کو لرز گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ سامنے تھی۔ کمزور' پژمردہ اور روئی روئی سی' حسین شاہ کے زوردار سلام پر اس نے ایک شاکی نظر اس پر ڈالی اور دھیرے سے جواب دے کر تایا جی کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

"بس میری جان یہی مشکل دن تھے تمہاری زندگی کے جن کا آج اختتام ہوا چاہتا ہے۔ اگرچہ میں اپنا شک اور فضول سوچیں تم پر کبھی ظاہر نہیں کروں گا' مگر اپنے ناروا سلوک کی معافی ضرور مانگوں گا تم سے اس عہد کے ساتھ کہ آئندہ تمہارے لبوں پر میرے نام کی صرف مسکراہٹ ہوگی بس اور آئندہ۔۔۔" اس کے جھکے چہرے کو دیکھتے حسین شاہ دل ہی دل میں مہوین سے مخاطب تھا جس میں کئی خوش گوار آئندہ چھپے تھے جن کی راہ میں اب کسی شک کا کوئی کانٹا موجود نہیں تھا۔

✡ ✡

نایاب جیلانی

پانچویں اور آخری قسط

سبز دریچے کے پار "شام اودھ" پھیل رہی تھی۔ کھڑکی کے کونوں سے لٹکتی بیلوں کی ہر ہر شاخ پھول، کلیوں اور خوشبوؤں سے لدی تھی۔ اس خوب صورت شام ماہ رو کا موڈ بڑا ہی خوش گوار تھا۔ وہ بڑے دنوں بعد اس قدر فریش نظر آرہی تھی۔ اس نے ڈارک بلیو شیفون کا امبر ائیڈ سوٹ نکالا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر ڈارک بلیو امبر ائیڈ ساڑھی نکال لی۔ جس کے بلاؤز پہ ہلکا سا نفیس سلور کام تھا۔ سلیویز بھی اتنے قابل اعتراض نہیں تھے۔ ماہ رو نے کچھ سوچ کر ساڑھی کو زیب تن کرلیا تھا۔ پھر ہلکا سا میک اپ کیا تو یوں لگا جیسے وہ کوئی اور ہی ماہ رو کا روپ دھار گئی تھی۔ عون سے شادی کے صرف ایک ماہ میں ہی وہ خاصی ڈل، افسردہ اور بوجھل دکھائی دیتی تھی۔ جسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی بھول گیا تھا۔ حتیٰ کہ ہنسنا بھی بھول گیا تھا۔ وہ اپنے سراپے کو آئینے میں دیکھ کر خود بھی مسحور رہ گئی تھی۔

ایک ماہ پہلے وہ کس قدر ہنگامہ پرور، خوش مزاج، چلبلی ہوا کرتی تھی۔ صرف ایک مہینے میں اس میں ایسی تبدیلی آئی تھی، اگر شازمہ دیکھ لیتی تو چیخ پڑتی۔ اور آج اس نے کلینڈر پہ نظر ڈالی تو اندازہ ہوا تھا ماہ رو کو اس گھر میں رہتے ہوئے عون کا غصہ، طنز اور عتاب سہتے ہوئے پورا ایک مہینہ ہوچکا تھا۔ اور یہ ایک مہینہ بس مہینہ ہی تھا۔ تیس دن، تیس سال تو نہیں ہوئے تھے، لیکن ماہ رو کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے اسی گھر میں رہتی آرہی ہے۔ ماہ رو کا یہاں اس گھر کے ایک حد تک آؤٹ موڈڈ (دقیانوسی) ماحول میں دل لگ گیا تھا۔

جہاں سب لوگ ایک ہی چھت تلے بڑی محبت سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی تکلیف کو سمجھتے تھے۔ احساس کرتے تھے۔ خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ہلکی سی چپقلش بھی ہوجاتی۔ رنجش کی لکیر بھی کھینچ جاتی تھی۔ پھر بھی یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے اور تایا رحمان کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی تھی کہ ان دونوں بھائیوں کے بچے، تایا رحمان کے اپنے بیٹے ہمیشہ اسی چھت تلے اکٹھے رہیں اور ان کا کاروبار بھی کبھی الگ الگ نہ ہو اور یہ خواہش کوئی بے جا ہرگز نہیں تھی۔ اور یوں وہ لوگ ابھی تک اس سایہ دار قسم کی رحمان منزل میں بخوشی رہ رہے تھے۔

ماہ رو کو اس گھر میں ایک دن بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ ابو سے لے کر کائنات تک سب ماہ رو کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ بہت پیار اور عزت دیتے تھے اور جس سے پیار اور عزت کی ماہ رو کو توقع تھی بس وہیں سے نو لفٹ کا سائن بورڈ منہ چڑھاتا تھا اور جب اسے پورا ایک مہینہ ڈیڈی سے ملے ہوئے ہوگیا تھا اور ڈیڈی اور شازمہ کے کئی ایک فون آچکے تو ابو نے عون کو پھر سے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"تمہیں عشق فرمانے کا شوق تھا، نبھانے کا نہیں۔" وہ ابھی کے ابھی تھکا ہارا ڈائریکٹر سے منہ ماری کے بعد گھر پہنچا ہی تھا، جب ابو نے اسے اپنے کمرے میں جانے ہی نہیں دیا، بلکہ رستے میں ہی کائنات اسے بڑے ہال کی طرف لے گئی تھی۔ یہ کہتے ہوئے کہ۔۔۔۔

"ابو! یاد فرما رہے ہیں۔" عون کچھ حیران ہوا تھا۔

"کہیں انہیں میری پلاننگ کی بھنک تو نہیں پڑ

گئی۔" اس کے دل میں خیال جاگا تھا' کیونکہ ابو عام طور پر اسے بہت کم کم ہی یاد فرماتے تھے اور ان کا یاد فرمانا' ایک لمبے جھگڑے کی شروعات کا شاخسانہ ہوا کرتا تھا۔ پھر باپ بیٹا لڑتے لڑتے طعنوں پہ اتر آتے تھے۔ وہ کچھ سوچتا ہوا اندر آگیا تھا۔ ابو شام کا اخبار دیکھ رہے تھے۔ عون کو آتا دیکھ کر کچھ چونک گئے تھے۔ پھر اخبار ایک طرف رکھ کے عون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ دوسرے معنوں میں فارم میں آچکے تھے۔ عون ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہیں دیوان پہ بیٹھ گیا تھا۔ قریب ہی عاشر بھی موجود تھا۔ ان دونوں کو آمنے سامنے بیٹھا دیکھ کر حساب کتاب کا کھاتہ اٹھاتا باہر نکل گیا تھا۔ جانتا تھا کہ ہال کا ماحول اب گرم ہوا چاہتا ہے۔ عون کے نشست سنبھالتے ہی ابو نے گلا کھنکار کے گولہ باری کا آغاز کیا۔

"کر آئے ہو چاکری! اپنا کام تو کاٹتا تھا۔ اب دوسروں کے رعب میں رہ کر کام کرنے کا مزا آئے

گا۔" ان کا لہجہ گہرا طنزیہ تھا۔ عون نے بھی گہرا سانس خارج کیا۔ پھر بڑے سرد لہجے میں بولا۔

"کم از کم وہاں کوئی میرے تازہ بہ تازہ ماضی کو نہیں جانتا۔ پلازہ میں تو دو دو ٹکے کے سیل بوائے تک مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسی اڑاتے تھے۔ آخر آپ نے میری کم بے عزتی تو نہیں کی تھی۔" عون کو بہت کچھ یاد آتا رہا' جو بھولتا تو پہلے بھی نہیں تھا اس وقت زخم پھر تازہ ہو گئے تھے۔ وہ بھولنا چاہتا بھی تو بھول نہیں سکتا تھا اور نہ ہی ابو' فریحہ اسے کچھ بھولنے دیتے۔

"اسی لیے تو انسان کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانے چاہییے۔ تاکہ اپنا ہی ماضی سوال نہ بن جائے۔۔۔" ابو نے پھر سے دھیمے لہجے میں چابک مارنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ تو میں تمہارا باپ تھا جو ساری صورت حال کو سمجھ کر تمہیں بڑی ذلت سے بچا گیا تھا۔ ورنہ تو سیٹھ سرفراز تمہیں جیل بھجوانے کا پکا ارادہ رکھتے تھے۔ اغوا اور دہشت گردی کے کیس میں۔۔۔ جس کی ضمانت بھی نہ ہوتی۔۔۔ اور تم ابھی تک جیل میں سڑتے رہتے۔"

"پھر اغوا۔۔۔" عون کا دماغ تپ اٹھا تھا۔ اعصاب جھنجھنا گئے تھے۔ اسے بے طرح سے غصہ آیا اور شاید وہ بھڑک ہی اٹھتا اگر بیچ میں اچانک فریحہ مداخلت نہ کر لیتی۔ فریحہ کے آتے ہی عون نے اپنا غصہ پی لیا تھا اور بمشکل ضبط کر کے چپ رہا تھا۔ کیونکہ اب فریحہ بول رہی تھی اور بڑی ذہانت سے ابو کو لاجواب کر رہی تھی' عون بھی چونک گیا۔ فریحہ کی باتیں رد کرنے والی نہیں تھیں۔ اگر ابو کے دماغ سے ماہ رو اتر جاتی تو۔۔۔؟

"حیرت کی بات ہے تایا جی! سیٹھ سرفراز نے آپ کو دھمکی دی' وہ عون کو اغوا کے کیس میں جیل بھجوائیں گے اور آپ نے بڑی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنا بیٹا پیش کر دیا۔ تاکہ جو مرضی سزا سنائیں اور انہوں نے بجائے عون کو جیل بھجوانے کے اپنی بیٹی سے نکاح کی سزا تجویز کر دی۔ جسے آپ نے فوراً" تسلیم کر لیا۔ آپ نے اس تمام سیٹ اپ کی وجوہات پہ غور نہیں کیا تھا۔" فریحہ کا دھیما ٹھوس سلگتا ہوا لہجہ ایسا تھا جس نے عون کو تو ڈھارس پہنچائی ہی تھی۔ تاہم تایا کو بھی خاصا لمحہ فکر عنایت کر دیا تھا' لیکن یہ ان پہ لمحاتی کیفیت تھی۔ وہ جلد ہی اس کیفیت سے آزاد ہو گئے تھے۔

"بیٹی! اس وقت کے حالات کچھ اور تھے۔ ایک شرمسار باپ بھلا کیا کرتا۔ میں تو اسی بات پہ شکر ادا کر رہا تھا کہ سیٹھ سرفراز نے بات نہیں بڑھائی اپنی اور ہماری عزت رکھ لی۔" تایا جی بڑے پر اذیت لہجے میں بات کر رہے تھے' جیسے اس وقت کی تکلیف ابھی تک چبھن دے رہی تھی۔ عون کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔

"تو پھر سیٹھ سرفراز نے ایک اغوا کار کو اپنی بیٹی کا رشتہ کیوں دیا؟" فریحہ کے اگلے سوال نے تایا کو بھونچکا کر دیا تھا۔ چند لمحے وہ کچھ بول نہیں پائے تھے۔

"انہوں نے خود نکاح کی تجویز رکھی تھی آخر کیوں؟" فریحہ جیسے زہر خند ہوئی تھی۔

"تو کیا کرتے؟" اس ذلیل نے کچھ تو ان کی بیٹی کے ساتھ کیا تھا جو وہ اس قدر مجبور ہو چکے تھے۔ کوئی باپ کس وجہ سے اس قدر مجبور ہو کر اپنی بیٹی کا رشتہ اپنی زبان سے دیتا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔۔۔ اور تم کچھ نہیں جانتیں۔ اس لیے عون کی بے جا حمایت نہ کرو۔" انہوں نے ایک تلخ نگاہ عون کے سراپے پہ ڈال کر فریحہ سے کہا تھا۔ تب وہ دل میں اٹھتے اشتعال کے ساتھ تن فن کرتی چلی گئی تھی' لیکن جانے سے پہلے وہ اتنا ضرور بڑبڑائی تھی۔

"اس ساحرہ نے آپ سب ہی پہ جادو چلا رکھا ہے۔ بڑی جادوگرنی بنی پھرتی ہے۔ اس کا جادو نہ توڑ دیا تو فریحہ نام نہیں میرا۔" اس کے انگ انگ سے شرارے پھوٹ رہے تھے' لیکن وہ اپنے دماغ کو حاضر رکھتے ہوئے ذہین دماغ سے اگلے لائحہ عمل کی بریفنگ لے رہی تھی۔ فریحہ کو آگے کیا کرنا تھا؟ اس بات سے سب بے خبر تھے۔ بڑے ہال میں ابھی تک عون کی کلاس چل رہی تھی اور ابو بڑے ریاضی دان بنے سوال کر رہے تھے۔

"اب تم مجھے بتاؤ کہ اونچی' ٹیڑھی میڑھی۔۔۔ سطح

سے ایک دم سطح مستوی (ہموار سطح) پہ کیسے آؤ گے؟"

"میں آل ریڈی ہموار سطح پہ ہوں... مجھ میں طول و عرض تو ہوگا عمق بالکل نہیں..." اس نے بھی حساب دانہ جواب دیا تھا۔ ابو لمحہ بھر کے لیے تیوری پہ بل ڈال کر سوچتے رہ گئے تھے۔ پھر گلا کھنکار کر دھیمی آواز میں غرائے۔

"عون...! تم سمجھ رہے ہو۔ میں کیا بکواس کر رہا ہوں۔" وہ زچ نہیں ہوئے تھے، لیکن عون ہی سنبھل کر سیدھا ہوا۔

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" اسے باپ کے سامنے لہجہ نرم اور الفاظ سخت رکھنے پڑے تھے۔

"اس بچی کے ساتھ تمہارا رویہ بہت برا ہے۔ میں آنکھیں بھی رکھتا ہوں اور دماغ بھی... وہ اس گھر میں قید ہونے نہیں آئی۔" انہوں نے خاصے سخت انداز میں اسے گھرکا تھا۔

"تو نہ آتی؟ میں باجوں گاجوں کے ساتھ لایا ہوں اس کو..." وہ ایک دم تلخ ہوگیا۔ ابو اسے خاصے تاسف سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"بار بار اس بات کو جتا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"صرف یہ ہی کہ وہ خود یہاں آنا چاہتی تھی، سو پری پلاننگ سے آئی۔ مزید مجھ سے توقع نہ رکھے کوئی..." اس نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا، لیکن اکڑ برقرار تھی ہنوز...

"وہ بیوی ہے تمہاری... تم اپنے حقوق پہچانو... اور ماہ رو کو خوش رکھنے کی کوشش کرو... اسے اس کے باپ سے ملوا کر لاؤ... اس بات کا تمہیں احساس ہونا چاہیے۔" اب کہ ان کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس کی اکڑ انہیں مشتعل کر رہی تھی۔

"میں نے اسے خوش رکھنے کا ایگریمنٹ سائن نہیں کیا تھا اور نہ ہی نکاح نامے میں ایسی کوئی شرط منظور کی تھی۔ باقی رہی اس کو باپ سے ملوانے والی بات، تو میں نے اسے روکا نہیں... جب چاہے جا سکتی ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ابو بھی مشتعل سے اخبار پٹخ کر اٹھے تھے۔

"بدھو! وہ کیسے اکیلی جائے...؟ کیا قاسم اور عاصم اپنی بیویوں کو ان کے میکے ملوانے نہیں لے کر جاتے۔ تم دستور سے نرالا کچھ کرو گے؟" ان کو غیض چڑھ گیا تھا۔ "آپ کے لیے اطلاعاً" عرض ہے۔ وہ اکیلی شتر بے مہار گاڑی بھگاتی، سڑکیں روندتی جگہ جگہ دندناتی پھرا کرتی تھی۔ اسے ثنا اور مریم سے کمپیری زن (مشابہت) نہ ہی کریں۔ وہ کوئی انیس سو ساٹھ کی مخلوق نہیں۔ جسے شوہر کی انگلی پکڑ کے گھر سے باہر نکلنا ہوتا ہے۔ اگر باپ سے ملنا ہوا تو خود چلی جائے گی۔ کسی سے پوچھنا گوارا نہیں کرے گی۔" عون نے بھی انہیں چار سنا کر خوب ٹھنڈا کرنا چاہا تھا۔

"وہ تمہاری طرح خودسر، بدتمیز یا بدتہذیب نہیں... جو منہ اٹھا کر کسی بزرگ کو گھاس تک نہ ڈالے اور چلتی بنے۔ اتنے دنوں سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ سب سے گھل مل گئی ہے۔ ہم سب کی بہت عزت کرتی ہے۔ اس گھر میں ایسے رہ رہی ہے جیسے سالوں سے یہیں ہو۔ اسی گھر میں آنکھ کھولی۔" "تم اس کی خودسری اور آوارہ مزاجی کی جھوٹی کہانیاں مت سنایا کرو اپنی ماں کو۔ ہم میں سے کوئی بھی یقین نہیں کرتا۔" وہ خاصے جارحانہ انداز میں بولتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے رکے تھے۔

"اور تم اپنے گریبان میں جھانکو۔ خود میں کوئی اچھائی پیدا کرو اور خاص طور پہ اپنا رویہ یہ ماہ رو کے ساتھ بدلو... میں اس کے باپ کے سامنے دوسری مرتبہ شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔" انہوں نے جیسے عون کو وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔ عون کی تیوری پہ بل پڑ گئے تھے۔

"رویہ بدلتی ہے میری جوتی۔" اس نے تنک کر سوچا۔ ابو بھی اٹھتے اٹھتے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچ کر بیٹھ گئے تھے۔

"سنو عون! جو ہو چکا ہے وہ پلٹ نہیں سکتا، لیکن بھولا تو جا سکتا ہے۔ بہتر زندگی کے لیے کچھ چیزوں کو نظر انداز کرنے میں ہی عقل مندی ہے۔" ابو کے الفاظ

عون کو کسی چابک کی طرح لگے تھے۔ وہ ہال کے دروازے تک جاتے جاتے پلٹ آیا تھا۔

"جو ذلت میں نے پلازہ میں اٹھائی تھی ابو! میں عمر بھر اسے بھلا نہیں سکتا۔" اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ ذلت کس کے توسط سے آئی تھی۔ وہ زہر خند ہوا۔

"اگر بھلاؤ گے نہیں تو کیا کرو گے؟" ابو کے تیور بھی جارحانہ ہو گئے تھے۔ ایسے ہی ان دونوں کا جھگڑا اسٹارٹ ہوتا تھا جو بڑھتا بڑھتا عون کو انتہائی بدتمیزی پہ مجبور کر دیتا تھا۔ پھر دونوں باپ بیٹا کئی کئی دن ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھتے تھے۔ ایک دوسرے سے بولتے نہیں تھے۔ تاوقتیکہ دوسرے جھگڑے کا آغاز نہ ہو جاتا۔

"میں اس فساد کی جڑ کو ختم کر دوں گا۔ اکھاڑ پھینکوں گا۔ بس اس دن کے انتظار میں ہوں، جب وہ خود سب کچھ اگل کر آپ کے سامنے اقرار کرے گی۔" عون نے اپنے خطرناک ارادے ظاہر کر دیے تھے۔ جنہیں سن کر ان کا سارا جلال آنکھوں اور چہرے پہ سمٹ آیا تھا۔ وہ خون رنگ آنکھوں سے بھڑک اٹھے تھے۔

"کیا تم آخری حد سے گزرنا چاہتے ہو۔ کیا تم ماہ رو کو طلاق دینا چاہتے ہو؟" بے غیرت! تم وہ کام کرنا چاہتے ہو جو میرے نسب، نسل، خاندان میں نہیں ہوا۔" وہ دہاڑتے ہوئے اس قدر ہانپ چکے تھے کہ چیخ و پکار اور غراہٹوں کی آواز سن کر عاشر اور امی کو حواس باختہ ہو کر آنا پڑا تھا۔ وہ بمشکل ابو کو کنٹرول کرتے واپس دیوان پر بیٹھا رہے تھے۔ ورنہ ابو کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح عون پہ حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ اس کا گریبان پکڑ کر طمانچے لگانا چاہتے تھے۔

پورا گھر ایک دم اکٹھا ہو گیا تھا۔ کائنات اور امی رو رہی تھیں۔ ثنا، مریم حواس باختہ تھیں۔ باقی سب الگ پریشان اور متوحش نظر آ رہے تھے۔ بس ایک کردار بڑا پرسکون اور خاموش تھا۔ جس کے چہرے پہ اطمینان بھرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ چہرے پہ عجیب سا تاثر تھا۔ ادھر ابو ابھی تک چلا رہے تھے۔

"اس سے پوچھو، یہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس کی جرات کیسے ہوئی میرے نسب کو داغ دار کرنے کی؟ میری پشتوں میں آج تک کسی نے طلاق کا لفظ نہیں سنا۔" ان کی شریان جیسے پھٹنے لگی تھی۔ عون نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بمشکل اپنے غصے کو قابو کیا تھا۔ اس کی لہو رنگ آنکھوں میں اک تیز چمک ابھر آئی تھی۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے سارے غصے کو پینا شروع کر دیا۔ چند لمحوں بعد وہ نارمل کیفیت میں آ گیا تھا۔ اس کا غصہ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ بڑے سکون میں کھڑا تھا۔ انتہائی مطمئن حالت میں۔ ٹائی کو گلے سے اتارتا ہوا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا۔ وہ بڑے خوش گوار، دھیمے، مگر اک خاص انداز میں چونکا دینے والے انداز و لب و لہجے میں بولا۔

"آپ کو کس نے کہا، میں ماہ رو کو طلاق دوں گا؟" اس کی آواز پہ لحہ بھر کے لیے پورے ہال میں سکوت چھا گیا تھا۔ اس قدر سکوت کہ سوئی بھی گرتی تو آواز آ جاتی۔ بھانت بھانت کی بولیوں میں ایک سناٹا اچانک ابھر کر سامنے آ گیا تھا۔ ہر کوئی آنکھیں پھاڑے عون کو دیکھنے لگا۔

"طلاق کے بعد تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ طلاق کے بعد تو میرا انتقام بھی ختم ہو جائے گا۔" اب اس کے چہرے پہ بڑی دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے جھک کر شوز اتارے۔ کوٹ کندھے پہ ڈالا، جوتے اٹھائے، ہر ایک کی آنکھ میں سوال اتر آیا۔ تجسس اتر آیا۔ ہر کوئی اس کے اگلے الفاظ کا انتظار کرنے لگا۔ عون نے بھی اس انداز میں پراسراریت کے وقفے کو مزید طویل کرتے ہوئے بالآخر اس تجسس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یوں کہ ہر کوئی ہکا بکا اور ششدر رہ گیا۔

"اطلاعاً" عرض ہے والد صاحب! میں آپ کی نقلی بہو کو طلاق ہرگز نہیں دوں گا۔ کسی قیمت پہ بھی نہیں دوں گا۔ میں بس آپ کی نقلی بہو پہ اصلی سوکن لاؤں گا، تاکہ وہ بھی ذلت کا مزا چکھ سکے۔" سب کے خوف

ناک حد تک عجیب تاثرات کو انجوائے کرتا' مسکراتا گنگناتا اپنے بیڈ روم کی طرف جارہا تھا۔ اس حالت میں کہ کوٹ کندھے پہ جھول رہا تھا۔ ٹائی گلے میں لٹک رہی تھی۔ جوتے ہاتھ میں اٹھا رکھے تھے۔ ننگے پیر فرش پہ چلتا وہ بڑے دل فریب انداز میں انگلش سونگ گنگنا رہا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تھا۔ خوشبو کا معطر' دلنشین' حسین' روح میں اتر جانے والا جھونکا نتھنوں سے ٹکراتا ہوا ایک الوہی' عجیب اور ان چھوا سا احساس بخش گیا۔ ایک ایسا احساس جس سے کبھی بھی عون کی آشنائی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی نہیں' جب باقاعدہ طور پہ فریحہ سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اس وقت بھی نہیں' جب اس کی فریحہ سے شادی ہو رہی تھی۔ یہ ایک ان چھوا احساس تھا۔ اس احساس کا کیا نام تھا۔ کیا احساسات کے نام بھی ہوتے تھے؟ اگر ہوتے تھے تو کیا؟ وہ اپنے ہی کمرے کے دریچے سے پگھلتی شام اودھ کو دیکھتا لمحہ بھر کے لیے اپنے آپ میں بھی نہیں رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
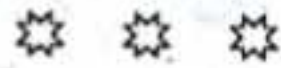
اور عون عباس شام اودھ کی دل فریبی کو زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس کرتے ہوئے واقعی ہی اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے مبہوت ہو گیا۔ اس نے زندگی میں رنگوں کو اس قدر کسی پہ کھلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ قوس و قزح میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ اس نے بائیں پہلو میں ہلچل سی محسوس کی تھی۔ جیسے کوئی گڑبڑاہٹ تھی۔ کسی کے قدموں کی آہٹ تھی۔ کیا "شہر دل" میں کوئی آرہا تھا؟ اس کی دھڑکنوں میں طلاطم سا اترا۔ بے ترتیبی سی ابھری' ہلچل سی مچی۔

اس کی آنکھوں میں خمار بھر گیا تھا۔ وہ کسی خواب کی کیفیت میں اس کے سامنے کھڑا ہوا بالکل مقابل دلنشین انداز میں دیکھتا ہوا ماہ رو کا دل جیسے کانوں میں دھڑکنے لگا۔ عون کے قدموں میں گرنے لگا اور وہ کسی بھیگتے لمحے میں بڑا بے بس ہو کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ماہ رو' سرفراز کے خم و چم سے زیر ہوتا' اس نے کسی فرشتوں سے معصوم لمحے کے زیر اثر ماہ رو کے شفق گال کو چھوا تو اس کی گرم انگلیوں کا لمس اس کے شفق گالوں کی ساری ملائمت میں اترنے لگا۔ ایک لمحاتی سی سحر انگیز کیفیت تھی جس نے دونوں کو بے بس کیا' عون نے جیسے قید محبت کی کھنکھناتی زنجیروں کا حصار کھینچا اور وہ ایک حسین خواب کی طرح اس کے مضبوط بازوؤں میں زنجیر ہو گئی۔

اس نے عون کی دھڑکنوں کو سنا۔ بہت غور سے سنا۔ وہاں ایک پکار مچی تھی۔ عون نے ایک دل نشین ملائمت سے اس کے شفق گالوں پہ زلفوں کے پردے کو ہٹا کر لب و انداز سے چھوا تو ماہ رو سرفراز کو لگا وہ عمر بھر کے لیے سرفراز ہو گئی ہے۔ عون عباس اسے عطا کر دیا گیا تھا۔ ماہ رو سرفراز کو بامراد کر دیا تھا۔ اس نے خود سپردگی کی ہر کیفیت کو دل کی پاگل ہوتی دھڑکنوں سے سنا تھا اور دونوں ہاتھوں کا ہلکا سا دباؤ عون کے سینے پہ ڈالا تھا۔ جیسے دھیرے سے پیچھے کو دھکیلا تھا۔ اس کے لب و انداز کی شدت اور تپش نے ماہ رو کے گال بے انتہا سرخ اور پر حدت کر دیے تھے۔ اس نے بے ارادہ ہی اپنا نازک دودھیا ہاتھ عون کے لبوں پہ رکھا تھا۔ اور جیسے سارا عالم انت انت ہو گیا تھا۔ ہر خواب جیسے آنکھوں سے اتر کر حقیقت بن گیا تھا۔ ہر گرد آلود آئینہ ٹوٹ گیا تھا اور کوئی دھیرے سے کان میں گنگنا رہا تھا۔ شہد امرت اتار رہا تھا۔

نہ خیال ہوں
نہ قیاس ہوں
میں بولتا احساس ہوں

اور پھر نازک سایہ حسین فسوں' لمحوں میں ٹوٹ گیا۔ بولتا ہوا ان کہا احساس دونوں کے دلوں کو متزلزل کرتا شام اودھ کے ساتھ ہی رواں دواں ہو گیا تھا اور کوئی لمحوں میں اتنا قریب آرہا تھا۔ عون اس سحر طراز کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے جیسے اس فسوں خیزی سے نظر چراتا پیچھے ہٹا اور سنبھل گیا۔ کچھ دیر پہلے کمزور لمحات کی عنایت سے نظر چراتا بالوں میں انگلیاں پھیرتا

دھپ دھپ کرتا واش روم میں گھس گیا تھا۔ یوں کہ دروازہ زوردار دھماکے سے بند ہوا۔ جیسے ساری جھنجلاہٹ دروازے پہ اتاری ہو۔ اور پھر گھنٹہ بھر بعد بمشکل ہی باہر نکلا۔ ماہ رو کو دو مرتبہ ساڑھی سنبھال کر دستک دینا پڑی تھی۔ بالآخر عون کا اشنان مکمل ہوا اور وہ باہر آگیا تھا۔ ماہ رو تولیہ پکڑ کر کھڑی تھی۔ جسے تھام کر بال اور گردن رگڑتا وہ یوں ڈریسنگ کی طرف مڑ گیا تھا کہ ماہ رو کی طرف اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ وہ گہرا سانس کھینچتی عون کو دیکھتی رہی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو بھی ہوا تھا۔ وقتی طور پر ہی سہی۔ عون کو ماہ رو کے بہت قریب لے آیا تھا اور ماہ رو ان لمحات کی سرشاری کو عمر بھر نہ بھلا پاتی۔ وہ لمحات جو غیر دانستہ ان کی زندگی میں دبے قدموں آئے تھے اور چپکے سے نکل گئے تھے اور ابھی ابھی تو سرشاری کی کیفیت ہی الگ تھی۔ وہ عون کی پشت کو بے خودی کے عالم میں دیکھتی رہی تھی۔ دیکھتی رہی تھی' یہاں تک کہ اس ارتکاز سے الجھ کر وہ کنگھا ڈریسنگ پہ پھینکتا اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ لیکن ماہ رو کو غور سے اپنی طرف دیکھتا پا کر ذرا جھنجلایا۔

"اور اب اس کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ میں بھی کیسا کمزور نکلا۔ حد ہوگئی آج تو...." اسے خود پہ شدید ہی غصہ آیا تھا اور ماہ رو اس کے کیسے خیالات سے مبرا بڑی مخمور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس کی تو زبان بھی بہت لمبی ہے۔ موقع پا کر جتائے گی اور طنز بھی کرے گی۔" عون بے طرح سے چڑا تھا۔ "بندے کو اتنا بھی بے حواس نہیں ہونا چاہیے۔ اب ہو گیا ہے تو کیا کروں؟ دیکھوں گا کیا کہتی اور کرتی ہے؟ ویسے بھی کون سا گناہ کیا ہے۔ زبردستی کی ہی سہی' تاہم اپنی چیز تو ہے نا۔" وہ خود کو دلاسا دیتا قدرے مطمئن ہوا تھا۔ پھر بال خوب خوب سنوار کر خاصا سنبھل کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کافی دیر کے بعد اس نے کچھ دیر پہلے والے لمحات کے تاثر اور اثر کو زائل کرنے کے لیے بڑا ٹھوس سا مائنڈ ورک کر لیا تھا۔ اسی لیے کچھ دیر قبل چھانے والی جھنجلاہٹ ختم ہو چکی تھی اور بوکھلاہٹ بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ جم کر صوفے پہ بیٹھ گیا اور بڑی دیدہ دلیری سے ماہ رو کا آنکھوں سے ایکسرے کرنے لگا۔

ایک مرتبہ پھر گل فام کے رنگوں سے سجی ماہ رو کو نظر بھر کے دیکھتے ہوئے دل کی سابقہ کیفیات سے ایک دم وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔ دھڑکنوں میں ویسا ہی طلاطم آیا تھا اور اس ستاروں کے رنگوں میں لپٹی شوکیس میں سجا کر بس دیکھ دیکھ کر دل بہلانے والی گڑیا کی کنفیوژن دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا چہرہ پھر سے گل رنگ ہونے لگا۔ پلکیں بار حیا سے جھکنے لگیں۔ تو گویا عون کے دل کا بدلتا موسم ماہ رو کے اندر بہاراں کر رہا تھا؟ عون نے بمشکل دل کو سنبھالا دیا۔ پھر وہ بے سبب اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جب کچھ اور نہ سوجھا تو خواہ مخواہ ہی ماہ رو پہ چڑھائی کر دی تھی۔ ظاہر ہے' بھڑاس تو نکالنی تھی۔ کچھ دیر پہلے ابو سے جھگڑ کر آیا تھا اور اب ماہ رو کے ساتھ بلاوجہ ہی لڑ رہا تھا۔ جیسے چند لمحے پہلی والی جھلاہٹ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

"یہ تم اتنا بیر بہوٹی بن کے کہاں جا رہی ہو؟" اس نے خاصے برہم لہجے میں پوچھا تھا' لیکن چاہ کر بھی اپنے الفاظ کو سخت نہیں کر سکا تھا۔ ورنہ تو ماہ رو سے بولتے ہوئے وہ کبھی الفاظ کی سنگینی پہ غور نہیں کرتا تھا۔ اس وقت پہلی مرتبہ اس نے بے ہودہ کہنے سے پرہیز کیا تھا اور نہ ہی اشتہاری ماڈل کہا تھا۔ آج واقعی کچھ انہونا ہو گیا تھا۔ ماہ رو جیسے سنبھل کر سیدھی ہوئی تھی۔

"ایسے ہی موڈ ہوا تو ساڑھی پہن لی۔"

"کیا کہنے تمہارے شاہانہ موڈ کے.... ایسے تیار ہوئی ہو جیسے ولیمے پہ جانا ہو.... بندہ گھر میں رہتے ہوئے کوئی گھریلو مناسب سوٹ پہنتا ہے۔ جس میں ایزی فیل بھی کرے۔" بڑے حیران کن انداز میں وہ مشورہ دیتا ماہ رو کو سخت بے ہوش کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ اللہ خیر' کوئی طنز نہیں تھا' کوئی طعنہ نہیں تھا۔ کوئی سڑا بسا جملہ نہیں تھا۔

"میں عادی ہوں اور ایزی فیل کر رہی ہوں۔" ماہ رو نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ وہ بھنویں سکیڑ کر بولا۔

"عادی تو تم بہت سی چیزوں کی ہو اور شوقین بھی..." "مثلاً" گیا... کیا... اس نے دلچسپی سے پوچھا' تو گویا وہ اسے آبزرو کرتا تھا اور زیادہ نہ سہی اسے کچھ کچھ جانتا تھا۔ ماہ رو کے لیے بڑا پر مسرت یہ مقام تھا۔

"یہ ہی کہ لوگوں کو الو بنانا... اپنی مرضی چلانا' ایکٹنگ... جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنا..." وہ جو انگلیوں پر گنوانے لگا تو ماہ رو کا منہ اتر گیا۔ وہ نہ جانے کس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی' لیکن یہ عون تھی نا' کبھی خوش نہیں کر سکتا تھا۔

"میں نے کسے الو بنایا؟ کسی کی آنکھوں میں جوتوں سمیت گھسی ہوں؟" اس نے برے دل کے ساتھ پوچھنا چاہا تھا۔

"میری..." عون نے آہ بھر کے کہا۔ "اور صرف آنکھوں میں نہیں... دل میں بھی..." اگلے الفاظ کہہ کے پچھتایا تھا۔

"آنکھوں میں کیا فائدہ؟ دل ہو تا تو بات بنتی بھی۔" اس نے شاید اگلے عون کے الفاظ سنے نہیں تھے۔ اگر سنے بھی تھے تو مذاق ہی سمجھا تھا۔ کیونکہ عون کو بھیانک مذاق کرنے کی عادت تھی۔ یہ ابھی ابھی ماہ رو پہ انکشاف ہوا تھا۔

"اگر دل بھی ہو تو...؟" عون نے لفظ پکڑ لیے تھے۔ ماہ رو کا خوش فہم دل خوش ہوگیا۔ "کیا واقعی...؟" اس نے ایک سرور بھری کیفیت میں پوچھا۔ عون نے فوراً" پینترا بدل لیا تھا اور بڑے ہی روکھے انداز میں کہا تھا۔ اب وہ آرام صوفے پہ نیم دراز ہو رہا تھا۔

"لوگ مذاق پہ بھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔" اس نے ماہ رو کی خوب خوش فہمی کا بھرکس نکالا تھا۔ ماہ رو بھی تھوڑا سا تلخ ہوگئی تھی۔

"میرے ساتھ تمہارا مذاق کا رشتہ بنتا ہے؟" اپنے تئیں اس نے عون کو لاجواب کرنا چاہا تھا۔ عون نے ذرا استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا اور بولا۔

"مذاق کا نہ سہی... ایک دوسرا رشتہ تو بنتا ہے۔" عون نے گہری نگاہ اس کے بھرپور ایمان ڈول دینے والے سراپے پہ ڈالی تھی۔ بلیو ساڑھی میں اس کا جگمگاتا حسن آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ لمبے کھلے حسین بال... دلنشین آنکھیں... دودھیا سراپا... وہ ایک مکمل حسن رکھتی تھی۔ اگر کوئی اور صورت حال ہوتی تو وہ ماہ رو کو شاید کبھی نظرانداز نہ کر سکتا۔ لیکن اب بیچ میں بہت لمبی بدگمانیوں کی خلیج کھڑی تھی۔ ماہ رو کو عون تک آتے آتے بڑا لمبا سفر کرنا تھا۔

"تم نے کب اس رشتے کو سمجھا؟" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے زخمی لہجے میں بولی۔

"اور کیا تم نے کوشش کی؟" عون نے الٹا تیوری چڑھا کر پوچھا تھا۔

"تم نے مجھے موقع دیا؟" ماہ رو کے منہ سے بے ارادہ ہی پھسل گیا تھا۔ پھر وہ بات کر کے پچھتائی تھی۔ کیوں کہ عون صوفے سے لیٹا لیٹا اٹھ گیا تھا۔ پھر اس کا کچھ دیر پہلے والا موڈ بدل گیا۔ چڑھتا غصہ ڈھل گیا۔ اور طنزیہ انداز بھی بدل گیا۔ گو کہ ہوتی یہ لمحاتی کیفیت تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ روپ بدلنے والا تھا۔ پل میں نرم ہو جاتا۔ پل میں گرم ہو جاتا۔ پل میں دھوپ ہو جاتا۔ پل میں بادل ہو جاتا۔

"تو اب موقع لے سکتی ہو؟ جو تیر چلانا ہے چلالو۔ میرے دل کو موڑ سکتی ہو تو موڑ لو۔" لمحہ بھر بعد وہ بڑے استہزائیہ لہجے میں کہہ رہا تھا یوں کہ ماہ رو کا دل کٹنے لگا۔

اس شخص سے ماہ رو نے محبت کی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے نہ اچھائیوں سے نہ برائیوں بس اس کے وجود سے کیا اس پتھر سے سر پھوڑا تھا' جس کے نزدیک ماہ رو کی زندگی کچھ بھی نہیں تھی۔ اور وہ ایک مذاق سمجھ کر اس کے جذبوں کو خاک دھول کر دیتا تھا۔ ماہ رو کو پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ واقعی ہی۔

"ہم کسی سے اپنی مرضی اور چاہ سے محبت تو کر سکتے ہیں لیکن کسی کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو۔ اور نہ ہی اسے خود سے محبت کرنے پہ مجبور کر سکتے ہیں۔"

ماہ رو کے چہرے پہ پھیلی اذیت کو محسوس کرتے' اس کا چہرہ پڑھتے' تاثرات سمجھتے ہوئے عون نے ایک

مرتبہ پھر پینترا بدل کے کہا تھا۔
"تم چند چیزیں کلیئر کر دو..... ہمارا حساب برابر ہو جائے گا؟" عون نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خود بھی ویسی ہی اذیت محسوس کی تھی جس سے ماہ رو گزر رہی تھی۔
ماہ رو خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو "کیا؟"

☆ ☆ ☆

وہ لانڈرنگ کر رہی تھی جب اس کی امی پورے گھر میں اسے تلاش کرتی پچھلے صحن میں آگئی تھیں۔ پھر اسے عون کے کپڑے دھوتے دیکھ کر ماتھے پہ بل ڈالتے ہوئے سخت کھردرے' بے زار لہجے میں بولیں۔
"تم سا احمق کوئی نہیں ہو گا فریحہ! عون کی نوکرانی بن کے کیا تم اس ماہ رو کو اس گھر سے نکال سکو گی؟ اور وہ مہارانی ماڈل گرل بنی ساڑھی پہنے ملکاؤں کی طرح دندناتی پھر رہی ہے۔ تم یہاں ماسی بن کر کون سی کہانی رقم کر رہی ہو؟ کون سا تمغہ تمہیں ملے گا؟" امی غصے سے پھٹ پڑی تھیں۔ فریحہ سنی ان سنی کر کے سرف میں شرٹس رگڑتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہی تھا۔
"تم بھائی جی کی اولاد' ان کی بیوی' بیٹی اور بہوؤں کی نوکر نہیں ہو۔ یہ کام عون کی بیوی کرے تو چار دن بھی نہ نکلے۔ اس پہ کوئی ذمہ داری ہی نہیں..... بھابھی جی نے اسے سر پہ بیٹھا رکھا ہے۔ عون باہر تو یوں ظاہر کرتا ہے جیسے اس لڑکی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں..... لیکن لکھوا لو مجھ سے۔ ساری ڈرامہ بازی ہے۔ عون نے خود ہی چکر چلایا ہو گا۔ تبھی تو وہ لڑکی عون پہ فدا ہے۔ اگر عون منہ نہ لگاتا تو کب کی لعنت بھیج کر جا چکی ہوتی۔ شوہر کے مان پہ یہاں ٹکی بیٹھی ہے۔" امی کا لہجہ سخت کھردرا اور بے زار تھا۔ "میری بات سنو فریحہ! چھوڑو یہ سب۔" انہوں نے زبردستی بالٹی اس کے تسلط سے آزاد کروائی تھی۔ اب وہ جھاگ والے ہاتھ لیے گم صم سی بیٹھی تھی۔ حالانکہ اس کا ذہن اب بھی مصروف عمل تھا۔

"تمہاری خالہ کا فون آیا تھا..... بڑا اچھا رشتہ بتا رہی ہیں..... تمہارے ابا سے بات کر لوں۔ پھر ہاں کروں گی۔ تم کہو' ان لوگوں کو بلوا لوں۔" امی نے بڑی بے تابی سے فریحہ کو تفصیلات بتائی تھیں۔ فریحہ کی بے زاری کسی طرح بھی کم نہ ہو سکی۔ اور بے نیازی کا بھی وہی حال تھا۔
"فریحہ! کیوں اس کمینے کے لیے خود کو برباد کر رہی ہو۔ کیوں نہیں سمجھتی کوئی لڑکی ایسے کسی لڑکے کے پیچھے پاگل نہیں ہوتی جب تک لڑکا اسے سبز باغ نہ دکھائے۔ عون نے اسے اپنی طرف مائل کیا ہو گا تبھی وہ گھائل ہو کر یہاں تک پہنچ گئی..... چلو مان لیتی ہوں۔ عون ایسا نہیں..... لیکن وقتی طور پر تو انسان شیطان کے بہکاوے میں آجاتا ہے نا..... پھر سامنے ماہ رو جیسی قیامت ہو۔ عون کا دل پھسل گیا ہو گا۔ جانے اس سے کیسے تعلقات بنا لیے ہوں گے۔ ماہ رو نے بھی موقع فراہم کیا ہو گا۔ کیا پتا' عون نے ٹائم پاس کرنے کے لیے ماہ رو سے دوستانہ بنایا ہو۔ سوچتا ہو گا۔ شادی تو طے ہے۔ خاندانی لڑکی سے ہو جائے گی۔ باہر تھوڑی عیاشی کر لے۔ پھر چھوڑ دینے کا ارادہ ہو گا۔ لیکن یہ امیر زادی عون کے گلے پڑ گئی۔ اور اچھا ہوا گلے پڑ گئی۔ ہماری جان چھوٹ گئی۔ ہم بچ گئے۔ اللہ کا شکر ہے۔ بروقت بچ گئے۔ شادی کے بعد پول کھلتا تو ہم تم کیا کر لیتے..... اسی لیے کہتی ہوں۔ مٹی ڈال اس کمینے پہ..... اللہ نے تمہارے جوڑ کا بہت اچھا بندہ بنایا ہو گا۔ تم از کم اس عون سے ہزار درجہ بہتر ہو گا۔" امی نے لمبی حکایت بیان کر کے بے ساختہ فریحہ کا ماتھا چوما تھا۔
"تو خوامخواہ عون کو ہر ایک کے سامنے سچا بنانے پہ تلی ہے۔ ارے' مرد کا کیا بھروسا! باہر سات سو عورتوں سے آنکھ لڑا کر گھر میں معصوم بن جاتا ہے۔ میں تو اول روز سے ہی جانتی تھی۔ اس سارے شرمناک قصے میں عون کا ہی ہاتھ تھا۔ اتنا نیک چلن تھا' اتنا سچا تھا تو اسے چھوڑتا کیوں نہیں؟ وہ زبردستی اس کے پیچھے آئی تھی تو اب طلاق کیوں نہیں دیتا؟ اس کا فرض تھا کھڑے کھڑے اسے گھر سے نکال دیتا اور تم سے نکاح

کرتا.... لیکن بات تو واضح ہے۔

عون نے خود ماہ رو کو ورغلا کر چکر چلایا.... اس سے تعلقات استوار کیا۔ پھر اپنے باپ کے خوف سے ماہ رو کی محبت سے جان چھڑوانی چاہی اور خود ہی پھنس بھی گیا۔ کیونکہ ماہ رو کوئی عام لڑکی نہیں جو عون سے دب جاتی۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پہ آگئی۔ عون کے مراد بر آئی۔ اس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی ہے فریحہ! ورنہ اپنی بیوی کے ساتھ راضی برضا ہے خوش ہے۔ اس کی خاطر نوکری بھی کرلی۔ اور زبردستی نوکری پہ بھی جانے لگا۔ اور یہ تیرے تایا کی بھی کوئی چال لگتی ہے۔ بیچ میں یہ سب ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے مل کر ہمیں بیوقوف بنایا ہے۔ عون کی شادی جان بوجھ کر تم سے تڑوائی۔ ان کی نیتوں میں ماہ رو کی دولت دیکھ کر فتور آگیا تھا...." امی ایک ہی سانس میں ایسا شروع ہوئیں کہ آخر میں ہانپنے لگیں۔ فریحہ نے ٹونٹی کھول کر امی کو پانی پلایا تھا۔ پھر خود بھی پانی پی کر اندر لگی آگ کو بجھانے لگی تھی۔ اس نے امی کی ہر بات سن لی تھی۔ سمجھ لی تھی۔ غور بھی کرلیا تھا۔ جو بات امی اتنی عرصے بعد اب سمجھ پائی تھیں وہ فریحہ نے اول روز ہی سمجھ لی تھی۔

اسے ابا نے بتایا تھا۔ کئی مرتبہ بتایا تھا کہ تمہاری سہیلی رحمان پلازہ بہت آتی ہے۔ پہلے تو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اب متواتر آتی ہے۔ فریحہ کے اپنے سورسز (ذرائع) بھی بہت تھے۔ اسے ہما نے بھی کئی مرتبہ بتایا تھا۔ ماہ رو تمہارے کزن میں انٹرسٹڈ لگتی ہے۔

ماہ رو وہاں جاتی تھی۔ یا بلوائی جاتی تھی؟

تب فریحہ اس وہم میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس کی چند دن بعد شادی تھی سو وہ وہم میں کیوں پڑتی.... اور تب فریحہ کو لگتا تھا۔ ہما جلن میں اسے ڈبل مائنڈڈ کرنا چاہتی ہے۔ وہ فریحہ سے جلتی ہے۔

لیکن یہ خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ ان کی وجوہات تھیں اور ٹھیک وجوہات تھیں۔

ماہ رو اور عون ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہو سکتے تھے۔ اور واقعی ہی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ماہ رو میں جو سب سے بڑی خوبی تھی۔ وہ اس کا بے داغ حسین سراپا تھا۔ جو کسی بھی مرد کو اسیر کرلیتا۔

اور عون عباس ماہ رو کا اسیر ہو گیا تھا۔ مانتا یا نہ مانتا۔ تسلیم کرتا یا نہ کرتا۔ اگر ابھی تک بھی مکر رہا تھا تو فریحہ کی بلا سے۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی، عون کب تک اور کہاں تک مکرتا ہے؟

مہندی والی رات پنڈال میں جانے سے پہلے اسے ایک فون کال موصول ہوئی تھی۔ ایک ایسی کال جس کی فریحہ کو نہ توقع تھی اور نہ امید تھی۔ نہ گمان میں تھا اور نہ خیال میں تھا۔

کال کرنے والی عورت شازمہ تھی۔ ماہ رو کی ماں.... جب اس عورت نے تعارف کروایا تب فریحہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

وہ شازمہ تھی جو عون کے بارے میں فریحہ سے کرید کرید کر پوچھ رہی تھی۔ عون کیسا ہے؟ کس مزاج کا ہے؟ تعلیم کیا ہے؟ کرتا کیا ہے؟ فریحہ نا سمجھی کے عالم میں بتاتی رہی۔ گو کہ وہ اتنی نا سمجھ نہیں تھی۔ پھر بھی اچانک کچھ کنفیوز ضرور ہو گئی تھی۔ اسی گھبراہٹ میں وہ تمام سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ پھر فریحہ کے سر پہ شازمہ نے جیسے دھماکا کیا تھا۔

"ایکچوئیلی! عون، ہماری ماہ رو میں انٹرسٹڈ (دلچسپی رکھتا) ہے۔ یو نو ماہ رو کے لیے پرپوزلز کی کمی نہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکا ہمارے سرکل میں ہے۔ لیکن ماہ رو کے ڈیڈی کسی مڈل فیملی میں رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں مڈل لوگ بہت لوونگ ہوتے ہیں اور قدر دان بھی۔ عون ماہ رو سے محبت کرتا ہے اور ہماری ماہ رو بھی.... ابھی تک اس نے پرپوزل نہیں بھیجا.... اینی وے، یہ اس کا ہیڈک ہے.... اوکے بائے.... پھر بات کروں گی۔ عون کے بارے میں انفارمیشن چاہیے تھیں، سو مل گئیں۔" عجیب پاگل عورت تھی۔ خواہ مخواہ اول فول بکے چلی جارہی تھی۔ اور اس پاگل سے زیادہ فریحہ نادان نکلی جو اس عورت کی بکواس کا جواب دیتی رہی۔

تب فریحہ نے اس عورت کی بکواس کو بکواس سمجھ

کر بھول جانا بہتر سمجھا۔ حالانکہ کوئی بھی بات معمولی ہرگز نہیں تھی۔ پہلے اس نے سوچا 'امی کو بتائے۔ پھر امی کی پریشانی کے خیال سے خاموش ہو گئی تھی۔ بعد میں اسے شازمہ کو سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اس کی کزنز کا جھرمٹ پہنچ گیا تھا اور اسے پنڈال میں لے جایا گیا۔ لیکن اس کے بعد ہوا کیا؟ شازمہ کی بکواس سچ ثابت ہو گئی؟

اور عون کا سارا پول کھل گیا۔ اسی رات ہی عون فریحہ کے دل سے اتر گیا تھا۔ اسی رات ہی فریحہ نے عون کو اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

گو کہ بھولنے میں 'ذہنی طور پر اس صدمے سے نکلنے میں فریحہ کو بہت وقت لگا تھا۔ لیکن اس نے خود کو مضبوط کر لیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ پورے قد سے زمین پہ کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ عون کو بھول گئی تھی۔

لیکن کیا وہ اپنی ذلت کو بھول سکی تھی! اس توہین کو بھول سکی تھی جو عون اور ماہ رو نے اس کے جذبات روند کر کی۔ شادی توڑ کر پورے زمانے کے سامنے رسوا کر کے کی۔ عون نے اور ماہ رو نے جو بھی کیا بہت برا کیا۔ پوری پلاننگ سے کیا۔ وہ ماہ رو سے سو مرتبہ شادی کر لیتا۔ جب دل کرتا شادی کر لیتا۔ لیکن فریحہ کو تماشا نہ بناتا۔ کم از کم شادی کا ڈرامہ رچا کر نہ کرتا۔

صاف صاف فریحہ کو ماہ رو کے متعلق بتا دیتا۔ وہ خود بخود رستے سے ہٹ جاتی۔ اس شادی کو توڑ دیتی۔ کیونکہ فریحہ کبھی بھی ایک ایسے شخص کی بیوی نہ بنتی جس کی یادوں اور دل میں اس کی سہیلی کا تصور ہوتا یا محبت ہوتی لیکن جو عون اور ماہ رو نے اس کی زندگی کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ وہ بھولنے والا نہیں تھا۔

فریحہ بھی ویسی ہی گیم کھیل کر عون کو برباد کرنا چاہتی تھی 'رسوا کرنا چاہتی تھی 'اس نے ماہ رو کی خاطر اسے برباد کیا تھا خود ماہ رو کے ساتھ کیسے آباد ہو سکتا تھا؟ فریحہ اسے کس طرح سے آباد ہونے دیتی؟ اور امی کہتی تھیں۔ ان کی بیٹی بھولی ہے۔ نادان ہے سادہ ہے۔۔۔ اور لوگ اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر اسے نوکر بنائے ہوئے ہیں۔۔۔ وہ عون کی نوکرانی بنی ہوئی ہے۔

اس کی بھولی امی فریحہ کی ذہانت اور فہم سے واقف نہیں تھیں۔ وہ ماہ رو سے زیادہ ذہین 'شاطر دماغ' عقل مند اور چالاک تھی۔ بظاہر کم گو 'سنجیدہ' دبو لیکن دماغ کے معاملے میں بہت تیز۔ وہ ماہ رو کو اپنی ذہانت سے پچھاڑنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

اس کی امی کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ عون سے تعلقات استوار کرنے کے پیچھے کیا وجوہات تھیں؟ پہلی بات اس کا اعتبار اور اعتماد لوٹانا۔۔۔ دوسری بات اس کو اعتماد میں لینا۔۔۔ اسے معاف کر کے اعلا ظرفی کی عظیم مثال قائم کرنا۔ اس کی نگاہ میں بلند اور بلند ہو جانا۔۔۔ عون کا بھروسا حاصل کرنا۔۔۔ اسے پھر سے قابو میں کرنا۔ ماہ رو اور عون کو الگ کروانا۔۔۔ بڑی ہوشیاری سے ماہ رو کا پتا کاٹ دینا۔

اتنی صفائی کے ساتھ وہ پشت میں خنجر گھونپ دینا چاہتی تھی جس قدر صفائی کے ساتھ ماہ رو اور عون نے اس کی پشت میں خنجر اتار دیا تھا اور پورے زمانے کے سامنے معصوم اور مظلوم بھی بن چکے تھے۔ ان سے بڑھ کر ہوشیار بھلا کون تھا؟ اور اب فریحہ باقاعدہ طور پر اپنی گیم کا آغاز کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ حالات سازگار بھی تھے اور کنٹرول میں بھی تھے۔

عون ایک مرتبہ پھر اس کی مٹھی میں تھا۔ کیونکہ فریحہ سے شادی توڑنے کے گلٹ (گناہ) اور شرمساری کے فیز سے نہیں نکلا تھا نہ فریحہ اسے نکلنے دینا چاہتی تھی۔

وہ عون سے اس وقت ہر بات منوا لینے کی پوزیشن میں آچکی تھی۔ عون اسے مظلوم بھی سمجھتا تھا اور اپنا ہمدرد بھی۔۔۔ یوں فریحہ کو اپنی پلاننگ فل طریقے سے ہینڈل کرنے کے لیے سازگار حالات مل گئے تھے۔

اگر اس گیم میں ماہ رو کو مات ہوئی 'فریحہ کی خواہش کے عین مطابق عون اسے طلاق دے دیتا تو یہ فریحہ کی پہلی کامیابی تھی۔

طلاق کے بعد اگر عون فریحہ کی طرف بڑھ آتا۔۔۔ اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتا تو یہ فریحہ کی دوسری کامیابی تھی۔

اور اگر عون ' ماہ رو کو طلاق دے کر فریحہ تک نہ بھی آتا۔ فریحہ سے شادی نہ بھی کرتا تب بھی فریحہ شکست خوردہ کبھی نہ ہوتی۔ فاتح ہی رہتی۔ اس لیے کہ دنیا بڑی وسیع تھی اور ایک عون عباس پہ ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ لیکن فریحہ یہ نہیں جانتی تھی ماہ رو سرفراز کے لیے دنیا بڑی چھوٹی تھی اور صرف عون عباس پہ ختم ہو جاتی تھی۔

✡ ✡ ✡
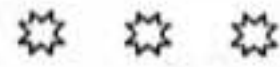
اور کبھی کبھی زندگی میں در آنے والا ایک لمحہ پوری زندگی کو بدل دیتا ہے۔

ماہ رو کی زندگی میں وہ خوش نصیب لمحہ جگمگاتا ہوا آ گیا تھا۔ وہ پوری عمر بھی اس گھر میں عون کی بے اعتنائی سہتے سہتے گزار دیتی تب بھی اس ایک لمحے کی سرشاری کا خاتمہ کبھی نہ ہوتا۔ وہ ایک لمحہ جو پوری زندگی پہ بھاری تھا۔ وہ ایک لمحہ جو پوری زندگی پہ محیط تھا۔ وہ اس ایک لمحے کی عنایت پہ ایسی معطر ہو چکی تھی کہ اس کی جیٹھانیاں ماہ رو سے پوچھ پوچھ کے تھک جاتیں۔

"ماہ رو! بتا دو گلابوں میں ڈھل کر کہاں سے آ گئی ہو؟" ثنا مسکرا مسکرا کر کہتی۔ پھر اسے چھیڑتی۔

"یاروں سے بھی پردہ داری...؟" کبھی مریم حیرانی سے پوچھنے لگتی۔

"بنارسی صبح نے تم پہ سایہ کر رکھا ہے... یا دیور جی کا کمال لگتا ہے۔" اس کی حیرانگی اور تعجب کسی طور پر کم نہیں ہوتا تھا۔ اور ماہ رو ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتی۔ گل و گلزار ہو جاتی۔ سراپا گلاب ہو جاتی۔ ان دونوں ماہ رو پہ دلکشی کا ہن برس رہا تھا۔

کئی مرتبہ تو عون بھی چونک جاتا۔ ٹھٹک جاتا۔ پھر جھنجلا جاتا۔

"تم یہ پارلروں کے چکر لگانے بند کرو۔" عون کے غصے پہ ماہ رو حیران رہ جاتی۔

"میں تو عرصہ ہوا پارلر نہیں گئی۔" ماہ رو سر تھام کے بیٹھ جاتی تھی۔ "یہ عون بھی نا..."

"تو پھر؟ یہ..." وہ اس کے حسن پہ کمنٹ دیتا دیتا رک جاتا تھا۔ تعریف کرنا تو گوارا ہی نہیں تھا۔ بس تنقید کر سکتا تھا اور تنقید بڑی دل جمعی سے کرتا تھا۔

"یہ تمہارا حسن نظر ہے... اور کچھ نہیں۔" ماہ رو بھی شرارتاً اسے چھیڑنے لگتی۔

"میں تمہیں اتنی حسین لگتی ہوں۔ حالانکہ یہ ڈریس رات سے پہن رکھا ہے... اور بال بنانے کا بھی ٹائم نہیں ملا۔" وہ بھی ماہ رو سرفراز تھی۔ بات کی جان ہی نہ چھوڑتی۔ گھما پھرا کر جتاتی۔

"اور آج تو منہ بھی نہیں دھویا۔" اس کی آنکھیں جگر جگر کرتیں اور مسکراہٹ ہونٹوں سے کبھی جدا نہ ہوتی اور تب عون جھنجلا کر باہر نکل جاتا تھا جیسے لا جواب ہو جاتا تھا۔

وہ ایسا ہی ایک بھیگا بھیگا سا دن تھا۔

موسم کے بدلتے ہی گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ پھر یہ برسات کے دن تھے۔ کبھی کبھی تو متواتر بارش ہوتی۔ رات دن لگاتار مینہ برستا تھا۔ بہت سہانا سماں ہو گیا۔ بڑے خوش گوار دن اور بڑی پر سکون ٹھنڈی راتیں ہو چکی تھیں۔

ڈیڈی کو کچھ ہارٹ ٹربلنگ ہوئی تو شازمہ انہیں ابراڈ لے جا رہی تھی۔ ان کا منتھلی (ماہانہ) چیک اپ کروانے۔ جانے سے پہلے وہ لوگ ماہ رو کے گھر ملنے کے لیے آئے تھے۔ اور ڈیڈی ہنستی مسکراتی ہیروں کی طرح دمکتی ماہ رو کو دیکھ کر ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو گئے تھے۔ اور جب ڈیڈی لوگ جانے لگے تب ڈیڈی سے عون کی امی نے بڑی سادگی بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ جب آئیں گے بھائی صاحب! تو عون کا ولیمہ کروں گی بہت دھوم دھام سے۔" امی کے سادگی بھرے لہجے میں کہے گئے الفاظ پہ ڈیڈی تو مسکرا کر سرہلا گئے تھے لیکن شازمہ نے اپنا مخصوص کھٹا میٹھا انداز اپنا کر بات پکڑنا ضروری سمجھا تھا۔

وہ نزاکت سے مسکراتی ہوئی بڑے انداز میں بولی۔

"بہن! کچھ زیادہ جلدی نہیں کر رہے آپ۔ ایک سال بعد کر لیتے... ابھی تو صرف دو ماہ ہی گزرے ہیں۔" شازمہ کے مخصوص کھنکتے لہجے اور الفاظ پہ مریم

"ثنا" کائنات اور ماہ رو ہنس ہنس کر بے حال ہو چکی تھیں۔ تب مریم نے ثنا کے کان میں گھس کر کہا۔
"ایک سال بعد ٹھیک رہے گا۔ تب تک بچہ بھی اپنے ابا کا ولیمہ اٹینڈ کرنے آجائے گا۔"
رات تک عون اور ماہ رو کا ولیمہ ہی ڈسکس ہوتا رہا۔ امی شازمہ کے طعنے پہ سیریس ہو چکی تھیں اور اب جلد از جلد عون کا ولیمہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے ڈیڈی کے واپس آجانے کے بعد ہی تقریب ہو سکتی تھی۔ بڑے ہال میں ہمیشہ کی طرح محفل جمی تھی۔ سب لوگ ہی موجود تھے۔ سوائے فریحہ کی فیملی کے۔

امی اور ابو ذرا الگ تھلگ کوئی گتھی سلجھانے میں مصروف تھے۔ باقی سب لوگ ذرا فاصلے پہ پھل جھڑیاں چھوڑتے عون کے ولیمے پہ تبصرے کر رہے تھے۔

کائنات کو اپنے ڈریس کی فکر پڑ گئی تھی۔ ثنا اور مریم بھی کپڑوں پہ ڈسکشن (گفتگو) کرنے لگیں۔ ماہ رو عاشر سے گپ لگا رہی تھی۔ جب عون بھی دفتر سے آگیا۔ خاصا تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ نوکری اور اپنے کام میں بہت فرق تھا۔ وہاں حکم چلانا ہوتا تھا۔ نوکری میں حکم ماننا ہوتا تھا۔ سو اچھے بھلے جاب کا شوق پورا کرتے ہوئے صاحب کے کس بل نکل رہے تھے۔
عون کے آتے ہی محفل کا رنگ بدل گیا تھا۔ ثنا اور مریم جیسے فارم میں آگئیں۔
"دیور جی! آپ کے لیے خوش خبری ہے۔" ثنا نے مسکراتے ہوئے عون کو بھی گفتگو میں شامل کیا۔
"ہیں جی؟ کون سی؟ کیا ماہ رو بھی اپنے ڈیڈی کے ساتھ ابراڈ جا رہی ہے؟" عون نے اس انداز میں کہا۔ جیسے اس خبر کے لیے کان ترس رہے تھے۔ ماہ رو کا اچھا بھلا موڈ خراب ہوا تھا۔
"تم مجھ سے اتنے تنگ ہو تو چلی جاتی ہوں۔" وہ تنک کر بولی تھی۔ منہ میں آئی منہ پہ مار دیتی تھی آخر ماہ رو سرفراز تھی۔
"دھمکی کیوں دیتی ہو، عمل کر کے دکھاؤ۔" عون نے اسے اور بھی تپ چڑھائی تھی۔ ان کی ایسی گرما گرم لڑائیاں عام روٹین کا حصہ تھیں۔ ایک سیر تھا دوسرا سوا سیر۔ برداشت دونوں میں بالکل نہیں تھی۔
ثنا کو بیچ میں مداخلت کر کے سیز فائر کروانا پڑا تھا۔ پھر وہ ڈپٹ کر رعب سے بولی۔
"دیور جی! آپ ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈالتے ہیں۔"
"اسے اٹھا کر باہر پھینک آؤ۔" عاشر نے بڑا مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔
"عون کو باہر پھینک دیا تو ولیمہ کس کا کریں گے۔" مریم نے عاشر کو دھپ لگائی تھی۔ تب اٹھتا ہوا عون لحہ بھر کے لیے چونک گیا تھا۔
"ولیمہ؟" اس نے حیرت سے حاضرین محفل کو دیکھا تھا۔ "کس کا ولیمہ ہو گا؟"
"تمہارا۔" ثنا نے مسکرا کر بتایا۔
"لیکن کیوں؟" عون نے تعجب سے پوچھا۔
"گھامڑ! ولیمہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اعلان شادی کے لیے... امی چاہتی ہیں سارے رشتے داروں کو اکٹھا کیا جائے۔" عاشر نے بھنا کر کہا تھا۔ عون چڑ سا گیا۔
"تاکہ پھر تماشا لگے؟" وہ تپ کر اٹھنے لگا تھا۔ پھر عاشر نے ٹانگ مار کر اسے واپس بٹھالیا۔
"جو بھی کہو... ولیمہ تو ہو کر رہے گا۔" اس نے اطلاعاً "عرض کیا تھا۔ تاکہ عون سمجھ لے۔ امی ابو نے فائنل فیصلہ کر دیا ہے۔ سو اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ کچھ سوچ کر عون بھی چپ کر گیا۔ پھر دلچسپی سے ان کی باتیں سنتی ماہ رو کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنے مخصوص اسٹائلش پیرہن میں بال بکھرائے مسکرا رہی تھی۔ جیسے ان کی گفتگو انجوائے کر رہی تھی۔ اس کے لمبے کھلے ریشمی بال دائیں کندھے پہ آگے کی طرف گرے ہوئے تھے۔
عون کو خوامخواہ الجھن ہونے لگی۔ ایک تو اس کی لاپروائیاں...؟
اردگرد تین چار دیور بیٹھے تھے۔ ساس سسر بھی موجود تھے اور محترمہ بیچ میں بال کھولے بڑی بے حیائی سے اپنا ولیمہ ڈسکس کر رہی تھیں۔ ثنا اور مریم سے

لباس فاخرہ کے متعلق گفت و شنید ہو رہی تھی۔
عون نے لحہ بھر کے لیے سوچا تھا پھر اٹھ کر جانے سے پہلے بولا۔
"اتنی جلدی بھی کیا ہے ولیمہ کی۔ میرے دونوں ولیمہ اکٹھے ہی کرلینا۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا ماہ رو کو دیکھ کر اور بھی مسکراہٹ کو پھیلا رہا تھا۔ اور ماہ رو کی مسکراہٹ ایک لمحے میں ہی سمٹ گئی تھی۔
حاضرین کو جب عون کی بات سمجھ میں آئی تو سب نے اسے ملامت کرنا شروع کردیا۔ عون نے کان دبا کر نکل جانا ہی مناسب سمجھا... لیکن جانے سے پہلے فریحہ کا ضرور پوچھا تھا۔
"فریحہ کہاں ہے؟ کھانا کون دے گا؟ اتنی بھوک لگی ہے۔ کسی کو کھانا پوچھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ فریحہ نہ ہو تو ہم لوگ بھوکے ہی مرجائیں۔" وہ دل کی جلن باہر نکالتا مڑنے لگا جب ثنا اور مریم بیک وقت بول پڑی تھیں۔ ان دونوں کو اچھا بھلا غصہ آگیا تھا۔ عون کو کان دبانے ہی پڑے تھے۔
"کھانا تمہاری بیوی دے گی اور پکایا تمہاری بھابھیوں نے ہے۔ ہمارے ہاتھ سلامت ہیں۔ ہم فریحہ کے محتاج نہیں۔" ثنا اور مریم نے اچھی بھلی کلاس لی تو عون جان چھڑاتا بھاگ نکلا تھا۔ تب ماہ رو بھی جلدی سے کشن گود سے گرا کر بھاگتی ہوئی کچن میں آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆
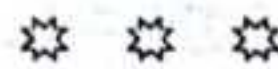
اس نے کھانا اوون میں گرم کرکے کچن ٹیبل پہ ہی لگا دیا تھا۔ عام روٹین میں کھانا دسترخوان پہ ہی لگا کرتا تھا لیکن جب یوں الگ الگ کھانا پڑتا تو جیسے دل چاہتا ویسے کھا لیا جاتا۔ چاہے اپنے کمرے میں یا پھر کچن میں۔ آج چکن منچورین تھا۔ ساتھ تندوری روٹی، سلاد اور پانی۔ ماہ رو کھانا لگا کر اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد فریش سا کچن میں آ ہی گیا تھا۔ جیسے ہی وہ اسٹول کھینچ کر بیٹھا، ماہ رو بھی برابر ہی بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اسٹول کھینچ کر تھوڑا پیچھے کیا تھا کیونکہ ساتھ اسٹول رکھنے پہ عون نے گھورنے کی کوشش فرمائی تھی۔
ماہ رو نے اس دفعہ اسٹول مقابل رکھ لیا تھا۔ اب وہ عون کے لیے سالن نکال رہی تھی۔ پھر سلاد سامنے کیا۔ اور گلاس میں پانی ڈالا۔ جیسے ہی عون نے پہلا روٹی کا نوالہ توڑا... ماہ رو نے بھی اپنی روٹی کا نوالہ توڑ لیا۔ عون نے تھوڑا ترچھی نظر سے ماہ رو کی طرف دیکھ کر کہا۔
"تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔" ماہ رو نے بے ساختہ نفی میں سرہلا کر زبان بھی برابر ہلائی تھی۔
"نہیں۔"
"کیوں؟" عون نے پوچھا۔
"تمہارا انتظار کررہی تھی..." ماہ رو نے بنا جھجک کے بتا دیا تھا۔ حاضر جواب تو وہ بلا کی تھی اور اعتماد بھی لاجواب تھا۔
"وجہ؟" اس نے ایک بھوں اچکا کر کہا۔
"تاکہ ایک ساتھ کھانا کھائیں..." ماہ رو نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ دونوں کا پہلا پہلا نوالہ ابھی ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ نوالہ ہاتھ میں پکڑے کچھ متعجب ہوا۔
"آج سے پہلے یہ تردد کیوں نہیں کیا؟"
"تاکہ تمہیں برا نہ لگے۔" جواب برجستہ تھا۔
"اور اگر اب برا لگے تو؟" عون نے گہرے لہجے میں کہا۔ "کیا تم کھانا چھوڑ دو گی؟"
"نہیں۔" اس کی سنجیدگی قابل دید تھی۔
"تم زبردستی کرو گی؟" اس نے پھر سے سوال کیا۔
"ہاں۔" ماہ رو نے اثبات میں سرہلایا۔
"کیونکہ تم زبردستی کرنے کی عادی ہو۔" اس کا لہجہ کچھ طنزیہ ہوگیا۔ ماہ رو نے شدومد سے ایک مرتبہ پھر سرہلایا۔
"واقعی۔"
"اور تم جوتوں سمیت آنکھوں میں بھی گھس جاتی ہو رائٹ؟" عون نے پھر سے طنزیہ لہجہ اپنایا۔

"اور جوتوں سمیت دل میں بھی گھس جاتی ہوں رائٹ؟" اس نے عون کے انداز میں جواب دیتے ہوئے سوال کیا تھا۔ عون اب تو لمحہ بھر کے لیے چپ ہوا۔ اور جب وہ جواب دینا نہیں چاہتا تو بات بدل دیتا تھا اور یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ اور وہ اس پہ پورا پورا قائم تھا۔ اس نے اب بھی بات بدل دی تھی اور بات کو وہیں پہ لے گیا تھا جہاں سے شروعات ہوئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سابقہ انداز میں کہا۔

"اور اگر میں رات بھر نہ آتا تو؟" وہ پوچھنا چاہ رہا تھا اگر وہ رات کو آتا ہی نا۔ کسی کام سے رک جاتا۔ آؤٹ آف سٹیشن چلا جاتا تو پھر ماہ رو کیا کرتی۔ کیا رات بھر بھوکا رہتی؟ یقیناً "نہیں۔

"پھر میں انتظار کرتی..... لیکن کھانا نہ کھاتی۔" ماہ رو نے اسے تعجب میں ڈال دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کی لیے بھونچکارہ گیا تھا۔ پھر اس نے کندھے اچکا دیے۔

"یہ تو احمقانہ سی بات ہے۔" اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

"تم نے محبت کو کب سمجھ دار دیکھا ہے؟" ماہ رو کا لہجہ کٹیلا تھا۔ وہ جیسے اندر ہی اندر متاثر ہوا تھا۔ یعنی محترمہ کو بولنا آتا تھا اور اچھا ہی بولنا آتا تھا۔

"محبت بیچ میں کہاں سے آگئی؟" عون نے برا مانتے ہوئے کہا تھا۔ جیسے محبت کا لفظ سن کر بہت برا لگا تھا۔ دل چاہا محبت کو کہیں دور ہی پھینک آئے۔ اسے دین خوار کرتی تھی۔

"محبت بیچ میں نہ ہوتی تو میں بھی یہاں نہ ہوتی۔" ماہ رو کا دل بجھ گیا۔ افسردہ ہو گیا۔ وہ لمحہ بھر میں رنجیدہ ہو گئی تھی۔ عون اس کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ وہ اس کی شکستگی کو بھی سمجھ گیا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھی؟ عون کھوج گیا۔ لیکن پھر بھی ایک پھانس تو تھی ہی۔

"کیا تم مجھ سے واقعی ہی محبت کرتی ہو؟" اس کا انداز بڑا ہی عجیب تھا۔ بالکل نہ سمجھ میں آنے والا۔

"کیسے یقین دلاؤں؟ شاید کوئی پیمانہ ہوتا اور ناپ لیا جاتا۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی تھی۔

"اگر محبت ہے تو اسے ثابت کر کے دکھاؤ؟" اس کا انداز ایک مرتبہ پھر عجیب تھا۔ چیلنجنگ سا۔ تحریک دلاتا۔ اکساتا۔ ماہ رو سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اگر محبت کی جائے یا محبت ہو جائے تو کیا ثبوت مانگتی ہے۔ کیا ہر محبوب ثبوت چاہتا ہے؟ ثبوت کیسے لایا جاتا ہے؟ ثبوت کس طرح سے لایا جاتا ہے؟ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"تم ایک مرتبہ پہلے بھی یہی سوال کر چکے ہو۔" ماہ رو اسے پلازہ میں ہونے والی ملاقات یاد دلا رہی تھی۔ جو یقیناً "خوش گوار نہیں تھی۔

"تب تم نے مجھے مطمئن کیا تھا؟" اس کا انداز طنز سے اچانک پاک ہو گیا تھا۔ یوں کہ بالکل سادہ لہجے میں بات کرتا وہ ماہ رو کو بہت ہی عجیب لگا تھا۔

"نہیں۔" اس کی آواز مدہم ہو گئی تھی۔

"اور اب؟" عون کی آنکھوں میں لکیر سی ابھری تھی جو لمحہ بھر میں ہی معدوم ہو گئی تھی۔ اس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔ کچھ جانچتا ہوا تھا۔

"کیسا ثبوت چاہتے ہو؟" ماہ رو نے بہت دیر کی خاموشی کے بعد بڑے گہرے عمیق لہجے میں پوچھا تھا۔ ایک اذیت ناک تکلیف سے گزرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس سے بڑھ کر تکلیف دہ مقام کون سا تھا جسے آپ چاہتے ہوں۔ جس کے لیے ہر کشٹ اٹھا کر آئے ہوں۔ جس کے لیے آگ کے دریا پار کر کے آئے ہوں۔ وہ آپ کی محبت پہ یقین ہی نہ کرتا ہو جو ثبوت مانگ کر محبت کی ماری سچائی کو آلودہ کر دے۔ جو محبت کو بری طرح سے شرمندہ کر دے۔

"جو مجھے سیٹسفائڈ (مطمئن) کر سکے۔ میں یقین کر سکوں کہ واقعی تمہیں مجھ سے محبت تھی کوئی سازش نہیں۔" عون کی سوئی وہیں پہ اٹکی۔ وہاں سے نہ ہٹتی تھی نہ آگے بڑھتی تھی۔ ماہ رو نے گہرا سانس خارج کیا۔

"میری اس گھر میں موجودگی تمہیں کیا لگتی ہے؟ کوئی سازش ہوتی تو اب تک کھل جاتی۔ میں تمہارے لیے یہاں ہوں۔ تمہارے لیے خود کو بدل

رہی ہوں۔ میں وہ نہیں تھی جو اب ہو چکی ہوں۔ اور میں نے ہر تبدیلی کو بخوشی قبول کیا ہے۔ میں نے زبردستی خود کو اس ماحول میں نہیں ڈھالا۔ کیا پھر بھی ثبوت ہی چاہیے؟" اس کا انداز لمحہ بھر میں جارحانہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ دبی دبی سرخی اتر رہی تھی۔ دبا دبا غصہ چھا رہا تھا۔

عون اس کی طرف آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ پھر گہرا سانس کھینچ کر بولا۔

"تمہارا میری زندگی میں آنا ان ایکسپیکٹڈ (غیر متوقع) تھا۔ کوئی اس طرح بھی آتا ہے؟" اس نے جھرجھری سی لے کر تھوڑا عرصہ پہلے والی کیفیت سے خود کو نکالا تھا۔ جیسے ابھی بھی اس وقت کا خیال بڑا تکلیف دہ اور کسی حد تک متعجب کرنے والا تھا۔

"عون عباس.....!" وہ دھیمے انداز میں مسکرائی تھی۔ خاصی زچ کر دینے والی مسکراہٹ تھی۔ جیسے جلتی پہ تیل ڈال دیا ہو۔ "جو میرے جیسے کردار ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔" اس نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

"یعنی سر پھرے؟" عون نے تائید چاہی تھی۔ ماہ رو کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ چمک گئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے روٹی کے ٹکڑے کو دیکھ کر بولی۔

"کھاؤ نا۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" وہ خود بڑی بے تکلفی کے ساتھ عون کی پلیٹ سے سالن لیتی مزے سے آدھی روٹی باتوں باتوں میں کھا چکی تھی۔ عون کا نوالہ وہیں کا وہیں تھا۔ اور وہ بڑی حیرت سے ماہ رو کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ڈونگے کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں سالن پیندے سے چپکا بس برائے نام تھا۔ عون نے بھوک سے تنگ آ کر کھانا شروع کر دیا۔ ورنہ وہ تو باقی سالن منٹوں میں چٹ کر دیتی۔

جس طرح اس نے نہایت دیدہ دلیری سے روٹی شیئر کر لی تھی۔ سالن بھی شیئر کر لیا تھا۔ پھر پانی کو کیسے بخشتی؟ اس کا اس کی طرف بڑھتا ہاتھ دیکھ کر عون عجلت میں بول پڑا۔

"ہمارے گھر میں ایک ہی گلاس ہے کیا؟" اس کا پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے گلاس نہیں اٹھایا۔

"نہیں تو، اور بھی اسٹینڈ پہ لگے ہیں۔" اس نے آدھا گلاس خالی کر کے بچے ہوئے پانی میں اور پانی ڈال دیا تھا۔ وہ اس کی ساری کارروائیاں دیکھتا رہا تھا۔ پھر خاصی ناگواری سے کہہ اٹھا۔

"میں نے کبھی کسی کا جھوٹا پانی نہیں پیا۔" وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ ماہ رو کو اندر ہی اندر سے زچ کر کے مزا آیا تھا۔ وہ بڑی معصومیت سے چہک کر بولی تھی۔

"لیکن میرا تو پینا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ابلے ہوئے پانی کی آخری بوتل تھی۔ پہلے سے آدھی، جس میں سے ڈیڑھ گلاس میں نے پانی پی لیا ہے۔ اب یہ آخری گلاس پانی بچا ہے۔ چاہو تو پی لو۔ یا پھر صبح تک انتظار کرو۔" ماہ رو آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارتی چمک لے کر عون کی طرف دیکھتی بڑی معصوم بن رہی تھی۔ اتنی معصوم کے عون کو اس کی معصومیت پہ تاؤ آگیا۔

وہ آفس سے آکر بھی ایک گھونٹ پانی نہیں پی سکا تھا۔ اور اب حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے اگ رہے تھے۔ عون نے ایک سلگتی نظر مسکراتی ہوئی ماہ رو پہ ڈالی تھی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا۔ جب وہ پانی پی چکا، گلاس خالی ہو چکا تب ماہ رو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ثنا بھابھی نے بتایا تھا۔ ایک پلیٹ میں کھانا کھانے سے اور ایک دوسرے کا جھوٹا پانی پینے سے محبت بڑھتی ہے۔ اس لیے سوچا۔ یہ ٹرک آزمالوں۔" اب وہ بڑی معصومیت سے فریج کھول کر پانی کی دوسری بوتل نکال کر ٹیبل پہ رکھ رہی تھی یوں کہ عون کا دماغ جیسے تپ اٹھا تھا۔ وہ جھلا کر اسٹول کھینچتا اٹھ کھڑا۔

"تم بہت چالاک ہو۔" ماہ رو کی کھلکھلاتی ہنسی کی آواز اسے پیر پٹخنے پہ مجبور کر چکی تھی۔ وہ کچن سے واک آؤٹ کر گیا۔

✲ ✲ ✲

"تم چائے نہیں لوگے؟" ایک گنگناتی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے جلدی سے تکیہ اٹھا کر کانوں پر رکھ لیا۔ تازہ تازہ ڈاج کھا کے آیا تھا۔ ابھی غصہ برقرار تھا۔ کیا خبر چائے بھی جھوٹی پلا دے۔ محبت بڑھانے کے چکر میں۔ کوئی اس سے پوچھتا تو سہی۔ محبت ہوتی تو بڑھتی نا۔ اگر ہوگی نہیں تو بڑھے گی کیسے۔ اور جھوٹا کھانا پینے سے کیسے بڑھ جاتی ہے؟ حد ہو گئی؟ یہ ثنا بھابھی کے فرمودات لے ڈوبیں گے اسے۔ آج کل لگتا تھا ثنا بھابھی اس کی کلاس لے رہی تھی۔ اور اس کے مشوروں پہ عمل کر رہی تھی۔ جیسے صنم خود ڈوبے تھے اب اسے بھی ڈبونا چاہتے تھے۔ یہ تو اس کا بے چارا بھائی تھا جس نے ثنا بھابھی سے گزارا کر لیا۔ ورنہ ایسی باتونی عورت۔ اتنی لمبی زبان.... بس چلتا تو کاٹ ہی ڈالتا.... اور اب اس ماہ رو کو پٹیاں پڑھائی جا رہی تھیں۔ تبھی اس کی زبان کو بھی کاٹ مل گئی۔ خیر زبان تو اس کی آل ریڈی (پہلے ہی سے) بہت تیز دھار جیسی تھی۔ ثنا بے چاری کا تو نام ایسے ہی بدنام ہو گیا۔

اور کچھ دیر پہلے ثنا کی ٹپ اس پہ آزما کر وہ کس قدر خوش تھی۔ آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ چہرہ ٹیوب لائٹ سے زیادہ روشن تھا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے عون کو اپنا جھوٹا پانی پلا کر دنیا فتح کر لی ہو۔ ماؤنٹ ایورسٹ سر کر لیا ہو۔ بحر ہند میں ڈبکی لگا کر زندہ سلامت واپس آ گئی ہو۔ اور اب عون کے سر پہ کھڑی مسلسل بزر بجا رہی تھی۔

"بولو نا.... کیا چائے لاؤں؟" اس نے تکیہ اٹھا کر عون کے کان پاس چلانا چاہا تھا۔ وہ دوسرا تکیہ ہاتھ مارتا تلاش کرتا رہ گیا تھا۔

"پھر جھوٹی چائے؟" وہ بڑبڑایا۔

"پرامس (وعدہ) جھوٹی نہیں لاؤں گی اب۔" ماہ رو نے یقین دلانا چاہا تھا۔

"میں کیسے یقین کر لوں؟" عون نے تکیے میں منہ گھسیڑتے ہوئے کہا تھا۔ ماہ رو سوچ میں پڑ گئی۔

"تم میرے ساتھ کچن میں آ جاؤ۔" کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے مشورہ دیا تھا۔ عون جھٹ سے بول پڑا

"مجھے معاف کرو، میں نے جوشاندہ نہیں پینا...." اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

"لیکن میں اچھی چائے بنانا سیکھ چکی ہوں۔ اور سویٹ ڈش بھی۔ کسی دن تمہیں بھی ٹرائی کرواؤں گی۔" ماہ رو نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا تب عون جھنجھنا گیا۔

"تم اپنا بزر بند کرو۔ مجھے چائے نہیں پینا۔" جانے کون سی جھلاہٹ تھی جسے خواہ مخواہ نکال رہا تھا۔

"ویل.... نہیں تو نہ سہی باہر ایسی رومانٹک بارش ہو رہی ہے۔ اتنا قیامت موسم ہے۔ نہ پیو چائے۔ ایسے موسم میں تو چائے دیوانہ کرتی ہے۔" ماہ رو نے بارش کی گھنٹیوں پہ کان لگا کر اسے جلا جلا کر کہا تھا۔ عون نے تکیے کے نیچے سے منہ نکال کر اسے اک نظر دیکھا تھا۔ وہ سبز درپچوں کے پار ہونے والے شور کو سن کر خوش ہو رہی تھی۔

"میں حواسوں میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ دیوانہ نہیں ہونا چاہتا۔" عون نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ بارش کی آواز سے کان ہٹا چکی تھی۔

"بہت ہی بورنگ آدمی ہے۔" وہ اس کی ہمیشہ والی بے زاری، جھلاہٹ، ناگواری پہ کمنٹ دیتی خود دوبارہ کچن میں چلی گئی تھی۔ پھر چائے بناتے ہوئے اسے کریم یاد آ گیا۔ رات کے اڑھائی بجے بھی اسے چائے کی طلب ہوتی تو محض ایک بٹن دبانے کی دیر ہوتی تھی۔ کریم چائے بنا کر منٹوں میں لے آتا تھا۔

اور اس وقت ماہ رو رات کے پونے ایک بجے خود اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ جوشاندہ سے کچھ بہتر، بہر حال چائے تو تھی ہی.... اور عون کہتا تھا، اپنی محبت کا ثبوت دو۔ کیا یہ کم ثبوت تھا؟ ماہ رو ایک چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے کچن میں کھڑی اپنے ہاتھوں سے چائے بنا رہی تھی۔ اور عون کو یقین نہیں آتا تھا۔ اور پتا نہیں کیوں یقین نہیں آتا تھا؟

اس کے دل میں آزردگی کی کن من ہونے لگی، باہر موسم بھیگ رہا تھا اور اندر ماہ رو کا من بھیگ رہا تھا۔

بارشیں اچھی ہوتی ہیں لیکن افسردہ کرتی ہیں۔ یادوں کے بھیگتے نخلستان میں لے جاتی ہیں۔

اور ابھی اس نے کڑوی کسیلی چائے کا ایک سپ لیا ہی تھا جب اچانک موسم بپھر گیا۔ ہلکی کن من طوفانی بارش میں بدل گئی تھی۔ ایک دم درختوں کی شائیں شائیں حواسوں پہ چھانے لگی۔ آندھی کے تیز جھکڑوں کے ساتھ دھڑ دھڑ اولے بھی گرنے لگے تو ماہ رو کی چیخ نکل گئی تھی۔ رومانٹک بارش تو طوفانی بارش میں اچانک بدل چکی تھی۔ اوپر سے گاہے بگاہے بجلی کڑکتی اور بند روشن دانوں' کھڑکیوں کی درزوں سے لپکتی ہوئی اندر آتی۔ خوفزدہ کرتی۔ چیخنے پہ مجبور کر دیتی تھی۔

ماہ رو نے چائے کا کپ وہیں ٹیبل پہ پٹخا اور اندر بھاگ آئی۔ رومانٹک موسم میں چائے پینے کا شوق دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ اس نے ٹھک سے دروازہ بند کیا اور جلدی سے بیڈ پہ آ گئی۔ عون نے ٹھک کی آواز پہ ذرا گردن اونچی کر کے دیکھا تھا پھر تکیے میں منہ گھسا لیا۔ کمفرٹر میں گھسنے کے بعد اس نے آنکھیں موند لی تھیں لیکن باہر ہوتی گرج چمک سے خوفزدہ ہو کر پھر سے کھول لیں۔ اچھی بھلی کن من چل رہی تھی۔ سج سج اترتی بوندیں' بارش کا ہلکا شور اسے بڑا فیسی نیٹ (گرویدہ) کرتا تھا۔ اوپر سے ٹھنڈی ٹھنڈی پون بڑی رومانٹک لگتی۔

بارشیں خاصی رومانٹک ہوتی ہیں لیکن طوفان؟

"اللہ کی پناہ۔" بجلی کے کڑکتے ہی اس نے دل ہی دل میں کہا۔ خوف کے مارے اچھی بھلی خنکی میں پسینہ آ رہا تھا۔ وہاں ڈیڈی کے گھر تو کبھی آندھی' طوفان' بارش کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ چاہے جتنے مرضی طوفان آتے۔ گرج چمک ہوتی۔ پھر بھی کسی کو خبر نہ ہوتی۔ ساؤنڈ پروف گھر کی وجہ سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ صبح اٹھ کر ہی خبر ہوتی کہ رات بڑا طوفان آیا تھا۔ یا نیوز چینلز بتاتے تھے کہ طوفان نے کس کس جگہ تباہی مچائی تھی۔

اور یہاں ۔۔۔؟ تو ایسے لگتا تھا جیسے طوفان کھڑکیوں اور روشن دانوں کے شیشے توڑ کر اندر گھس آئے گا۔ اس نے مارے خوف کے کھڑکیوں اور روشن دانوں کی چٹخنیوں کو لرزتے کانپتے چرچراتے دیکھا تھا۔ معاً عون کی آواز تکیے کے پیچھے سے آئی۔

"لائٹ تمہارے باپ کے نوکر آ کے بند کریں گے۔" جانے اسے کس بات کی جھنجلاہٹ تھی۔ خوامخواہ چڑتا' لڑتا اور جھلاتا تھا۔

ماہ رو نے گردن گھما کر عون کی طرف دیکھا۔ جیسے تشکر بھرا سانس خارج کیا ہو۔

"تھینک گاڈ! یہ جاگ رہا ہے۔" وہ اندر ہی اندر کچھ مطمئن ہوئی تھی۔ ورنہ بپھرتے طوفان' کڑکتی بارش میں تنہا جاگ کر بارش اور طوفان کی دہلانے والی شائیں شائیں کو سننا بڑا بھیانک تھا۔

"نہیں تم کرو گے۔" اس نے آنکھیں میچے میچے جواب دیا تھا۔ آواز خاصی کانپتی سی تھی۔

"کیوں؟ تمہارے پیروں میں مہندی لگی ہے؟" عون نے چڑتے ہوئے بھنا کر کہا۔

"نہیں میں لیٹ چکی ہوں۔" اس نے عذر تراشا۔

"لیٹ چکی ہو۔ مر تو نہیں چکی۔" وہ غصے میں کمفرٹر پھینک کر اٹھا۔ ماہ رو بھی جلدی سے حواس باختہ بولتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"لائٹ بند کی تو شاید مر ہی جاؤں۔" اس کا لہجہ سخت روہانسا تھا۔ وہ مارے خوف کے سپید پڑتی جا رہی تھی۔ عون ذرا کی ذرا ٹھٹکا۔ اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ شاید سمجھ گیا تھا کہ وہ ڈر رہی ہے۔

"اچھا۔۔۔" اس کا انداز طنزیہ ہو گیا۔ "اب کرو نا۔۔۔ رومانٹک بارش کو انجوائے۔ بڑا رومانس چڑھ رہا تھا۔ تم پر اب آنکھیں میچ کر کمفرٹر میں گھسی ہو۔ نکلو باہر مل کر انجوائے کرتے ہیں طوفانی بارش کو۔ آندھی کے جھکڑوں کو کڑکتی بجلی کو۔" وہ منٹوں میں شروع ہو چکا تھا۔

"تمہیں تو موقع چاہیے مجھ پہ طنز کرنے کا۔" ماہ رو روہانسی ہو گئی تھی۔ عون جان بوجھ کر لائٹ آف کر

کے دوبارہ اپنی جگہ پر جم کے لیٹ گیا تھا۔ جیسے ہی بتی بجھی تھی کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ اب کڑکتی بجلی کے زیادہ اثرات دکھائی دیتے تھے جیسے ہی باہر بجلی کڑکتی روشن دان اور کھڑکی سے کوند کر کمرے میں گھس آتی تب ماہ رو کی گھٹی گھٹی چیخ منہ میں ہی دب کر رہ جاتی تھی اور عون سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھ کر اس کے خوف کو انجوائے کرتا ہوا بول رہا تھا۔

"مجھے تو روشنی میں نیند نہیں آتی۔"

"اور مجھے اندھیرے میں نہیں آتی...." ماہ رو نے بھنچی بھنچی آواز میں بتایا "اوپر سے باہر کا بھیانک شور۔"

"لیکن میں تو بہت انجوائے کر رہا ہوں۔ تم بھی کرو نا۔" شاید اس کا باتیں کرنے کو دل کر رہا تھا یا پھر کوئی خواہش سی جاگی تھی یا ماحول کا فسوں' تنہائی یا اپنے اور ماہ رو کے درمیان رشتے کا خوب صورت احساس۔ آخر ایک انسان ہی تھا۔ بشری تقاضوں سے مبرا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اور بندہ ہر ایک سے تو جھگڑ سکتا تھا۔ ہر ایک سے جنگ کر سکتا تھا۔ لیکن فطرت سے لڑنا آسان نہیں تھا۔ عموما" انسان فطرت سے ہار جاتا تھا۔ اور فطرت کا جیتا جاگتا ایک احساس اس کے بائیں پہلو میں تھا اور دھڑک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ کس طرح شوریدہ جذبات پہ بندھ باندھ لیتا۔ مچلتے احساسات کو روک پاتا۔ پاگل ہوتی دھڑکنوں کو قابو کر سکتا۔ دل کی بدلتی حالت کو معمول پہ لا پاتا۔ یہ کیسے ممکن تھا؟

اس نے کروٹ بدل کر ماہ رو کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے بہت قریب تھی۔ صرف چند سانسوں کے فاصلے پہ .... پھر بھی اس کے سینے کا زیروبم' سانسوں کا شور وہ محسوس کر سکتا تھا۔ وہ چت لیٹی تھی اور چھت کو گھور رہی تھی۔ یقینا" وہ خوف زدہ تھی۔ عون کا لہجہ اور انداز بدل گیا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھول گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کتنے فاصلے تھے۔ کتنی بڑی خلیج تھی۔ اور عون کو یہ بھی بھول گیا تھا۔ اسے ماہ رو سے انتقام لینا ہے۔ فریحہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینا ہے۔ اور اس پہ سوکن بھی لانی ہے۔ اور بھی جانے کیا کیا اس کے وہ سارے خوفناک ارادے دھڑ دھڑ کر کے خود بخود گر رہے تھے۔

اس نے کسی الہامی کیفیت میں گم ہو کر ماہ رو کے اوپر ہاتھ رکھا۔ تاکہ اسے متوجہ کر سکے۔ وہ جو چھت کو گھور گھور کے دیکھ رہی تھی عون کے لمس کو پا کر لمحہ بھر کے لیے دنگ رہ گئی۔ اس کا اوپر والا سانس اوپر اور نیچے والا سانس نیچے ہی دبا رہ گیا تھا۔

دل کی دھڑکنوں میں ایسا طلاطم بپا ہوا کہ اندر کا شور باہر کے شور پہ سبقت لے گیا تھا۔ پھر اسے عون کی دھیمی بوجھل آواز سنائی دی تھی۔ اس کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔

"ڈر رہی ہو؟" اس کا انداز بدل گیا۔ لہجہ بدل گیا۔ وہ بہت ملائمت سے پوچھ رہا تھا۔ ماہ رو نے اس کی گرم سانسیں اپنے چہرے پہ محسوس کی تھیں۔ یا پھر اس کے گال ہی گرم دھواں نکال رہے تھے۔ وہ سن سی ہو گئی۔

"ہاں۔" ماہ رو کے ہونٹ بے آواز پھڑپھڑائے تھے۔

"کس سے؟" وہ دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ ماہ رو کا خوف بڑھ گیا۔ لیکن یہ خوف نہیں تھا۔ یہ کچھ اور ہی تھا۔ کوئی اور نوکیلا سا احساس چبھن دیتا۔ چونکاتا ہوا۔ تو کیا اپنے لیے؟ محض اپنے من کی خواہش پر؟ اپنی طلب کے لیے؟ جب چاہا پہلو میں بیٹھایا جب چاہا دھتکار دیا؟

ماہ رو کی آنکھوں میں شب زفاف رڑکنے لگی تھی۔ وہ ذلت' وہ تکلیف' وہ خوابوں کا ٹوٹ جانا۔ عون کا دھتکار دینا۔ وہ تھپڑ جو ماہ رو کے گالوں پہ ابھی تک ایک یاد کی طرح نقش تھے۔

بھولنے کو تو ماہ رو ہمیشہ کے لیے بھول جاتی۔ کبھی اس وقت کو' اس اذیت اور درد کو یاد ہی نہ کرتی۔ اگر عون عباس کی طرف سے ایک لفظ معذرت کا سننے کو مل جاتا۔ صرف ایک حرف ملال کا اور بس.... وہ تو ماہ رو سرفراز کو بن مول کے بہت پہلے ہی خرید چکا تھا۔ وہ اپنے ڈھولن یار کی داسی تھی۔ لیکن وہ اپنے محبوب کی

صرف محبت' چاہ' الفت اور نظر التفات کی ہی پیاسی نہیں تھی۔

اسے اپنی کھوئی ہوئی عزت بھی چاہیے تھی۔ وقار بھی چاہیے تھا اور اپنی انا کی بھی ضرورت تھی۔ عزت نفس کی بھی ضرورت تھی اور عون جو اس وقت شجر سایہ دار کی طرح اس پہ اپنی چھاؤں کر رہا تھا۔ ماہ رو یہی تو چاہتی تھی۔ اس کا یہی تو اولین خواب تھا۔ تمنا تھی۔ خواہش تھی۔ لیکن اس طرح نہیں۔

"بولو! بولو نا ڈر لگ رہا ہے۔ کس سے؟" عون کی مخمور آواز اسے یادوں کے تلخ سمندر سے کھینچ کر باہر لے آئی تھی۔ ماہ رو نے ایک گھٹا گھٹا سانس سینے کی قید سے باہر نکالا۔ پھر اس کے منہ سے بے ارادہ ہی نکل گیا۔

"تم سے..." ماہ رو کے لفظوں میں جانے کون سا اثر تھا جو عون جھٹکا کھا کر حواسوں میں آگیا۔

"کیا؟" عون کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا سیدھا ہوا۔ پھر اس نے تکیے پہ اپنا سر گرا لیا تھا۔ اس کے دماغ میں سے دھواں نکلنے لگا۔

"او مائی گاڈ! آج پھر عون کو رہ رہ کر خود پہ غصہ آنے لگا۔ ماہ رو کیا سمجھتی ہو گی۔ دعوے آسمانوں جتنے کرتا ہوں اور... اور چند کمزور لمحوں میں سارے اختیار خود سے کھو دیتا ہوں۔ میں اس قدر کمزور ہوں؟ لمحوں کے فسوں کا شکار ہو جاتا ہوں یا پھر اس ماہ رو سرفراز میں ہی کوئی ایسی کشش ہے جو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

ایک مرتبہ پھر شرمندگی کا حصار کھینچ رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر خود کو ملامت کر رہا تھا۔ معاً اسی لمحے باہر بہت زور کی بجلی کڑکی تھی یوں لگا۔ روشن دانوں کو پھاڑتی ہوئی اندر آن گھسے گی۔ ماہ رو کی بے ساختہ چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے خوف کی انتہا پر بلا ارادہ ہی عون کا کندھا دبوچ لیا تھا۔ تب عون کی سنجیدہ سی سرد آواز اچانک سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ سونے دو' آدھی چیخیں کل تک اٹھا رکھو۔" وہ برفیلے لہجے میں بولتا کروٹ بدل گیا تھا یوں کہ ماہ رو آنسو بھری آنکھوں سے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور عون کے ازلی دھوپ چھاؤں جیسے رویے کے ساتھ بڑی سبک خرامی سے وقت گزر رہا تھا۔ ماہ رو اب عون کے رویوں پہ جلتی' کڑھتی اور سسکتی نہیں تھی۔ عون کی روٹین بھی وہی تھی۔ اب بھی فریحہ ان کی زندگیوں میں بلاوجہ ہی مداخلت کرتی تھی اور عون سے اپنی اجارہ داری ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ادھر عون بھی بھاگ بھاگ کر فریحہ فریحہ' کرتا ہر کام میں اس سے مشورہ لیتا تھا۔ فریحہ بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

اس دن خاندان میں کوئی فوتگی ہو گئی تھی' امی ابو' ثنا تینوں چلے گئے تھے۔ مریم میکے گئی ہوئی تھی۔ کائنات' یاسر' عامر کالج تھے۔ باقی آدھے پلازہ اور عون اپنے دفتر... جس سے گوڈے گوڈے تنگ آچکا تھا۔ اور صبح صبح ہزار باتیں کرتا' باس کو گالیاں دیتا روانہ ہوتا تھا۔

آج صبح بھی اسے اپنے باس پہ غصہ چڑھ رہا تھا۔

"الو کی دم ہے... بڑا کمینہ ہے۔ تین تین فائلیں اکٹھی دیتا ہے۔ اتنا کام جیسے الو کے پٹھے نے دام دے کر خرید لیا ہو۔" وہ اپنے باس کو کوستا تیار ہوتا زہر نکال رہا تھا۔

"ورکرز سے کام لے لے کرانہیں سوکھا تنکا بنا دیا۔ تنخواہ دیتے جان نکلتی ہے۔ خود الو' موٹا' سانڈ... کھا کھا کر پھٹنے کے قریب ہے۔" وہ ناشتا کرتے ہوئے بھی بھڑاس نکالتا جا رہا تھا۔

میری کیس فائل سانڈ کے پاس پھنسی ہوئی ہے... جیسے ہی چکمہ دے کر پروموشن فائل نکلوالوں گا' پھر اس سانڈ کو منہ بھی نہیں لگاتا۔ پروموشن ہوتے ہی میرا ڈپارٹمنٹ بدل جائے گا۔" عون زیر لب بڑبڑاتا اپنے باس کی غائبانہ درگت بنا رہا تھا۔ تب ہی اورنج جوس پیتی ماہ رو نے لمبی لمبی جمائیاں روکتے ہوئے کہا۔ "ایک بات کہوں' اگر تمہارا دماغ مزید نہ تپے تو؟" معاً اسے

ڈیڈی کی خواہش اور آفر کا خیال آگیا تھا۔ موقع مناسب بھی تھا۔ اور تمہید کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ سو ماہ رو نے بات کرنے کی ٹھانی۔

"ڈیڈی کی خواہش تھی۔ تم ان کے بزنس میں آجاؤ۔ اگر شیئرز رکھنا چاہتے ہو تب بھی.... ورنہ پراپرٹی میں جو میرا حصہ ہے۔ اسے ڈیڈی الگ کردیں گے۔ نئی فرم بھی لانچ کردیں گے۔ اور ہمیشہ ہیلپ فل رہیں گے اور تمہارے لیے آبجیکشن ایبل (اعتراض کے قابل) بھی کچھ نہیں.... اگر تم چاہو تو۔" اس نے جوس پی کر ٹشو سے ہونٹ صاف کیے تھے۔ عون سے بحث کے لیے انرجی کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔

"اگر میں نہ چاہوں تو...." عون نے تحمل سے ساری بات تو سن لی تھی۔ لیکن تیوری کے بل جوں کے توں تھے۔ جیسے اس کی بات پسند نہ آئی ہو۔

"تو پھر اپنے سڑے ہوئے سانڈ باس کی گھرکیاں سنتے رہو۔" ماہ رو نے طنز کیا۔ عون نے اسے سخت قسم کی گھوری سے نوازا تھا۔

"یعنی میری ہی بلی، مجھے ہی میاؤں۔" وہ تپ کر رہ گیا تھا اور سوچ رہا تھا آئندہ باس کی بکواس کے معاملے میں محتاط رہے گا۔ اس کے سامنے پھلجھڑیاں نہیں چھوڑے گا۔

اور ابھی ماہ رو شاید اسے قائل کرنے کے لیے کچھ دلائل بھی دیتی لیکن تب ہی فریحہ عون کی من پسند چائے بنا کرلے آئی تھی۔ کچھ بھی ہو جاتا۔ عون صبح سویرے فریحہ کی چائے کے بغیر نہیں جاتا تھا بلکہ قاسم، عاصم، عاشر وغیرہ تک بقول ان سب کے فریحہ کی چائے کا دم انہیں دن بھر تازہ دم رکھتا ہے۔

اور فریحہ اسی بات پہ گردن تان کر چلتی تھی.... کیونکہ جو خوبیاں اس میں تھیں۔ وہ کسی اور میں نہیں تھیں۔ اور جیسے ہی فریحہ نے عون کو کپ تھمایا.... عون نے من وعن ڈیڈی کا پیغام اور خواہش فریحہ تک پہنچادی۔ پہلے تو اس نے کمال اداکاری سے کہا۔

"میں اس معاملے میں نہیں بولتی۔ تم لوگوں کا آپس میں طے کرنے والا معاملہ ہے۔" لیکن جب عون کا اصرار بڑھا تو فریحہ نے ماہ رو کو اک خاص تیز نظر سے دیکھتے ہوئے اپنی رائے سے نوازا تھا۔

"ہمارے تو پرکھوں میں کبھی ایسے کام نہیں ہوئے۔ جو آج کل ہو رہے ہیں۔ ہوتے جارہے ہیں۔ تم اپنا بزنس لات مار چکے ہو۔ کسی اور کے بزنس میں کیوں جاؤ گے؟ پھر سسر کے بزنس میں سارا زمانہ باتیں کرے گا۔ عون کا بزنس میں شروع سے انٹرسٹ نہیں۔" فریحہ نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ ماہ رو کو بے طرح سے غصہ آگیا۔

"عون عباس کے اور ہمارے بزنس میں کافی ڈیفرنس ہے۔" اسے خود کو کول رکھنے کے لیے ایک اور گلاس جوس پینا پڑا تھا۔

"اچھا.... تم کیا جتانا چاہتی ہو؟ ہمارا اور تمہارا اسٹیٹس میچ نہیں کرتا۔" فریحہ دھیمے پر اثر لہجے میں رنجیدگی ظاہر کرتی بولی تھی۔ عون کے سامنے وہ جان بوجھ کر بات کو غلط ٹچ دے رہی تھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ماہ رو جھنجلائی۔ اور یہ پہلی مرتبہ جھنجلاتا نہیں تھا۔ فریحہ سے جب بھی تکرار ہوتی تھی وہ اسی طرح باتوں کے میٹھے تیر چلا کر اگلے بندے کو جلانے کے بعد لطف اندوز ہوتی تھی۔

"جو بھی مطلب تھا۔ بات تو یہی نکلتی ہے۔ تمہارے باپ کی فیکٹریاں ہیں اور ہماری دکانیں۔ تمہارا باپ بھی بزنس کرتا ہے۔ ہم بھی بزنس کرتے ہیں.... فرق تو ہوا نا.... دکانوں اور فیکٹریوں میں۔" فریحہ نے ایک تیز لپک کو آنکھوں میں بھر کے ماہ رو کو لاجواب کردیا تھا۔ اس سے واقعی جواب نہیں بن پڑا۔

"اور تم اپنی فیکٹریوں کا رعب اپنے پاس ہی رکھو۔ عون جاب میں انٹرسٹڈ تھا۔ جاب ہی کرے گا۔ نہ اسے دکان چلانے کا شوق ہے نہ فیکٹری۔" فریحہ نے دوٹوک لہجے میں بات مکمل کردی تھی۔ یعنی ماہ رو کا منہ بند کردیا تھا۔ اور عون بالکل خاموش تھا۔ کیا اسے ماہ رو کی حمایت میں بولنا نہیں چاہیے تھا۔" اور وہ بولا۔ بھی تو کیا؟ اس سے بہتر تھا نہ ہی بولتا۔ یعنی اس نے فریحہ کو

روکا نہیں۔ بلکہ اس کی بات سے اگری کرلیا۔

"فریحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم اپنے ڈیڈی سے معذرت کرلینا۔ بزنس وغیرہ میرے بس کا روگ نہیں۔" ماحول پہ چھائی کثافت کو کم کرتے ہوئے نسبتاً" اسے اپنا رویہ بدلنا پڑا تھا۔ وہ ماہ رو کا اترا چہرہ دیکھ رہا تھا جو اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتا؟ ماہ رو کی آفر ایکسیپٹ کرنے کا اسے تصور بھی محال تھا۔ وہ بزنس سے خار کھاتا تھا۔ نری سردردی اور ٹینشن..... اسے آٹھ سے آٹھ تک کی جاب پسند تھی۔

اگر وہ خود انکار کرتا تو ماہ رو کو اتنا برا نہ لگتا۔ لیکن بیچ میں فریحہ نے آکر مداخلت کی تھی۔ اس وجہ سے ماہ رو نے اپنی بہت بے عزتی محسوس کی تھی۔ کیونکہ جوبات عون کو کرنی چاہیے تھی وہ فریحہ کر رہی تھی۔

وہ جوس کا گلاس ٹیبل پہ پٹخ کر اندر جا رہی تھی۔ اور فریحہ فاتحانہ نظروں سے ماہ رو کو میدان چھوڑ کر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں سے ہٹ کر عون کے تاثرات عجیب تھے۔ جیسے اسے ماہ رو کا منظر سے ہٹنا اچھا نہ لگا ہو۔

☆ ☆ ☆

باہر خاصی پیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

برسات کے دن جاتے ہی موسم پھر سے گرم اور خشک ہو چکا تھا۔ درختوں کے پتے تک تیز دھوپ میں کملا جاتے تھے' پتیاں سوکھ رہی تھیں۔ ماہ رو اس وقت برآمدے میں بیٹھی تھی اور اس کے قریب گیندے کی مسلی پتیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اگر اس وقت فریحہ کی امی آجاتیں تو اس کی درگت بنا دیتیں۔ کیونکہ یہ پھول انہوں نے لگا رکھے تھے۔ ماہ رو بے خیالی میں صبح والا سارا غصہ ان معصوم پھولوں پہ نکال رہی تھی۔ پھر تنگ آکر اٹھی اور لاؤنج میں آگئی۔ سارے لاؤنج میں دھوپ گھوم رہی تھی۔ عون کی امی ہوتیں تو فوراً" چقیں اور پردے گرا دیتیں۔ وہ سب چونکہ فوتگی میں لگے ہوئے تھے اس لیے ماہ رو نے خود ہی پردے وغیرہ برابر کر دیے۔ معاً" فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

وہ بے زاری سے فون تک گئی تھی اور ہیلو بھی بمشکل ہی کہا۔ دوسری طرف عون ہوگا۔ یہ ماہ رو کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کی ساری سستی ہوا ہو چکی تھی۔

عون نے صبح والے موڈ سے ہٹ کر قدرے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

"تم سو تو نہیں رہی تھی؟"

"نہیں....." وہ اتنے خوش گوار موڈ پہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔

"اور لنچ کا کیا بنا؟" ایک اور ملائمت میں ڈوبا سوال آیا۔ ماہ رو نے حیرانی پہ قابو پا کر بتایا تھا۔

"امی اور بھابھی چکن ٹنڈے بنا گئی ہیں۔" اس نے اچک کر کچن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ چولہے پہ ککر رکھا تھا۔ یعنی ہانڈی تیار تھی۔ تاکہ پیچھے سے ماہ رو کو کھانا بنانے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ روٹیاں یاسر نے تندور سے واپسی پہ لے کر آئی تھیں۔ سو لنچ کی طرف سے بے فکری تھی۔ سلاد وہ خود بنا سکتی تھی۔ اب اتنا بھی نہ کرتی۔ "وہ ایکچوئیلی! میں نے موٹے سانڈ کو لنچ پہ انوائٹ کرلیا ہے۔ اسی بہانے فائل پہ بات کرلوں گا۔ موٹا اپنی بیوی کے ساتھ آئے گا۔ کھانے کا کیا کرو گی؟ وہ ہوٹل کا کھانا بالکل نہیں کھاتا۔ اینی وے تم فریحہ سے کہنا۔ وہ مینج کرلے گی۔ کوکنگ اس کے دائیں ہاتھ کا کام ہے۔" وہ روانی میں بولتا ہوا پھر فریحہ نامہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ ماہ رو جو صبح سے تپی ہوئی تھی چڑ کر بولی۔

"میں نے خود کافی کوکنگ سیکھ لی ہے۔ بنا سکتی ہوں۔ فریحہ کی خدمات لینے کی ضرورت نہیں۔"

"سانڈ نے ابھی مرنا نہیں۔ کم از کم میری فائل پہ سائن کرنے سے پہلے تو نہیں۔" عون نے جیسے دہائی دی تھی۔

"تمہارا سانڈ میرے ہاتھ کا کھانا کھا کر ہمیشہ یاد رکھے گا۔" ماہ رو بھی اپنی تعریفوں پہ تلی ہوئی تھی۔ عون نے سر تھام لیا۔

"تم مروادو گی مجھے۔"

"دیکھنا تو سہی.... تم بھی یاد رکھو گے۔" ماہ رو نے اگلی بات سنے بغیر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔ لیکن پھر سے فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ اس نے تلملا کر فون اٹھایا۔

"تم مجھے اب کچھ کرنے دو گے یا نہیں؟ ٹائم بھی کم ہے۔" وہ بھنا کر بولی تھی۔ عون کو ہول اٹھنے لگے تھے۔ اسے ماہ رو کی کوکنگ پہ بھروسا نہیں تھا۔ اور وہ کافی خدشات کا شکار تھا۔ لیکن ماہ رو نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ فون بند کر دیا تھا پھر جلدی سے کچن میں آ گئی۔ عون کو متاثر کرنے کا یہ پہلا بہترین موقع تھا۔ وہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔ فریحہ کو کیوں بلاتی؟ تاکہ وہ اور عون کو اپنے کنٹرول میں کر لیتی۔ اور عون بھی بلاوجہ اس کا احسان مند رہتا۔ فریحہ کو اور اپنی کوکنگ اور سگھڑاپے کی دھاک بٹھانے کا موقع مل جاتا۔

ماہ رو بڑی پرجوش تھی۔ اور خوب ولولے کے ساتھ کچن میں آئی تھی۔ فریج کھولا اور سب سے پہلے سامان دیکھا۔ گھر میں ہر چیز موجود ہوتی تھی۔ اور ابھی بھی موجود تھی۔

وہ سب سے پہلے ذہن میں مینو ترتیب دینے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ کس سے مزید مشورہ لے۔ فریحہ کا آپشن تو ریجیکٹ (نامنظور) شدہ تھا۔ وہ مر کر بھی اس سے مدد نہ لیتی۔ مریم کے میکے کال کرنا غیر مناسب تھا۔ کائنات ہوتی تو وہ ضرور مشورہ دیتی لیکن اب....

وہ کیا کرے؟ پلاؤ بنانا مشکل نہیں تھا۔ اس نے بہت دفعہ اس گھر میں بنتے دیکھا تھا۔ ماہ رو کو بھی پسند تھا اور طریقہ بھی آتا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک مرتبہ ری فریش کرنا ضروری تھا۔

معاً" فریحہ کچن میں آ گئی۔ وہ جو سوچوں میں گم بریانی اور پلاؤ میں سے ایک ڈش کو فائنل کرنا چاہتی تھی لمحہ بھر کے لیے چونک گئی۔ "ایں یہ فریحہ کیوں آئی؟" ماہ رو کو بے طرح سے غصہ آیا تھا۔ ادھر فریحہ پورے کچن میں پھیلائی چیزوں کو دیکھ کر معنی خیزی سے مسکراتی رہی۔

"کیوں آئی ہو؟" اس کی استہزائیہ نظروں کو دیکھ کر ماہ رو نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا تھا۔ فریحہ کی طنزیہ مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی تھی۔

"عون نے فون کیا تھا۔ تاکہ دعوت وغیرہ کا انتظام کر سکوں۔ آخر پہلے بھی تو کرتی تھی۔ اور اسے میرے پکائے کھانوں پہ بھروسا ہے۔" فریحہ کا آگ لگاتا لہجہ ماہ رو کو غصے کی انتہاؤں پہ لے گیا تھا۔ اس نے زہر بھرے لہجے میں فریحہ کو جتلایا۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ تمہارا شکریہ جو تم نے ماضی میں کیا۔ اب میں خود بنا لوں گی۔ تم جاؤ۔" ماہ رو نے بمشکل دفع ہو جاؤ کہنے سے خود کو روکا تھا۔ اسے فریحہ پہ غصہ ہی بہت تھا۔ یہ اور بات تھی کہ مروتاً" چپ کر جاتی تھی۔ فریحہ اس کھلی بے عزتی پہ توہین سے تپ اٹھی تھی۔ اس کا لہجہ ابلتے پانی کی طرح کھول رہا تھا۔

"میں چلی جاتی ہوں.... اور دیکھتی ہوں تم کون سا عون سے میڈل وصول کرتی ہو۔ آج یہ چیلنج تمہیں دیا۔" فریحہ کا زہرخند انداز، تپتا سرخ چہرہ اور آنکھوں کا عجیب سا تاثر نظرانداز کیے جانے والا نہیں تھا۔ لیکن ماہ رو نے فریحہ پہ لعنت ڈال کر اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اور کھانے کی تیاری میں لگ گئی تھی۔ چونکہ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت تھا۔ اب تو فریحہ کو بھی منہ توڑ جواب دینا تھا۔ بڑی آئی تھی سگھڑ اور سلیقہ مند۔

ماہ رو کبھی بھی فریحہ سے اتنے تلخ لہجے میں بات نہ کرتی۔ لیکن یہ فریحہ خود ایسی باتیں کرتی تھی کہ نہ چاہ کر بھی اسے منہ توڑ جواب دینا پڑ جاتا تھا۔

ماہ رو نے سوچا وہ پلاؤ، قورمہ، کباب، اور میٹھے میں ٹرائفل بنا لے گی۔ سیلڈ الگ سے ہوں گے۔ اتنے کم وقت میں یہ سب کچھ بھی بن جاتا تو بہت تھا۔ ویسے بھی یہی ڈشز اس نے ثنا اور مریم سے سیکھی تھیں۔ اس گھر میں یہی ڈشز زیادہ تر پکائی اور کھائی جاتی تھیں۔ مہمانوں کے لیے بھی یہی اہتمام ہوتا تھا۔ اور یہ ایک لحاظ سے کافی اہتمام تھا۔ لیکن چونکہ یہ دعوت کی تیاری تھی سو وہ بار بار کنفیوز ہو جاتی۔ اسی

کنفیوژن میں اچانک سے اپنے کک کریم کا خیال آ گیا تھا۔

"او... میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا۔ مجھے کریم سے ہیلپ لینا چاہیے۔" دوسرے ہی لمحے وہ اپنا سیل فون اٹھا کر کچن میں آ گئی تھی۔ چکن، چاول چنتے دھوتے ہوئے ساتھ ساتھ وہ کریم سے بات کر رہی تھی۔ اور کریم سن کر ہول ہول جا رہا تھا۔

"ماہ بی بی! رحم کریں۔ ہم پہ رحم کریں۔ آپ کچھ مت پکانے کی کوشش کریں۔ میں سب کچھ ریڈی کرتا ہوں اور ڈرائیور کے ساتھ آ کر دے جاتا ہوں۔ آپ ہاتھ بھی مت لگائیے گا اسٹو کو۔" کریم کی جیسے جان پہ بن آئی تھی۔

"تم مجھے جسٹ گائیڈ کرتے رہو۔ کوانٹٹی میں کچھ مسنگ ہو جاتا ہے۔ میں سب کر لوں گی۔" ماہ رو نے رعب سے کہا۔

"ماہ بی بی! آپ سے نہیں ہو گا۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا آپ کچن میں ہیں۔ آپ کچھ نہیں بنائیں۔ سب کچھ اے ون فٹافٹ ریڈی کرتا ہوں۔" کریم نے آخری دم تک زور لگایا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

"دس از کوائیٹ نیو ٹو می... آئی ایم ویری ایکسائٹڈ تم بس گائیڈ کرو۔" (یہ میرے لیے سراسر نیا ہے۔ میں بہت پرجوش ہوں۔ تم مجھے بتاتے جاؤ) ماہ رو نے جوش سے کاپی پنسل پکڑ کے ضروری پوائنٹ لکھ لیے تھے۔ دوسری طرف کریم بھی فون بند کر کے سارے ہیلپرز کو اکٹھا کرتا کچن کی طرف بھاگ رہا تھا۔ سرفراز ولا میں ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔

ماہ رو نے موبائل رکھ دیا اور پوری تندہی سے کام میں لگ گئی تھی۔

اور پھر حیرت انگیز طور پر ماہ رو نے کافی چیزیں اتنی بہترین بنا لیں کہ خود بھی دنگ رہ گئی۔

اس نے پلاؤ بھی بنا لیا۔ دانہ دانہ الگ نہ سہی لیکن بہت اچھا بنا تھا۔ قورمہ بھی تیاری کے آخری مراحل میں تھا۔ کباب جسٹ فرائی کرنے تھے۔ ٹرائفل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھا تھا۔ مہاللہ وہ نہا کر بننا چاہتی تھی۔ کیونکہ تین چار گھنٹوں میں ہی وہ حال سے بے حال ہو چکی تھی۔

منہ پہ، ہاتھوں پہ، کپڑوں پہ جگہ جگہ داغ لگے تھے۔ پسینہ بہہ رہا تھا۔ بال گھونسلے میں بندھے لگتے تھے۔ وہ ایک ایک چیز کو چکھتی مطمئن ہو کر اپنے روم کی طرف چلی گئی تھی۔

جب تک وہ نہا کر باہر آئی... تب تک قورمہ بھی پک گیا۔ ماہ رو نے پہلے خود کو سنوارا۔ بہت اسٹائلش شرٹ جس کے نیچے وہی اس کی پسندیدہ ٹائٹس پہنے، گلے میں رسی نما اسٹول... بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنا کر اس نے نیچرل میک اپ کیا اور باہر آ گئی... اب اسے فٹافٹ سیلڈ بنانا تھا۔ جو آدھے گھنٹے میں بن گیا۔ اور اسی وقت عون بھی اپنے اسٹاف کے جلو میں آ گیا۔

ساند اور اس کی بیوی کے علاوہ دو لڑکیاں، ایک انکل اور ایک آنٹی بھی ساتھ آئے تھے۔ ماہ رو کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"کیا کھانا پورا ہو جائے گا؟"

اس کا دل ہل گیا۔ دو لوگوں کے تناسب سے کھانا کچھ ہی زیادہ تھا۔ مارے گھبراہٹ کے وہ خاصی بوکھلا گئی تھی۔ لیکن اس نے اپنی بوکھلاہٹ مہمانوں پہ ظاہر نہیں کی تھی۔

مہمانوں سے مل کر جوس سرو کر کے اور اپنی ڈھیر ساری تعریفیں وصول کر کے وہ کچن میں آ گئی تھی۔ اور اس کے پیچھے عون بھی بھاگا بھاگا آ گیا تھا۔ پھر اس نے ڈھکن اٹھا اٹھا کر ایک ایک ڈش کو دیکھا۔

"خوشبو تو اچھی ہے اور مقدار بھی کم نہیں۔ کھانا پورا ہو جائے گا۔ ایکچوئیلی! باقی لوگوں کا اچانک پروگرام بن گیا تھا۔ پھر میں نے سوچا بتانے کی ضرورت نہیں۔ فریحہ کون سا کم کھانا بناتی ہے۔" اس نے ڈشز کی خوشبو سے مطمئن ہو کر فریحہ نامہ کھولا ہی تھا جب ماہ رو اچانک تپ گئی تھی۔

"کھانا میں نے بنایا ہے۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"ایں... واقعی؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔ بالکل

یقین نہیں آیا تھا۔ اور اسی لیے عون نے دوبارہ ساری ڈشز کا معائنہ کیا۔ وہ کھانے کی خوشبو سے' رنگت سے تو مطمئن ہو چکا تھا لیکن ذائقہ؟

وہ چکھے بغیر ماہ رو کو ڈش آؤٹ کرنے نہیں دے رہا تھا۔ ماہ رو بڑے جوش و خروش سے اسے ایک ایک آئٹم چکھا رہی تھی۔ اور وہ جیسے جیسے چکھ رہا تھا۔ اس کے تاثرات؟ ماہ رو کی نگاہ جیسے ہی عون کے چہرے پہ پڑی تھی۔ اس کی جیسے جان نکل گئی۔ اس کے پیروں تلے سے زمین ہل گئی تھی۔ عون کا کوئی ایک تاثر بھی نارمل نہیں تھا۔ وہ کسی بھی آئٹم کو چکھ کے خوش نہیں ہوا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

ماہ رو تو آخری تسلی کر کے ایک ایک ڈش کو کئی مرتبہ چکھنے کے بعد مطمئن ہوئی تھی۔ پھر اب کیا ہوا تھا؟ آخر کیا؟ وہ گھبرا گئی تھی۔ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کا دل اتنا بے قابو ہو رہا تھا کہ حد نہیں۔

پھر عون نے ایک ایک چیز کو زبردستی ماہ رو کے منہ میں ٹھونسا۔

"چکھو.... خود چکھو اور بتاؤ۔ یہ تم نے کھانا بنایا ہے؟ یہ مہمانوں کے کھانے' ان کے سامنے رکھنے کے قابل ہے؟ یہ تم نے کیا کیا؟ اوف' خدایا! یہ تم نے کیا کر دیا؟ اب میں کیا کروں؟ تم نے مجھے بے عزت کر دیا۔" عون مارے پریشانی' غصے اور غضب کے خود بھی کچن میں چکراتا پاگل ہو رہا تھا۔

"کدھر ہے فریحہ! میں نے اسے کہا تھا کھانا بنائے.... پھر تم نے کیوں بنایا؟ مجھے شرمندہ کرنے کے لیے! مجھے ذلیل کرنے کے لیے؟ بتاؤ۔ تم نے یہ کیوں کیا؟ جان بوجھ کر؟" وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ لیکن بہت اونچی آواز میں چلا بھی نہیں سکتا تھا۔ تاکہ مہمانوں تک آواز نہ پہنچ جائے۔

اور ماہ رو کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو جیسی بھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ رہی تھیں اور زبان عجیب و غریب ذائقوں پہ اکڑ رہی تھی۔

یہ خوش رنگ پلاؤ تھا جس میں سے ٹاٹری کی کھٹاس محسوس ہوتی تھی۔ یہ قورمہ تھا جس میں چینی کے علاوہ کوئی اور ذائقہ نہیں تھا۔ اور ٹرائفل میں نمک۔ کیا یہ سب ماہ رو نے بنایا تھا؟ اور تب یہ ایسا کیوں نہیں تھا؟ آخر اس کی محنت کو کس نے نظر لگائی تھی؟ اس کا بنایا کھانا کس نے خراب کیا تھا؟ اور اب کھانا خراب ہو چکا تھا تو پھر مہمانوں کے سامنے کیا رکھنا تھا؟

ماہ رو کو اتنا زور کا چکر آیا کہ وہ سلیب نہ پکڑتی تو زمین بوس ہو جاتی۔

☼ ☼ ☼

اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ماہ رو کے دل کو پتنگے لگ رہے تھے۔ اور عون کے طعنے جیسے جان نکال رہے تھے۔ عون' سن ہوتے دماغ کو قابو میں رکھتا فریحہ کو بلا لایا تھا۔

"تم کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔ میں کسی ہوٹل سے ایک آدھ ڈش اٹھا لاتا ہوں۔" وہ اتنا پریشان تھا کہ حد نہیں تھی۔ اور اسے پریشان دیکھ کر ماہ رو کا دل کٹ کٹ کے گر رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔ اس کی ساری محنت اکارت گئی تھی۔

ہاتھ جلایا بھی تھا اور ہاتھ کچھ آیا بھی نہیں تھا۔

الٹا عون کا غصہ اور ناراضی سہنا پڑ رہی تھی۔ وہ اتنے شدید غصے میں تھا کہ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا۔ اوپر سے اس کی شعلہ بیانی۔

"تمہیں پتا تو تھا اس پھوہڑ کو کچھ نہیں آتا۔ پھر تم کیوں اس پہ چھوڑ گئیں سب کچھ...." وہ زہر بھری اچٹتی نگاہ ماہ رو پہ ڈالتا فریحہ سے مخاطب تھا۔ اور تب فریحہ کو اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا موقعہ مل گیا۔

"اس نے مجھے خود نکالا تھا کچن سے باتیں سنا کر۔" وہ بڑے طنز سے بغیر جھجکے اس کے منہ پر کہہ رہی تھی۔ اسے کون سا ماہ رو سے ڈر تھا۔ جو وہ منہ پہ بات نہ کرتی اور نہ ماہ رو سے بہناپا تھا جو' اس کا پردہ رکھتی۔ وہ اسے ذلیل کروانا چاہتی تھی سو کروا رہی تھی۔

اور عون نے ماہ رو کی سات منٹ کی اندر وہ دھلائی کی تھی کہ شاید ہی کسی کی ہو۔ بس مارنے کی کسر رہ گئی تھی۔ بلکہ بھگو بھگو کر مار بھی رہا تھا۔ غصہ بھی کر رہا تھا۔

طنز بھی۔ بے عزتی بھی۔ فریحہ کے سامنے۔ پھر فریحہ نے اپنی تیز ترین سروسز مہیا کرتے ہوئے کہا۔

"تم کھانا لے آؤ۔ میں تب تک کباب فرائی کرتی ہوں۔ یہ تو کباب بھی ٹھیک نہیں۔ جلے سے لگتے ہیں۔" اس نے فریج سے کوک نکالتے ہوئے عون کو باہر بھیجا تھا اور ماہ رو کے بنائے کباب ڈسٹ بن میں الٹ دیے۔ اپنی طرف سے اسے اور اس کی بنائی چیز کو ریجیکٹ کیا تھا۔

ماہ رو اس کھلی بے عزتی پہ احتجاج بھی نہیں کر سکی۔

اور عون جو ایک مرتبہ پھر ماہ رو کو زہر بھری نگاہوں سے گھورتا موبائل پہ کھانے کا آرڈر دے رہا تھا اس وقت خاموش ہو گیا جب اندر آتی سکینہ دکھائی دی تھی اور اس کے پیچھے فل شیف یونیفارم میں کریم تھا۔ اس کے پیچھے ہیلپر سلیم۔ ان سب نے بڑے بڑے ٹفن اٹھا رکھے تھے۔ اور وہ لوگ مودب سے کچن میں آنے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ عون' فریحہ اور خود ماہ رو تک حیرانی رہ گئی تھی۔

تب کریم مہذب لہجے میں نرمی سے بولا۔

"ماہ بی بی! آپ کو منع بھی کیا تھا۔ کچھ نہ پکائیں۔ میں دعوت کا سارا اہتمام کر لیتا ہوں۔ پھر بھی آپ نے....." کریم نے کچن میں پھیلے پھیلاوے کو دیکھتے ہوئے سلیم کو اشارہ کیا۔ سارے ٹفن ٹیبل پہ سجا کر سلیم نے منٹوں میں کچن سمیٹ دیا تھا اور سکینہ ماہ رو سے پوچھ کر شوکیس سے نفیس ساڈنر سیٹ نکال رہی تھی۔ ساتھ کریم سے مخاطب تھی۔

"منع تم نے خاک کیا تھا۔ ماہ بی بی نے اپنا ہاتھ تک جلا لیا۔ صدقے جاؤں' اوپر کچھ لگایا بھی نہیں....." سکینہ جو مارے صدمے کے اس کا ہاتھ دیکھ کر پھٹ پڑی تھی ماہ رو کے روکنے پہ بمشکل رکی۔

"سکینہ تم مجھے چھوڑو' اور فٹافٹ کھانا سرو کرو..... میں ڈرائنگ روم میں ہوں۔" ماہ رو کا لمحوں میں ازلی اعتماد لوٹ آیا تھا۔ اور وہ کچھ دیر پہلے کی ساری ٹینشن بھلا کر ایک نظر فریحہ کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھتی ہوئی کچن سے باہر جانے لگی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اب کھانا سرو کرنے' ٹیبل سجانے تک کسی بھی قسم کی ٹینشن نہیں تھی۔ اس کے گھر کا ٹرینڈ کک آچکا تھا۔ سب کچھ بہترین ہونے والا تھا۔

اسے اپنے وفادار' ذہن شناس نوکروں پہ ٹوٹ کر پیار آگیا تھا۔ کریم جانتا تھا۔ وہ کبھی بھی کسی دعوت کا اہتمام نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس نے یہ کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ سو وہ اپنی ذہانت سے سب کچھ بنا لایا تھا۔ ماہ رو جیسے بہت بڑی ذلت سے بچ گئی تھی۔

کچن سے نکلتے ہوئے اس نے عون کو بھی مخاطب کیا۔

"ہم ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔ مہمان بھی کیا سوچتے ہوں گے۔ میزبان کہاں غائب ہیں۔" اور پھر فریحہ پہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے۔ اور فریحہ ایک کونے میں کھڑی ہکا بکا دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کا وجود اتنا ہی مس فٹ تھا۔

اور اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ وہ حیران نہیں تھی ششدر تھی۔

اس کے ذہین دماغ کی پوری چال اسی پہ الٹ گئی تھی۔

شیف کریم ٹیبل پر برتن لگا رہا تھا۔ سر پہ ٹوپا جسم پہ یونیفارم' ہاتھوں پہ گلوز..... ایک خوب صورت ٹیبل سج رہی تھی۔ رنگ رنگ کے لذیذ' گھر کے بنے' ذائقہ دار' خوش رنگ کھانے ڈش آؤٹ ہو رہے تھے۔ چکن ویجی ٹیبل رائس' فش اسٹریس' مٹن تکہ' کباب سیزلر' چکن الاکیو' بیکڈ میکرونی' میٹھے میں دہلوی کھیر..... ٹھنڈی چاندی کے ورق سے سجی..... خوشبودار لذیذ.....

ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو..... جو فریحہ کے نتھنوں میں گھس کر اسے پھر سے ذلت کا احساس دلا رہی تھی۔ اسے پچھاڑ رہی تھی۔

اور فریحہ ایک مرتبہ پھر شکست خوردہ کھڑی تھی۔ اکیلی' تنہا اور بے بس۔ وہ ماہ رو کو عون کے ہاتھوں رسوا

کروانا چاہتی تھی۔ لیکن الٹی چال پہ جو اس باختہ ہو
گئی۔ ماہ رو پھر جیت گئی تھی۔ کیونکہ عون کا باس 'اس
کے کولیگز' ماہ رو سے بے انتہا متاثر ہو کر تعریفوں کے
پل باندھتے روانہ ہوئے تھے...... وہ سب عون کی بیوی
کے حسن 'سلیقے' قرینے سے بے انتہا 'امپریس تھے۔
خاص طور پر باس کی بیوی۔ جو یہ سن کر شدید حیران
ہوئی تھی کہ ماہ رو سیٹھ سرفراز کی بیٹی ہے، جن کی کمپنی
میں اس کا باپ بطور ایم ڈی کام کرتا تھا۔

اور یوں ماہ رو ایک مرتبہ پھر فاتح کہلائی گئی تھی اور
فریحہ شکست خوردہ بھی' زخم خوردہ بھی۔

✡ ✡ ✡

اور پھر یہ سلسلہ یہاں تک رکا نہیں تھا۔ فریحہ نے
اگر ماہ رو کو پچھاڑنے کا عہد کر رکھا تھا تو وہ اس عہد کو
آخر تک تکمیل کے مرحلوں میں پہنچانا چاہتی تھی۔ وہ
ماہ رو کو عون کی زندگی سے نکالنا چاہتی تھی اور اس کے
لیے فریحہ نے ہر حد کو للکارا تھا۔ اسے ہر صورت ماہ رو کو
اس گھر سے نکالنا تھا۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی
تھی۔ اس دن ماہ رو بڑی ذلالت سے بچ گئی تھی حالانکہ
فریحہ نے اس کے منظر سے ہٹتے ہی بڑے طریقے کے
ساتھ ہر پکی ہوئی ڈش میں چینی کا پانی 'ٹاٹری' نمک ملا کر
اپنی کمینگی کا ثبوت دیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں
ہوئی۔ لیکن عون کے ہاتھوں ماہ رو کو بے عزت کروا کر
اس نے بڑا مزا لوٹا تھا۔

اس دن گو کہ ماہ رو کی کچھ بچت بھی ہو گئی تھی۔ اس
کے نوکر ٹفن اٹھا کر لے آئے اور ماہ رو مزید ذلیل ہونے
سے بچ گئی۔ یہاں فریحہ کی ذہانت کو تھوڑی مات ہوئی
تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ماہ رو اپنے گھر سے
نوکروں اور پکے پکائے کھانے کو منگوالے گی۔ کم از کم
اس دن کی حد تک معاملہ سمٹ گیا۔

رات کو تایا تائی واپس آئے تو انہیں بھی ساری
کہانی سنائی گئی۔ تائی یہ تو بھول گئی تھیں کہ کھانے میں
چینی نمک کس نے ملایا تھا لیکن وہ ماہ رو کے جلے ہوئے
ہاتھ کو دیکھ کر عون کی ڈھنائی کرنا نہ بھولی تھیں۔ پھر
عون کو اپنے سامنے بلا کر ماہ رو کے زخم پہ مرہم لگوائی
تھی۔ ساتھ ساتھ کھنچائی بھی کی۔

"جب فریحہ موجود تھی تو تم نے میری بیٹی کو کچن
میں کیوں جانے دیا۔ ابھی تو ہاتھ جلا ہے اگر وہ زیادہ جل
جاتی تو۔" یوں عون کی درگت بناتی تائی کو ماہ رو سے پیار
کرتے دیکھ کر فریحہ کے سینے پہ سانپ لوٹ گئے تھے۔

اور پھر عون کی وہ معذرت جو اس نے ماہ رو کے ہاتھ
کو پکڑ کر مرہم لگاتے ہوئے سب کے سامنے کی تھی
فریحہ عمر بھر نہ بھلا پائی۔

اور فریحہ کیا عون کی نوکرانی تھی؟

"میرے باپ کی بھی توبہ جو تمہیں کبھی کچن میں
بھیجوں۔" اس کے آبلوں کو تکتا وہ شرمسار تھا اور پھر
فریحہ ناک تک سنگ سار جو عون کے حکم بجا لاتی۔
اس کی کنیز بنی رہتی۔ اس کی گرد پروانوں کی طرح
گھومتی۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں
مناتا۔

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔

فریحہ کو ان چھوٹی موٹی پلاننگز میں اب ترمیم کرنا
پڑی تھی۔ اسے کوئی بڑا داؤ چلنا تھا۔ کیونکہ ماہ رو کے
جمے ہوئے قدم ان چھوٹی موٹی چالوں سے اکھاڑے
نہیں جا سکتے تھے۔ اس کے لیے کسی بڑی وجہ 'بڑے
منصوبے' ضرورت تھی۔

چھوٹی موٹی ہر چال ناکام ہوتی چلی گئی تھی۔

اس نے کئی مرتبہ ماہ رو کی بے خبری میں عون کے
ان کپڑوں کو جلا کر دیکھ لیا تھا جو ماہ رو اپنے تئیں استری
کر کے الماری میں لٹکا دیتی تھی۔ پھر جب عون پہننے
لگتا تو ایک لمبی لڑائی کا آغاز ہو جاتا۔ وہ ماہ رو کی بے عزتی
کرتا 'غصہ ہوتا۔ اسے پھوہڑ' بد سلیقہ 'نکمی ہونے
کے طعنے دیتا.... پھر چیختا چلاتا باہر نکل جاتا یا تائی کے
ہتھے چڑھ کر اپنا غصہ اپنے ہی ہاتھوں گنوا دیتا۔ تائی ماہ رو
پہ آنچ آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

"اس کے باپ کے گھر پر ہر کام کے لیے نوکر ہیں....
آواز دے تو دس حاضر ہوتے ہیں۔ اگر وہ تمہاری محبت
میں کام کرتی ہے اور کچھ غلط ہو جاتا ہے تو تم درگزر سے

کام لیا کرو۔ آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی۔" تائی ہمیشہ ماہ رو کے لیے ڈھال بن جاتی تھیں اور تایا ماہ رو کے لیے سایہ دار درخت۔ پھر عون کی کہاں جرات پڑتی وہ ماہ رو کو انگلی بھی لگا دیتا۔ ایسے ہی ہر فریحہ کی چال اپنے داؤ میں خود پھنس جاتی تھی۔

اور اس دفعہ فریحہ کو یقین تھا کہ وہ کبھی ہارے گی نہیں۔ کبھی مات نہیں کھائے گی۔ کبھی شکست نہیں پائے گی۔ کیونکہ قدرت نے بھی اسے بڑا اعلا پائے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ لیکن اس سے بھی پہلے فریحہ نے ایک رات عون کے سامنے روتے ہوئے اس کا دل اور بھی رام کرنے کے چکر میں کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ میں بہت صابر ہوں۔ بہت اعلا ظرف ہوں۔ یا پتھر کی بنی ہوں۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ اور میں سب کچھ بھلا چکی ہوں۔ نہیں عون! میں اپنی ایک ایک اذیت اور ذلت کو نہیں بھولی۔ جو مجھے اٹھانا پڑی۔ مجھے پورے خاندان' محلے' رشتے داروں اور اجنبیوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑا۔ میری شادی ٹوٹی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں ہر ایک کے سامنے سوالیہ نشان بنی۔ ابھی تک میرا جو بھی رشتہ آتا ہے لوگ مڑ کر دوبارہ نہیں آتے۔ اس لیے کہ انہیں میری شادی ٹوٹنے کی وجوہات پتا چل جاتی ہیں۔ تم نے ایک دن ذلت اٹھائی..... میں ہر روز اسی ذلت کے مرحلے سے گزرتی ہوں۔ لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کا نشانہ بنتی ہوں۔ اور خواری اٹھاتی ہوں۔

میرا دل دیکھو تو فگار ہے۔ میں اپنے ٹوٹے وجود کا بوجھ اٹھائے بمشکل چلتی پھرتی ہوں۔ دل کرتا ہے خود کشی کر لوں۔ مر جاؤں۔ خود کو ختم کر لوں۔ امی' ابا کا خیال نہ ہو تو مر ہی جاؤں....." وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ عون کو رام کرنے تک روتی رہی۔ اور رام تو عون اس کے آنسو دیکھ کر ہی ہو جاتا تھا۔ اور ابھی بھی اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس کا گلٹ بھی تازہ ہو گیا۔ نئے سرے سے ماہ رو پہ غصہ آنے لگا۔ جی چاہ رہا تھا۔ اس کی تکہ بوٹی کر دے۔

آخر ماہ رو کی غلط چالوں نے فریحہ کو ان حالوں تک پہنچایا تھا۔

وہ لوہے کو نرم ہوتے دیکھ کر مزید چوٹ کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے پھر بھی اتنا کچھ سہہ کر بھی ماہ رو کا برا نہیں چاہا۔ اس کے لیے ہمیشہ اچھا ہی سوچا۔ تمہارے حوالے سے اس کی عزت کی۔ اسے کبھی طعنہ نہیں دیا۔ آخر برباد تو میں اسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔" فریحہ روتے ہوئے ایک ایک سوئی کو ٹھیک جگہ پر چبھو رہی تھی۔ عون کا سر جھک گیا۔ فریحہ اور بھی جانے کیا کیا کہتی رہی۔ تڑپتی رہی..... ساری پچھلی باتوں کو دہراتی رہی۔

عون شرمسار سا سنتا رہا۔ جب فریحہ رو رو کر اور بول بول کر ہانپ گئی تب عون دھیمی افسردہ' بوجھل آواز میں بولا۔

"میں تمہاری تکلیف کیسے کم کروں فریحہ! میں شرمسار ہوں۔ گو کہ مجھے بھی تم سے کوئی دھواں دھار محبت نہیں تھی۔ لیکن بچپن سے ایک انسیت ضرور تھی۔ مجھے شادی ٹوٹنے کا اتنا ہی دکھ ہوا تھا جتنا تمہیں۔ میں بھی ویسی تکلیف سے گزرا تھا جس سے تم گزری۔ لیکن یقین مانو ابو اور چاچا میری ایک نہیں سن رہے تھے۔ ماہ رو کو سچا اور مجھے جھوٹا کہتے تھے۔"

فریحہ نے اس کی ساری بات کو نظر انداز کر کے صرف پہلے جملے پہ فوکس رکھا۔

"تم میری تکلیف کم کر سکتے ہو۔" وہ اپنی بات دہرا رہی تھی۔

"کیسے؟" عون دھیمی افسردہ آواز میں آہستگی سے کہہ سکا۔ شرمندگی ایسی تھی کہ سر اٹھانا بھی محال تھا۔ یہ ماہ رو بھی نا..... عمر بھر کے لیے سوالیہ نشان بنا چکی تھی۔

"ماہ رو سے کہو۔ بھری محفل کے سامنے مجھ سے معافی مانگ لے۔ اپنا گناہ تسلیم کر لے۔ اس نے مجھے برباد کیا۔ تمہیں مجھ سے چھینا۔ شادی تڑوائی..... ہر ہر بات کا اقرار کر لے۔ بولو' کر سکتے ہو؟ ماہ رو کو مجبور کر سکتے ہو؟ میری اذیت ختم نہیں ہو گی لیکن کم ضرور ہو

جائے گی۔" فریحہ نے گیند اس کی کوٹ میں ڈال کر اپنا پہلا وار کیا تھا۔ جو کہاں تک کامیاب ہو سکتا تھا.... وہ اسی رات ہی پتا چل گیا۔

کامیابی اور ناکامی کا اسی رات فیصلہ ہو گیا تھا۔ اور فریحہ کے فیصلے تو آر یا پار ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ ہوا کچھ اس طرح سے....

☼ ☼ ☼

اور پھر وقت ماہ رو سرفراز کو دوراہے پہ لے آیا تھا۔

اور وقت ماہ رو سرفراز کو ایک بند گلی میں لے آیا تھا۔ ایسی بند گلی جس کے سامنے کوئی رستہ نہیں تھا۔ پھر بھی ماہ رو سرفراز نے اس بند گلی میں اپنے لیے راہ نکال لی تھی۔

صرف اپنے لیے نہیں، عون کی خوشی کے لیے۔ عون کی مرضی کے لیے۔ عون کی خواہش کے لیے۔ عون کی محبت کے لیے اور عون عباس کا حکم مان کر۔

وہ اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اس کے سامنے یوں ہی نہیں کھڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے کسی مقصد کے لیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ نہیں تھا۔ لیکن سختی ضرور تھی۔ اور یہ سختی اپنی بات کو منوا لینے کے یقین کی حدوں کو چھوتی آنکھوں میں چھا رہی تھی۔

ماہ رو نے اس کی ایک ایک بات دل کے کانوں سے سنی تھی۔ اس نے دماغ کے ہر فیصلے، ہر کاوٹ ہر بندش کو جھٹک دیا تھا۔ اس اپنی ہر دلیل کو جھٹک دیا تھا۔ اس نے اپنے اندر سے اٹھتی ہر آواز کو جھٹک دیا تھا۔ وہ صرف عون عباس کو سننا چاہتی تھی۔ وہ صرف عون عباس کی آواز کو سننا چاہتی تھی۔ باقی کیا تھا؟ سب کچھ ہیچ... باقی کیا تھا؟ سب کچھ ہیچ؟

صرف وہ تھا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا ایسا عشق جو جنون نہیں بنا۔ بس عشق رہا.... اور عشق لا محدود رہا۔ جسے دیکھ کر وہ ماہ رو سرفراز سے داسی بن گئی تھی۔ جوگن بن گئی تھی۔ اور وہ جو اس کا یقین تھا۔ ایقان تھا۔ سائبان تھا۔ کبھی بے مہر اور کبھی مہربان تھا۔

وہ جو چڑھتا آفتاب تھا۔ وہ جو ڈوبتا مہتاب تھا۔ نہ عروج تھا نہ زوال تھا۔ بس عشق باکمال تھا۔ وہی عون عباس، ماہ رو سرفراز کے سامنے کھڑا تھا۔ کچھ بولتا ہوا۔ کچھ کہتا ہوا۔ کچھ منواتا ہوا۔

اور ماہ رو کیوں نا، اس کی بات سنتی، مانتی.... عمل کرتی۔

اس نے دل کے کانوں کو اس کے حرف حرف پہ لگا دیا۔ عون عباس کہہ رہا تھا۔ تمہیں فریحہ سے معافی مانگنا ہوگی۔ ہر جرم کا اقرار کرنا ہوگا۔ کردہ یا نہ کردہ.... اور ہر صورت کرنا ہوگا۔ وہ گناہ گار ہوتی یا نہ ہوتی۔ مجرم ہوتی یا نہ ہوتی۔ اسے اقرار کرنا تھا۔ سب کے سامنے تسلیم کرنا تھا۔

ایک معذرت نامہ پیش کرنا تھا۔

اور اگر اتنی سی بات کے بدلے۔ اتنے سے عمل کے بدلے عون عباس اپنی داسی سے راضی ہو جاتا تو یہ سودا کیا گھاٹے کا سودا تھا؟

عون عباس کی خوشی اور خواہش کے لیے تو ماہ رو آگ کا دریا پار کر سکتی تھی۔ پل صراط پہ چل سکتی تھی۔ جان کی بازی لگا سکتی تھی۔ خود کو ہار سکتی تھی۔

پھر یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔

صرف فریحہ سے معافی! گو کہ بہت ساری چیزوں میں ماہ رو انجان تھی۔ بے خبر تھی۔ اور جو کچھ ہوا تھا بے خبری میں ہوا تھا پھر بھی نادانستگی ہی سہی فریحہ کا دل ٹوٹا تھا۔ ماہ رو اس حد تک مجرم نہیں تھی پھر بھی معافی کے لیے تیار ہو گئی۔ گو کہ انجانے میں ہی سہی ... فریحہ کا دل تو فگار ہوا تھا۔ ماہ رو کی معافی بنتی تھی یا نہیں بنتی تھی۔ پھر بھی اس نے عون کی آواز پہ لبیک کہا تھا۔ وہ جان و دل سے حاضر ہو گئی تھی۔ ہر قسم کے نتائج کی پروا کیے بغیر۔

"بس عون عباس! اتنی سی بات؟ اگر پہلے کہہ دیتے اس انداز میں کہہ دیتے تو ماہ رو کبھی انکار نہ کرتی۔ انکار کرنے کی جرات ہی نہ کرتی۔ میں اپنی جان وار دیتی۔ خود کو ہار دیتی۔ لیکن تمہاری بات کبھی نہ رد کرتی۔" ماہ رو کے لہجے میں ٹھاٹھیں مارتے محبت کے سمندر کو محسوس کر کے عون عباس کا دل ہل گیا تھا۔ وہ سرتاپا ہل

گیا تھا۔ پھر وہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ بول ہی نہ سکا۔ کیونکہ ماہ رو نے ہر ہر لفظ اور ہر ہر حرف کی تکمیل کردی تھی اور صرف لفظوں کی حد تک نہیں کی تھی' بلکہ بڑے ہال میں جب سارا خاندان گھر کا بچہ بچہ موجود تھا تب بھی وہی الفاظ دوہرائے تھے جو فریحہ سننا چاہتی تھی اور جس کا گھر کے کسی بھی فرد کو گمان تک نہیں تھا۔ ماہ رو نے بڑے ٹھہرے ہوئے' ٹھوس' مستحکم اور پائیدار لہجے میں کہا تھا۔

"میں فریحہ سے معافی مانگتی ہوں۔ ان سب ناکردہ غلطیوں اور گناہوں کی اور کردہ گناہوں کی.... جو مجھ سے انجانے میں ہوئے یا جان بوجھ کر ہوئے۔ جس کی وجہ سے فریحہ کا دل ٹوٹا۔ اور میں اس دل کے سامنے شرمندہ ہوں۔ شرمسار ہوں۔ کیونکہ دل اللہ کا گھر ہوتا ہے۔ اس کو توڑ دینا گناہ ہے۔ مجھ سے یہ گناہ انجانے میں ہوا فریحہ یقین کرے یا نہ کرے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکی تھی۔ "لیکن سچ یہی ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کردی تھی۔ اس صورت میں کہ ہر آنکھ حیران تھی۔ ہر چہرہ فق تھا۔ ہر کوئی جیسے دنگ تھا۔

فریحہ چاہتی تھی۔ ماہ رو جھک کر اس کے سامنے آئے۔ ذلیل ہو کر آئے۔ اپنے گناہوں تلے دب کر آئے۔ اور ماہ رو ایسے ہی جھک کر آئی بھی تھی۔ لیکن اس کے جھکنے کو اعلا ظرفی' وسیع القلبی کی واضح مثال کہا گیا تھا اور اس کی ساس نے روتی ہوئی ماہ رو کو سینے سے لگا کر محبت بھرا احساس بخشا تھا اور ماہ رو تب بھی تڑپ تڑپ کر ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ رو رو کر ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک ہی پکار تھی۔ ایک ہی ورد تھا۔ ایک ہی گردان تھی۔

"عون عباس کے لیے....

عون عباس کے لیے....

ماہ رو سرفراز ہر حد سے گزر سکتی ہے۔ عون عباس کے لیے جھک بھی سکتی ہے۔ ناکردہ گناہ کا کشٹ بھی اٹھا سکتی ہے۔ عون عباس کے لیے ماہ رو سرفراز مر بھی سکتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

اور یہ فریحہ کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا۔

ہر چال کا رخ پلٹ جاتا تھا۔ ہر چال کا منہ الٹ جاتا تھا۔

فریحہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر رہی تھی۔ ہر چال اس کے منہ پر پڑ رہی تھی۔

اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا؟ وہ تو ماہ رو کا سر جھکانا چاہتی تھی۔ عون اور ماہ رو میں اختلاف کی ایک اور بڑی خلیج لانا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ماہ رو' عون کی بات کیسے مان گئی؟ کیوں مان گئی؟ وہ انکار کرتی تو منصوبہ کامیاب ہوتا۔ ان کا جھگڑا بڑھتا اور فریحہ عون کو طعنے دینے کے لیے پنجے تیز کرتی۔ اس کی بیوی اس کا کہا ایک لفظ تک نہیں مانتی۔

لیکن یہاں سب کچھ الٹ گیا تھا۔ بکھر گیا تھا۔

ماہ رو ایک مرتبہ پھر اپنی تمام تر بے وقوفی کے ساتھ جیت گئی تھی۔ فریحہ اپنی تمام تر ذہانت کے ساتھ ہار گئی تھی۔ وہ اعلا ظرف بھی بن گئی۔ وسیع القلب بھی بن گئی۔ وہ عاجز بھی بن گئی۔ وہ جھک بھی گئی۔ اور ایک مرتبہ پھر ماہ رو ہر جگہ ہر منظر میں واضح ہوتی چھا گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر فریحہ پس منظر میں چلی گئی تھی۔

ایسا کیوں ہوتا تھا؟ ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ فریحہ کے ساتھ ہی کیوں ہوتا تھا؟ وہ ہر دفعہ خود سے یہ سوال پوچھتی تھی۔ لیکن ہر دفعہ کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔

لیکن اس دفعہ یہ نہیں ہونے والا تھا۔ بالکل نہیں ہونے والا تھا۔ کیونکہ اس دفعہ جو داؤ فریحہ نے چلا تھا وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ قدرت نے اسے موقع فراہم کیا تھا۔ ایسا موقع جسے فریحہ نے اپنی ذہانت کے ساتھ مکمل اپنے بس میں کرلیا تھا۔ یہاں ماہ رو اور ماہ رو کا حسن ہار گیا تھا۔ فریحہ کی ذہانت جیت گئی تھی۔ ہوا کچھ اس طرح سے تھا۔

وہ ماہ رو کا جنم دن تھا۔ اس دن سے پہلے ماہ رو کے ڈیڈی اور ممی ابراڈ چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ ملنے آئے تھے اور اس کے ہفتہ بعد ماہ رو کا برتھ ڈے آگیا۔ اس گھر میں پہلی مرتبہ بچوں کے علاوہ کسی کی

سالگرہ منائی جارہی تھی۔ بہت دھوم دھام کے ساتھ۔ ہر ایک سرشار تھا۔ ہر ایک خوش تھا۔ ہر کوئی پرجوش تھا۔ حتی کہ عون بھی۔

عون چاہے جتنا مرضی خوش ہونے کا سوانگ بھرتا یا ماہ رو جتنی مرضی خود کو کامیاب، خوش اور سرشار کرنے کی اداکاری کرلیتی۔ پھر بھی فریحہ جانتی تھی وہ دونوں اول روز سے ہی ایک دوسرے سے دور ہیں... اور دور ہی رہیں گے۔ یہ فاصلے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ کیونکہ بیچ میں فریحہ کھڑی تھی۔

اور اس دن فریحہ نے ماہ رو کو بہت خوش دیکھا تھا۔ اتنا خوش کہ اس کا اپنا بھی یقین ڈول گیا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی۔ انتہاؤں کی خوش تھی۔ جیسے ہفت اقلیم کی دولت پالی ہو۔ جیسے پورا زمانہ پالیا ہو۔ اس نے آج بھی بلیو رنگ پہن رکھا تھا۔ بلیو کلر کی ستاروں سے بھری میکسی میں اس کی دودھیا رنگت چھلک رہی تھی، اس کے حسن کی تابناکی سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں... اور دھڑکنوں کی حالت کا انت نہیں تھا۔

یہ تو عام لوگوں کا حال تھا۔ اور عون پہ اس نے کیا حشر سامانی کی ہوگی۔ وہ اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ بلکہ تیاری کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ جب اچانک عون کمرے میں بولتا ہوا داخل ہوا تھا۔

"ایک تو بچوں کو مات کرتی تم۔ موم بتیوں کو پھونک مار کے بجھاؤ گی۔ اور کیک کاٹو گی۔ اوپر سے تیاری ختم ہونے کو نہیں آرہی۔ بچے الگ سیون اسٹوری کیک کو دیکھ دیکھ کر ماؤں کی جان کھا رہے ہیں۔ اب نکل بھی آؤ باہر یا اکیس توپوں کی سلامی پیش کروں... تم نے تو..." اور عون کے اگلے الفاظ منہ میں ہی گم رہ گئے تھے۔ وہ جیسے زنجیر پا ہو گیا تھا۔ یا مسحور ہو گیا تھا یا مبہوت ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں رنگ محل کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔ وہ ایک خواب کی کیفیت میں چلتا ہوا اس کے مقابل آگیا۔ اس کے سامنے آگیا۔

پھر اس نے عالم بے خودی میں ماہ رو کا رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

"یہ کس پہ بجلیاں گرانی ہیں؟" اس کی آواز میں بھی بے خودی کی سوندھ گندھ گئی تھی۔ اس کے چہار جانب مہکار تھی۔ خوشبو تھی، رنگ تھے، جگنو تھے۔

عون کو لگا۔ وہ کھڑے سے گر پڑے گا۔ اس کے بازو ماہ رو کی کمر میں حمائل تھے اور جب وہ گرے گا تو ماہ رو اس کے اوپر... نہیں، اس وقت ایسی سچویشن افورڈ ایبل نہیں تھی۔ باہر لوگ تھے اور مہمان تھے۔ اور ماہ رو کی پکار بھی بہت واضح تھی۔ سب لوگ باہر اسے بلا رہے تھے۔ تاکہ وہ آئے اور کیک کاٹے۔ اور عون کے دل میں، جو بھاپ کی طرح اٹھتا رومانس مچل رہا تھا اس کا کیا بنتا؟

اس نے عالم بے بسی سے ماہ رو کو خود میں سمو لیا... اور ماہ رو جیسے سراپا زعفران بن گئی تھی۔ ماہ رو کی ساری طراری اور اعتماد جاتا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے پاگل ہوتی دھڑکنوں کو قابو کرتے ہوئے کہا تھا اور بمشکل ہی کہا تھا۔

"تم پہ بجلیاں گرانی ہیں..." وہ بار حیا سے ٹوٹ پڑتی تھی اور پلکوں کی جھالر اٹھتی نہیں تھی۔ اور دل تھا کہ عون عباس کے حضور سجدہ ریز ہو رہا تھا۔

"ہم تو کب سے مر مٹے۔" عون کی آواز اور بھی بوجھل ہوئی۔

"لگتا تو نہیں... ثبوت دو تو بات بنے۔" اس نے عون کی بات اسی پہ لوٹا دی تھی۔ وہ گلا کھنکار کر رہ گیا۔ پھر اس نے ماہ رو کی صبیح پیشانی کو ہاتھ کی پوروں سے چھوا اور نرم سی مہر محبت ثبت کی تھی۔

"کیا ابھی دوں؟" وہ آنکھوں میں شرارت بھر کے پوچھ رہا تھا۔ اس کا اشارہ واضح تھا۔ دنیا جہاں کی بولڈ ماہ رو نے فریحہ کو بھری محفل میں معافی نامے کا اعزاز بخشا تھا تب سے عون کا رویہ، اس کے جذبات، اس کے احساسات میں واضح تبدیلی آگئی تھی۔

عون بدل گیا تھا۔ اور واقعی عون عباس بدل گیا تھا۔ کم از کم ماہ رو کے لیے بدل گیا تھا۔

"نہیں، ابھی نہ وقت ہے نہ موقع..." ماہ رو نے اس کی بات کا جواب دیا تھا اور عون نے برجستہ آگے

ٹکرا لگا گیا تھا۔

"اور نہ دستور۔۔۔ کیونکہ ثبوت حقیقی پیش کرنے کے لیے ایک وسیع پلیٹ فارم ہونا چاہیے۔ موقع ہونا چاہیے۔ دستور ہونا چاہیے۔ ہر چیز کا ایک قرینہ ہوتا ہے۔ ایک طریقہ ہوتا ہے۔ کیوں ماہ رو! ٹھیک کہا نا۔۔۔؟" عون نے پھر سے شرارت کی تھی۔ ماہ رو مسکرا دی۔ کھل کر' تازگی کے ساتھ۔ کیا وہ وقت قریب آرہا تھا۔ کیا شام ہجر جا رہی تھی؟ کیا عون کی بدگمانیاں ختم ہو رہی تھیں۔ کیا اس کا دل ماہ رو کی طرف پلٹ رہا تھا۔

"امی اور بھابھیوں نے اتنا خرچا کروا دیا۔ سالگرہ کے نام پر' ساتھ میں ولیمہ نپٹا دیتے تو کچھ فائدہ بھی ہوتا۔" پھر عون جان بوجھ کر اسے ستانے لگا تھا۔ چڑانے لگا تھا۔ ماہ رو نے بڑے برجستہ انداز میں کہا۔

"منہ دھو رکھو وہ خرچا الگ سے ہوگا۔ تم سستے میں چھوٹنے والے نہیں۔"

اس نے کھنکتی آواز میں مسکراہٹوں کے پھول بکھرائے تھے۔ جنہیں عون عباس نے شگفتہ لبوں سے سمیٹ لیا تھا۔ معا" باہر سے عاشر کی آواز آئی۔

"بھائی صاحب! رومانس بعد میں فرمائیے گا۔۔۔ بچہ پارٹی بس کیک پہ دھاوا بولنے ہی والی ہے۔ دیکھنا' تمہارے باہر آتے تک کیک ہضم بھی نہ ہو جائے۔"

عاشر کی آواز پہ عون اور ماہ رو سنبھل کر سیدھے ہوئے تھے پھر مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ یوں کہ بڑے ہال میں جانے تک از خود عون نے ماہ رو کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور ماہ رو کو یوں لگا تھا وہ وصال پا گئی ہے اور ماہ رو سرفراز وہ اپنے کھوئے ہوئے عشق کو پا گئی ہے۔ وہ اپنے روٹھے ہوئے عشق کو پا گئی ہے۔

ہر آنکھ نے انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ لیکن ایک آنکھ نے انہیں نفرت اور حسد بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور اس ستاروں سے بھری چمکیلی رات میں ابھی وہ عون کو پالینے کی خوشی ٹھیک طرح سے محسوس کر بھی نہیں سکی تھی جب وہ ہو گیا تھا جس کا تصور بھی محال تھا۔ اور ماہ رو سرفراز نے زندگی میں پہلی مرتبہ سرخ آندھی کو اٹھتے دیکھا تھا۔ سرخ آندھی اور اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ بادلوں کو زمین پہ گرجتے دیکھا تھا۔ بدخواہوں کو آگ لگاتے دیکھا تھا۔ بدبختوں کو ہنستے مسکراتے چہروں سے مسکراہٹیں نوچتے دیکھا تھا۔

آفتیں کیسے ٹوٹتی ہیں؟ عذاب کیسے نازل ہوتے ہیں؟ ماؤس کیسی زندگیوں میں گھستے ہیں۔ اور ریاکار کیسے فتح یاب ہوتے ہیں؟ ماہ رو کو آج پتا چلا تھا۔ اور لوگ بظاہر معاف کر کے بھی معاف نہیں کرتے۔ بدلے لیتے ہیں۔ انتقام پورے کرتے ہیں۔ ماہ رو کو آج علم ہوا تھا۔

یہ وہی ستاروں بھری جگمگاتی شام تھی جس کے اختتام پر' سب مہمانوں کے چلے جانے کے بعد وہ سب لوگ بڑے ہال میں بیٹھے تھے۔ اور ماہ رو کو دیے جانے والے گفٹ کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔ یاسر' عامر اور عاشر ہر گفٹ پہ تبصرے کرتے' اس کی جانچ کرتے' مالیت کا اندازہ لگاتے اور برا سا منہ بنا لیتے تھے۔

"پر ہیڈ کے حساب سے زیادہ کھا گئے سستا تحفہ دے گئے۔"

ان کے ہر کمنٹ پہ ماہ رو ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔ پھر ڈپٹ کر کہتی۔

"تحفہ دیکھتے ہیں۔ اس کی قیمت نہیں دیکھتے۔۔۔ خلوص دیکھتے ہیں۔ باتیں نہیں بناتے۔" عاشر نے فورا" نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میں تم سے ایگری نہیں کرتا۔"

"اور میں بھی۔۔۔" یاسر نے بھی میدان میں آنا چاہا۔

"اب پوچھو بھلا کیوں؟" عاشر نے بڑی سمجھ داری سے کہا تھا۔ ماہ رو نے پوچھا کیوں۔

"اس لیے کہ اگر ہم برتھ ڈے پہ بلا کر مہمانوں کے سامنے گھاس پھونس رکھ دیتے۔ کدو پکا کر رکھ دیتے۔ کیک کی بجائے حلوے کا پہاڑ بنا کر اوپر موم بتی لگا دیتے۔۔۔ اور سب مہمانوں کے سامنے مارے خلوص

کے بچھ بچھ جاتا۔ ان کے قدم تک پکڑ لیتے۔ پھر بھی کوئی ہمارے خلوص کو دیکھنا گوارا نہ کرتا۔ لات مار کے چلا جاتا۔ سو سو باتیں الگ کرتا۔ پورے زمانے میں برتھ ڈے پارٹی کا مینیو بھی نشر کرتا۔" عاشر نے اتنے مزاحیہ انداز میں بات مکمل کی تھی کہ پوری محفل زعفران زار بن گئی تھی۔

سب لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ انہی قہقہوں کے درمیان میں اچانک' ہاں بالکل اچانک پورب کی طرف سے سرخ آندھی اٹھی تھی۔ غبار' گندگی' غلاظت' خاک ہی خاک۔ مٹی ہی مٹی' ریت ہی ریت۔ وقت زوال ماہ رو سرفراز پہ تن کے کھڑا تھا۔

وہ کون سی گھڑی تھی جب اس کی زندگی میں بھونچال آگیا۔ وہ بھی وقاص کے توسط سے۔ وہی وقاص جو شازمہ کا پی ایچ ڈی بھانجا تھا۔ نہائیت قابل' معزز' باوقار.....

اور ایک وقت میں یہی کوئی سات آٹھ ماہ پہلے اس کا ماہ رو کے لیے پرپوزل آیا تھا۔ جو آیا اور گیا..... ماہ رو کو کبھی بھول کے بھی یاد نہیں آیا تھا۔

اور آج وہی وقاص رات کے بارہ بجے گفٹ پیک اٹھا کر ماہ رو کے گھر چلا آیا۔ ماہ رو کی محبت میں؟ دوستی میں آخر کس رشتے اور کس تعلق کی بنیاد پر؟

ماہ رو تو اسے جانتی تک نہیں تھی۔ اس کا وقاص سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا جس کے توسط سے وہ ماہ رو کو تحفے دیتا۔ بلکہ خود دینے آتا۔

آخر یہ سب کیا تھا؟ وقاص کیوں آیا تھا؟ وقاص کس لیے آیا تھا؟ اور گیٹ تک ہی کیوں آیا تھا؟ اور یہ فریحہ بتا رہی تھی۔ تحفے وقاص دے کر گیا تھا۔ ساتھ ایک خط بھی تھا۔ جو فریحہ نے ہی وصول کیا۔ گفٹ اور خط دونوں چیزیں..... بلکہ خط نما کارڈ۔ خاصا بڑا اور اسٹائلش۔

اور فریحہ نے ماہ رو کو دینے کی بجائے عون کے ہاتھ میں پکڑائی تھیں۔ دونوں چیزیں..... دونوں ناگ' دونوں برزخ..... دونوں رنگ کی آگ۔

اور عون نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گفٹ کھولنے کی بجائے وہ خط کھول لیا تھا۔ اور پھر جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا۔ محفل کا رنگ بدلتا گیا۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ ہر طرف سناٹا پھیل گیا۔

اس نے خط یا کارڈ کا متن پڑھا۔ بہت نازک سے ٹشو کے صفحات کا تھا۔ بیچ میں سنہری تتلیاں تھیں۔ جو کارڈ کھولتے ہی پھڑک پھڑک کر اوپر کو اٹھتیں۔ یہ کارڈ یہاں سے نہیں مل سکتا تھا۔ کافی منہگا تھا۔

عون نے اپنی سرخ آگ سی نگاہ کارڈ کے متن پہ جما دی تھی۔

"جان عزیز! جنم دن مبارک ہو..... شادی کے بعد پہلی سالگرہ میں ہی ہمیں بھول گئیں..... تم سا ہرجائی کون؟ تم سا بے وفا کون؟ کال اس لیے نہیں کی کہ تم اور تمہارا پرنس ڈسٹرب نہ ہو۔ کہیں لمبی کال مار دوں اور وہ ہم سے جیلس نہ ہو جائے۔ ایک دفعہ تم ہاتھ آجاؤ۔ تو لمبے عرصے کے لیے لے اڑیں گے تمہیں۔ بہت بورنگ اور ڈل ہو چکی تم..... ورلڈ ٹور پہ جائیں گے تو پرانی ماہ رو کو واپس لے آئیں گے۔

باقی کہانی بعد میں سہی..... مے دس ایونٹ برنگ ہیپی نیس ٹو یو..... ہیپی برتھ ڈے ٹو یو....." کارڈ میں میوزک بجنے لگا تھا اور ساتھ فریحہ کی کمنٹری بھی۔

"وقاص نے کہا۔ وہ ماہ رو کی زندگی سے جا چکا ہے۔ گو کہ یہ بہت بے وفا نکلی۔ ہرجائی نکلی۔ پلٹ کر حال بھی نہیں پوچھا۔ پھر بھی میں اس کا برتھ ڈے وش نہ کروں یہ کہاں گوارا کر سکتا ہوں۔" اور فریحہ نے اس رات اپنی کمینگی کی ہر انتہا دکھا دی تھی۔ ہر حد سے گزر گئی تھی۔ ہر انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

اور اس کے لفظ آگ تھے۔ شرارے تھے۔ شعلے تھے۔ زہریلے ناگ تھے۔ جنہوں نے ماہ رو کو ڈس لیا تھا۔ نیل نیل کر دیا۔ فریحہ نے اور بھی بکواس کی تھی۔ اس نے ایسی ایسی شرم ناک باتیں بتائی جنہیں سن کر اس کے ابا اور تایا تک دنگ رہ گئے تھے۔ فریحہ بولتی رہی۔ آگ برساتی رہی۔ آگ بھڑکاتی رہی۔

اور سب لوگ انگشت بدنداں اسے سن رہے تھے۔ جیسے سن ہو رہے تھے۔ جیسے ان کی زبانیں تالو

سے چپک گئی تھیں۔

پھر فریحہ کی زہر بجھی زبان کو بریک لگ گئے تھے کیونکہ عون عباس کسی شیر کی طرح دھاڑتا ہوا ماہ رو پہ پل پڑا تھا۔ پھر سرخ آسمانوں اور ڈولتے پتواروں نے دیکھا تھا۔ پھر سسک پڑتی خزاؤں نے دیکھا تھا۔ ماہ رو سرفراز کا چہرہ عون عباس کی وحشت سے دوسری مرتبہ داغ دار ہو گیا تھا۔ خونم' خون ہو گیا تھا۔

وہ لہرا کر زمین پر گری تھی.... اور وہ زمین پہ نہیں گری تھی۔ وہ پاتال میں جاگری تھی اور وہ کسی وحشی درندے کی طرح چیخ رہا تھا۔

"تمہاری ذات میں اتنے کانٹے ہیں کہ کوئی تمہارے قریب کیسے آئے؟ اور تم ناگن کی ایسی قسم میں سے ہو جس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ دوسرا سانس بھی نہیں لیتا۔

تم نالی کا کیچڑ تھیں.... تم گند تھیں۔ تمہیں میرے ماں باپ نے سر آنکھوں پہ بٹھالیا۔ تم جیسے فاحشہ کو عزت دی۔ تمہیں محبت دی۔ تم غلیظ عورت! نالی کا گند ہو۔ غلاظت ہو۔

تم جیسی ذلیل عورتوں کو تمہاری اعلا سوسائٹی کے ریپر نے چھپا رکھا ہے۔ تم جیسی عورت ہمارے جیسے گھرانوں میں خدا نا خواستہ ہوتی تو اب تک قبر میں اتار دی جاتی۔

وہ تمہارا باپ تھا جس نے تمہاری ہر "بدکرداری" پہ پردہ ڈال رکھا تھا۔ اور یہ میں ہوں عون عباس! اپنے اس پورے خاندان کے سامنے اپنی زندگی سے نکال رہا ہوں۔ دفع کر رہا ہوں.... کیونکہ عون عباس سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن بدکردار عورت کو ایک پل اپنی زندگی میں نہیں رکھ سکتا.... ابھی اور اسی وقت اپنے عاشق صادق کے پاس دفع ہو جاؤ.... چلی جاؤ۔ نکل جاؤ.... میں تمہیں دھتکار رہا ہوں۔ دھتکار رہا ہوں دھتکار رہا ہوں۔" عون نے بالوں سے پکڑ کر ماہ رو کو گھسیٹا اور ایک زوردار دھکا خارجی دروازے تک دیا۔

وہ لڑکھڑاتی ہوئی دہلیز کے بیچ گھٹنوں کے بل گری تھی۔ اس کا ماتھا پھٹ گیا۔ اور لمحوں میں خون آلود ہو گیا تھا۔

ماہ رو نے پھٹتے سر کی ساری اذیت کو بھلا کر اک نفرت بھری نگاہ اس پورے ماحول پہ ڈالی تھی اور پھر اتنی تذلیل' بے عزتی' نفرت' دھتکار کے بعد بھی اپنی جگہ پہ اٹھی اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ ہر ایک کی نگاہ میں پھر سے تعجب اور خوف اُمڈ آیا تھا۔

"بس یا کچھ اور؟" ماہ رو نے اپنے بکھرے حواسوں کو یکجا کر کے بڑے ضبط اور بڑے تحمل سے کہا تھا۔ پھر عون کی شعلہ اگلتی نگاہوں میں دیکھتی پھٹ پڑی تھی۔

"وقاص کون تھا؟ کیا ہے' میں اسے نہیں جانتی اور صفائی بھی نہیں دوں گی۔ تم کیا ہو' تم کیا تھے میں بس تمہیں جانتی تھی۔ میں بس تمہیں جانتی ہوں۔" ماہ رو لڑکھڑا کر آگے بڑھی گفٹ اور زمین پہ پڑا کارڈ اٹھایا۔

"تم نے ایک کارڈ کی مبہم تحریر پڑھ کر مجھ پہ الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ تم نے فریحہ کی ایک ایک بکواس پہ یقین کر لیا۔ یہ تمہارے گھر کی پاک باز عورت ہے۔ معصوم' سادہ' بے گناہ....

میں بازار کی عورت ہوں۔ فاحشہ' عیاش' مکار' بدنام' بدکردار۔

تم نے اپنی کزن' اپنے گھر کی شریف عورت کی ہر بات کو سچ تسلیم کر لیا۔ اس لیے کہ فریحہ سچی ہے۔ تم سب کی نظر میں سچی ہے۔ میں بدکردار ہوں.... فاحشہ ہوں' مکار ہوں' دھوکے باز ہوں تو میں جھوٹی ہوئی۔

تم نے اس کارڈ کی تحریر پڑھی۔ تم نے اس کے فٹ نوٹ پہ لکھا نام نہیں پڑھا۔ تم نے بہت اچھا کیا۔ نہیں پڑھا۔ اگر پڑھ لیتے تو مجھے اندازہ کیسے ہو پاتا کہ تمہاری نظر میں میری اوقات کیا ہے؟

تمہاری سوچ ایسی سطحی اور چھوٹی ہو گی۔ مجھے گمان تک نہیں تھا۔ خیال تک نہیں تھا۔

اور وقاص کون تھا؟ یہ فریحہ کو بتانے کی جھوٹی کہانی پاس سے بنا کر سنانے کی ضرورت نہیں۔" ماہ رو کے دھیمے سلگتے الفاظ پہ حاضرین محفل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ حتیٰ کہ عون عباس بھی دم بخود رہ گیا تھا۔ جبکہ فریحہ کی امی اپنی بیٹی کا نام سن کر چیخ پڑی تھیں۔

"اے لڑکی! اپنی گندی زبان سے میری بیٹی کا نام

مت لے۔" ان کی غراہٹ پہ ماہ رو سابقہ تحمل بھرے لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کی بیٹی بے شک مجھ پہ گند گراتی رہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ اور شاید یہاں ایسا ہی انصاف ہے۔ لیکن مجھے فریحہ سے کوئی شکوہ نہیں.... کوئی گلہ نہیں.... اس نے تو ادلے کا بدلہ کرنا تھا۔ پورا پورا بدلہ لینا تھا۔ اپنی ذلت کا انتقام لینا تھا۔ سو اس کا بدلہ تو پورا ہوا۔

بقول فریحہ کے میں نے اس کو عون کی زندگی سے نکالا تھا۔ آج اس نے مجھے بھی نکلوا دیا۔ بہت اچھا کیا.... اپنا انتقام پورا کر لیا۔

جہاں تک اس کارڈ کا تعلق ہے تو یہ کارڈ میری ممی شازمہ نے بھیجا ہے.... اور یہ گفٹ جس کے ریپر پہ کوریئر کی مہر، ٹکٹ اور سگنیچر ہیں.... یہ غیر ملکی ٹکٹ اور مہر بتاتی ہے کہ یہ گفٹ اور کارڈ کہاں سے آیا۔ میری ممی اور ڈیڈی میری شادی کے بعد پہلی برتھ ڈے میں شریک نہیں ہو سکے۔ لیکن انہوں نے مجھے ابراڈ جا کر بھی بھلایا نہیں.... یقیناً" یہ گفٹ وقاص کے ایڈریس پہ بھیجا گیا تھا۔ اور وقاص اس امانت کو یہاں مجھ تک پہنچا گیا۔ اگر تسلی کرنی ہے تو فون اٹھائیں اور کال ملائیں۔

اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے وقاص کی شادی کو سات ماہ ہو چکے ہیں۔ وہ ایک شریف اور معزز انسان ہے.... گو کہ وہ ایک غیر مناسب وقت میں یہاں آیا۔ لیکن اسے یقیناً" میری ممی نے مجبور کیا ہو گا کہ رات بارہ سے پہلے مجھے گفٹ دے کر جائے.... میری ممی ان نزاکتوں کو سمجھتی نہیں۔

اور یہ گفٹ پہ لکھا ایڈریس، مہر ٹکٹ آپ کی تسلی کے لیے ہیں.... اور کارڈ پہ فٹ نوٹ لکھا بھی دیکھ لیں۔ شازمہ سرفراز لکھا صاف نظر آ رہا ہے.... اندھوں کو بھی نظر آ رہا ہے اور جو فریحہ نے کہا وہ سب جھوٹ، بکواس اور انتقام ہے۔ اور رہا مجھے اس گھر سے یا گھر کے افراد سے کوئی گلہ نہیں.... بس اتنا ضرور تلخ ترین مرحلوں سے گزرنے کے بعد اندازہ ہو چکا ہے کہ کسی کی زندگی میں واقعی زبردستی نہیں گھستے۔

اور کبھی محبت کے حصول کی دعا بھی نہیں کرتے۔ اگر کچھ طلب کرنا ہو تو عزت اور اعتماد طلب کرنا چاہیے۔

ان دو چیزوں کے سامنے محبت، بہت ہیچ ہے اور محبت بہت ہیچ ہے۔

مجھے ماہ رو سرفراز کو آج اندازہ ہوا ہے کہ محبت کس قدر ذلیل کرتی خوار کرتی۔ رسوا کرتی اور بار بار دھتکارتی ہے۔" ماہ رو نے اپنے پھٹے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر ابلتے خون کو روکنے کی ناکام سی سعی کی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے کارڈ، گفٹ ہوا میں اچھالتی مڑی اور الٹے قدموں اونچی آواز میں روتی ہوئی رحمان منزل سے دور بہت دور چلی گئی تھی۔ یوں کہ ماہ رو کو آوازیں، دیتے پیچھے بھاگتے، پکارتے وہ سب لوگ التجائیں کرتے خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ بالکل خالی ہاتھ۔

اور وہ ماہ رو سرفراز جو بالکل اچانک تین ماہ پہلے ان کی زندگیوں میں کسی ناگہانی آفت کی طرح آئی تھی۔ پھر کسی طوفان کی طرح نہیں سبک خرام ہوا کی طرح چپکے سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی۔ اور شاید واقعی ہی ہمیشہ کے لیے۔

☼ ☼ ☼ ☼

ماہ رو کی زندگی میں طوفان آیا اور بہت ساری تباہیاں مچاتا نکل گیا۔

وہ واپس سرفراز ولا آ چکی تھی۔ اور اس کے آتے ہی ممی، ڈیڈی بھی افتاں خیزاں پہلی فلائٹ سے پاکستان پہنچ چکے تھے۔ ماہم بھی حواس باختہ آ گئی۔ وہ دبئی فیشن شو کے لیے گئی تھی ماہ رو نے اسے بھی ارجنٹ بلا لیا وہ بڑی اداس ویران اور تنہا تھی اس کے دل پہ بہت بوجھ تھا اور وہ کسی اپنے کے کندھے پہ سر رکھ کر بہت سا رونا چاہتی تھی۔

پھر ماہم آ گئی تو ماہ رو کی جلتی روح کو بھی سکون آ گیا۔ پھر جو ماہ رو نے رو رو کر اپنے دل کی حکایت پہلے شازمہ اور ڈیڈی کو سنائی پھر ماہم سے دل کے سارے دکھ بیان کیے۔

ماہم چپ چاپ سنتی رہی تھی۔ اس نے ماہ رو کو ٹوکا نہیں۔ دل کھول کر رونے دیا۔۔۔ اس ساری کہانی بلکہ لمحہ بھر کی غلط فہمی میں بار بار وہ ایک ہی بات دہراتی تھی۔

"ساری دنیا جو بھی کہہ لیتی۔۔۔ عون عباس مجھے کریکٹرلیس نہ کہتا۔ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے اس نے کیسے مجھ پہ اتنے گھٹیا الزام لگائے تھے؟ اس کے ضمیر نے کیسے گوارا کیا؟" وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ اور پچھلے ایک ہفتے سے رو رہی تھی۔ جب اس کا صدمہ کچھ کم ہوا' غصہ تھوڑا ہلکا ہوا۔۔۔ اندر کا سارا غبار نکل گیا تب ماہم نے شازمہ کے کہنے پہ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے اسے سمجھانا شروع کیا تھا۔

"جس اذیت میں تم مبتلا ہو۔۔۔ سیم اسی تکلیف سے عون بھی گزر رہا ہے۔ اس کے گھر والے بھی گزر رہے ہیں۔ اور یہ تو تم خود بھی کہتی ہو۔ عون کے گھر والے تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ عون کی امی دس مرتبہ کالز کر چکی ہیں اور تین مرتبہ تمہیں لینے آ چکی ہوں۔ جو غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ اسی وقت ختم بھی ہو گئی۔ عون کو وقتی غصہ آیا تھا۔ کسی بھی انسان کو ایسی پچویشن میں غصہ آ سکتا ہے۔ یہ فطری عمل تھا ماہ رو! اب وہ بے چارا پچھتا رہا ہے۔ ایک ہزار ایک مرتبہ۔۔۔۔" ماہم بڑے پیار' بڑی نرمی اور ملائمت سے اسے سمجھا رہی تھی جب ماہ رو نے سوں سوں کرتے ہوئے بہت تنگ کر کہا۔

"عون کا نام مت لو۔ اس کی وکالت نہ کرو۔ مجھے اس کا نام بھی نہیں سننا۔" وہ غصے سے چیخ گئی تھی۔ برہم ہو گئی تھی۔ البتہ عون کی امی کا سن کر تھوڑا نرم بھی پڑی تھی۔ جو بھی تھا۔ عون کی امی اور اس کے گھر والے عون جیسے ہرگز نہیں تھے۔

"ٹھیک ہے نہیں لیتی۔۔۔ اگر وہ خود آ جائے تو؟؟" ماہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھنے کی جسارت کی تھی۔

"تو میں اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گی۔۔۔" ماہ رو نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "یا اسے قتل کر دوں گی۔ ایسوں کی ایسی ہی سزا ہونی چاہیے۔"

"پھر وہ تمہارے ہاتھوں قتل ہونے آ گیا ہے ماہ رو! اگر قتل کا ارادہ بدل جائے تو مجھے بتا دینا۔ تمہاری توہین کا بدلہ لینے کے لیے جوس میں پوائزن ملا دوں گی۔ تاکہ اسے سزا تو مل سکے۔" ماہم نے بڑی سنجیدگی اور رازداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہ رو کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دیکھا تھا جہاں پہلے تعجب ابھرا اور پھر غصہ بھر گیا تھا۔

"اللہ نہ کرے! بہت کمینی ہو تم۔" ماہ رو دہل گئی تھی پھر ماہم کو قہقہہ لگا کر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا اور خود بھی مسکرا دی۔ یہ اور بات ہے کہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ کے آگے کشن رکھ لیا تھا۔

"غصہ تھوک دو ماہم کی جان! اور یہ غصہ ہے بھی اوپر اوپر سے۔ بہت بن لیا تم نے۔ اب بس کرو۔ اور ان ماں بیٹے کی فریاد سن لو۔ وہ نیچے سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ اور پچھلے ایک ہفتے سے بے چارے ہر روز تمہیں منانے کے لیے آتے ہیں۔۔۔" اور ابھی ماہم کے اگلے الفاظ منہ ہی میں تھے جب شازمہ کسی کا بازو پکڑ کر اندر لے آئی تھی۔ اور وہ کوئی ایسا تھا جسے دیکھ کر ماہ رو کی روح فنا ہو گئی تھی۔ وہ بیٹھے سے ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"ہماری ماہ رو کو منا سکتے ہو تو منا لو۔ بس یہ چیلنج اچیو کرو۔ باقی کا معاملہ ہم پہ چھوڑو۔" شازمہ نے ماہم کو اشارہ کیا تھا پھر وہ دونوں مسکراہٹ دبا کر روم سے باہر نکل گئی تھیں۔

وہ دونوں روم میں تنہا رہ گئے تھے۔ آج میوزک بھی بند تھا۔ روم خاموش تھا۔ البتہ کمرے کے در و دیوار جاگ رہے تھے۔ بول رہے تھے۔ گنگنا رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے والی اداسی اچانک ختم ہو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھتا رہا۔ پھول' پردے' بیڈ' میوزک سسٹم' اور دیوار پہ لگی اپنی ہی انلارج تصویر کو' جانے کب یہ فوٹو ماہ رو اڑا کر لے آئی وہ کچھ متحیر سا اپنی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ پر اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر ماہ رو کو دیکھا اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ وہ پہلی والی ماہ رو نہیں تھی۔ ایک ہفتے میں بہت

ویک ہو چکی تھی۔ چہرہ مرجھا گیا تھا۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔

آخر وہ اتنے بڑے صدمے سے گزری تھی اور وہ بھی عون کی وجہ سے۔

اسے اپنی جذباتیت پہ شدید غصہ آگیا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ خود کو ملامت کرتا اپنے آپ پہ غصہ ہی تو کر رہا تھا۔ دراصل وہ شدید قسم کا جذباتی اور فوراً" رد عمل ظاہر کرنے والا بندہ تھا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی اور عادتیں چھوٹ ہی جاتی ہیں۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ اپنی اس عادت کو بدل لے گا۔

اور اب ماہ رو کی طرف یک ٹک دیکھتا عون سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ گفتگو کو کہاں سے شروع کرے۔ تمہید کس طرح سے باندھے؟ اور ماہ رو کی بدگمانی، غصے، دکھ اور اذیت کو ختم کیسے کرے؟

بہت دیر کی بچار کے بعد جب ماہ رو کو اس کی نگاہوں سے الجھن ہونے لگی تھی تب عون کو بالآخر بولنا ہی پڑا تھا۔۔۔ لیکن اس سے بھی پہلے وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ماہ رو کے قریب آیا تھا۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل ماہ رو سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

ماہ رو جو غصے میں رخ بدل چکی تھی اور اٹھنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ عون کو اتنا قریب بیٹھا دیکھ کر قدرے بے بس ہو گئی۔ تاہم اس کی سماعتیں عون کی آواز کا لاشعوری طور پہ انتظار کر رہی تھیں۔ جو بھی تھا۔ اس ستم گر سے عشق تو تھا ہی۔ ہر اچھائی اور برائی سے مبرا۔ اس نے عون سے محبت کی تھی۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں سے نہیں۔

وہ اب بھی عون کو ہی چاہتی تھی۔ اس کی خامیوں اور خوبیوں کو نہیں۔

کافی دیر ماحول پہ خاموشی چھائی رہی تھی۔ جسے بالآخر عون کی آواز نے توڑ دیا تھا۔

"ماہ رو۔۔۔!" وہ بولا تو جیسے انگ انگ بول اٹھا تھا۔ پورا ماحول بول اٹھا تھا۔ بیڈ روم کی ایک ایک چیز بول اٹھی تھی۔

"بہت لمبی تمہید میں نہیں پڑوں گا۔ حساب دان ہوں۔ حسابی بات کروں گا۔ مختصر مگر جامع۔ گو کہ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ بات کہاں سے شروع کروں؟ تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں یا تمہیں تمہارے بارے میں بتاؤں؟ چلو، تم آج مجھے بغیر ٹوکے سنتی رہو۔ میں بہت لمبی کہانی نہیں سناؤں گا۔

میں عون عباس، بہت جذباتی آدمی ہوں۔ جب بچہ تھا تب بھی جذباتی تھا۔ جب بڑا ہوا تب بھی جذباتی رہا۔ مجھے ہر بات پہ فوری رد عمل دینے کی عادت تھی۔ میں غور و فکر عموماً" بعد میں کرتا ہوں۔

میرے اپنے باپ سے اختلاف اپنی جگہ تھے۔ اور یہ بہت شروع کے اختلاف تھے۔ یقیناً" تمہیں امی نے بتا دیا ہو گا۔ ابو کس طرح سے میرے ہر شوق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے تھے۔ مجھے فوج میں نہ جانے دیا۔ وکالت نہ پڑھنے دی۔ مجھے جاب نہ کرنے دی۔ ابراڈ نہ جانے دیا۔۔۔ اور ابو بے شک مجھے نافرمان کہتے تھے پھر بھی ہر اختلاف کے بعد میں مانتا ہر بات ابو کی تھا۔ یہ ساری باتیں بہت پہلے کی تھیں۔ اصل جو جھگڑے کی شروعات ہوئی تھی وہ تمہیں امی نے نہیں بتائی۔ جب امی کو لگا، میں شادی کی عمر کو پہنچ چکا ہوں تو امی نے چپکے ہی چپکے فریحہ کے لیے چاچی کو میرا نام دے کر راضی کر لیا تھا۔ چاچی کی بھی خواہش تھی، میں ان کا داماد بنوں۔

کیونکہ ابو سے چند اختلافات کے علاوہ میں بڑا فرمانبردار قسم کا بندہ تھا۔ امی نے جب مجھ سے پوچھا تو میں نے ان کی پسند کو ایکسپٹ کر لیا۔ تب میرے ذہن میں نہ خواب تھا نہ کوئی خیال تھا۔ لیکن جب ابو کو پتا چلا تو وہ بہت برہم ہوئے۔۔۔۔ ان کے نزدیک میں ضدی، ہٹ دھرم، من مانی کرنے والا اور کاروبار سے بے زار رہنے والا بندہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ فریحہ کے لیے کم از کم مجھے نہ منتخب کیا جائے۔

"کیونکہ فریحہ خاصی سمجھ دار، سنجیدہ اور مدبر قسم کی لڑکی تھی۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکا تھا "اور عاشر، فریحہ کے متعلق سوچنے لگا تھا۔"

وہی عاشر جو شادی کے نام سے بدکتا تھا۔ لیکن فریحہ کے لیے اس نے حامی بھر لی تھی۔ اور فریحہ نے کیا کیا؟

اپنے ہاتھوں عاشر کو بھی کھو دیا۔ جو کچھ فریحہ نے کیا۔ جو کچھ اچانک ہوا تھا... یا جس تکلیف سے ماہ رو گزر کے یہ گھر چھوڑ گئی تھی یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

ہر کوئی فریحہ کی سازش اور بدنیتی کو جان گیا تھا۔ اور یہ فریحہ کے لیے مزید بڑا دھچکا تھا۔ کہا جاتا ہے نا.... انسان زمین سے گرا ہوا تو کھڑا ہو سکتا ہے لیکن کسی کی نظر سے گر کر دوبارہ کھڑا ہونا محال ہے۔

اور فریحہ ان دنوں ایسے ہی فیز سے گزر رہی تھی۔

نہ صرف عون کی ہمدردیوں کے رخ بدل گئے تھے بلکہ تایا تائی کی شفقتوں کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ جہاں تک عاشر کا تعلق تھا۔ تو فریحہ کی سازش کھل جانے کے بعد عاشر بھی اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ وہی عاشر جو درپردہ فریحہ کو جانے کب سے پسند کرتا آرہا تھا۔

لیکن جب فریحہ عون سے منسوب ہو گئی تھی تب عاشر خود بخود پیچھے ہٹ گیا تھا۔ کیونکہ اسے اخلاقی قدروں کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ پرائی امانتوں کی خواہش کیوں رکھتا۔

ماہ رو کی سالگرہ سے پہلے عاشر نے اپنی امی سے ڈھکے چھپے لفظوں میں فریحہ کے متعلق بات کی تو وہ دل سے راضی ہو گئی تھیں۔ انہیں فریحہ شروع سے پسند تھی۔

جب عون والا مسئلہ الجھ گیا تب بھی وہ فریحہ کو بہو بنانے کی خواہش رکھتی تھیں۔ کیونکہ عاشر فریحہ کو بہت عرصے سے پسند کرتا آرہا تھا۔ لیکن اب حالات مختلف تھے۔

عاشر نے خود فریحہ سے رشتہ نہ جوڑنے کی بات بڑوں تک پہنچا دی تھی۔

فریحہ نے سنا تو ایک اور دھچکے کے زیر اثر پچھتاووں میں گھر گئی۔

عاشر کبھی بھی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا جو نیت کی بری تھی۔ جس کی نیت میں کھوٹ تھی اور جس کے شر سے اس کے بھائی کا گھر اجڑنے لگا تھا۔

رشتوں کی بنیاد خلوص پہ ہوتی ہے۔ نیت خالص نہ ہو تو رشتے بھی خاص نہیں رہتے، کیا خبر، کچھ وقت گزرتا تو عاشر اپنے دل کو دوبارہ فریحہ کی طرف موڑ لیتا۔ لیکن اس کے لیے بہت وقت درکار تھا... اور فریحہ کو واپس اپنے حقیقی خالص وقار کو بحال کرنے میں بڑا وقت لگنا تھا۔ بڑا لمبا سفر کرنا تھا۔

اور اس وقت ماہ رو کو ایک ایک حکایت بتاتا وہ چونک گیا تھا۔ پھر اس نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اب وہ ماہ رو کو فریحہ اور اپنی دوستی کے متعلق بتا رہا تھا۔

"گو کہ فریحہ سے میری دوستی بہت تھی پھر بھی میں نے اس کے ساتھ شادی کا کبھی سوچا نہیں تھا۔

اور ابو نے بھی خاصی مخالفت کی۔ لیکن پھر امی کے سامنے مان گئے۔ ورنہ وہ فریحہ کے لیے عاشر کو ہی چاہتے تھے۔ جب ابو کی مخالفت کا مجھے پتا چلا تب مجھے بہت دکھ ہوا کہ ابو کی نگاہ میں میری اتنی سی بھی وقعت نہیں۔ مجھے فوری ردعمل دینے کی عادت تھی۔ سو میں ابو کے سامنے فریحہ سے شادی کے لیے انکار کر آیا۔ میں نے ان سے کہا "آپ فریحہ کی عاشر کے ساتھ کر دیں... میرا انکار ابو کو سخت توہین لگا تھا۔

تب ابو کی میرے ساتھ خوب لڑائی ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے کمینہ، باغی اور خود غرض تک کہا۔ اور بھی جانے کیا کیا۔ پھر ابو کو یہ بات کبھی بھولی بھی نہیں تھی۔ وہ اکثر مجھے جتاتے تھے اور طعنے دیتے تھے۔

خیر، رشتہ تو طے ہو گیا۔ لیکن پھر ہوا کیا؟

قصہ مختصر ایک دھوپ بھری دوپہر میں ایک حسین و جمیل سرپھری لڑکی نے ایک اچھے بھلے جذباتی لڑکے کو اپنا اسیر کر لیا تھا۔ بھلا کیسے؟

کوئی بھی بات پرانی نہیں۔ اور نہ مجھے بھولی ہے۔ نہ میں بھول سکتا ہوں۔

تم فریحہ کے ساتھ رحمان پلازہ آئی تھی اور پہلی مرتبہ آئی تھی۔ جب تم انٹرنس سے اندر آرہی تھی تب... ہاں، واقعی تب میرے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی ماہ رو! تم مانو یا نہ مانو... اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ تم فریحہ کے ساتھ آئی ہو... میں تو اپنے تئیں

فریحہ کو جھڑکنے کے لیے پیچھے آیا اور پھر خود ہی حیران رہ گیا۔

میرے پیچھے تم کھڑی تھی۔ اور تم مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اور میں تمہیں سامنے مرر میں دیکھ رہا تھا۔ اور تب تمہاری آنکھوں میں پگھلتا احساس بن کہے پہلی نگاہ میں مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ اور میرے دل کی دھڑکنوں نے یقیناً" تم تک میرے اندر کی بدلتی لے اور سر پہنچا دیے تھے۔

تب ہی دھڑکنوں کا ایسا تال میل چلا کہ تمہیں مجھ سے لافانی پیار ہو گیا۔ اب آگے تمہیں کیا بتاؤں؟ اگلی کہانی سے تم واقف ہو۔ کیونکہ آگے جو بھی ہوا تمہاری کوششوں' سچی لگن یا سچی محبت کی وجہ سے ہوا تھا۔

لیکن تب بھی کچھ چیزیں بہت مسنگ تھیں۔ کیا کیا؟

سب سے پہلے تو ذہن اس اچانک پوری گیم کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ کیسے؟ کس طرح؟ اور کیونکر یہ ممکن ہوا؟ میرا تمہارے گھر جا کر تمہیں ہراساں کرنا بہانہ بن گیا تھا تم اس صورت حال کو سہہ نہ سکیں اور ہسپتال پہنچ گئیں۔ باقی کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ ہمارا نکاح کیونکر ممکن ہوا؟

اس حقیقت سے تم بھی ناواقف تھیں اور میں بھی۔

ابو بھی شاید ہمیں کبھی نہ بتاتے.... لیکن کل رات نہیں بلکہ تمہاری برتھ ڈے والی رات ہی اچانک شازمہ آنٹی کی کال آگئی تھی۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ وقاص گفٹ اور کارڈ دے گیا۔ اور تب امی نے آنٹی کو اس وقت کی ساری بھیانک سچویشن کا لفظ لفظ سنا دیا۔ پھر آنٹی پہ کیا گزری؟ لفظوں میں بتانا ممکن نہیں.... انہوں نے میری جو دھلائی کی وہ ایک طرف' پھر میرے ہی مجبور کرنے پہ وہ فوراً" پاکستان آگئیں۔

اور تب آنٹی نے ہمارے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کچھ انکشاف کیے تھے جن کا متن کچھ یوں تھا۔

"میں ماہ رو کی اسٹیپ مدر ہوں۔ لوگ کہتے ہی ہوں گے زبان کی کچھ تیز ہوں۔ لیکن دل کی بری نہیں۔ میں نے ماہ رو کا کبھی برا نہیں سوچا۔ اسے اپنی بیٹی ہی سمجھا۔ اور جب اس نے اپنا حال دل مجھ سے شیئر کیا تو میں نے اس سے پرامس کر لیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا.... ماہ رو یک طرفہ محبت کا شکار ہے۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ مجھے ماہ رو کے پیار تک پہنچنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ تب میں نے فریحہ سے بات بھی کی۔ عون کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا عون کی اس سے شادی ہو رہی ہے۔ ہم قطعا" انجان تھے۔ بعد میں عون کا ہمارے گھر آکر ماہ رو کو ڈی گریڈ کرنا.... ماہ رو کا ہوسپٹلائزڈ ہونا۔ سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔ مجھے تب بہت غصہ آیا۔ اور پھر میں رحمان پلازہ پہنچ گئی۔ وہاں میں نے بہت تماشا لگایا۔ غصہ کیا بے عزتی کی۔ ہنگامہ کیا۔ عون پہ غصے کی شدت میں الزامات لگائے۔ اور پھر یوں ہوا کہ بھائی صاحب میری دھمکیوں پہ سرینڈر کر کے میرے ساتھ ہی ماہ رو کو دیکھنے ہسپتال پہنچ گئے۔ تب ماہ رو کی حالت دیکھ کر اور میرے رونے دھونے واویلا کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے ایک گھنٹے کا وقت مانگا۔ تنہائی میں بہت دیر سوچتے رہے۔ پھر فون کر کے سب کو اکٹھا کر لیا۔ اور یوں نکاح ہو گیا۔

بھائی صاحب نے اپنی بے عزتی' رسوائی اور ذلت کے خوف سے یہ قدم اگر اٹھایا بھی تھا۔ پھر بھی نبھا دیا۔ ہماری ماہ رو کو کبھی بھی جتایا نہیں۔ اسے دکھ نہیں دیا۔ خاندانی شرافت اور نجابت اسی کو کہتے تھے اور شاید اسی لیے سرفراز اپنی بیٹی کو مڈل فیملی میں دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہاں قدر بھی ہوتی ہے اور قدردان بھی.... بعد میں فریحہ والا معاملہ پتا چلا تو ضمیر نے خاصا اپ سیٹ رکھا تھا۔ لیکن یقین مانیے ہم انجان تھے۔ قطعی انجان .... ورنہ ایسا کبھی نہ ہوتا.... اور اب میں پچھلی ہر چیز کے لیے معذرت کرنے آئی ہوں۔ میں نے ماہ رو کے لیے اچھا کرنے کی کوشش میں اپنا ہلکا سا کردار ادا کیا تھا اور اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کی۔ غلط یا صحیح.... اس کا مجھے پتا نہیں تھا.... اور اس طرح میرے ذہن کی بھی ہر گرہ کھلتی چلی گئی تھی۔ مجھے تمہاری محبت پہ یقین بھی

تھا اور میرا ایمان بھی.... لیکن فریحہ والا گلٹ یا ابو کی طرف سے ملنے والے طعنے' ذلت ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ لوگوں کی تو مجھے کبھی پروا نہیں رہی تھی۔ جو مرضی بولتے رہیں۔

نہ میں کٹھور تھا نہ سنگ دل۔ نہ بشری تقاضوں سے مبرا۔ تمہاری محبت' التفات' میری خاطر خود کو بدلنا اور میرے گھر والوں سے گھلنا ملنا مجھے ہر چیز اپنی طرف کھینچتی تھی لیکن وہی فریحہ بیچ میں.... ایک گلٹ کی طرح.... قصہ مختصر جو کچھ بھی فریحہ نے کیا۔ تم کو ڈی گریڈ کرتی رہی۔ ٹارچر کرتی رہی.... تم پر الزامات لگائے اور مجھے بھڑکایا اور بلاوجہ اپنا انتقام پورا کرتی رہی.... کل رات اس نے سارے اعترافات کیے اور مجھ سے معافی بھی مانگی۔ لیکن میں نے اسے ببانگ دہل کہہ دیا ہے اگر ماہ رو معاف کرے گی تو میں معاف کروں گا۔ ورنہ ہرگز نہیں اور اب میں خود بھی تم سے اپنے ہر برے رویے کی معافی مانگتا ہوں۔ کیا تم مجھے معاف کرو گی؟" عون نے اس کے گھٹنوں پہ دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر منت بھرے لہجے میں کہا تو ماہ رو جو ایک ٹرانس میں اسے سن رہی تھی ایک دم چونک سی گئی تھی۔ پھر جیسے اپنے حواسوں میں آگئی۔ گو کہ دل کی حالت بہت مختلف تھی لیکن اس ستم گر کو کچھ سزا تو دینا چاہیے تھی۔ سزا تو کچھ بنتی ہی تھی۔ جتنا اس نے رلایا تھا۔ تھوڑا خود بھی تڑپتا۔

"کیا کان پکڑ لوں ماہ رو!" عون نے پھر سے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ماہ رو کی خاموشی اسے ہولا رہی تھی۔

"پکڑ لو...." بالآخر ماہ رو نے ہونٹوں کے قفل کھول ہی دیے تھے اور ساتھ دل کے بھی۔ وہ آگیا تھا۔ اتنا ہی کافی تھا۔ اس کی بدگمانیاں دور ہو گئی تھیں۔ بس یہی کافی اور ضروری تھا۔ باقی ہر بات' ہر دلیل ہر وضاحت بے معنی تھی۔ وہ نہ بھی وضاحتیں دیتا تب بھی ماہ رو کو شازمہ نے بھی ہر بات بتا دی تھی۔ ہر وہ بات جس سے ماہ رو بے خبر تھی۔ جو ہوا تھا ایسے ہی ہونا تھا۔ یوں ہی ہونا تھا۔ ایسے ہی تقدیر میں لکھا تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے سے ایسے ہی ملنا تھا۔ بیچ میں جو بھی موڑ' تلخیاں' رکاوٹیں آئی تھیں انہوں نے آنا ہی تھا۔ تو پھر وضاحتیں کیسی؟ بدگمانیاں کیسی؟ رنجشیں کیسی؟ ناراضیاں کیسی؟

اور اب وہ ماہ رو کے کان پکڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔ اور ماہ رو جیسے چیخ پڑی تھی اور اس چیخ میں بے ساختگی تھی۔

"بدھو! میرے نہیں اپنے پکڑو۔" اس نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔

"کیوں؟ میرے اور تمہارے کوئی دو ہیں.... ہماری سب چیزیں اکٹھی ہیں' سانجھی ہیں.... میرے کان تمہارے کان۔" وہ معصومیت سے بولتا جان بوجھ کر ماہ رو کو چھیڑ رہا تھا۔ ستا رہا تھا۔ کیونکہ وہ جان گیا تھا بدگمانی کے بادل چھٹ گئے تھے۔

"اب بتاؤ کرو گی معاف!" عون نے اس کے کان ذرا زور سے دبائے تھے۔ ماہ رو تکلیف سے کراہی تھی۔

"کیا زبردستی معافی لو گے؟" اس نے تنک کر پوچھا۔ اور یہ تنتناہٹ صاف مصنوعی لگتی تھی۔

"زبردستی کرنے والوں کے ساتھ زبردستی کی جاتی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے.... ماہ رو کے عین سامنے.... ایک یقین کے ساتھ۔ ایک کامل ایقان کے ساتھ۔ گویا اس کا دل کہتا تھا۔ ماہ رو اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو نہیں جھٹکے گی۔ جس طرح اس نے ماہ رو کو دھتکارا تھا وہ کبھی بھی اسے نہیں دھتکارے گی۔

"آؤ کہ پچھلے ہر غم' کرب اور بے ترتیب چیزوں کو بھلا کر نئی زندگی کا آغاز کریں۔" اس نے روشن چمکتی آنکھوں سے ماہ رو کی طرف اسی یقین کامل سے دیکھا تھا جس کی طاقت عون عباس کو بتا رہی تھی کہ جیت ہمیشہ خالص جذبوں کی ہوتی ہے اور محبت ہر صورت میں اپنا آپ منوا لیتی ہے۔

وہ محبت جو رحمان پلازہ میں ایک نگاہ بے اختیارانہ سے شروع ہوئی تھی بالآخر ہزار ڈگمگاہٹوں کے بعد کاملیت کی سرحدوں کو چھونے لگی۔ یقین کی انتہاؤں سے ہوتی ہوئی اعتماد اور اعتبار کے اونچے میناروں پہ ہمیشہ کے لیے جلوہ گر ہو گئی تھی۔ ماہ رو نے اس کی چمکتی آنکھوں کے دیوؤں کو والہی نظروں سے دیکھا اور عون عباس کے دونوں بڑھے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر اس کے ہمراہ سج سج چلتی نیچے جا رہی تھی۔ وہاں.... اس جگہ' اس نگر' اس محبتوں کی بستی میں جہاں کچھ لوگ بڑی شدت کے ساتھ ماہ رو کے منتظر تھے.... اور اس کی راہوں میں آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے۔

ماہ رو نے ایک روشن دن کو خوش آمدید کیا.... اور عون کے ہمراہ ایک ایسی راہ گزر پہ چلنے لگی تھی جس میں یقیناً" آگے بھی کچھ گنجلک موڑ بھی تھے' کچھ رکاوٹیں بھی' کچھ رنجشیں بھی۔ کچھ ناراضیاں.... کبھی کبھی کی لڑائیاں بھی۔ لیکن ان سب میں محبت اور اعتبار روشن مینار کی طرح چمکتی راہوں کو منور کرتے رہیں گے۔ تاکہ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے غبار اسے آلودہ نہ کر دیں۔

☼ ☼ ☼

اور پھر ایک خوشگوار زندگی کی شروعات نے ماہ رو سرفراز کو نہ صرف سرفراز کیا تھا بلکہ سرخرو بھی کر دیا تھا۔ رحمان منزل میں اب بھی اس کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ عون کے امی ابو سے لے کر بھابھیوں تک ہر کوئی ماہ رو کے نام کی مالا جپتا۔ کچھ وقت گزرا تو فریحہ کی امی' ابا تک نے اپنا دل صاف کر لیا۔ جب بہت سی تلخ حقیقتیں ان پر آشکار ہوئی تو وہ اپنی ہی نگاہ میں شرمندہ ہو گئے تھے۔ ان کی عقل مند ذہین بیٹی نے انہیں پشیمانی کی ہر انتہا تک پہنچایا تھا۔

سب سے بڑی بات فریحہ نے ماہ رو کے واپس آ جانے کے بعد اسی بڑے ہال میں سب کے درمیان اس سے معافی مانگ کر اعلا ظرفی کی نہیں' وسیع القلبی اور صاف دلی کا ثبوت پیش کیا تھا۔

فریحہ کی معافی نے باقی سب کے دلوں کو بھی صاف کر دیا تھا کیونکہ ماہ رو نے اعلا ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے فریحہ کو معاف کر دیا تھا۔ اور فریحہ فرقان کو اس تلخ ترین "تجربے" سے کچھ سمجھ میں آتا یا نہ آتا۔ لیکن ایک بات بہت اچھی طرح سے سمجھ آ گئی تھی۔ کہ حسن اور ذہانت کے مقابلے میں جیت نہ حسن کی ہوتی ہے نہ اعلا پائے کے ذہین' شاطر اور پچھاڑ دینے والے دماغ کی.... جیت ہمیشہ خالص اور صاف نیت کی ہوتی ہے۔ بے کھوٹ نیت اور بے کھوٹ دل کی ہوتی ہے۔ ماہ رو سرفراز کو اس کے حسن نے نہیں خالص نیت نے بامراد کیا تھا۔ اور فریحہ کو اس کے ذہین دماغ نے نہیں۔ بدنیتی نے بے مراد رکھا تھا۔

☼ ☼

www.Paksociety.com
سحرش فاطمہ
میری کہانی کا دی اینڈ
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

"یہ کیا سارا وقت تم یہ ناولز پڑھتی رہتی ہو؟ تھک نہیں جاتیں؟" میں نے بے زاری سے رومیصہ کو دیکھا جو انہماک سے ناول کے اندر گھسی ہوئی تھی۔

"اف مجھے ڈسٹرب نہ کرو، جاؤ یہاں سے پلیز! سکون سے کوئی پڑھنے بھی نہیں دیتا۔" میں جو رومیصہ کے لیے سینڈوچ بنا کر لائی تھی کہ کل ہفتہ تھا یعنی دو دن کی چھٹی تو اپنی پیاری بہن کے ساتھ خوش گوار موڈ میں گزاروں گی پر یہاں تو۔۔۔

"ادھر دو تم یہ کتاب۔۔۔" میں نے ناول چھینا۔

"تانجیہ یہ کیا حرکت ہے بھلا؟" رومیصہ نے بھنویں سکیڑ کر کہا بلکہ ذرا غصے کا انداز تھا۔

"اتنا نہ پڑھا کرو، ورنہ امتحانات میں سوال کے جواب میں تم ان ناولز ڈائجسٹوں کے خلاصے لکھ آؤ گی اور کچھ نہیں۔" میں نخرے سے کتاب کو ہاتھ میں لے کر پیچھے کیا اور سینڈوچ اس کے ہاتھ میں دیا۔

"تمہیں کیا پتا کتنا مزا آتا ہے یہ سب پڑھ کر۔۔۔ احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں کچھ اچھا باقی ہے ورنہ تو یہاں کے لوگ۔۔۔" اب وہ بھی سینڈوچ کھاتے ہوئے آرام دہ انداز میں گویا ہوئی۔

"ارے جاؤ۔۔۔ ایسا کچھ نہیں جو بھی اس میں لکھا ہوتا وہ تخیل ہوتا ہے۔ لوگ پڑھتے ہیں اور بس اسی دنیا میں رچ بس جاتے ہیں اور جب حقیقت میں اس کا الٹ ہوتا ہے نا تو دل کس قدر ٹوٹ جاتا ہے، انسان کی ذات بکھر جاتی ہے، اس کا ابھی تمہیں اندازہ نہیں۔" میں نے بڑی بی بن کر سمجھانے کا فیصلہ کرلیا۔

"تم ایسی باتیں کیوں کررہی ہوں؟ بھئی اگر کچھ غلط بھی دکھا رہے ہوتے ہیں ڈراموں میں تو کیا کچھ اچھا نہیں دکھاتے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو بس ان ناولز، کہانیوں میں بھی تو یہی ہوتا ہے، مانا کہ کچھ واقعی الگ بھی ہوتا ہے، لیکن اچھی باتیں بھی تو بتائی جاتی ہیں نا۔"

"اچھا اب بحث بند کرو، چپ چاپ سینڈوچ کھاؤ، کھانا بھی نہیں کھایا تھا تم نے۔" میں نے بڑی بہن ہو کر تحکم انداز میں کہا تو وہ بھی چپ چاپ کھانے میں مگن ہوگئی۔

☼ ☼ ☼ ☼

"اف تانجی۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا میں کالج جاؤں گی ہائے وہ بھی کو ایجوکیشن۔۔۔"

میں رومیصہ سے تین سال بڑی تھی۔ میں نے گرلز کالج سے ہی پڑھا تھا۔ اس لیے جب یونی ورسٹی جانے کا سوچا تھا تو امی ابو نے اسی کالج سے ڈگری لینے کا حکم جاری کردیا تھا لیکن وقت اتنا بھی نہیں بدلا تھا کہ میری چھوٹی بہن رومیصہ گرلز کالج کے بجائے کو ایجوکیشن میں پڑھنے جائے، خیر امی ابو کی مرضی کیا کہہ سکتے ہیں۔ "سوچو کتنا مزا آئے گا نا کالج میں۔۔۔" وہ خوشی سے جیسے پاگل ہوئے جارہی تھی۔

"روی۔۔۔ ایسے خوش ہورہی ہو جیسے بس تم ہی کالج جانے لگی ہو اس دنیا میں۔۔۔ میں بھی جاچکی ہوں، بلکہ جارہی ہوں اب بھی۔۔۔" میں اپنا یونیفارم پریس کررہی تھی۔

"ارے ہٹو کیا بات کردی تم نے۔۔۔ میں یہاں لڑکوں کے ساتھ پڑھوں گی تو شغل لگ رہا ہے گا نا۔۔۔"

"لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب ان کے ساتھ گھومنے پھرنے لگ جاؤ گی؟" مجھے اس کی بات اچھی نہیں لگی۔

"تو میں نے یہ کب کہا؟ مطلب جیسے میں نے ناولز میں پڑھا ہے نا کیسے لڑکیاں نخرے کرتیں، لڑکے بھاؤ نہیں دیتے چھپ چھپ کے دیکھتے ہیں، پیار کرنے لگ جاتے ہیں۔ جب ایسی چیزیں میں اصل میں دیکھوں گی تو مزا آئے گا ہی نا! کب تک صرف ناولز میں پڑھتی رہوں گی یا ٹی وی پر دیکھتی رہوں گی؟" رومیصہ میرے پاس آئی اور پیار سے مجھ سے چمٹ کر یہ سب بولا۔

"دور ہٹو لڑکی!" میں نے رومیصہ کو دور کیا خود سے۔۔۔

"تم وہاں پڑھنے ہی جاؤ گی سمجھیں۔ ان خرافات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"لو اسٹوریز تو یہیں کالج یونی ورسٹی' آفسز سے شروع ہوتی ہیں نا اور ہائے ہیپی اینڈ ہوتا ہے۔"
رومیصہ پھر بولی۔
"ضروری نہیں کہ ہر دفعہ ایسا ہو؟" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
"ارے تم بس منفی ہی سوچا کرو۔" یہ اس کی خود کی سوچ تھی کہ افسانوں کی باتیں ہی حقیقت میں ہوتی ہیں اور جہاں کوئی دکھی اسٹوری لگنے لگے یا کوئی بتائے تو وہ انہیں پڑھنا تو دور' اس کا تصور بھی نہیں کرتی تھی اور یہیں شاید وہ غلط تھی۔ دنیا میں جیسے اچھائی کے ساتھ برائی ہے' اچھی سوچ کے ساتھ منفی اور غلط سوچ ہے' ویسے ہی ان افسانوں میں بھی ہے' لیکن بات وہی ہے کہ لوگ پڑھتے کیا ہیں' سمجھتے کیا ہیں اور پھر عمل پیرا کس پر ہوتے؟ ایں کی خوشی مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کس بات کی تھی؟

☼ ☼ ☼

وہ دن آہی گیا تھا جب میری چھوٹی بہن کالج جانے والی تھی۔ اس کی تیاری دیکھنے کے لائق تھی۔
"ناشتا تو ڈھنگ سے کرلو لڑکی۔" ہماری والدہ ماجدہ نے رومیصہ کو جھڑکا جس نے جوس بھی آدھا گلاس پی کر رکھ دیا تھا اور ناشتا بھی آدھا کیا اور بس بار بار گھڑی کو دیکھتی جارہی تھی۔
"امی دیر نہ ہوجائے پہلے دن ہی امپریشن خراب ہوجائے گا۔" رومیصہ کی بات پر مجھے ہنسی آگئی۔
"آپ ہنس کیوں رہی ہیں ہمشیرہ صاحبہ؟" رومیصہ نے مجھے گھوری دی۔
"میری مرضی' اب کیا ہنسنا بھی آپ کی اجازت سے ہوگا؟" مجھے چھیڑنے میں مزا آرہا تھا۔
"مجھ سے تو بات ہی نہ کرو۔"
"پر میں بات تو نہیں کررہی تھی' البتہ تم نے بات کی میں تو ناشتا کررہی تھی چپ چاپ۔" اس نے پھر سے گھورا اور میں پھر سے ہنس پڑی۔
"ویسے روی! موبائل کی اجازت تو نہیں ہوگی نا کالج میں؟" یہ جانتے ہوئے کہ اجازت نہیں ہوتی لیکن رومیصہ کا بھروسا نہیں تھا' وہ لے جاسکتی تھی اور شاید نہیں' بلکہ یقیناً" اس کا یہی ارادہ تھا۔
"اجازت ہو نہ ہو میری مرضی میں تو لے کر جاؤں گی۔" رومیصہ نے زبان چڑائی۔
"ارے کیوں؟ مت لے کر جاؤ خوامخواہ وہاں مسئلہ نہ بن جائے۔" میں نے صلح دی۔
"اوہو امپریشن بہنا سمجھا کرو بھئی۔" اس نے آنکھ مارتے ہوئے بولا اور اور ہمارا وقت پورا ہوچکا تھا۔ ارے ناشتے کا' سو ہم اپنی منزل پر گامزن ہوگئے۔
"میرا کالج.... بالآخر میں بھی آگئی یہاں۔" رومیصہ کالج کے گیٹ کے اندر گئی اور خود کلامی کرنے لگی۔
"اب میں بھی ناولز کی ہیروئن کی طرح بے نیازی سے چلوں گی اور کوئی بات کرے گا تو بہت اچھے سے بات کروں گی۔" ہاتھ ملتے ہوئے جارہی تھی اور اپنی سوچوں میں گم تھی۔ تب ہی ایک لڑکے سے ٹکرا گئی۔
"اف نظر نہیں آتا کیا؟ اندھے ہو؟ کالج کیا آگئے بس لڑکی سے ٹکرانا تو لازمی ہے نا؟" رومیصہ نے پھنکارتے ہوئے کہا۔
"او ہیلو میڈم! دیکھ کر تو آپ نہیں چل رہی تھیں' نظریں آسمان کے بجائے زمین پر رکھتیں تو دکھ جاتا کہ آپ پتھر سے لڑکھڑائی تھیں اور میں غلطی سے جو آپ کے پیچھے تھا آپ سے ٹکرا گیا۔" وہ لڑکا بھی تیز تیز بولنے لگا اور رومیصہ کو چپ کرگیا۔ رومیصہ پھر سے اپنے خیالوں' افسانوں کی دنیا میں پہنچ چکی تھی جہاں ہیرو ایٹی ٹیوڈ دکھاتا ہے اور لڑکی بس دل ہار جاتی ہے۔
"ہیلو؟ کدھر گم ہوگئیں آپ؟" لڑکے نے چٹکی بجائی اور رومیصہ کو اصلی دنیا میں واپس لے آیا۔
"جی اچھا سوری...." رومیصہ نے سعادت مندی کے سارے ریکارڈ توڑ کر کہا۔
"جاؤ نا اب مجھے بھی جانا ہے کلاس ڈھونڈنے۔" وہ آگے نکل گیا اور رومیصہ اسے جاتا دیکھتی رہی لیکن پھر خیال آیا اور اپنی کلاس ڈھونڈنے کے لیے آگے بڑھ

گئی۔ جیسے تیسے کلاس میں پہنچی لیکن کلاس شروع ہوچکی تھی جس پر ٹیچر نے تھوڑا سا جھاڑا تھا اور وہ سر جھکائے کلاس میں آگئی۔ اس کی نظر اسی لڑکے پر پڑی اور حیرانی سے آنکھیں پھیل گئیں۔ "اف یہ میری ہی کلاس میں ہے اور اسی کے سامنے ٹیچر نے سنا دی۔" اسے شرمندگی محسوس ہوئی۔

"ایکسکیوزمی مس لیٹ کمر۔" سر عباد نے رومیصہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"جی... جی سر..." تھوک نگلتے ہوئے رومیصہ نے کہا۔

"ایک تو آپ لیٹ آئی ہیں۔ دوسرا آپ کا دھیان کہیں اور ہے۔ میں پہلے ہی دن پڑھانا شروع کرتا ہوں، تاکہ آپ لوگ فیملیئر ہوجائیں لیکن... خیر آپ کا نام کیا ہے۔" رومیصہ ڈر گئی تھی۔

"سوری سر..."

"واٹ؟ مس میں آپ کا نام پوچھ رہا ہوں۔" سر عباد نے ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔

"سر... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" رومیصہ نے جیسے ہی کہا، پوری کلاس ہنسنے لگی۔

"سائلنز..."

"میں آپ کا نام پوچھ رہا ہوں مس... یہاں سب سے پوچھ چکا ہوں، آپ ہی رہ گئی ہیں۔ کیا مہربانی کرکے اپنا نام بتائیں گی، تاکہ یہ مرحلے طے پائے اور پڑھائی سے سلسلہ واپس جوڑا جائے۔"

"جی... رومیصہ نام ہے۔"

"گڈ... تو اب پڑھائی پہ توجہ دیں اور سنیں جو میں بتا رہا ہوں۔" سر عباد نے پڑھانا شروع کیا۔ جیسے تیسے کلاس ختم ہوئی لیکن یہ پرائیویٹ کالج تھا، یہاں ایک ہی کلاس روم میں سب سبجیکٹس ہوتے تھے، اس لیے سب وہیں بیٹھے رہے۔ ایک ایک کرکے کلاسز ہوتی رہیں اور رومیصہ کسی نہ کسی لیکچر کے دوران ٹیچر کی ڈانٹ کھاتی۔ بریک کے دوران اس نے ساتھ بیٹھی اسٹوڈنٹ سے دوستی کرلی۔ چھٹی تک دونوں ساتھ رہیں اور دن کا اختتام ہوگیا۔ پورے دن کی روداد سنانے کو بے چین رومیصہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ وہ گھر پہنچی، چینج کیا اور بے صبری سے ناجیہ کا انتظار کرنے لگی۔ ناجیہ کے گھر آتے ہی رومیصہ نے اسے گھیر لیا۔ "ارے سانس تو لینے دو بہن کو، کوئی بھاگی تو نہیں جا رہی نا۔" امی نے ڈانٹا۔

"نہیں نا، پہلے میری بات سنے گی۔" بچوں کی طرح ضد کی۔ ناجیہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"اف ناجی... آج کا دن بڑا ہی برا گزرا۔" رومیصہ نے داستان سنانا شروع کی۔

"کیوں... کیوں کیا ہوا؟ ہونا کیا تھا؟ ہیرو کے سامنے تمہاری ہیروئن بہن کی مٹی پلید ہوگئی اور کیا۔" رومیصہ نے صبح والا قصہ گوش گزار کیا۔

"رومیصہ اب تم کالج میں آگئی ہو اور پلیز یہ ناولز کی دنیا سے باہر نکلو، خود کو ہیروئن نہ سمجھو، ویسے تمہارے اس ہیرو کا نام کیا ہے؟" ناجیہ جو اسے سمجھا رہی تھی، خود اس لڑکے کو بھی ہیرو کہہ بیٹھی۔

"یار اس کا نام عفان ہے، نام بھی کتنا اچھا ہے نا، ویسے وہ دکھنے میں بھی برا نہیں۔" رومیصہ نے ٹھنڈی آہیں بھری۔

"بس... بس... ہیروئن صاحبہ اب آپ رومیصہ بن جائیں اور جاکر آرام کریں، مجھے بھی کرنے دیں۔"

رومیصہ کی سوچ جیسی تھی، وہ اسی میں جی رہی تھی حقیقت سے دور... جو کالج لائف اس نے پڑھی یا دیکھی تھی اسی کو ذہن نشین کرلیا تھا لیکن ہر دن کچھ نہ کچھ الٹ ہوجاتا جس کی وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ عفان، رومیصہ کو دیکھتا ضرور تھا لیکن دل ہی دل میں ہنستا تھا، اس کی بے وقوفیوں پر اور دوسری طرف رومیصہ منتظر تھی کہ بس اس سے بات کرلے یا دوستی ہوجائے لیکن ایسا ہو ہی نہیں پاتا تھا۔ دن گزرتے جارہے تھے۔ رومیصہ بھی پڑھائی کو لے کر سیریس ہوگئی تھی۔ سلام دعا سب سے تھی لیکن دوستی اس کی نمرہ سے ہی رہی، پہلے دن سے... ایک دن لائبریری میں بک ایشو کرواتے ہوئے اس کی نظر اکیلے بیٹھے عفان پر گئی۔ اس کا دل چاہا، وہ اس کے پاس جائے

"بیٹھے باتیں کرے۔ بک لے کر وہ جانے ہی لگی تھی باہر' لیکن دل نے آڑھے ہاتھ لیا اور قدم خود بخود عفان کی جانب بڑھنے لگے' وہ اس کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھنا ہے؟" عفان نے اسے دیکھا اور پوچھا۔

رومیصہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بیٹھو نا! اس چیئر پر بیٹھنا ممنوع نہیں ہے۔" عفان کا لیے دیے والا انداز تھا۔

"بدتمیز۔۔۔ بندہ پیار سے بھی تو کہہ سکتا تھا نا۔" رومیصہ نے دل میں سوچا۔ آخر کو ناول جیسا ہیرو سمجھی تھی عفان کو۔

"کیا پڑھ رہے ہو؟"

"دکھ نہیں رہا؟"

"میرا مطلب کچھ خاص ہے؟"

"تم کیا یہاں باتیں کرنے آئی ہو؟" عفان نے بے زار ہو کر پوچھا۔

"نہیں میں تو تمہارے لیے آئی ہوں۔" رومیصہ نے ایک دم کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔" عفان کی حیرت بجا تھی۔

"میرا مطلب تمہیں دیکھ کر یہاں آگئی تھی۔ سوچا تھوڑی دیر باتیں بھی ہو جائیں گی پڑھنے کے ساتھ ساتھ۔۔۔" رومیصہ کی سمجھ میں نہ آئے کہ کہے کیا۔

"اچھا۔۔۔ مجھ سے باتیں کرنے آئی ہو وہ بھی لائبریری میں؟ اس سے اچھا ہم کینٹین میں مل لیتے۔" عفان نے جس انداز میں کہا رومیصہ کو لگا وہ سنجیدہ ہے۔

"کیا واقعی۔۔۔؟"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ میں تم سے باتیں کروں گا؟ تم سے تو دوستی بھی نا رکھوں ہونہہ۔۔۔" عفان یہ کہہ کر اٹھا اور چلا گیا باہر۔

"کوئی بات نہیں رومی ڈیئر۔۔۔ ناول کے ہیرو بھی تو ایسے ہوتے ہیں' پسند کرتے ہیں لیکن جتاتے نہیں نا' انا کا مسئلہ ٹائپ۔۔۔" رومیصہ نے خود کو تسلی دی۔ وہ ہر اس جگہ موجود ہوتی جہاں عفان ہوتا اور عفان چڑ جاتا تھا۔

ناجیہ یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید رومیصہ کا بھوت اتر گیا ہے تب ہی وہ چپ چپ رہتی ہے اور بس بکس میں گھسی رہتی ہے لیکن رومیصہ' عفان کے خیالوں میں گم رہتی۔

☼ ☼ ☼

ان کے امتحانات شروع ہو گئے تھے اور مقابلہ تھا' چونکہ سب اچھے اسکولز سے آئے تھے تو اپنی سابقہ پوزیشنز برقرار رکھنے کے لیے جی توڑ محنت میں سب مشغول تھے۔

"میری ناولز کی ہیروئنیں تو ہر فن مولا ہوتی ہیں' پڑھائی میں ایسی ہوتی ہیں کہ ہیرو کو بھی مات دے دے اور یہاں میں ہوں۔ میرا ہیرو اف۔۔۔ ویسے ناولز کے ہیرو بھی اچھے پڑھے لکھے تو ہوتے ہی ہیں' پر میرا کیا ہو گا۔" رومیصہ پین ماتھے پر ٹکائے اپنی ہی دنیا میں گم تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرح' موقع ملے اور وہ عفان سے بات کرے۔ اسی سوچ میں اسے ایک ترکیب مل ہی گئی' کھانے کی نہیں ہیرو سے ملاقاتوں کی۔

"ہیلو عفان۔۔۔" اگلے دن بریک میں وہ عفان کی ڈیسک کی طرف آئی۔

"جی میڈم کہیے۔" عفان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ رومیصہ تو اس کے مسکرانے پر ہی کھو گئی۔

"او ہیلو میڈم! یہ کیا آپ کی بیماری ہے' بات کرنے کے بعد کھو جانا؟" عفان نے صبر کے دو گھونٹ پیے اور کہا۔

"سوری۔۔۔ وہ مجھے تم سے کام تھا ایک۔" رومیصہ نے نظریں چرائیں۔

"کیا کام تھا؟"

"مجھے یہ ٹاپک سمجھ نہیں آرہا۔" رومیصہ نے بک آگے کی۔

"تمہارا دھیان کلاس میں ہوتا ہی نہیں ہے تو سمجھ

کیسے آئے گا؟ اسکول میں بھی ایسی ہی تھیں کیا؟" عفان نے تمسخر بھرے انداز میں پوچھا' جس پر رومیصہ فقط مسکرادی۔

"ویسے اگر تم مجھے بریک میں ہی کچھ اہم ٹاپکس سمجھادو تو...."

"کیوں؟ میں نے کیا یہ جاب شروع کردی ہے کہ میڈم رومیصہ کو روز وقت دوں اور پڑھاؤں؟"

"عفان دل میں تو تمہارے لڈو پھوٹ رہے ہوں گے لیکن بس یہ تمہارا ایٹی ٹیوڈ ہے۔" رومیصہ نے دل میں سوچا۔

"پلیز یار... اب دوست کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتے تم؟"

"دوست... اچھا واقعی... چلو مان جاتا ہوں لیکن رزلٹ اچھا نہ آیا تو دوستی ختم... ڈن؟" رومیصہ نے ناولز کی طرح ٹیوشن والی ٹرک آزمائی تھی' جس پر عفان راضی بھی ہوگیا تھا۔ رومیصہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اب روز بریک میں پڑھائی بھی ہوتی نوک جھونک بھی ہوتی۔ عفان بھی رومیصہ سے اب اچھی طریقے سے بات کرتا تھا۔ کبھی کبھی روڈ ہوجاتا تھا لیکن رومیصہ پھر بھی نارمل رہتی۔ امتحانات کی وجہ سے بات چیت کم ہورہی تھی لیکن ایک دوسرے کو موبائل نمبر دے رکھا تھا' جس کی وجہ سے گھر جاتے ہی فون کالز میسجز ہونے لگتے اور وجہ پڑھائی ہی ہوتی تھی لیکن ناجیہ کو یہ بات بھی اچھی نہیں لگی۔

"رومی... یہ سب کیا ہے میری جان؟" ناجیہ نے بس سوال کیا۔

"کیا سب؟" رومیصہ نے ناسمجھی میں پوچھا۔

"تم سارا وقت موبائل پر لگی رہتی ہو اور جب پوچھوں تو وہ لڑکا ہوتا ہے۔" ناجیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"وہ لڑکا نہیں عفان ہے' ہم پڑھائی کرتے ہیں فون پر۔" رومیصہ نے کلیئر کرنا چاہا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے پڑھائی کا؟" ناجیہ نے پوچھا۔

"یار ناجی تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ اب سن لو' میں عفان کو پسند کرتی ہوں' اس لیے میں اس سے بات کرتی ہوں پڑھائی کے بہانے ہی سہی... ہاں میں یہ کرتی ہوں۔ اب بولو کیا کرلوگی؟"

"تمہیں یہ لگ رہا ہے کہ تم کوئی واقعی ناول کی ہیروئن ہو اور یہ سب کرکے تم مجھے جتانا کیا چاہتی ہو کہ تم صحیح ہو میں غلط؟ مت بھولو میں تمہاری بڑی بہن ہوں' تم سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتی ہوں۔" ناجیہ نے سمجھانا چاہا۔

"تمہیں ناولز سے چڑ ہے' ڈراموں سے بھی منفی نقطے ہی نکال لاتی ہو' تم ان سب کی وجہ سے منفی سوچ رکھنے لگی ہو اور کچھ نہیں۔" رومیصہ نے بھی دوبدو جواب دیا۔

"تمہیں اندازہ ہے' تم نے جو ابھی بات کی ہے وہ کہا کیا ہے؟" ناجیہ نے وہی بات شروع کی۔

"ہاں... میں نے اپنے پورے ہوش و حواس میں رہ کر یہ بات کی ہے اور عفان بھی مجھ سے پیار کرتا ہے' بس وہ جتاتا نہیں' لڑکا ہے نا کیسے کہے گا۔ اسے شاید یہ لگے کہ میں نہ برا مان جاؤں۔" رومیصہ خیالی پلاؤ بنانے میں اتنی آگے نکل چکی تھی۔ ناجیہ نے رومیصہ کو سمجھانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کیا سمجھاتی اور کتنا سمجھاتی۔ بقول رومیصہ کے ناجیہ تو رکھتی ہی منفی سوچ ہے۔

دن و ماہ گزرتے جارہے تھے۔ عفان کی رومیصہ سے بہت اچھی بلکہ گہری دوستی ہوگئی تھی' دونوں ہمہ وقت ساتھ پائے جاتے تھے۔ پورے کالج میں اس بات کا چرچا تھا لیکن دونوں کو اس بات کی فکر نہیں تھی۔ رومیصہ خود پر رشک کرنے لگی تھی کہ عفان اس کے ساتھ ہے' وہ بھی اس سے پیار کرتا ہے لیکن جتاتا نہیں تو دوسری طرف عفان کے دل میں کیا ہے یہ بات رومیصہ جانتی ہی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"عفان ایک سال گزر گیا۔ ہم کتنے نزدیک آگئے نا ایک دوسرے کے۔ کہاں تو ایک دوسرے سے بات

بھی نہیں کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہے ہماری پہلی ملاقات؟" رومیصہ نے کینٹین میں کافی پیتے ہوئے یاد دلانا چاہا۔

"ہاں یاد ہے۔" عفان زیر لب مسکرایا۔

"عفان تمہاری مسکراہٹ بہت دل لبھاتی ہے میرا۔" رومیصہ نے ایک دم اسے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" عفان نے ہاتھ ہٹایا۔

"ایسا کیا ہو گیا؟ صرف ہاتھ ہی تو رکھا تھا اور اچھا میں جانتی ہوں۔ ابھی تک میں نے اظہار نہیں کیا اور تم نے بھی نہیں کیا نا؟ اسی لیے تمہیں یہ عجیب لگا نا۔"

رومیصہ اپنی رو میں جو دل چاہ رہا ہے بولے جا رہی تھی۔

"تم ہوش میں تو ہو' کیا بول رہی ہو؟" عفان وہاں سے اٹھ کر جانے لگا۔

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا عفان؟" رومیصہ ہچکچائی۔ "کس بات کا اظہار؟ ذرا سنانا پسند کرو گی تم؟" عفان نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

"بیٹھ جاؤ۔۔۔ آرام سے بات کرتے ہیں نا۔" رومیصہ کو کینٹین میں یہ سب عجیب لگ رہا تھا اب۔

"کیوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کچھ نہیں ہوا اور اب کہہ رہی ہو بیٹھ جاؤ۔" عفان نے ابرو اچکاتے ہوئے کہا۔

"عفان کیا ہو گیا ہے؟ اچھا ناراض نہ ہو' میں کہہ دیتی ہوں' میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں۔ بس اب خوش؟" رومیصہ نے ایک ہی سانس میں آنکھیں بند کر کے کہا۔

"واٹ؟ آر یو آؤٹ آف یور مائنڈ (کیا تمہارا دماغ خراب ہے؟) یہ کیا بولے جا رہی ہو؟ پیار؟" عفان تقریباً" چیخا تھا۔

"عفان آرام سے بولو' سب بیٹھے ہیں یہاں۔" رومیصہ نے کینٹین پر نظر دوڑائی۔

"مس رومیصہ۔۔۔ پہلی بات تو یہ میں جو تمہارے ساتھ ہوں نا وہ صرف اس لیے تھا کہ تم کچھ سدھر جاؤ' پڑھائی کی طرف آجاؤ' نہ جانے تمہارے دماغ میں کیا فتور بھرا ہوا ہے' میں تو تم سے ہمدردی کرنے چلا تھا

لیکن تم تو اسے پتا نہیں کیا سمجھنے لگ گئیں۔" عفان کمر پہ ہاتھ رکھے اسے سنائے جارہا تھا۔

"یہ کوئی فلم نہیں چل رہی' نہ کوئی یہ ڈراما کہ لڑکا لڑکی کالج میں ملے' دوستی ہوئی اور پیار ہوگیا۔ ہماری عمر ہے کیا یہ سب کچھ کرنے کی؟" عفان بہرحال کہہ تو صحیح رہا تھا لیکن جس انداز میں کہہ رہا تھا' وہ رومیصہ کا دل دکھا رہا تھا۔

"ہمدردی؟" رومیصہ نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"ہاں اور کیا؟ یہ سب میں ہمدردی میں کررہا تھا کہ کہیں تمہیں ایسا نہ لگے کہ تم کم تر ہو' لوگ تم سے دوستی نہیں کرتے' کوئی بات نہیں کرتا تو چلو اب بندی خود آکر اتنا کہہ رہی ہے تو بات کرنے میں دوستی کرنے میں حرج نہیں' پر تم تو....."

عفان اسے حقیقت سے روشناس کروا رہا تھا۔ جس بات کو وہ اچھے انداز میں پڑھتی یا دیکھتی یا اپنے خیالات میں جمع کرتی آئی تھی۔ اس کا منفی پہلو جس سے وہ نفرت کرتی تھی' نہ سمجھنا چاہتی تھی' آج وہی پہلو عفان اسے بتا رہا تھا۔ ناجیہ بھی اسے یہی سمجھانا چاہتی تھی۔ اس وقت کینٹین میں ان دو کے علاوہ بھی کافی لوگ تھے۔ اسے برا لگ رہا تھا' نہیں برا کیوں لگے گا؟ عفان نے ہتک آمیز انداز میں جو کچھ کہا سب کے سامنے اس کا مذاق سا بن گیا تھا۔ سب اسے دیکھ رہے تھے اور وہ ابھی بھی اپنے کسی ناول کی کہانی کو سوچ رہی تھی کہ ایسا بھی ہوا تھا کیا کہیں؟

جو بھی تھا عفان اسے پسند بھی نہیں کرتا یہ تو اس نے جتا دیا تھا لیکن اب..... اب رومیصہ؟ اس کا دل؟ اس کے ناول؟ اس کے افسانوی دنیا' وہاں کے لوگ' وہاں کی محبت' وہاں کے ہیرو' سب کچھ اسے برا لگ رہا تھا۔ وہ کس حال میں گھر پہنچی' وہ ہی جانتی تھی۔ مرجھایا سا چہرہ جب ناجیہ کے سامنے آیا تب اس نے یہی کہا۔

"میری جان..... میں نے تمہیں سمجھایا تھا' کہا بھی تھا۔ یہ سب چھوڑ دو' ان میں کچھ نہیں رکھا۔ تم بے شک یہ سب پڑھو' انہیں سمجھو' ان میں سبق موجود ہوتا' وہ سمجھو' کہیں کہیں حقیقت بھی موجود ہوتی ہے تو ساتھ میں تلخیاں بھی ہوتی ہیں' ہمیشہ تو خوش آئند اختتام تو نہیں ہوگا نا؟ کہانیاں پڑھو تو ان کو دماغ میں بٹھانے کے بجائے ان میں سے اچھی باتیں سیکھو اور بری باتوں کو ایسے دماغ میں رکھو کہ جیسے اپنے آپ کو بچانا ہو۔ کوئی بھی چیز بری نہیں ہوتی لیکن اس کام کا کرنا اس کا طریقہ کار اس کا رزلٹ برا ہو بھی جائے تو بھی سبق ملتا ہے۔ تم ابھی چھوٹی ہو ان چیزوں کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دو۔ اب جو ہونا تھا ہوگیا' بہتر ہے خود کو بدل لو۔"

ناجیہ کی بات رومیصہ سمجھی یا نہ سمجھی لیکن دل دکھنے پر کون نصیحتوں کو سمجھنا چاہتا ہے؟ وہ واقعی بدل گئی تھی۔ اس نے پڑھنا تو نہیں چھوڑا افسانوں کو' نہ اس دنیا سے ناطہ توڑا' البتہ اب ہر چیز پڑھنے لگی تھی اور محسوس بھی کرسکتی تھی۔ اس نے جو بھی کیا نادانی میں کیا اور اب خود کو بردبار کرنے کے لیے ان ہی کہانیوں سے وہ سبق لیتی ہے۔

☆ ☆ ☆

پیاری سی لڑکی تھی
کچھ پگلی سی تھی
خوابوں میں' خیالوں میں
اکثر کھوئی رہتی تھی
کوئی مدبر سا' کوئی اپنا سا
سعی کرتا نصیحت تھوڑی جو
سنبھلنے سا
جو جھٹک جاتی تھی
لڑ جاتی تھی
ہر بات پہ.....
خفا ہوجاتی تھی
پگلی جو تھی
آخر سنبھلی جو
ٹھوکر' رسوائی کے سبب
عقل پھر جو آگئی تھی۔

☆ ☆

دیا شیرازی

ناولٹ

جون کی تپتی دوپہر میں وہ بڑا سا دوپٹا لیے گلی میں داخل ہوئی۔ ساری گلی سنسان پڑی تھی انسان تو کیا کوئی حیوان چرند پرند کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اب کوثر پچھتا رہی تھی اسے گھر سے اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ اپنے پیچھے قدموں کی آواز سن کر اس نے پلٹ کے دیکھا۔ ایک مجنوں سا شخص گلی کے نکڑ پہ کھڑا اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ اس کے لمبے اور الجھے بالوں میں جگہ جگہ تنکے اڑسے ہوئے تھے۔ اس کا پورا لباس مٹی اور کیچڑ سے لت پت تھا۔ چہرے پر مٹی کی تہ جمی تھی۔ اس جلتی دوپہر میں بھی وہ ننگے پاؤں بڑی بے نیازی سے کھڑا تھا۔ کوثر کو اسے دیکھ کر خوف محسوس ہوا۔ اس نے اپنی چادر ٹھیک کی اور تیز، تیز قدموں سے چلنے لگی۔

اسے جاتا دیکھ کر وہ پاگل آدمی بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ ڈر کے مارے کوثر کو اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ اسے پیچھے آتا دیکھ کر کوثر نے دوڑ لگا دی۔ اسے بھاگتا دیکھ کر وہ آدمی بھی سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔ کوثر نے ایک لمحے کو مڑ کر اپنے اور اس آدمی کے درمیان فاصلہ دیکھنا چاہا اور اسی لمحے وہ کسی چیز میں پاؤں اٹکنے سے زور سے منہ کے بل گری تھی۔ فرش سے نکلا اینٹ کا کونا اس کی پیشانی میں لگا تھا اور وہاں سے خون بہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کے اٹھتی، وہ آدمی روشن روشن پکارتا اس کے سر پہ پہنچ گیا تھا۔ کوثر کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ اس آدمی نے اسے اٹھانا چاہا۔ کوثر ڈر کے پیچھے ہٹی۔

"روشن.... روشن.... میں مٹھو۔ تمہارا مٹھو۔"

وہ شخص ہاتھ سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے، بچوں کی طرح بولا۔ کوثر کو اپنی حالت پہ رونا آنے لگا۔

"رونا نہیں.... رونا نہیں میں سب کو بتا دوں گا روشن اچھی ہے مٹھو گندا...." تھو، تھو وہ زمین پہ تھوکنے لگا کوثر کو اس کی لایعنی باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔ اس کا ڈر کچھ کم ہوا تھا اس نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور ماتھے سے بہتا خون صاف کرنے لگی۔ اس پاگل کی نظر اب خون پہ پڑی تھی۔ اس پر گویا وحشت طاری ہو گئی۔

"خون.... خون" وہ زور، زور سے چلانے لگا۔ "روشن خون.... مٹھو گندا۔" وہ پھر سے بے ربط الفاظ بول رہا تھا۔ کوثر کو وہ اب کافی بے ضرر سا لگا۔ ایک افسوس بھری نظر ڈال کے وہ گلی میں مڑ گئی۔ "بے چارہ پاگل" اس نے زیر لب کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

باہر زور کی بارش برس رہی تھی۔ موسم کئی دن سے برہم تھا۔ شام ڈھلتے ہی آسمان کے تیور بدل سے جاتے، ساری رات چھما چھم بارش برستی رہتی۔ ایسے میں نجانے کیوں دل خوامخواہ اداس ہو جاتا وجہ سمجھ میں نا آتی۔ انسان بھی موسم کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ مدھر ہوا چلے تو دل خود بخود جھومنے لگتا ہے۔ آم کے پیڑ میں جھولا ڈالنے کو مچلنے لگتا ہے اور اگر بارش برسے تو بچھڑے ہوں کی یاد میں ہم بھی رو پڑتے ہیں۔ بھولے بسرے غم یاد آنے لگتے ہیں۔ بارش مسلسل کھڑکی پر دستک دے رہی تھی۔ روشن نے اٹھ کے کھڑکی کھول

دی۔ بارش کی بوندیں جواب تک کھڑکی سے سر پٹخ رہی تھیں راستے کھلنے پر اندر چلی آئیں۔ جیسے بجلی کی کڑک سے سہم کر جائے پناہ ڈھونڈ رہی ہوں۔ تیز ہوا کے ساتھ آتی بارش کے پانی کی بوچھاڑ نے روشن کو سرتاپا بھگو دیا تھا۔ لیکن وہ وہاں تھی کہاں۔

لکڑی کے قدیم پلنگ پہ چادریں یوں پھڑپھڑانے لگی جیسے کوئی ننھا پرندہ قفس سے نکلنے کو بے تاب ہو۔ کونے میں رکھی میز پہ شمع تھوڑی دیر پھڑپھڑائی اور گل ہو گئی۔

کمرے میں ایک دم سے اندھیرا عود آیا۔ بجلی چمکتی تو چند لمحوں کے لیے منظر واضح ہو جاتا پھر اندھیرا چھا جاتا۔ اناں ساتھ والے کمرے سے نکل کر کچن سے دیا سلائی لینے گئیں۔ سرتاپا سفید لباس میں ملبوس سفید دودھیا بال۔ کسی بھٹکی روح کی طرح ایک لمحے کو نظر آئیں پھر غائب ہو گئیں۔ دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ لیکن بارش کے شور میں کچھ سنائی نا دیا۔ اب کی بار دروازہ باقاعدہ دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ روشن خیالوں سے

باہر آئی کھڑکی سے باہر کا دروازہ صاف نظر آتا تھا۔

"اس وقت کون آگیا۔" اناجی بڑبڑاتی ہوئی اٹھیں۔ بارش کے پانی سے غرارے کو بچاتی سنبھلتی باہر دروازے کی جانب آئیں۔

"کون ہے۔" اناجی کی آواز میں سوال کم غصہ زیادہ تھا۔ باہر مکمل خاموشی چھائی رہی شاید ان کی نحیف آواز باہر تک نہیں پہنچی تھی۔ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ باہر کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ پتھر کی بن گئی تھیں۔ بجلی ایک لمحے کو چمکی تھی۔ بس ایک لمحے کو روشن کو اس کا چہرہ نظر آیا تھا۔ بارش میں بھیگے کھڑے اس شخص کو وہ ہجوم میں بھی پہچان لیتی اس کا پورا وجود آندھیوں کی زد میں آگیا تھا۔ بیس سال سے اس کے وجود پر جمی برف ایک لمحے میں پگھل گئی تھی۔ پتھر کی مورت میں حرکت ہوئی تھی۔ اپنی چیخوں کو دونوں ہاتھ سے روکتی روشن نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بیس سال جوانی کے کھلتے نوخیز جذبوں کو اس نے کیسے حالات کی برف کی سل تلے دبایا تھا وہ جانتی تھی۔ اپنی طرف اٹھتی تمسخر بھری نگاہوں نے کیسے کیسے سینہ چھلنی کیا تھا یہ بھی صرف وہ ہی جانتی تھی۔ تماشا دیکھنا بہت دلچسپ کھیل ہے۔ تماشا بننا کیا ہوتا ہے یہ بھی صرف وہ ہی جانتی تھی۔ بیس سال پہلے ابا کے کیے گئے ایک فیصلے نے اس کی پوری زندگی جھلسا کے رکھ دی تھی۔

یہ روشن وہ روشن کہاں رہی تھی جس کی شرارتوں سے پورا گھر محظوظ ہوتا تھا۔ جس کے لبوں پر ہنسی کے فوارے پھوٹتے تھے۔ جو سارا دن گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکراتی رہتی تھی کبھی اس دیوار سے لگی کھڑی ہے تو کبھی اس منڈیر سے لٹکی ہوئی ہے۔ ٹک کے بیٹھنا اسے آتا نہیں تھا۔ آس پاس کی لڑکیوں کو کٹھا کیے سارا دن پچھلے صحن میں آم کے پیڑوں پہ پڑے جھولے جھولتی۔ گھر گھر کھیلتی۔

روشن تو کہیں کھو گئی تھی۔ ابھی تو وہ گڑیوں سے کھیلنا چھوڑ کے اماں سے کھانے کی چھوٹی موٹی چیزیں بنانا سیکھ رہی تھی۔ جانے ابا کے من میں کیا آئی کہ اس کو اسفندیار سے نکاح کی ڈوری میں باندھ دیا۔

اسفندیار ان کا اکلوتا بھتیجا تھا۔ ان کے مرحوم بھائی کی نشانی ابھی پچھلے مہینے تو اس چودھواں سال لگا تھا۔ ایسی بھی کیا جلدی رو' رو کے روشن نے آنکھیں سجالیں۔ اسفندیار اس سے آٹھ سال بڑا تھا سمجھ دار تھا۔ روشن بھی ایک دو سال میں سمجھ دار ہو جائے گی ویسے بھی ہم کون سا ابھی رخصتی کر رہے ہیں۔ ابا کی منطق ہی نرالی تھی۔ اسفندیار کو وہ اب بھی بھائی جان ہی کہتی تھی۔ اس کی سکھیاں کھی کھی کرنے لگتیں۔

"مشنو اب وہ تمہارا بھائی جان نہیں ہے اسے بھائی مت بلایا کرو نکاح ٹوٹ جائے گا۔"

"بھائی نا بلاؤں تو.... باقی جان۔" وہ لب بھینچ گئی شرم سے گال سرخ ہو گئے۔

ساری دوستیں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگتیں۔

اسفندیار نے آگے بڑھ کے ساکت کھڑی اناجی کے پاؤں چھوئے وہ ہل بھی نا پائیں۔ ان کے سامنے ان کی بیٹی کا مجرم جھکا ہوا تھا۔ ماں اپنے تو سات خون بھی معاف کر سکتی ہے لیکن اپنی اولاد کے قاتل کو کیسے بخش سکتی ہے اور اسفندیار نے تو روشن کو جیتے جی مار ڈالا تھا۔

"رو.... شن.... ہے گھر پہ" کتنے سالوں بعد اس نے لبوں سے روشن کا نام لیا تھا۔ وہ اسے بھولا نہیں تھا۔ بھول ہی تو نہیں پایا تھا۔ اسے بھلانے کے لیے وہ کئی برس دربدر رہا تھا۔ اس ایک نام سے پیچھا چھڑانے کے لیے لیکن وہ ناکام رہا۔ دو کو صفر سے ضرب دو تو نتیجہ صفر ہی آتا ہے۔ چار کو صفر سے ضرب دو تو نتیجہ پھر صفر ہی آئے گا۔ وہ بھی تمام عرصہ مختلف چیزوں کو صفر سے ضرب دیتا رہا تھا۔ شادی بچے 'گھر' نوکری' ضرب روشن اور نتیجہ اس کے سامنے تھا۔ روشن کو وہ اپنے دماغ سے نکال نہیں پایا تھا۔ آخر کار وہ تھک گیا اس نے جوڑ توڑ بند کر دی۔ اس کی امریکن بیوی نے طلاق

لے لی تھی، بچے اس کے ساتھ ہی چلے گئے تھے اور اسفندیار جہاں سے چلا تھا۔ وہیں آکھڑا ہوا۔

وہ ست رنگی چنری کا آنچل لیے گھر کے پچھلے صحن میں دوستوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ سفید دودھیا پاؤں تیزی سے گول گول دائروں میں اٹھ رہے تھے۔ پائل کی چھن چھن بارش کی بوندوں کے شور سے مل کے الوہی گیت سنا رہی تھی۔ الہڑ لڑکیوں کی ہنسی کی جھنکار پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ نمو اور وہ بارش میں بھیگتیں دونوں بازو، پھیلائے آسمان کی اور دیکھ رہی تھیں۔ بارش میں اس کا لباس بھیگا ہوا تھا۔ سفید رنگت پر گہرے سبز رنگ کا لباس آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ بارش کی بوندیں مسلسل اس کا چہرہ بھگو رہی تھیں۔ روشن آنکھیں بند کیے مسکرا رہی تھی۔ نمو تھک کے آم کے پیڑ کے نیچے بنی بینچ پر باقی سب لڑکیوں کے ساتھ جاکر بیٹھ گئی۔ وہ اپنا دامن نچوڑ رہی تھی جو بارش کے پانی سے بھیگا ہوا تھا۔

"روشن اب آجاؤ بیمار پڑ جاؤ گی۔" اناں بی نے باورچی خانے کی کھڑکی سے پچھلے صحن میں جھانک کر آواز لگائی۔ بیچ میں لگے آم اور جامن کے پیڑوں کی وجہ سے لڑکیاں ان کی آنکھوں سے اوجھل تھیں۔

"آرہے ہیں اماں بس تھوڑی دیر میں۔" روشن نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ اسے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا تھا۔ گلابی چہرہ دھل کے اور نکھر گیا تھا۔ کالے لہرداربالوں سے کسی جھرنے کی طرح پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کی پائل کھل گئی تھی روشن جھک کر اسے دوبارہ بند کرنے لگی۔

مٹھو گرم گرم پکوڑوں کے شاپر لیے دوڑتا ہوا صحن میں آیا تھا۔ روشن کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ مکمل چاند حسن آج حسن کی دیوی بھی اسے دیکھ کے شرما گئی تھی۔ وہ تو پھر انسان تھا۔ مٹھو پتھر کا بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔

ایک ساتھ کھیلتے کودتے وہ سب بڑے ہوئے تھے۔ اس نے کبھی روشن کو آنکھ بھر کے نہیں دیکھا تھا ان میں لڑکا لڑکی کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ وہ چھ لڑکیاں تھی اور مٹھو ان کی ساتویں سہیلی۔ وہ نمو سے ایک سال چھوٹا تھا اور کسی سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کے سارے کام مٹھو کے سر ہوتے۔ چھپ چھپ کے املی منگوائی جاتی، کیریاں توڑ کے وہ ان کے ساتھ چٹخارے لے لے کے کیریاں کھاتا۔ اناں بی دیکھ لیتیں تو ضرور جھاڑ پلاتیں۔

"وہ تو لڑکیاں ہیں مٹھو تیری کیوں مت ماری گئی ہے۔ اتنی کھٹی چیزیں نا کھا لڑکی بن جائے گا تو بھی کسی دن۔" اناں بی کی اس منطق پر وہ کھی کھی کرنے لگتیں۔ مٹھو کے کان پہ جوں بھی نا رینگتی۔ وہ لڑکا تھا لیکن کبھی کسی کو یہ بات محسوس ہی نہیں ہوئی۔ مٹھو ان کے ہر راز میں شریک تھا۔ نمو کے ساتھ مٹھو کا آنا لازمی تھا نا آتا تو محفل پھیکی پھیکی سی لگتی، اسے باقاعدہ بلایا جاتا۔ وہ پورے محلے کی رپورٹ فٹافٹ سناتا۔ کس کے گھر میں کیا ہوا۔ محلے بھر کی ساس بہوؤں کی چیخ چیخ اسے خوب معلوم تھی۔ شاداں کے سر پر گومڑ کیسا ہے اور رشید کی بیوی نے اسے سرراہ کیوں سوٹیوں سے پیٹ ڈالا۔ مٹھو کو معلوم تھا اور اس کی رپورٹنگ کی وجہ سے ان کے پورے گروپ کو گھر بیٹھے بٹھائے محلے بھر کی داستان سننے کو مل جاتی تھی۔ تیز تیز جھولا جھولتی صفیہ نے حیرت سے بت بنے مٹھو کو دیکھا۔

"مٹھو سارے پکوڑے بھیگ گئے۔ جم کیوں گئے ہو۔" صفیہ نے جھولا روک کر آواز دی بت بنا مٹھو ہڑبڑا کر ہوش میں آیا۔ روشن نے اٹھ کر مٹھو کے ہاتھ سے پکوڑے لیے اس کے ہاتھوں کی لرزش کو نہیں دیکھا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ کون توجہ دے۔ روشن نے شاپر کھول کر دیکھا اور مایوس ہو گئی۔

"جلیبی نہیں لائے۔" روشن کو بارش کے موسم میں جلیبی کھانا پسند تھا جب کہ نمو اور باقی لڑکیاں پکوڑے شوق سے کھاتی تھیں۔ مٹھو اسے بتا نا سکا کہ جلیبیاں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ اسی پیر پر لوٹ گیا نکڑ والے کے پاس جلیبیاں ختم تھیں وہ پیدل بازار چلا گیا۔ اپنے پیسوں سے پاؤ بھر جلیبیاں خریدیں اور بھاگتا ہوا واپس آیا تھا۔ اس نے لاکر جلیبیاں روشن کو پکڑائیں۔

روشن خوش ہو گئی۔ مٹھو ہواؤں میں اڑنے لگا۔ روشن کو معلوم نا ہو سکا مٹھو بدل گیا تھا۔ وہ ان کی سہیلی نہیں رہا تھا۔ مٹھو لڑکا بن گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چار دن سے مٹھو بخار میں پھنک رہا تھا۔ سب کا خیال تھا بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے بخار ہو گیا تھا، سردی لگ گئی تھی شاید۔ ان کی محفل میں مٹھو کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ مٹھو نہیں تھا تو ساری محفل پھیکی پھیکی سی لگتی۔ دو تین دن انتظار کے بعد آخر روشن اس کے سر پر جا کھڑی ہوئی مٹھو سوتا بن گیا۔ وہ روشن کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا اپنے بدلتے احساسات سے وہ خود ہی گھبرایا ہوا تھا۔ بخار تو ایک بہانہ بن گیا تھا۔ اگر روشن کو پتا چلا کہ میں اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں وہ تو میری شکل بھی نہیں دیکھے گی۔ اپنی سوچوں پہ وہ خود شرمندہ تھا۔

"کیا ہے مٹھو اتنے دن سے بخار کا بہانا کیے پڑے ہو۔ ہم سب بور ہو رہے ہیں تمہارے بغیر، خدا کا واسطہ ہے اب اٹھ جاؤ۔" روشن نے اس کے چہرے سے کمبل ہٹایا۔ وہ آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ روشن نے اس کی پیشانی پہ چھو کر بخار دیکھنا چاہا۔ مٹھو کو لگا کسی نے گرم گرم انگارا اس کی پیشانی پہ رکھ دیا ہو۔

"کوئی بخار وخار نہیں ہے ناٹک کر رہا ہے سالا کام سے جان چھڑانے کے بہانے ہیں سارے۔" روشن نے خفگی سے نمو کو اطلاع دی نمو نے بھی روشن کی دیکھا دیکھی اس کے سر کو چھوا، واقعی وہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"مٹھو اٹھو۔۔۔ اب یہ ڈرامے بند کرو ہم نہیں آنے والے تمہاری باتوں میں۔" روشن نے اس کا شانا ہلایا وہ جوں کا توں لیٹا رہا۔ بالآخر وہ دونوں تھک ہار کے واپس چلی آئیں۔

"روشن ہے۔۔۔" اب کی بار اسفندیار نے کچھ بلند آواز میں پوچھا۔ انابی نے پہلے تو نا سمجھی والے انداز میں اسے گھورا پھر کچھ سمجھ کر سر ہلایا اور بیٹھک کی طرف جانے لگیں۔ اسفندیار نے بریف کیس اٹھایا اور ان کے پیچھے چل پڑا۔ یہاں اسے کسی کو راستہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان راستوں پر وہ اتنی بار چلا تھا کہ اب آنکھیں بند کر کے بھی وہ گھر کی ایک ایک چیز کو چھو کر بتا سکتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ انابی نے اندھیرے میں رکھا ماچس ٹٹولا اور موم بتی روشن کر دی۔ وہ پلٹ کر اسے ایسے دیکھنے لگیں جیسے ان کے پاس بولنے کو کچھ نا رہا ہو۔ اسفندیار کو ان کی نظروں کا سامنا کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ معافی کے وہ سارے الفاظ جو وہ پورا راستہ سوچتا آیا تھا جیسے کہیں کھو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے بولنے کی ہمت جمع کی۔

"انابی میں آپ سے معافی۔۔۔" انابی نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

"تم میرے گناہ گار نہیں ہو اسفندیار۔۔۔" وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"معافی مانگنی ہے تو اس سے مانگو جو گزشتہ بیس برس سے تمہارے لوٹ آنے کی آس لگائے بیٹھی ہے۔" اسفندیار کے دل پر جیسے چابک پڑا تھا۔

"میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔ تم کپڑے بدل لو۔۔۔" انابی باہر چلی گئیں اسفندیار نے بیگ کھول کے اندر رکھا واحد سوٹ نکالا۔ وہ زیادہ سامان ساتھ نہیں لایا۔ اسے پورا یقین تھا وہ دروازے سے واپس لوٹا دیا جائے گا اور روشن پتا نہیں وہ ہو گی بھی یا نہیں بیس سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ اتنا انتظار کون کرے گا۔ شاید روشن کی کہیں شادی ہو چکی ہو گی۔ اس نے بھی تو اتنا طویل عرصہ پلٹ کے خبر نہیں لی تھی۔ بس اک موہوم سی امید تھی جو اسے وہاں کھینچ لائی تھی۔ روشن کے نام کے ساتھ اس کا نام جڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسفندیار نے دروازے پر دستک دی۔ دراز قامت مردانہ وجاہت سے بھرپور شخصیت۔ سفید شرٹ، سیاہ وکیلوں والا کوٹ، نفاست سے جمائے گئے بال، نک سک سے تیار وہ کسی کو بھی ایک نظر میں متاثر کر سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے دروازہ کھلنے کا منتظر کھڑا تھا۔ کورٹ

جانے سے پہلے اباجی سے کسی کام کے سلسلے میں مشورے کے لیے آیا تھا' باپ کے مرجانے کے بعد اباجی نے ہی اس کے سر پر دست شفقت پھیرا تھا' وہ انہیں چچا نہیں باپ ہی سمجھتا تھا۔ اس کا پورا بچپن یہیں گزرا تھا۔ چھوٹی سی گڑیا روشن کے ساتھ کھیلتا تھا۔ میٹرک کے بعد وہ اپنے گھر شفٹ ہو گیا تھا اباجی نے بہت روکا لیکن وہ نہیں مانا ہاں ان سے ملنے وہ تقریباً" دوسرے دن آتا تھا۔ اباجی کو بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا تھا۔ روشن کو اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی وہ دالان کے ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ اسفند یار اباجی کے کمرے میں چلا گیا۔ روشن اب سولہ برس کی ہو چکی تھی۔ اسفند کے ساتھ اپنا رشتہ اسے اب سمجھ آنے لگا تھا۔ کچی عمر کے سارے خوابوں میں اس نے اسفندیار کے نام کا رنگ بھرا تھا۔ اس کا ہر سپنا اسی ایک بندے پر جاکر ٹھہرتا تھا۔ وہ خواب بننے لگی تھی۔ دن رات اسفند کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اسے دیکھنے کے اسے سننے کے بہانے تلاش کرنے لگی تھی۔ دوسری طرف مکمل سکوت تھا' اگر کہیں کوئی مدھر جذبہ تھا بھی تو اسی نہایت بردباری اور سنجیدگی میں چھپایا ہوا تھا۔ روشن بہانے بہانے سے بیٹھک کے دروازے کے چکر کاٹتی رہی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے محو گفتگو تھا' روشن کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا' وہ دل مسوس کے رہ گئی۔ وہ بھلا مجھے کیوں دیکھیں گے بڑے آدمی جو بن گئے ہیں۔ دل بدگماں سا ہونے لگا۔ اباجی نے آہٹ سن لی تھی۔

"روشن بیٹا!" اباجی کی آواز پر وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر گئی تھی۔

"السلام علیکم ۔۔۔ جی اباجی ۔۔۔" وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ شکل سے ہی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسفندیار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور دھیمے لہجے میں سلام کا جواب دیا روشن کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"بیٹا اپنی ماں سے کہو چائے لے آئیں اسفندیار کو آفس سے دیر ہو رہی ہے۔"

"اباجی چائے پھر کسی دن آکر پیوں گا فی الحال اجازت چاہیے' بہت لیٹ ہو گیا ہوں۔ راستے میں بھی آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اباجی بھی ساتھ ہی باہر نکل گئے۔ روشن نے کب سے رکی سانس خارج کی۔ کمرہ سونا سونا لگنے لگا تھا۔

"مٹھو۔۔۔ ارے او مٹھو کہاں ہو؟" روشن دیوار سے چارپائی لگا کر چڑھی ہوئی تھی۔ کتنی ہی آوازیں دینے کے بعد بھی مٹھو کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ چاچی مٹھو کی امی باورچی خانے سے برآمد ہوئیں۔

"شنو مٹھو گھر میں نہیں ہے تمہیں کوئی کام ہے تو بتاؤ وہ آئے تو کہہ دوں گی۔" چاچی نے دوپٹے سے چہرے سے پسینہ پونچھا۔ روشن کا چہرہ اتر گیا۔

"چاچی میرا رزلٹ آیا ہے مٹھو کو کہہ کر اخبار منگوانا تھا۔" وہ اترے چہرے کے ساتھ بولی۔ اسے رزلٹ پتا کرنے کی بہت جلدی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آج ہی رزلٹ ملے اور ابھی وہ کالج میں داخلہ لے لے۔ اس کے اندر ہی اندر کہیں یہ خواہش پل رہی تھی کہ وہ بھی اسفندیار کی طرح اعلا تعلیم حاصل کرے۔ اتنے پڑھے لکھے بندے کے سامنے وہ خود کو گنوار محسوس کرتی تھی' اوپر سے اس کا بے پروا رویہ پتا نہیں کتنی پڑھی لکھی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھتا ہو گا۔ جبھی تو مجھے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا اسے احساس کمتری ہونے لگا۔

"ہاں یاد آیا وہ اخبار تو نمو خود لینے گئی ہے بس آتی ہی ہو گی۔" چاچی نے سر پہ ہاتھ مار کر کہا۔

"اچھا مجھے بتایا ہی نہیں کس کے ساتھ گئی ہے۔" اسے نمو پر غصہ آنے لگا۔

"مٹھو کے ساتھ اور کس کے ساتھ جانا ہے۔ دونوں سیدھے تیرے ہی گھر آئیں گے۔ دیکھنا' چاچی واپس باورچی خانے میں گھس گئیں۔ دروازے پر دستک سن کے روشن نے چارپائی سے چھلانگ لگائی اور دروازے کی طرف لپکی۔ نمو ہی ہو گی۔ اس نے ایک طرف ڈھلکے دوپٹے کو درست کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

"آپ ۔۔۔" اسفندیار کو سامنے کھڑا پا کر وہ سٹپٹا گئی۔

اس کے یوں لاپروا انداز میں لیے گئے دوپٹے کو اسفند یار نے ناگواری سے دیکھا۔ روشن نے گھبرا کر دوپٹا درست کیا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا دروازہ کھولنے کو۔" وہ غصے سے بولا۔

"وہ میں سمجھی نمو ہوگی۔" وہ گھبرا کر صفائی دینے لگی۔

"نمو نہیں تھی میں تھا۔۔۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو۔۔۔ سو لوگ آتے ہیں ابا جی سے ملنے۔ حلیہ دیکھو تم اپنا۔" وہ اب بھی برہم تھا روشن کی سٹی گم ہو گئی دوپٹا سر پہ لو ٹھیک سے۔" اسفند یار نے دروازہ بند کیا اور بیٹھک کی جانب بڑھ گیا۔

اتنے عرصے بعد بولے بھی تو کیا۔ ان کے پاس میرے لیے صرف ڈانٹ ہی ہوتی ہے۔ بچی سمجھتے ہیں مجھے۔" روشن کی آنکھیں بھیگنے لگیں وہ کمرے میں جا کر خوب روئی تھی۔

"روشن بیٹی اٹھو دیکھو تمہارا رزلٹ آیا ہے۔ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہو یہ لو مٹھائی کھاؤ۔" ابا جی نے ایک گلاب جامن ڈبے سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

"ابا جی نمو آگئی کیا؟" روشن نے گلاب جامن لے کر منہ میں ڈالا اس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی تھوڑی دیر پہلے کی اداسی جاتی رہی۔

"نمو کا تو پتا نہیں اسفند یار آیا تھا یہ مٹھائی بھی ساتھ لے کر آیا تھا کہہ رہا تھا ابا جی روشن بہت ذہین ہے میں نے اس کے لیے ایک بہت اچھا لڑکیوں والا کالج دیکھا ہے وہیں داخلہ کروائیں گے۔" ابا جی کا چہرہ خوشی اور فخر سے تمتما رہا تھا۔ روشن کا منہ کھل گیا وہ ہونق بنی ابا جی کو دیکھ رہی تھی۔

"اسفند یار نے میرے لیے یہ سب کیا۔" وہ بے یقینی سے ابا جی کے ہاتھ میں پکڑے مٹھائی کے ڈبے کو دیکھ رہی تھی۔

نمو مٹھو کے ساتھ ہی رزلٹ لے کر آئی تھی۔ ساتھ میں گرم جلیبیاں بھی تھیں۔ روشن کو اب رزلٹ میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی وہ تو صبح والا واقعہ نمو کو سنانے کو بے تاب ہو رہی تھی۔ روشن کو اخبار ایک طرف رکھتا دیکھ کر نمو کو حیرت ہوئی۔

"روشن تمہیں رزلٹ نہیں دیکھنا۔" مٹھو نے بھی چونک کر روشن کی طرف دیکھا۔

"وہ تو میں دیکھ چکی کب کی۔۔۔" روشن نے شرارت سے ان دونوں کو دیکھ کر کہا۔

"کیا، کب۔۔۔ کیسے۔۔۔" نمو کا منہ کھل گیا حیرت سے وہ تو سب سے پہلے گئی تھی رزلٹ لینے ایسا کون سا فرشتہ آگیا جو اس سے بھی پہلے روشن کو رزلٹ دے گیا۔ صبح جب وہ جا رہی تھی اس وقت تک تو روشن سو رہی تھی۔ نمو کے لیے سارا معاملہ گتھی بنا ہوا تھا۔

"صبح اسفند خود لے کر آئے تھے اور ساتھ میں مٹھائی کا ڈبا بھی۔" وہ اترا کر بتانے لگی۔

"سچ کہہ رہی ہو۔" نمو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اس کھڑوس اسفند یار سے اسے مر کر بھی ایسی امید نہیں تھی۔ مٹھو نے اسفند یار کا نام سن کے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ روشن کے منہ سے اسفند یار کا نام سن کے اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ اس کا بس نا چلتا تھا وہ اسفند یار کا وجود ہی ختم کر دے۔

"ہاں اور کہہ رہے تھے روشن بہت ذہین ہے اس کا ایڈمیشن شہر کے بہت اچھے کالج میں کرواؤں گا۔" روشن جیسے خود ابھی تک یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ مٹھائی کا ڈبا لینے گئی۔ نمو بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی۔ ٹیبل پر ایک طرف پڑا جلیبیوں کا شاپر اور اخبار مٹھو کا منہ چڑا رہا تھا۔ حسد کی تیز لہر نے اسے اپنے لپیٹ میں لے لیا۔

دیوانگی کی اصل وجہ عشق لاحاصل ہے۔ عشق چاہے دولت کا ہو، خواہشوں کا ہو۔ عورت کا ہو اس کی آخری منزل دیوانگی ہے۔ ایسی خواہش جس کا پورا ہونا ممکن نا ہو، یا ایسی چیز کے پیچھے بھاگنا جو تقدیر میں نا لکھی گئی ہو، پاگل پن کا سبب بنتی ہے۔ روشن بھی اس کا عشق لاحاصل ہی تھی۔ اس سے محبت ہونے سے پہلے بھی وہ جانتا تھا روشن اس کی نہیں ہے اور اس سے

محبت ہو جانے کے بعد بھی' اسے یقین تھا کہ روشن اس کی نہیں ہو سکتی یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی وہ خود کو روشن کو چاہنے سے نہیں روک پایا تھا۔ شاید یہی تقدیر کا فیصلہ تھا۔ وہ سب تو کٹھ پتلیاں تھیں۔ تار تو کہیں اور سے ہلائے جارہے تھے۔

اس کی محبت میں شدت بڑھتی جارہی تھی۔ روشن کسی کی بیوی تھی وہ جانتا تھا لیکن وہ جتنا اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی کوشش کرتا' اس کی وحشت بڑھنے لگتی۔ وہ تھک گیا تھا خود سے لڑتے لڑتے۔ روشن اسے صرف ایک اچھا بچپن کا دوست سمجھتی تھی۔ وہ اسفند یار سے محبت کرتی تھی وہ کیسے اپنا دل اس کے سامنے کھول کے رکھتا۔ وہ یقیناً" اسے مسترد کردیتی اور جو تھوڑا بہت وہ اس سے بات کرلیتا تھا شاید وہ بھی بند ہو جاتا۔ وہ جب بھی اپنا اور اسفند یار کا موازنہ کرتا خود کو بہت چھوٹا اور حقیر محسوس کرتا' لیکن اس دل کا کیا کرتا جو ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ وہ روشن کے سامنے مسلسل اچھا بنتے بنتے تھک گیا تھا' وہ دن بدن اسے خود سے دور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کیا وہ روشن کے بغیر نہیں رہ سکتا اب وہ اچھا سوچے یا برا اسے ہر صورت روشن چاہیے تھی۔ روشن اس کی تھی۔ اسے اپنانے کے لیے وہ ہر مشکل سے گزر سکتا تھا۔ پہلی بار یہ خیال آنے پر وہ خود سے بھی خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن آہستہ' آہستہ وہ اس بارے میں سوچنے لگا تھا۔

کچی عمر کی خواہشیں اکثر جنوں بن جاتی ہیں اگر ان پر بروقت بند نا باندھا جائے تو اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے جاتی ہیں۔ مٹھو عمر کے اس دھانے پر تھا جہاں خواہشوں کے ریلے بہتے ہیں۔ اچھا برا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اپنی خواہشوں پر بند باندھنے میں وہ بری طرح ناکام ہوا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا وہ اپنے ساتھ کسی اور کا مقدر بھی تباہ کرنے جارہا تھا۔

☼ ☼ ☼ ☼

"شیش..." چاچی نے اسے آہستہ بولنے کو کہا۔ وہ مٹھو کی بات سے گھبرائی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ تھوڑی دیر کو رکا۔

"آپ ایک مرتبہ ان سے بات کریں۔" وہ اپنی ضد پہ اڑا ہوا تھا۔ چاچی کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔

"پاگل مت بنو مٹھو تم جانتے ہو وہ ہاں نہیں کریں گے۔ خوامخواہ کیوں مجھے اس عمر میں لوگوں کے سامنے رسوا کرنے پہ تلے ہو۔ میں نے اگر ایسی کوئی بات کی تو لوگ مجھے پاگل سمجھ کر پتھر ماریں گے۔ اب بھی وقت ہے' سنبھل جاؤ' اس آگ میں ہاتھ مت ڈالو سب کچھ جل کے راکھ ہو جائے گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر منت بھرے لہجے میں بولیں۔

"میں نے بہت سوچا ہے اس بارے میں اور کوئی راستہ نہیں ہے۔" مٹھو کے لہجے میں چٹانوں کی سختی تھی۔

"بیوی ہے وہ کسی کی۔ نکاح ہوا ہے اس کا اسفند یار کے ساتھ....." وہ عاجزی سے بولیں۔

"نکاح ٹوٹ بھی تو سکتا ہے....." پھنکارتا ہوا لہجہ' اسفند یار کا نام سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔

"کیوں توڑے گی وہ نکاح۔" چاچی طیش میں آکر بولیں۔ "وہ بھی تمہارے لیے۔ تمہارا اور اسفند یار کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ وہ ہر لحاظ سے تم سے بہتر ہے۔" ماں تا نے دل پر پتھر رکھ کر اکلوتے بیٹے کو آئینہ دکھایا۔

"میں اسے خوش رکھوں گا بہت جو وہ کہے گی وہ سب اس کے لیے کروں گا۔ اسفند یار سے بڑا افسر بنوں گا۔ آپ ایک بار بات تو کریں۔" وہ اب گڑگڑانے لگا تھا۔ چاچی نے بے بسی سے اکلوتے بیٹے کو دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں رہا تھا یا سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا دونوں صورتوں میں بربادی اس کا مقدر تھی۔ کاش ماں اولاد کا مقدر اپنی مرضی سے لکھواتی تو وہ سو بار روشن لا کر اس کی جھولی میں ڈال دیتیں۔ لیکن یہ سب کہاں ممکن تھا۔

"مٹھو ہمارا اور ان کا برسوں کا ساتھ ہے۔ بہت عزت کرتے ہیں حاجی صاحب اور بی بی میری۔ میں مر کر بھی ان سے یہ بات نا کہہ پاؤں گی۔ خواہشوں نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ میں اندھی نہیں ہوئی۔ میں جانتی ہوں میں مر کر بھی روشن کو تمہاری بیوی ....."
چاچی نے نچلا لب دانتوں میں دبالیا۔

"استغفراللہ...." چاچی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"تو بھول جا اسے۔ سمجھ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اسے اور اگر پھر بھی نہیں بھول سکتا تو چلا جا یہاں سے۔ میں تیری جدائی سہہ لوں گی لیکن تمہاری وجہ سے کسی کی بربادی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ چلا جا تمہیں میری ماما کا واسطہ چلا جا۔" چاچی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر ان پر ٹکا دیا۔ جیسے بات کو ختم کر واب کا اشارہ کیا ہو۔

"ٹھیک ہے پھر چلا جاتا ہوں میری وجہ سے تمہاری عزت پہ حرف آتا ہے نا تو میں اس گھر سے تو کیا دنیا سے ہی چلا جاتا ہوں۔" مٹھو ایک دم سے بپھر کر باہر نکلا چاچی کو لگا ان کا کلیجہ کس نے دبوچ لیا ہو۔

"مٹھو۔ رکو جھلیا نا ہو...." وہ آوازیں دیتی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔ مٹھو نے باورچی خانے سے چھری لے کے اپنا بازو کاٹ دیا تھا۔ اس کی کلائی سے بہتے بھل بھل خون کو دیکھ کے چاچی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

☆ ☆ ☆
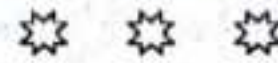
"میری بڑی خواہش تھی ایک بار تمہاری تائی کے ساتھ اس پاک در کا دیدار کر آؤں۔ اب تو آگے اور بوڑھا ہونا ہے۔ ہاتھ پاؤں سے طاقت دن بدن کم ہی ہو گی پھر پتا نہیں جانا ہوتا ہو۔" بیٹھک میں اس وقت وہ پانچ افراد بیٹھے تھے۔ ابا جی کے یوں اچانک پروگرام سے وہ اداس ہو گئی تھی۔ نمو نے اس کے ہاتھ کو دبا کے ڈھارس دی۔

ابا جی اسفندیار سے مخاطب تھے۔ جو سر جھکائے ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور گاہے بگاہے گردن اثبات میں ہلا کر ان سے اتفاق کر رہا تھا۔

"اسی وجہ سے میں نے اتنی چھوٹی عمر میں روشن کا نکاح تم سے پڑھوا دیا۔ کچھ پتا نہیں تھا کب بلاوا آجائے۔ جوان بچی کو کس کے سہارے چھوڑ کے جاتا۔ اب تو دل کو سکون ہے کہ ادھر زندگی پوری بھی ہو جائے تو پیچھے کی فکر نہیں ہے۔" انہوں نے پھر گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

"ابا جی ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں...." روشن روہانسی ہو کر بولی۔ اسے اماں ابا کے دور جانے کے تصور سے ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ "میں اسفندیار کے ساتھ اکیلی کیسے رہوں گی۔" سوچ سوچ کے اسے چکر آ رہے تھے۔ ابا نے تو حد کر دی چپکے چپکے تیاری کرتے رہے روشن کو کانوں کان خبر نا دی۔ اور اسے تب بتایا جب جانے کا وقت آگیا تھا وہ احتجاج بھی نا کر سکی۔

"جھلیے جانا تو اک دن سب کو ہے۔ پھر حقیقت سے کیا آنکھیں چرانا۔" ابا جی نے اس کو سینے سے لگا کر شفقت سے اس کے سر پر بوسہ دیا۔ روشن کی آنکھیں بھر آئیں۔ ابا جی اٹھ کھڑے ہوئے تو سب ہی کھڑے ہو گئے۔

"اسفند بیٹا تمہاری امانت تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ بس ذرا خیال رکھنا ابھی نا سمجھ ہے کوئی غلطی ہو جائے تو معاف کر دینا اگر وقت ملا تو میں باقاعدہ رخصتی کر کے جاتا۔ زندگی رہی تو واپس آ کر سارے ارمان پورے کروں گا۔"

"جی ابا جی...." اسفندیار تابعداری سے بولا۔

ابا جی نے روشن کو گلے لگایا تو کب کے رکے آنسو چھلک پڑے۔ اماں نے ڈھیروں نصیحتیں بیٹی کے پلو سے باندھیں اسے بمشکل چند باتیں سمجھ میں آئی تھیں۔

"بس بیٹا اب رونا بند کرو اللہ نے چاہا تو ہم بہت جلد واپس آجائیں گے اور تمہارے ساتھ نمو بھی تو ہے نا اس کے گھر چلی جایا کرنا جب دل چاہے۔" ابا جی نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

"اور ہاں اسفند بیٹے کو شکایت کا موقع مت

دینا۔" اس نے گردن ہلا دی۔ اسفند یار نے بیگ اٹھائے اور گاڑی میں رکھنے لگا۔

ان کے جانے کے بعد دیر تک نمو اسے تسلیاں دیتی رہی تھی۔

اسفندیار گھر لوٹا تو کھانا ٹیبل پر رکھا تھا۔ روشن کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ تسلی کر کے اپنے کمرے میں لوٹ آیا کھانا کھا کر وہیں سو گیا۔

اسفندیار صبح سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور روشن کی چائے لے کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب ندارد.... اس نے مایوس ہو کر چائے واپس باورچی خانے میں رکھی۔ چاچی کو ہدایات دے کر وہ آفس کے لیے نکل گیا۔

روشن کی آنکھ آٹھ بجے کھلی۔ کوئی زور، زور سے دروازہ بجا رہا تھا وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔ باہر سے نمو کی آواز آ رہی تھی اس نے دروازہ کھول دیا۔ نمو بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"روشن مٹھو نے...." اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔

روشن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"کیا ہوا مٹھو کو.... مٹھو نے کیا....؟" اس نے نمو کو جھنجوڑ دیا جو تواتر سے روئے چلی جا رہی تھی۔

"مٹھو نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔" نمو نے بمشکل یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

"کیا۔" روشن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ "مگر کیوں...." اسے یقین نہیں آ رہا تھا مٹھو بھلا ایسا قدم کیوں اٹھائے گا۔ نمو نفی میں سر ہلانے لگی۔

"کچھ پتا نہیں صبح، صبح امی سے کچھ جھگڑا ہوا تھا بس۔ لیکن کسی کے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔"

"اتنی سی بات پر خودکشی...." وہ الجھ گئی۔ جھگڑا ہوا کس بات پر تھا.... مٹھو ایسا تھا تو نہیں.... اب کہاں ہے وہ...." روشن نے سرہانے رکھا دوپٹا پہنتے ہوئے پوچھا۔ وہ دونوں نمو کے گھر جانے لگیں۔

"ہسپتال میں ہے ابھی تک.... تم دعا کرو روشن اسے کچھ نا ہو۔" نمو روتے ہوئے بولی۔

"اسے کچھ نہیں ہو گا تم تسلی رکھو۔" روشن نے نمو کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دی۔

✡ ✡ ✡

سوا گیارہ بجے تک مٹھو گھر آ گیا تھا۔ وہ ابھی تک غنودگی میں تھا روشن کو اس کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔ چاچی کی حالت الگ خراب تھی۔ وہ شدید ذہنی صدمے سے گزری تھیں۔ مٹھو کی اس حرکت نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ نمو ماں کو پنکھا جھلنے لگی۔ روشن مٹھو کے سرہانے بیٹھی رہی۔ بچپن سے لے کر اب تک اس کے ساتھ بتائے گئے سارے لمحے اسے رلا رہے تھے۔ مٹھو ان کی سہیلی تھا۔ اس کا دل لڑکوں کے کھیلوں میں کم کم ہی لگتا تھا۔ وہ گڑیوں کے گھر بناتیں مٹھو سب سے آگے آگے ہوتا۔ آم کے پیڑوں میں جھولے اسی نے باندھے تھے۔ بھاگ بھاگ کر ان کے سارے کام کرتا۔ بازار کے چکر لگاتا۔ مٹھو ان کی محفل کی جان تھا اور آج وہ اس حال میں۔ روشن نے اس کے بازو پہ بندھی پٹی کو دھیرے سے چھوا۔

"اماں!" وہ ہوش میں آ رہا تھا شاید۔ اس نے ماں کو پکارا۔ چاچی بے تابی سے اٹھ کر اس کی طرف لپکیں۔

"ماں صدقے.... ماں واری.... میرا پتر.... میرا سوہنا۔" چاچی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وہ دیوانہ وار مٹھو کی پیشانی چومے جا رہی تھیں۔

"پانی...." وہ بمشکل بول پایا تھا۔ نمو بھاگ کے پانی لے آئی۔ لرزتے ہاتھوں سے بھائی کو پانی پلایا۔ روشن ایک طرف کھڑی یہ سب دیکھتی رہی۔ مٹھو نے چند گھونٹ بھر کر پھر سے آنکھیں موند لیں۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری...." روشن نے قریب آ کر پوچھا۔ مٹھو نے آنکھیں کھول دیں جیسے وہ اسی ایک آواز کا منتظر تھا۔ روشن کا رویا رویا روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ مٹھو کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"روشن...." مٹھو نے دھیرے سے پکارا۔ روشن اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔

"تم تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ.... میرا دل گھبرا

رہا ہے۔" مٹھو نے روشن کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔
"روشن! اسفند یار باؤ تمہیں پوچھ رہے تھے ابھی۔" چاچی نے خشک لہجے میں کہا۔ روشن اٹھ کھڑی ہوئی مٹھو نے ایک ناراض نظر ماں پر ڈالی وہ جانتا تھا وہ جھوٹ بول رہی تھیں۔ "کیسی کٹھور ماں ہے۔"
مٹھو نے نفرت سے سوچ کے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ روشن پھر آنے کا وعدہ کر کے گھر چلی آئی اسفند یار کے آنے کا وقت تھا اور وہ کھانا بھی بنا کے نہیں آئی تھی۔
چاچی نے ایک شاکی نظر آسمان پر ڈالی جیسے اپنی بے بسی بیان کر رہی ہوں اور وضو کرنے چلی گئیں۔
روشن گھر میں داخل ہوئی اسفند یار اپنے کمرے میں دونوں سرہانے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے سلام کرنے پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔
"وعلیکم السلام آ گئیں تم۔" اسفند یار نے بات میں پہل کی۔
"جی..." مختصر جواب کے بعد وہ پھر خاموش ہو گئی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا بات کرے۔ اسفند یار نے ہی دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔
"میں آتے ہوئے ہوٹل سے کھانا لیتا آیا تھا تمہارے لیے کچن میں رکھا ہے۔ میں نے کھا لیا ہے۔" وہ نرمی اور اپنائیت سے بولا۔ روشن کی نظریں بے ساختہ اوپر اٹھیں ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ٹکرائیں اگلے ہی پل روشن نے پھر نظریں جھکا لیں۔
"کھانا نہیں بنایا پھر بھی مسکرا رہے ہیں غصے تو بہت ہوں گے اظہار نہیں کر رہے۔ ضرور ابا سے شکایت لگائیں گے۔ کیا کروں معافی مانگ لوں...." وہ اپنی سوچوں میں الجھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ منہ سے بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔
"کچھ کہنا ہے تمہیں...." اسے یوں کھڑا دیکھ کر اسفند یار نے نرمی سے پوچھا۔
"نن... نہیں تو..." وہ سٹپٹا گئی۔ اسفند نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ جیسے اس کی حرکات کو سمجھنا چاہ رہا ہو۔ وہ الٹے پاؤں واپس بھاگی اور سیدھا باورچی خانے میں جا کر دم لیا' سامنے شیلف پر کھانے کے دو تین شاپرز رکھے تھے۔ وہ کھانا نکال کر اپنے کمرے میں ہی لے آئی کنڈی چڑھائی کھانا کھا کر وہیں سو گئی۔
اس کی آنکھ کھلی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ اسفند یار نے چارپائی صحن میں عین اسی جگہ ڈالی تھی جہاں ابا جی کی چارپائی ڈالی جاتی تھی۔ اسفند تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا ریڈیو پر خبرنامہ چل رہا تھا۔ روشن کمرے کی چوکھٹ کے بیچوں بیچ گومگو کا شکار کھڑی تھی۔ آگے جائے یا وہیں بیٹھی رہے صحن میں ایک ہی چارپائی رکھی تھی گویا اس کے بیٹھنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔
"ارے رات کا کھانا بھی تو بنانا ہے۔" اسے اچانک یاد آیا۔ سبزی تو منگوائی ہی نہیں۔ ابا جی اور اماں ہوتے تھے تو اسے یہ بکھیڑے پالنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اب سب کچھ اسے ہی کرنا تھا۔ وہ ہمت کر کے اسفند یار کی چارپائی تک آ گئی۔ بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔
"ارے روشن تم کب آئیں۔"
وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ اسفند یار نے ایک طرف کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔
"میں یہیں ٹھیک ہوں۔" وہ ٹس سے مس نا ہوئی۔
"وہ میں..." دونوں نے ایک سے الفاظ ساتھ شروع کیے پھر جھینپ کے چپ ہو گئے۔ اسفند یار نے ہی دوبارہ بات شروع کی۔
"میں تمہارے ہی اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ تم سے پوچھنا تھا رات کھانے میں کیا لے کر آؤں تمہیں جو پسند ہو وہ بتا دو۔" اسفند یار نے ریڈیو بند کیا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے لباس سے اٹھتی پرفیوم کی دھیمی دھیمی مہک روشن کو مسحور کر رہی تھی۔
"آپ سامان لے آئیں کھانا میں بنا دوں گی۔"
"تمہیں کھانا بنانا آتا ہے۔" اسفند یار نے بے ساختہ کہا۔ وہ تو اسے بچی سمجھ رہا تھا۔ روشن شرمندہ ہو

گئی۔

"جی تھوڑا بہت بنالیتی ہوں۔" روشن نے کسر نفسی سے کام لیا۔ کھانا وہ اچھا خاصا بنالیتی تھی۔

اچھا... میں تو سمجھا اتائی نے تمہیں اب تک کھانا پکانا نہیں سکھایا اور اب مجھے روز ہوٹل سے کھانا لے کر آنا پڑے گا۔ چلو خیر بچت ہو گئی میری۔" وہ مسکراہٹ دبائے اسے چھیڑنے کو بولا۔ روشن جھینپ سی گئی۔

"اچھا بتاؤ کیا کیا لانا ہے۔ میں ابھی لے آتا ہوں آج ہم دونوں مل کے کھانا بنائیں گے۔" اسفندیار نے بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پہ جھولتی لٹ کو پیچھے ہٹا کر بشاش لہجے میں بولا۔ وہ روشن اور اپنے بیچ کھڑی تکلف کی اس دیوار کو آہستہ آہستہ ختم کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا روشن اس کے سامنے کھل کر بات کرے اس کے ساتھ کچھ شیئر کرے اس کے لیے ضروری تھا کہ ان دونوں کے بیچ دوستانہ فضا قائم ہو۔ روشن کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اسفندیار سے اس حد تک بے تکلفی کی اسے توقع نہیں تھی۔

"کچھ بھی لے آئیں جو آپ کو پسند ہو میں بنا دوں گی۔" وہ کسمسا کر پیچھے ہٹی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اسفندیار نے ہاتھ ہٹا لیا۔

"تم ڈرو گی تو نہیں اکیلے۔" وہ بات بدل کر بولا۔

"آپ جلدی واپس آجائیے گا۔" روشن نے بے قابو ہوتے دل کے ساتھ کہا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ اسے ڈر نہیں لگے گا۔ کیونکہ وہ سچ مچ کافی ڈرپوک تھی۔

میں بس سامان لے کر ابھی آتا ہوں۔ اسفندیار نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور کمرے سے بٹوا لینے چلا گیا۔ روشن نے صحن کی لائٹس جلائیں۔ کیا کروں نمو کو بلاتی ہوں۔ اس نے دل میں سوچا اسفندیار کے جانے کے بعد دروازہ بند کیا اور چارپائی گھسیٹ کر نمو کے صحن میں جھانکا۔ پورے صحن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے ابھی تک بتی نہیں جلائی تھی۔ مٹھو نیم اندھیرے میں چارپائی پر بیٹھا بازو پہ بندھی پٹی کو گھور رہا تھا۔

"مٹھو... او مٹھو..." روشن نے اسے دیکھ کر آواز دی۔ مٹھو نے چونک کر اسے دیکھا اس کی بدلی نگاہیں روشن اندھیرے کی وجہ سے دیکھ نہیں پائی۔

"نمو ہے گھر پر؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"نہیں وہ گھر میں نہیں ہے۔ لہجہ بدلہ ہوا تھا روشن سمجھ نہیں پائی۔

"اور چاچی؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"وہ بھی نہیں ہیں... کیوں کیا ہوا؟" مٹھو نے اس کے لہجے میں چھپی پریشانی کو محسوس کیا۔

"اسفندیار گھر پر نہیں ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ نمو ہوتی تو تھوڑی دیر میرے ساتھ بیٹھ جاتی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"اسفندیار کہاں گئے۔" اسفندیار کا نام لیتے مٹھو کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"وہ سودا لینے گئے ہیں تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔ تب تک کوئی بیٹھے۔"

مٹھو کی آنکھوں میں شعلہ لپکا تھا۔ روشن دیکھ نہیں پائی تھی۔

"میں آتا ہوں تم ڈرو مت۔" وہ اسے تسلی دے کر اٹھا۔ روشن سر ہلا کر نیچے اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

لائیٹ اچانک سے چلی گئی تھی۔ روشن کی سانس حلق میں اٹک گئی۔ آس پڑوس میں لائیٹس روشن تھیں۔ شاید کوئی خرابی ہو گئی ہے پہلے ہی کیا کم گھبراہٹ تھی۔ لائیٹ کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔ یہ مٹھو پتا نہیں کہاں رہ گیا۔ وہ خود سے ہمکلام تھی۔ دل ہی دل میں آیات کا ورد کرنے لگی۔ ڈر کے مارے دل ڈوبا جا رہا تھا۔ صحن میں ڈر لگ رہا تھا وہ باورچی خانے میں آکر بیٹھ گئی چولہا جلا لیا اندھیرا کچھ کم ہوا۔ دل سینہ پھاڑ کر باہر نکلنے کو تھا۔ ایک سے ایک ڈراؤنے خیال آ رہے تھے۔

"یا اللہ کسی کو بھیج دے۔" وہ دعائیں کرنے لگی۔ دروازے پہ دستک سن کر وہ اچھل پڑی چیخ نکلتے، نکلتے رہ گئی۔

"کون؟" ڈر ڈر کر پوچھا۔

"روشن میں ہوں مٹھو دروازہ کھولو۔" مٹھو کی آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی۔ بھاگ کر دروازہ کھولا۔ "اتنی دیر کیوں کی میری ڈر کے مارے جان نکل رہی تھی۔" اوپر سے لائیٹ بھی خراب ہو گئی۔

مٹھو چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اسے یوں بت بنا دیکھ کر روشن کو اس سے خوف محسوس ہونے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ دیکھو مٹھو اس وقت میرا مذاق کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔" وہ اندر ہی اندر ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ مٹھو ٹس سے مس نہیں ہوا۔

وہ بہت سوچ سمجھ کر یہاں آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے اس کی محبت کھڑی تھی۔ اس کا اٹھایا ایک قدم اسے تباہ کرنے والا تھا۔ وہ ایک عورت تھی ساری عمر اپنی بدنامی کا داغ دھوتے دھوتے مر جاتی کوئی اعتبار نا کرتا۔ کوئی نا اپنا تا چاہے وہ کتنی بھی پوتر کیوں نا ہو۔ ایسے میں وہ آگے بڑھ کر اسے اپنا لے گا۔ لیکن کیا وہ اس سب کے بعد مجھے قبول کرے گی۔ یا میرے وجود پر تھوک کر چلی جائے گی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن اتنا تو اسے یقین تھا کہ اگر آج اس نے یہ موقع گنوا دیا تو وہ ساری عمر کے لیے روشن کو کھو دے گا۔ اور اسفندیار اس نے دل ہی دل میں اسفندیار کو موٹی سی گالی سے نوازا۔ ہمیشہ کے لیے روشن کو اس سے دور لے کر چلا جائے گا۔

"نہیں روشن میری ہے صرف میری۔" دروازے پہ کھٹکا ہوا تھا۔

"روشن۔۔۔" اسفندیار نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ جب تک اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں۔ ایک ہیولا تیزی سے دیوار پھلانگ کے بھاگ گیا تھا۔ اسفندیار کے ہاتھ سے شاپرز چھوٹ گئے تھے۔ وہ بے یقینی سے اندھیرے میں کھڑی گھبرائی ہوئی روشن کو دیکھ رہا تھا۔ جو دوپٹے کی جگہ اپنے بازوؤں سے خود کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ عورت تھی بیس سال گزر گئے تھے اپنے آنسوؤں سے اپنے دامن پر لگے داغ دھوتے دھوتے۔ لیکن وہ روز اول کی طرح اسی جگہ موجود تھے۔

سب کچھ ایک لمحے میں ہوا تھا۔ اسفندیار کی آواز سن کے مٹھو نے اس کا دوپٹا چھینا اور دیوار پھلانگ گیا۔ اور اسفندیار کے دل میں، ہمیشہ کے لیے شک چھوڑ گیا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا۔ روشن اپنی جگہ ششدر کھڑی رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا مٹھو نے ایسی حرکت کیوں کی۔ سب ٹھیک ہوتا اگر وہ ایک شخص اس کا اعتبار کر لیتا، تب دنیا کی انگلیاں شاید اس پر نا اٹھتیں۔ لیکن اس نے روشن کا اعتبار نا کیا وہ ایک دم سے چار دیواری سے نکل کر چوراہے پر آگئی تھی۔

کیا کیا نہیں سنا تھا اس نے اپنے کردار کے بارے میں۔ کیسی کیسی کیچڑ نا اچھالی گئی تھی اس پہ۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ پہلے پہل وہ بہت روئی تھی۔ چلائی تھی اپنی صفائی دی تھی۔ کلام پاک اٹھا کے قسمیں کھائی تھیں۔ لیکن اسفندیار نے پھر بھی اس کا یقین نہیں کیا تھا۔ چاچی نے بیچ میں پڑ کر اس کی سچائی کی گواہی دینی چاہی تو اسفندیار نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بھی منع کر دیا اور جب وہ مکمل خاموش ہو گئی تب اسفندیار اس کے پاس آیا تھا۔

"روشن۔۔۔" روشن نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

"میں اگر مان بھی لوں تم بے قصور ہو پھر بھی میں تمہیں وہ مقام نہیں دے پاؤں گا جو تمہارا تھا۔ مرد کے دل میں اگر ایک بار شک بیٹھ جائے تو کبھی نہیں نکلتا۔ اچھا ہے، ہم دونوں راستے الگ کر لیں۔" روشن نے چپ چاپ سامان باندھا تھا۔ اسفندیار نے اسے بہاولپور اس کی خالہ کے گھر چھوڑا تھا اور کبھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔ پتا چلا ملک ہی چھوڑ گیا ہے۔ ابا جی اور

اماں گھر لوٹ آئے روشن انہیں لٹی پٹی ملی۔ کس سے فریاد کرتے ہم اسفندیار کو بھی بد دعا نادے پاتے۔ زبان انکار کردیتی۔ بیس بائیس سال اسے بھی بچوں کی طرح پالا تھا۔ ابا جی یہ غم لیے دنیا سے ہی رخصت ہو گئے انابی نے تسبیح پکڑلی اور روشن کی سانسیں سولی پر اٹک گئیں۔

☆ ☆ ☆
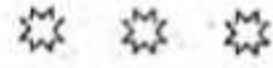
اسفندیار نے کپڑے تبدیل کرلیے تھے۔ سردی کا احساس قدرے کم ہوا۔ انابی نے گرم گرم بھاپ اڑاتا چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔

وہ اب بھی خاموشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ خاموشی نے زیادہ طول پکڑا تو اسفندیار نے ہی بات کرنے کی کوشش کی۔

''کیسی ہیں آپ....'' اسفندیار نے موم بتی کی پیلی روشنی میں ان کے جھریوں بھرے چہرے کو آزردگی سے دیکھا۔ وہ جس انابی کو چھوڑ کے گیا تھا وہ ان سے یکسر مختلف تھیں۔ گلابی رنگت مضبوط جسم' وہ دیکھنے سے ہی کشمیرن معلوم ہوتی تھیں۔ گزرے وقت نے ان پر گہری چھاپ چھوڑی تھی۔

''جیسا چھوڑ کے گئے تھے ویسی ہی ہوں۔ تم نے تو مارنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ دیکھو پھر بھی زندہ بچ گئی۔'' نا چاہتے ہوئے بھی ان کی زبان سے شکوہ پھسل گیا۔ اسفندیار کو احساس ہو رہا تھا اس نے اپنی عزیز ترین ہستیوں کو وہ دکھ دیا تھا جو کوئی دشمن بھی نا دیتا۔ ابا جی اس کی وجہ سے دنیا سے ہی رخصت ہو گئے تھے۔ انابی دنیا سے کٹ کے رہ گئی تھیں اور روشن وہ تو زندہ درگور ہو گئی تھی۔

روشن کو چھوڑ کر جانے کے بعد اس پر آشکار ہوا تھا کہ وہ اسے ناکردہ گناہوں کی سزا دے آیا تھا۔ اس کا دل ہر لمحہ گواہی دیتا رہا تھا کہ روشن پاک دامن ہے۔ اس کا ضمیر ہر وقت احتجاج کرتا رہتا۔ ضمیر کی اس خلش سے وہ تنگ آجاتا۔ وہ ہر پل خود کو یقین دلاتا رہتا تھا کہ وہ روشن سے نفرت کرتا ہے۔ وہ بے وفا تھی گناہ گار تھی۔ اس نے خود اسے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ لیکن دل ہر بات کی نفی کردیتا' سب دھوکا سب آنکھوں کا فریب تھا۔ روشن ایسی تھی ہی نہیں۔ روشن کا معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا۔ وہ چلانے لگتا اسے بھولنے کی ہر کوشش ناکام گئی تھی۔ پھر شادی بچے وہ کسی کے ساتھ انصاف نا کرپایا تھا۔ کسی بے گناہ پر بدکرداری کا الزام لگا کر وہ کیسے سکون سے جی سکتا تھا۔ آخر اس نے دل کے سامنے ہار مان لی۔ وہ واپس لوٹ آیا تھا۔ اسے سکون کی تلاش تھی جو اسے اس وقت ملتا جب روشن اسے معاف کرتی۔

''روشن کہاں ہے؟'' اس نے بہت عقیدت سے روشن کا نام لیا تھا۔

''اسے کہاں جانا ہے....'' انا جی کے لہجے میں بے پایاں کرب تھا۔

''مجھ سے ملے گی وہ....'' اسفندیار کے لہجے میں التجا تھی۔ انابی نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر ہلایا اور باہر چلی گئیں۔

بارش کی شدت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ آج جیسے اس نے بھی سب کچھ جل تھل کرنے کی ٹھانی تھی۔ روشن گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ابھی تک بے یقینی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ تو کیا وہ سچ مچ لوٹ آیا تھا۔ بیس سال سے وہ روز کھڑکی میں کھڑی کتنی ہی دیر چوکھٹ پر نظریں جمائے رہتی تھی۔ بہت طویل انتظار تھا۔ انابی اسے یوں کھڑا دیکھ کے ٹھنڈی سانس بھرتیں۔ انہے اسفندیار سے کوئی امید نہیں تھی۔ وہ تو اس کی طرح ایک پتلا تھا۔ اس نے وہاں آس لگا رکھی تھی جہاں سے ڈوری ہلتی تھی۔ روشن نے اپنا معاملہ رب کے سپرد کر دیا تھا۔ اور اسے پورا یقین تھا اسفندیار ایک دن لوٹنے پر مجبور ہوگا۔

ایک بار وہ آکر میری بے گناہی کا ثبوت دے دے تاکہ میں اپنی نظروں میں سرخرو ہو جاؤں۔'' وہ گڑگڑا کر دعا کرتی۔ ایک عرصے سے اس کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ اور آج بالآخر وہ لوٹ آیا تھا۔

دروازے پر کھٹکا ہوا۔ کمرے میں اندھیرے کی وجہ

سے انابی اسے دیکھ نہیں پائی تھیں۔
لیکن وہ جانتی تھیں وہ اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔
"وہ آگیا ہے روشن۔۔۔" انابی کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ روشن نے کب سے سینے میں اٹکی سانس خارج کی۔ جیسے طویل قید کے بعد آزادی کا پروانہ ملا ہو۔
عمر قید کے قیدیوں کو طویل قید کے بعد جب رہائی ملتی ہے تو وہ کتنی ہی دیر جیل کے دروازے پہ کھڑے چپ چاپ سوچتے رہتے ہیں کہ اب کہاں جانا ہے۔ ان کے عزیز رشتے دار ان کے بغیر جینے کا ڈھنگ سیکھ چکے ہوتے ہیں اور اب ان کی کہیں جگہ نہیں ہوتی۔
"اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ ہو سکے تو تم بھی اسے معاف کر دو۔" انابی آج اس کی وکیل بن کر آئی تھیں۔
"معاف کر دوں۔" روشن بڑبڑائی۔ اس نے بے یقینی سے ماں کے الفاظ دہرائے۔
"اس کی جگہ کوئی بھی مرد ہوتا وہ یہی کرتا' معاف کرنے کے معاملے میں مرد ذات بہت کم ظرف ہوتا ہے۔ وہ تو پھر بھی لوٹ آیا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید کبھی نا آتا۔ جب باپ ہو کر تمہارے ابا نے اعتبار نا کیا وہ تو پھر غیر تھا۔"
روشن کے چہرے پہ ایک لمحہ آکر ٹھہر گیا۔ اباجی نے اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ وہ کلام پاک لے آئے تھے۔ مٹھو کو بلایا گیا تھا۔
نسیم اپنے بیٹے سے کہو اس کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر گواہی دے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ سچ تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر روشن کا قصور ہوا تو میں پوری زندگی اس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔" اباجی کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا وہ بہت ضبط سے کھڑے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ مٹھو اور روشن دونوں کو گولی سے اڑا دیتے۔
"حاجی صاحب میں قسم کھاتی ہوں تمہاری کڑی بے قصور ہے۔" چاچی آگے بڑھ کر بولیں۔
"مجھے تمہاری نہیں تمہارے بیٹے کی گواہی چاہیے۔" اباجی کا لہجہ سرد تھا۔ مٹھو جو سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا اباجی کے سامنے آکھڑا ہوا اس کا چہرہ تنا ہوا تھا۔ مٹھو نے کلام پاک پہ ہاتھ رکھا تو بہت سے لوگوں کی دھڑکن چند لمحوں کے لیے تھم سی گئی۔ پتا نہیں وہ کیا کہنے والا تھا۔ روشن کی قسمت کا فیصلہ اس کے ادا کیے گئے چند الفاظ نے کرنا تھا۔
"مٹھو تمہیں میرے دودھ کا واسطہ سچ بولنا۔" چاچی نے کڑک کر کہا۔ مٹھو کا ہاتھ ایک لمحے کو کانپا تھا۔
"میں قسم کھاتا ہوں اس کلام پاک کی کہ۔۔۔" وہ رکا۔ روشن کی سانسیں رکنے لگیں۔
"اس رات روشن نے مجھے خود اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ گھر پر اکیلی تھی اور اسفند باؤ بھی گھر پر نہیں تھے۔" مٹھو نے ہاتھ ہٹا دیا۔ روشن بدحواس ہو کر اس کو ہاتھ ہٹاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ مٹھو اس کے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتا تھا۔ روشن کو لگا وہ گندگی کے گڑھے میں گر گئی ہے۔ جہاں سے چاہ کر بھی عمر بھر نا نکل پائے گی۔ وہ چیخ پڑی۔
"مٹھو آگے بھی بولو۔۔۔ مٹھو آگے بتاؤ کیا ہوا تھا۔"
روشن انابی کے بازوؤں میں تڑپ رہی تھی۔
"بے غیرت۔۔۔" اباجی کا ہاتھ اٹھا اور اسے ساری دنیا کی نظروں میں بے اعتبار کر گیا۔
"نہیں اباجی نہیں یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" وہ مچلنے لگی۔
"حاجی صاحب مٹھو ایسی دس قسمیں بھی کھالے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ میں ماں ہوں اس کی مجھے پتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ میرا یقین کریں۔" اباجی چلے گئے تھے چاچی دہلیز تک ان کے پیچھے گئی تھیں لیکن انہوں نے کسی کی نا سنی۔
"مٹھو تجھ سے خدا پوچھے تو نے آج اس نمانی پہ تہمت لگائی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آج سے تو میرے لیے مرگیا۔" چاچی جلال میں آ کر بولیں۔ مٹھو کی وجہ سے وہ انابی سے نظریں ملانے کے قابل بھی نا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"روشن۔۔۔" اندھیرے میں ایک مانوس سی آواز

ابھری روشن نے سانس روک لی۔ وہ ہمہ تن گوش بنی ہوئی تھی۔ جس ایک لمحے کا اس نے برسوں انتظار کیا تھا۔ وہ آن پہنچا تھا۔

"مجھے پتا ہے تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ میرا قصور بہت بڑا ہے اور معافی کا لفظ اس کے آگے بہت چھوٹا ہے۔ میری بس اتنی التجا ہے۔ میرے لیے کوئی سزا تجویز کردو اپنے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا ہو ہو کر میں تھک چکا ہوں۔ مجھے سزا سنا دو۔" اسفندیار ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہا تھا۔ روشن کا چہرا خاموشی سے بھیگتا رہا ۔ یہی تو وہ الفاظ تھے جن کو سننے کے لیے ایک عرصے سے اس کے کان ترسے ہوئے تھے۔ آج اس کی تمنا پوری ہو گئی تھی۔ اسفندیار کے الفاظ نے اسے اپنی ہی نظروں میں معتبر کردیا تھا۔

"جب جانتے تھے کہ میں بے قصور ہوں میں نے آپ سے کوئی بے وفائی نہیں کی تھی۔ پھر لوٹ آنے میں اتنا وقت کیوں لگایا۔" روشن کے لہجے میں بے پایاں دکھ بول رہے تھے۔

"میں ڈرتا تھا تمہارا سامنا کرنے سے 'نانی اور ابا جی سے نظریں ملانے سے اپنی امانت وہ میرے حوالے کر گئے تھے اور میں اس کی حفاظت نا کر سکا۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں روشن ہو سکے تو مجھے معاف کردو۔ میں نے تمہیں شدت سے چاہا تھا تمہاری معصومیت تمہاری پاکیزگی سے عشق کیا تھا۔ شاید اسی لیے تمہارے کردار پر اٹھتے چند چھینٹے بھی میں برداشت نہیں کرپایا تھا۔ سزا صرف تمہارے حصے میں نہیں آئی میں نے بھی سزا کاٹی ہے تم سے اتنے برس دور رہ کے۔ میں گزرے برسوں کے ایک ایک لمحے کا مداوا کردوں گا مجھے ایک بار صرف ایک بار موقع دو۔ تمہاری ساری محرومیاں میں اپنے دامن میں سمیٹ لوں گا۔ بولو میرا ساتھ دو گی نا....." اسفندیار نے اس کا آنسوؤں سے دھلا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر پوچھا۔ روشن نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اسفندیار نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ بادل چھٹ چکے تھے چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل کر مسکرانے لگا۔

☆ ☆ ☆

مکمل ناول

نادیہ جمال

دل اُسے یاد کریں

''ارے! یہ کیا؟ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟'' شمامہ ہاتھ لے کر جونہی واش روم سے باہر نکلی تو حیرت کا جھٹکا کھا کر رہ گئی تھی۔ عریسہ جوں کی توں بازو لٹکائے' بے زار صورت کے ساتھ بیڈ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ خوب صورت بلیک کلر کا ڈیزائنو کا جوڑا جو بطور خاص اس نے ماریہ بی والوں سے آج کے فنکشن کے لیے لیا تھا۔ ایسے بیڈ پر الٹا سیدھا پڑا ہوا تھا۔

''سلی گرل! ٹائم اتنا کم ہے اور تم ابھی تک ایسے بیٹھی ہوئی ہو اگر لیٹ ہوگئیں تو امی کے سامنے میں تمہارا نام لے دوں گی۔'' کہتے ہوئے شمامہ نے سر پہ لپیٹا ہوا تولیہ اتارا تو اس کے مشک بو نم لمبے بال اس کی پشت پہ بکھر گئے۔ وہ مڑ کر آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ کل کیے گئے فیشل کی بدولت اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔ کل کافی ٹائم وہ دونوں پارلر میں گزار آئی تھیں۔

''میں کوئی تیار ویار نہیں ہو رہی..... نہ میرا کہیں جانے کا موڈ ہے۔ تم اور امی چلی جاؤ فنکشن میں۔'' انتہائی اکتاہٹ سے کہتے ہوئے عریسہ دھپ سے پیچھے کی طرف بیڈ پہ لیٹ گئی۔

''ہائیں' دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تمہارا؟'' شمامہ کی براؤن آنکھیں اس کی بات پہ حیرت سے پھیلیں۔

''اب تک گیسٹ آچکے ہوں گے' ہم قریبی رشتہ دار ہیں' عین ٹائم پر پہنچیں گے تو کتنا برا فیل ہوگا ناحیہ کو۔''

''یار! کیا مصیبت ہے۔ جب کہہ دیا میرا جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تو ڈیٹس اٹ۔'' عریسہ جھنجلا کر بولتے ہوئے جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ بے زاری اس کے چہرے کے ایک ایک نقش سے مترشح تھی۔

''مگر کیوں؟'' شمامہ کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

''بس۔ جب سے میں نے ناحیہ کی انگیجمنٹ کا سنا ہے' تب سے مجھے ایک انسلٹ سی فیل ہو رہی ہے۔ یو نو شمامہ! انگیجمنٹ ایک لڑکی کی زندگی کا ایک بہت بڑا ایونٹ ہوتا ہے۔ کسی کے ساتھ جڑنے کا بر ملا اعلان لڑکی کو کتنا کانفیڈنٹ اور آسودہ کر دیتا ہے' تم اندازہ نہیں کر سکتیں' اب دیکھنا ناحیہ جب کالج میں انگیجمنٹ رنگ پہن کر آئے گی تو اس کے انداز و اطوار ہی اور ہوں گے۔ اس کی منگنی کی فوٹو گرافس جب سارے کالج میں پھریں گی تو اس کی اتراہٹ دیکھنا آج اس کی ساری فرینڈز مدعو ہوں گی۔ جو ناحیہ کے منگیتر اور اس کی سسرال کی سج دھج کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی۔ میری کتنی شدید خواہش ہے کہ اسی قسم کا ایک فنکشن ہمارے گھر بھی ہو مگر.....'' بولتے بولتے عریسہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ شمامہ آنکھیں پھاڑے اسے بولتا دیکھتی رہی۔ پھر چند ثانیے بعد چل کر بیڈ تک آئی۔ عریسہ کا ماتھا پیار سے چوم کر اسے بازو پھیلا کر خود سے لگا لیا۔

''مائی گاڈ! عریسہ! تم ایسے فضول کے کمپلیکسز کا کب سے شکار ہوگئیں۔ میری جان۔ منگنی کوئی ایسا اہم اور بڑا ایونٹ نہیں ہوتا جس کے ہونے پہ انسان فخر میں مبتلا ہو جائے اور نہ ہونے پہ انتہائی احساس کمتری کا شکار۔'' عریسہ کے بال ہاتھ سے سلجھاتے ہوئے شمامہ اپنے مخصوص میٹھے اور نرم لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی۔

''اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں' تمہارے نزدیک منگنی جتنا غیر اہم فنکشن ہے' میرے لیے اتنا ہی اہم'

میں اسے ...ی جیسے اہم بندھن کی خوب صورت تمہید سمجھتی ہوں۔" عریسہ ہنوز نروٹھے پن سے بولی۔ شمامہ ایک دم سے مسکرا دی وہ اسے اس وقت ایک بچی ہی لگ رہی تھی۔

"بیٹا! آپ لوگ تیار نہیں ہوئیں؟" اسی دم نازش نے اندر جھانکا۔

"جی امی! میں تو تیار ہو رہی ہوں، بس یہ عریسہ لیزی گرل دیر کیے دے رہی ہے۔" شمامہ آرام سے اپنا دامن بچاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف مڑ گئی۔

"ہری اپ عریسہ! اسما میری خالہ زاد بہن ہے۔ اس کی بیٹی کے منگنی کے فنکشن پر ہم غیروں کی طرح عین وقت پہ پہنچیں کتنا فیل ہوگا انہیں۔" نازش نرمی سے کہتی باہر چلی گئیں۔

''پلیز عریسہ! اب اٹھ بھی جاؤ' اگر تم نے جانے سے انکار کیا تو پھر میں بھی نہیں جا رہی۔ امی کو جواب خود دیتی رہنا۔'' عریسہ کو یونہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھے دیکھ کر شمامہ زچ ہو گئی تھی۔

''چل رہی ہوں۔ زیادہ بلیک میل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عریسہ پھاڑ کھانے والے انداز میں کہتے ہوئے جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے انداز پہ شمامہ کے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

خوب صورت' صاف رنگت' اسمارٹ سراپے کی مالک عریسہ رضوان کو چاچو ریحان نے اپنے چھوٹے لاڈلے بیٹے باسم ریحان کے لیے لگ بھگ دس سال قبل اپنے بھائی رضوان سے مانگ لیا تھا۔

''ارے بھائی رضوان! اپنی عریسہ میرے آنگن کی رونق بنے گی۔ بس سن لیا نا تم نے۔'' گلابی فراک میں ملبوس دو سالہ عریسہ کو گود میں لیے' اس کے گلابی گلابی پھرے رخساروں پہ بوسہ دیتے ہوئے ریحان احمد نے چھوٹے بھائی رضوان کو مان بھرے تحکمانہ انداز میں مخاطب کیا تھا۔

''جی بھائی جان! مجھے بھی باسم سے بڑھ کر اور کون عزیز ہو سکتا ہے۔ میرا بھتیجا' میرا خون ہی میرا اصل بیٹا ہے۔'' رضوان احمد نے ادب سے بڑے بھائی کا مان بڑھایا تھا۔ عریسہ سے دو سال بڑی شمامہ کے لیے ان کی بہن رفعت اپنے بیٹے نویر کے لیے جھولی پھیلائے کب سے ان کے جواب کی منتظر تھیں۔

باسم ان کا بھتیجا تھا تو نویر بھی انہیں کم پیارا نہ تھا۔ نازش اپنی سمجھ دار اور ذہین شریک حیات سے انہوں نے ہمیشہ کی طرح مشورہ مانگا۔ رائے طلب کی۔ نازش کو بھلا کیا اعتراض ہوتا تھا۔ سسرال میں انہیں ہمیشہ سے من چاہی اہمیت اور عزت ملی تھی۔ اکلوتی نند اور دیورانی سے تعلقات مثالی تھے۔ سو نہایت خوش اسلوبی سے باہم مل کر تینوں گھرانوں نے اپنے بچوں کے

☼ ☼ ☼

باسم' نویر' شمامہ اور عریسہ چاروں کو بلوغت کی سرحد پہ پاؤں رکھتے ہی محبت کی دھیمی دھیمی خوشبو نے اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے بڑوں کے جوڑے گئے اس سنجوگ کے دل سے قدر دان تھے' ممنون تھے' مشکور تھے۔ کوئی ایک ماہ قبل ثمینہ کو اپنے بیٹے باسم کی منگنی دھوم دھام سے کرنے کا خیال آگیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ ایک چھوٹی سی تقریب میں باسم' عریسہ کو انگوٹھی پہنا دے۔ زیادہ مہمان نہیں بلائیں گے۔ صرف قریبی رشتہ دار مدعو ہوں گے۔ بچوں کی خوشی کا سامان بھی ہو جائے گا اور ہم بڑوں کی بھی گپ شپ ہو جائے گی۔ ساتھ میں عمار اور قرۃ کی بھی منگنی کا فنکشن رکھ لیتے ہیں۔'' ثمینہ رسانیت سے بول رہی تھیں۔

''مگر کیوں بھابھی! ہمارے درمیان طے پائے ہوئے رشتے کا تقریباً'' سب کو علم ہے۔ ویسے بھی اب ماشاء اللہ سے باسم کو جاب مل چکی ہے۔ عریسہ کی گریجویشن مکمل ہوتے ہی ان شاء اللہ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔''

''ہاں کہتے تو تم لوگ ٹھیک ہو' تمہارے بھائی جان بھی یہی کہتے ہیں' مگر بچوں کی ضد ہے کہ منگنی کا فنکشن ضرور رکھا جائے۔ میں افزا اور باسم سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔'' وہ نیم رضامندی سے بولیں۔ افزا نے بھلا کیا اعتراض کرنا تھا' البتہ باسم ضد پہ اڑ گیا۔

''ایک چھوٹا سا فنکشن رکھنے میں رضوان انکل کا کیا جاتا ہے۔ شادی جب ہو گی دیکھی جائے گی' فی الحال تو میں دس' بیس رشتہ داروں کی موجودگی میں عریسہ کو رنگ پہنانا چاہتا ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا تھا۔

''ہاں بیٹا! خواہش تو میری بھی یہی ہے' میں صرف تمہاری نہیں بلکہ عمار اور قرۃ کی بھی باقاعدہ منگنی کرنا چاہتی ہوں۔ کیوں عمار بیٹا! تم نے قرۃ کا انگیج منٹ

ڈریس کوئی سوچا ہوا ہے' تو بتا دو' میں ویسا ہی خریدوں گی۔" ثمینہ نے ٹی وی دیکھتے عمار کو مخاطب کیا تھا جو ان کی گفتگو عدم توجہی سے سنتے ہوئے مکمل طور پر کسی انگلش ڈاکومنٹری فلم میں گم تھا۔

"پلیز امی! اس منگنی وغیرہ کے کھڑاگ سے مجھے تو دور ہی رکھیں مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔" عمار نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر سرد لہجے میں جواب دیا تھا۔

عمار کا رویہ تو کبھی کبھی انہیں سخت پریشان کر کے رکھ دیتا تھا۔ قرۃ العین اس کی سگی پھپھی زاد تھی۔ شریف' باحیا' سادہ انداز و اطوار کی مالک' جس سے عمار کی نسبت انہوں نے باسم اور عریسہ کی طرح بچپن میں ہی طے کر دی تھی۔ باسم کی عریسہ سے محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ عریسہ کے بارے میں اپنے والہانہ جذبات کا اظہار برملا کرتا رہتا تھا۔ عریسہ کو ایک شاندار سے فنکشن میں' انگوٹھی پہنانے کا آئیڈیا بھی سراسر باسم کا ہی تھا۔ جبکہ عمار کا معاملہ یکسر الٹ تھا۔ نہ تو اس نے قرۃ کے لیے ایسی کوئی وارفتگی دکھائی تھی' نہ ہی اس کے رویے سے پتا چلتا تھا کہ وہ قرۃ کے لیے نرم گرم جذبات رکھتا ہے۔ باسم کے مقابلے میں ویسے بھی وہ خاصا ریزروڈ' سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ ہر ماں کی طرح ثمینہ کو بھی اپنی اس پہلی اولاد سے باقی بچوں کی نسبت کہیں زیادہ محبت تھی۔ اس کی تابع داری' سنجیدہ' متین طبیعت ان کے لیے باعث فخر تھی' مگر قرۃ والے معاملے میں یکسر بے گانگی اور بے نیازی کسی طور نظرانداز کرنے کے قابل نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

"کہاں ہو؟ کب سے دکھائی نہیں دی ہو۔" براؤن کاٹن کے ٹراؤزر اور ریڈ ٹی شرٹ میں ملبوس' موبائل کان سے لگائے ہلکے پھلکے انداز میں بولتے ہوئے باسم ٹیرس پر آگیا تھا۔

"کہیں نہیں' بس گھر میں بزی رہتی ہوں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کرتی رہتی ہوں۔" عریسہ کا انداز لاپروا اور مگن سا تھا۔

"مہمان' کیسے مہمان؟"

"مائی ڈیئر باسم ریحان! میرے پیرنٹس کی سب سے چھوٹی' خوب صورت پیاری اور من موہنی بیٹی کے رشتے کے لیے مہمان آئے تھے' بس ان کی خاطر تواضع میں بزی تھی۔" اب کے عریسہ خاصے ناز سے اٹھلا کر بولی تھی۔

"میں خود آ کے پوچھتا ہوں تم سے ان اوٹ پٹانگ باتوں کا مطلب۔" تپ کر باسم نے موبائل آف کر دیا اور کچھ سمجھی' نہ سمجھی کی کیفیت میں گھرا ٹھیک پندرہ منٹ میں وہ رضوان چاچو کے گھر پہنچ گیا تھا۔ نازش آنٹی لاؤنج میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ شمامہ دکھائی نہ دے رہی تھی۔ وہ سیدھا عقبی لان میں چلا آیا۔ وائٹ کاٹن کی شلوار اور پرپل پرنٹڈ قمیص' دوپٹے میں' پھولوں کے کنج کے قریب سنگی بنچ پہ بیٹھی وہ ایک کھلا کھلا تروتازہ پھول ہی لگ رہی تھی۔ فریش انگوروں کی پلیٹ قریب پڑی تھی۔ دانہ دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے باسم پہ نظر پڑی تو کھل کر مسکرا دی۔

"ارے آؤ' باسم۔"

"ہاں جی کون سے مہمان' کس کا رشتہ آیا؟" باسم بنچ پہ ذرا فاصلے پہ بیٹھ گیا۔

"بتایا تو تھا' میرے امی ابو کی سب سے چھوٹی بیٹی کا رشتہ لے کر مہمان آئے تھے۔ وہ بیٹی جو خاصی خوب صورت ہے۔" باسم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ شرارتی انداز میں بولی۔

"کیوں آنے والے مہمانوں کو علم نہیں ہوتا کہ تم بچپن سے انگیجڈ ہو۔" باسم اب کے چبھتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"علم نہیں تھا۔ تب ہی تو میری کالج فرینڈ اپنے بھائی کا پروپوزل لے کر آ گئی' میں سوچ رہی ہوں کہ ایک بورڈ گھر کے گیٹ پہ لگا دیتی ہوں جس پہ واضح جلی الفاظ میں لکھا ہو کہ عریسہ رضوان کی انگیجمنٹ باسم ریحان سے ہو چکی ہے۔ اس لیے پروپوزل کی خاطر آنے کی زحمت نہ کی جائے۔ اسی طرح کا ایک

کارڈ گلے میں لٹکا کر کالج جایا کروں تاکہ کوئی لڑکی مجھے اپنی بھابھی، چاچی اور مامی بنانے کی خواہش اپنے دل میں نہ پالے۔ کسی فنکشن میں بھی جاؤں تو یہی کارڈ وہیں بھی چل سکتا ہے۔ نان سینس۔" انگور کی پلیٹ پرے کھسکاتے ہوئے وہ خاصی خفگی سے بولی تھی۔

"مائی گاڈ۔ اتنی لمبی فہرست، مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ میں کسی قلوپطرہ سے منسوب ہوں۔" باسم نے ہلکے سے ہنستے ہوئے بنچ کی بیک پہ ایک بازو پھیلا دیا۔

"زیادہ ہنسنے کی ضرورت نہیں، کبھی آکر مل لو۔ کوئی ڈاکٹر، تو کوئی بینکر، کسی کا بھائی امریکا میں تو کسی کا کزن دبئی میں بزنس مین، ایک سے بڑھ کر ایک پروپوزل۔ کوئی ہفتہ ایسا نہیں کہ جس میں میرے رشتے کے حوالے سے کوئی مہمان نہ آیا ہو۔ امی اور شمامہ بے چاری تو مہمانوں کی خاطریں کر کر کے تھک گئی ہیں۔" وہ خاصے چڑے انداز میں بولی تھی۔

"تو پرابلم کیا ہے۔ تم کھل کے کلیئر کردو کہ تم اپنے کزن سے منسوب ہو۔ ڈیٹس اٹ۔" باسم کا انداز خاصا لاپروا تھا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارا حوالہ نہیں دیتی، مگر سب یہی رسپانس دیتے ہیں کہ بچپن کی طے کردہ نسبتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور میرے پاس کوئی پروف بھی تو نہیں، نہ ہاتھوں میں انگیجمنٹ رنگ، نہ انگیجمنٹ فنکشن کی فوٹو گرافس۔" گل خیرہ پہ منڈلاتی خوش رنگ تتلیوں کے غول کو دیکھتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی۔

"ہوں.... تو انگیجمنٹ رنگ اور گرینڈ فنکشن۔" کان کی لو مسلتے ہوئے باسم پر سوچ انداز میں بولا۔ وہ تو اس کامنی سی لڑکی کے قدموں میں دنیا جہاں کی خوشیاں ڈھیر کردینے کی آرزو دل میں رکھتا تھا اور یہ تو محض ایک منگنی کی باقاعدہ رسم تھی۔

"اوکے پھر انگیجمنٹ رنگ اور ڈریسز کی شاپنگ مل کر کریں گے۔" باسم نے بیٹھے بٹھائے پلان سیٹ کرلیا تھا۔ عریسہ کے چہرے پہ ایک اطمینان بھری مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی تھی جس میں مان اور تفاخر کے رنگ بہت واضح تھے۔

☆ ☆ ☆

رفعت تخت پہ کل جمع پونجی بکھرائے بیٹھی تھیں۔ بھورے، ہرے، نیلے نوٹ۔ گھر کے کونے کھدرے سے پس انداز کی ہوئی رقم نکال لائیں۔ سارا جمع جتھا سامنے تھا، مگر کام نہ بن پا رہا تھا۔ پہاڑ جتنا خرچہ اور اتنی قلیل سی رقم۔ وہ صحیح معنوں میں سخت پریشان تھیں۔

قرۃ کا ارادہ آج تفصیلی صفائی کا تھا۔ گھر کے سارے پردے، کشن کور، بیڈ کور، میز پوش.... سب باہر۔ چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں صحن میں بنی پڑی تھیں۔

"ارے امی! کیا پیسوں کو دھوپ لگوا رہی ہیں آج؟" تولیے سے گیلے بال رگڑتے ہوئے نوریز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی باتھ لے کر آرہا تھا۔

"کیسی دھوپ لگوانی بیٹا! بیٹھے بٹھائے خرچہ آن کھڑا ہوا ہے۔" رفعت نے کھسک کر اس کے لیے تخت پہ جگہ بنائی، پھر واش بیسن دھوتی فاریہ کو آواز لگائی۔

"فاریہ آجاؤ بھائی کے لیے ناشتا لے آؤ۔"

"کیسا خرچہ امی!"

"تمہاری منگنی کا خرچہ اور کس کا۔ سوچا تھا ان ہی پیسوں سے تمہاری اور قرۃ کی شادی کی کوئی نہ کوئی چیز لے لوں گی۔"

"امی! میں بھائی کی منگنی پہ ویسا سوٹ بنواؤں گی جیسے کل مارننگ شو کی اینکر نے پہن رکھا تھا۔ لمبا گھیر دار فراک اور پاجامہ۔" فاریہ ناشتے کی ٹرے تخت پہ رکھتے ہوئے اشتیاق سے بولی۔

"ہاں، ادھر خرچے پورے نہیں ہو رہے، یہ فراک بنوانے کی بات کرتی ہیں۔" رفعت ڈپٹنے والے انداز میں بولیں۔

"تو امی! یہ منگنی کا شوشہ باسم وغیرہ نے چھوڑا ہے۔ کوئی ہم تھوڑی شوق پورا کررہے ہیں۔ میری شمامہ سے نسبت طے ہے، اب مزید اس رشتے کے لیے کون سی توثیق چاہیے۔ یہ باسم لوگوں کا شوق ہے۔ ان کو

پورا کرنے دیں۔" وہ پراٹھے اور قیمے کا نوالہ منہ میں منتقل کرتے ہوئے آرام سے بولا تھا۔

"ارے بیٹا! ثمینہ' عریسہ کے ساتھ ساتھ قرۃ کو بھی انگوٹھی پہنانا چاہتی ہے۔ اب یہ دونوں اپنی انگلیاں سجا بیٹھیں۔ شمامہ بھی تو ان جیسی لڑکی ہے۔ میری بھتیجی ہے۔ اسے کتنا محسوس ہوگا۔ اگر اس کی انگلی خالی رہے۔"

"نہیں امی! شمامہ ایسی فارملیٹز کو پسند کرنے والی نہیں ہے۔ اسے میرے اور اپنے رشتے کی مضبوطی کا بخوبی ادراک ہے ایسی بے مقصد باتوں کو وہ نہیں فیل کرنے والی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ وہ جتنا شمامہ کو چاہتا تھا' اتنا ہی جانتا تھا۔

"وہ خود محسوس نہ کرے' مگر خاندان' برادری والے مجھے ضرور محسوس کروائیں گے کہ مجھ سے اتنا بھی نہ بن پڑا کہ ایک چھلا ہی بھتیجی کی انگلی میں ڈال لوں۔" رفعت کو سبکی ہونے کا خوف لاحق تھا۔

"تم کیوں نہیں گئیں مامی ثمینہ کے ساتھ شاپنگ پر۔ جب کہ انہوں نے تمہیں بلایا بھی تھا۔" خالی کپ ایک طرف رکھ کر اس نے ٹانگیں سیدھی کرلیں' اوائل دسمبر کی دھوپ میں ماں کی گود کی سی گرمی و لطافت تھی۔

"میں کیوں خواہ مخواہ چلی جاتی۔ باسم اور عریسہ نے تو مل کر شاپنگ کی اور اگر میں جو اپنی پسند سے کوئی چیز لے لیتی تو ہو سکتا تھا میرا اور ثمینہ مامی کا ٹیسٹ میسج نہ کرتا۔" قرۃ نے تلخی سے کہتے ہوئے گیلی قمیص زور سے جھٹکی اور تار پہ ڈال دی۔ اس کے چہرے پہ سختی چھا گئی تھی۔

"سنا تو ہے۔ میری چیزیں بھی عریسہ سے کم نہیں ہیں۔ ویسی ہی اعلا اور مہنگی۔" تار شروع سے آخر تک تھیلے کپڑوں سے بھر چکی تھی۔ قرۃ نظر نہیں آرہی تھی' کپڑوں کے پار سے اس کی آواز ابھری۔

"آخر میں بھی تو ماموں جان کے گھر کی بڑی بہو بننے والی ہوں۔ بھلا مجھے کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ خاندان میں اپنا امیج تھوڑی خراب کرنا تھا۔" نویر کو نہ جانے کیوں قرۃ کا لہجہ بھیگا بھیگا محسوس ہوا تھا۔ وہ نوٹ کر رہا تھا جب سے منگنی وغیرہ کی بات چھڑی تھی' قرۃ کی آنکھیں سرخ رہنے لگی تھیں۔ باتوں کا جواب اکثر کاٹ دار اور تلخ لہجے میں دیتی۔ چہرے پہ ہمہ وقت ایک سختی سی چھائی رہتی۔ لہجے کی نرم و لطافت نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اور واقعی پانی ٹپکاتے کپڑوں کے اس پار وہ اپنی گیلی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

وہ بھی تو عریسہ کی طرح' بچپن سے عمار سے منسوب تھی۔ دھڑکنوں نے جس پہلے نام پہ اتھل پتھل مچائی تھی' وہ بلاشبہ عمار کا ہی نام تھا اسی ایک نام کے پھولوں ہی سے اس کا نخلستان دل مہک رہا تھا۔ اس کا روپہلے مہکتے مہکتے جذبات اور امنگوں سے بھرا دل چاہتا کہ کبھی وہ عمار کی برتھ ڈے پر اسے وش کرے یا اس کی اپنی برتھ ڈے پہ عمار اسے کہیں باہر گھمانے لے جائے۔ عید پہ مبارک باد کا آنے والا میسج سب سے پہلے عمار کا ہی ہو۔ وہ نت نئی ڈشز بنا کر مامی جی کے گھر بھجوائے اور پھر عمار سے خوب داد پائے۔ وہ روٹھے تو اس کی جان پر بن آئے۔ یہ بیمار ہو تو عمار کو کسی طور چین نہ آئے' مگر یہ اس کے خواب ہی تھے جنہوں نے حقیقت تک کا سفر طے نہیں کیا تھا۔

اس کی معصوم' سادہ اور فطری خواہشات تھیں جو رفتہ رفتہ حسرتوں اور محرومیوں میں بدلتی جارہی تھیں۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ عمار نے اسے کبھی مخاطب بھی کیا ہو۔ زندگی میں ایک دوبار ماموں کے گھر سامنا ہوا۔ سلام اور بات چیت تو در کنار' عمار کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ تک نہ اترتے تھے۔ عمار کی سرد مہری اور بے گانگی جان لیوا حد تک انسلٹنگ تھی۔ تذلیل کا احساس ہمہ وقت اسے چٹکیاں بھر بھر کر بے چین کیے رکھتا تھا۔ اپنے جذبوں کی بے توقیری اسے ہرگز اتنا نہ رلاتی گر جو وہ باسم' نویر اور عریسہ' شمامہ کو اس رشتے کی فطری اور جائز لطافتوں اور خوب صورتیوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتے ہوئے نہ دیکھتی۔ ہمدردی' دوستی' ایثار اور خلوص یہ سب محبت کی کتاب کے مختلف حصے تھے' جن کے یہ

چاروں بلاشبہ مرکزی کردار تھے۔ مشین نے بزر بجایا تو وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ آنسو پونچھے اور کپڑے آکر نکالنے لگی۔

"ایک بہن کے تن پر لاکھوں کا جوڑا سجا ہو۔ ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھی اور دوسری بہن کا معمولی جوڑا اور ہلکے گہنے۔ اگر منگنی تین چار ماہ آگے ہو جائے تو پھر کام بن سکتا ہے۔ تمہاری تنخواہ بھی آجائے گی اور کچھ گھر کی بچت' قرۃ کی تنخواہ۔" رفعت ابھی تک اپنے حساب کتاب میں الجھی ہوئی تھیں کئی دفعہ کے جوڑ توڑ کے باوجود بھی اخراجات زیادہ ہو رہے تھے۔

"امی! ہمارا اور ماموں ریحان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ عمار بھائی کی اچھی خاصی سیلری ہے۔ باسم کی اپنی جاب ہے۔ ماموں کی پنشن اور ادھر ایک میں کمانے والا' فاریہ' حسان اور ابوبکر کی اکیڈمی' گھر کے خرچے' قرۃ کا جہیز۔ بس جس کو چاؤ چڑھا ہے وہ منگنی کرے۔ ہمیں کوئی شوق نہیں ایسی خواہ مخواہ کی تقریب کا۔ نہ ایسے چونچلے ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔" نویر نے قطعی انداز میں کہتے ہوئے تخت پہ بکھرے پیسے سمیٹے اور انہیں رفعت کی گود میں ڈالا۔ پاؤں میں چپلیں پھنسائیں اور سیدھا اندر کمرے میں آگیا۔ اس کی انگلیاں موبائل پہ ثمامہ کا نمبر پریس کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ثمینہ پر بری طرح جھنجلاہٹ سوار تھی۔ بے حد جلتے بھنتے انداز میں ناشتے کا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں جس شدت سے لب بھینچتیں' اتنی ہی شدت سے آنکھیں بھر آتیں۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی آخر یہ لڑکا چاہتا کیا ہے؟ کیوں اتنا تنگ کر رکھا ہے مجھے۔" پٹخ پٹخ کر سنک میں جھوٹے برتنوں کا انبار جمع کرتی جا رہی تھیں ابھی نسیم آتی تو دھو دیتی سارے برتن۔ آفس جانے کے لیے نک سک سے تیار' سیڑھیاں اترتے ہوئے باسم کے کانوں میں ماں کی تپی تپی آواز پڑی تھی۔ لاؤنج میں ٹیبل پہ پڑے ایک کارڈ پہ نظر پڑی تو کفوں کے بٹن بند کرتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو تھم گئے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر کارڈ اٹھایا۔ اسما آنٹی کی بیٹی ناجیہ کی منگنی کا انویٹیشن کارڈ تھا۔

"امی! آپ رضوان انکل کی طرف گئی تھیں؟ انہوں نے منگنی کی کون سی ڈیٹ دی ہے۔ آفٹر آل کارڈ بھی چھپنے کو دینے ہیں۔ ڈیٹ تو کنفرم ہو جائے۔" وہ ہاتھ میں کارڈ پکڑے پکڑے ماں سے مخاطب ہوا۔

"نہیں ہو رہی منگنی بیٹا جی! رضوان نے منع کر دیا۔ صاف کہہ دیا بس اب پکا کا فرض ادا کرنے کا ٹائم ہے۔ ان منگنی چونچلوں کا ان کے پاس ٹائم نہیں۔ بس اب شیروانی' کلاہ پہن کر بینڈ باجوں کے ساتھ دولہا بن کر سال بعد ان کے گھر جانا اور ان سے ڈھیروں دعائیں لینا۔" ثمینہ نے جل کر جواب دیا۔ اور صوفے پہ بیٹھ کے دونوں ہاتھوں سے سر دبانے لگیں۔

"کیا مطلب 'منع کر دیا۔" وہ ہکا بکا ہوا۔

"اب جب کہ ساری تیاری مکمل ہے۔ تو منع کرنے کی کیا تک بنتی ہے۔" وہ جیسے تپ کر بولا تھا۔

"بس جان! ایک تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہاری رفعت پھپھو نے نویر کی منگنی کے لیے تین چار ماہ کی مہلت مانگ لی۔ اوپر سے اس عمار نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔" بولتے بولتے انہوں نے دانت پیسے تھے۔

"کیوں' بھائی نے کیا کیا ہے۔؟" وہ چونکا۔ ماں کی طیش بھری کیفیت بھی اسے اچنبھے میں ڈال رہی تھی۔

"کرنا کیا ہے۔ بس ماں باپ کے لیے پریشانی کھڑی کرنی ہے۔ منع کر گیا ہے قرۃ سے منگنی کے لیے۔ کہہ رہا تھا نہ اسے قرۃ سے دلچسپی ہے نہ اسے انگوٹھی پہنانے میں۔" ثمینہ تو جیسے رونے کو آگئی تھیں۔ کس سفاکی سے وہ انہیں پریشانی کے گرداب میں دھکیل گیا تھا۔

"آپ ہی کا طے کیا ہوا رشتہ ہے۔ آپ جانیں اور آپ کا کام' مجھے جب قرۃ میں کوئی انٹرسٹ نہیں تو اس سے جڑی فارملیٹز سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ اس امید میں ہر گز مت رہیے گا کہ قرۃ کے ہاتھوں پہ میرے نام کی مہندی لگے گی اور وہ اس گھر میں میری

دلہن بن کر آئے گی۔" عمار سخت لہجے میں وہ سیروں پتھر ان کی ذات پر لڑھکا کر لاہور واپس جاب پہ چلا گیا تھا۔
"میں کیا جواب دوں گی رفعت کو۔ کیا منہ دکھاؤں گی خاندان والوں کو کہ بیٹھے بٹھائے یوں برسوں پہلے طے کیا ہوا رشتہ کیوں ٹوٹ گیا۔" ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ "باسم نے کوئی جواب نہیں دیا۔
وہ تو عریسہ کی خواہش پوری کرنے کی خاطر اس نے یہ سب سلسلہ شروع کیا ہوا تھا' ورنہ وہ بھی سیدھے سیدھے گرینڈ طریقے سے شادی کا قائل تھا۔ وہ بس عریسہ کے رد عمل کو سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اب عریسہ منگنی کے ملتوی ہونے کا سنے گی اس کا ری ایکشن بھی کم نہیں ہو گا۔ کتنی ایکسائیٹڈ تھی وہ اس کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے۔ شاپنگ مالز میں پھر پھر کر اس کی تو ٹانگیں دکھنے لگی تھیں مگر مجال ہے جو عریسہ کے جوش و خروش میں ذرا برابر بھی کمی آئی ہو۔ ایک ایک آئٹم خریدنے میں کئی کئی گھنٹے لگا دیے۔
"یا خدا! ہم پر کرم کر ہمارے معاملات میں آسانی پیدا کر۔" بے ساختہ دعائیہ انداز میں باسم نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر ان ہی ہاتھوں میں اپنا سر گرا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لوگ جب اسماء کے ہاں پہنچیں تو اس وقت سارے مہمان تقریباً" پہنچ چکے تھے۔
اسماء بہت پرتپاک انداز میں ملیں۔ ناجیہ اسٹیج پہ بیٹھی تھی۔ آف وائٹ شرارے' قیمتی جیولری اور مشاقی سے کیے گئے میک اپ نے اس کے دلکش خدوخال کو نکھار دیا تھا۔
عریسہ کی جوں ہی ناجیہ پہ نظر پڑی تو وہ بے ساختہ ایک ہوک سی اٹھی تھی اس کے دل کے اندر' کتنی خوب صورت اور کانفیڈنٹ لگ رہی تھی ناجیہ۔ اور پہلو میں بیٹھا اس کا منگیتر انیق جو تھری پیس سوٹ میں بلا کا ہینڈسم لگ رہا تھا۔ انیق ذرا سا ناجیہ کی طرف جھکے ہوئے ہولے ہولے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ناجیہ کے لبوں پہ ایک شرمگیں مسکان کھل رہی تھی۔ عریسہ اسٹیج کی طرف پشت کرکے لان میں پڑی چیئر پہ بیٹھ گئی۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چلا تھا۔ یہ سب تو اس کی چاہ تھی۔ یوں سج سنور کر اسٹیج پر بیٹھنا' سب مہمانوں کا مرکز نگاہ بننا۔
کتنی معصوم او بے ضرر سی اس کی منگنی کی خواہش تھی۔ جو کسی نے بھی پوری نہ ہونے دی۔ شامہ' امی' ابو' پھپھو' باسم اور سب سے خفا تھی۔ کسی نے بھی اس کی خواہش کا احترام نہ کیا تھا۔
میوزک' ہلا گلا' قہقہے' خوشبوئیں کوئی چیز بھی تو اس کے من کی یاسیت دور کرنے میں کامیاب نہ ہو رہی تھی۔ نازش خاندان کی خواتین میں گھری خوش دلی سے گپ شپ لگا رہی تھیں۔ باسم کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا' ورنہ اس کی کمپنی ہی اس کے مزاج پر اچھا اثر ڈالتی۔
افزا اس کے پھولے چہرے پہ سجے اکتاہٹ کے تاثرات کی وجہ جانتی تھی' تب ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی لڑکیوں کے گروپ میں لے گئی تھی۔ دوپٹا سیٹ کرتی شامہ کی نظر نوریر پہ پڑی تو دل نے ایک بیٹ مس کر دی تھی۔ ادھر نوریر کے لبوں پہ بھی اسے دیکھ کر ایک دلکش مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔
"ہیلو' کیسی ہو؟" وہ قریب آکر بشاشت سے بولا۔
گہری نظریں اس کے سجے سنورے روپ کا دلچسپی سے جائزہ لے رہی تھیں۔ اور نوریر کی یہی نگاہیں تو شامہ کا کام تمام کیے دیتی تھیں۔ دو منٹ بھی اس کے سامنے ٹکنا محال لگتا تھا۔
"فائن۔ آپ کیسے ہیں؟"
جھکی جھکی نظروں سے وہ جواباً" گویا ہوئی۔ اس کے کھلے دراز ریشمی بال ہلکے ہلکے ہوا سے اڑ رہے تھے۔ وہ معمول کے دنوں کی نسبت کہیں زیادہ پیاری اور دلکش لگ رہی تھی' ورنہ تو نوریر نے جب بھی اسے دیکھا' کچن میں مصروف عمل دیکھا۔ عریسہ تو تھی ہی لاپروا اور کھلنڈری طبیعت کی مالک' نازش مامی کو بھی شامہ کی وجہ سے کافی سہولت تھی۔ بے حد سگھڑ' تابع دار اور گھریلو کاموں میں طاق' صورت تو صورت اس کے

اعلا خواص ہی سب کے دل جیتنے کے لیے کافی تھے۔ نوریر کو کبھی کبھی تو خود پہ رشک آنے لگتا تھا کہ قسمت نے شمامہ جیسی لڑکی کا ساتھ اس کے نصیب میں لکھ دیا تھا۔

"تھینک یو شمامہ! تھینک یو ویری مچ۔"

"کس چیز کا شکریہ؟" اس نے حیرانی سے ذرا کی ذرا آنکھیں اٹھائیں۔ "منگنی کے فنکشن کو ملتوی بلکہ سرے سے منعقد ہی نہ کروانے پر میرا ساتھ دینے کا شکریہ۔" وہ پورے جذب سے کہہ رہا تھا۔

"ارے نہیں، مجھے خود یہ منگنی وغیرہ کی رسمیں ٹائم کا ضیاع اور پیسے کی بربادی لگتی ہیں۔ اصل چیز تو کمٹ منٹ ہوتی ہے۔ جب آپ دل و دماغ کے مکمل یقین کے ساتھ کسی کے ساتھ بندھ جاتے ہیں تو ایسی فارملیٹز کے ہونے یا نہ ہونے سے رشتے پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ اعتماد سے ٹھوس لہجے میں بول رہی تھی۔ اس دن لاؤنج کی ڈسٹنگ کرتے ہوئے اس کے سیل پہ نوریر کی کال آگئی تھی۔

"جی نوریر، خیریت؟"

دھڑکتے دل سے پوچھا۔ برسوں کا ساتھ، بے تکلفی، دوستی مگر ابھی بھی بات کرتے ہوئے دل دھڑک دھڑک جاتا تھا، ہتھیلیاں پسیج جاتیں۔

"شمامہ! باسم اور عریسہ کی منگنی کے فنکشن کے ساتھ امی میری اور تمہاری منگنی کا بھی فنکشن رکھنا چاہ رہی ہیں مگر ہماری معاشی حالت فی الحال اس قسم کی تقریب کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ تم جانتی تو ہو۔ ایک میں کمانے والا، چھوٹے بہن بھائیوں کی اسکولنگ، امی کی دوائیں۔ یار! تم ایسا کچھ کرو کہ ہماری منگنی کا فنکشن تین چار ماہ تک پوسٹ پون (ملتوی) ہو جائے۔" نوریر انتہائی درخواست گزاری کے سے انداز میں بول رہا تھا۔

"تین چار ماہ کیوں نوریر! یہ فنکشن سرے سے ہی غیر اہم اور غیر ضروری ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے اس قسم کی تقریب کا۔ یہ تو باسم اور عریسہ کو اپنی منگنی پہ فرینڈز کو بلانے کا شوق چرایا ہے۔ انہیں شوق پورا کرنے دیں۔ مجھے اور آپ کو اس میں شامل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے سہولت سے بات ختم کر دی تھی۔

"شمامہ! تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ امی ہر حال میں تمہیں انگوٹھی پہنانے پہ در پے ہیں۔ یہ ان کے لیے انا اور عزت کا مسئلہ ہے کہ عریسہ کو مامی ثمینہ رنگ پہنا سکتی ہیں تو وہ کیوں نہیں۔ ایک طرف خاندان میں ناک اونچی رکھنے کا شوق، دوسری طرف گھریلو اخراجات، وہ توازن نہیں رکھ پا رہی ہیں۔ دوسرا میری کسی بات کو بھی ماننے سے انکاری ہیں اب تم ہی کچھ کرو؟"

اس نے رات کے کھانے کے بعد معمول کے مطابق چائے بنائی۔ اور ٹرے میں کپ رکھ کر اسٹڈی میں چلی آئی۔ رضوان احمد ناک کی پھننگ پہ عینک ٹکائے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ جب بھی چائے دینے آتی تو ڈھیر ساری باتیں ان سے کرتی۔ کالج کی باتیں، فرینڈز کے قصے، خاندان میں آنے والے اتار چڑھاؤ، عریسہ کی بدتمیزیاں، شوخیاں، رضوان احمد گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے اس کی ساری باتوں کو توجہ سے سنے جاتے۔ جب تک وہ آخری چسکی لیتے، وہ باتوں کا کوٹہ مکمل کر چکی ہوتی۔

آج بھی باتوں باتوں کے دوران وہ اپنے مدعا پر آگئی۔

"ابو! باسم اور عریسہ نے مل کر منگنی کی لاکھوں کی شاپنگ کر لی ہے۔ رفعت پھپھو بھی اس فنکشن میں اپنے بیٹے کی خوشی شامل کرنا چاہتی ہیں۔ جب کہ مالی لحاظ سے ان کا ہاتھ ان دنوں کافی تنگ ہے، منگنی کا خرچہ تو درکنار، روز مرہ کے اخراجات کے لیے بھی پیسے کم پڑ جاتے ہیں۔ بس خاندانی وقار اور وضع داری سے مجبور ہو کر منگنی کا بلاوجہ کا خرچہ کر رہی ہیں۔ میری وجہ سے ان کا بجٹ خراب ہو، یہ میں ہر گز نہیں چاہتی۔ پلیز آپ کچھ کریں کہ ان کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچے نہ ہی ان کے گھریلو معاملات کسی تنگی کا شکار ہوں۔" جھجک جھجک کر بولتے ہوئے اس نے بات مکمل کر کے

ان کا چہرہ دیکھا تھا۔ رضوان احمد کی زیرک اور معاملہ فہم طبیعت سارا مسئلہ سمجھ چکی تھی۔ بیوہ بہن رفعت کے حالات کوئی ان سے ڈھکے چھپے تو نہیں تھے۔ اس دفعہ ثمینہ منگنی کی ڈیٹ پوچھنے آئیں تو انہوں نے صاف صاف کہہ ڈالا۔

"دیکھیں بھابھی! یہ منگنی وغیرہ کا سلسلہ فی الحال کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ اس مہینے کے کسی بھی ٹائم میرا جاپان کا ٹور متوقع ہے۔ بچے جو ہلہ گلہ خوشی مستی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی شادی پہ سارے ارمان پورے کرلیں۔ فی الحال میرے شیڈول میں اس منگنی وغیرہ کا وقت نہیں نکلتا۔" ثمامہ اور نوریز دونوں کے دلوں میں ایک ساتھ اطمینان اترا تھا۔ یہ محبت کرنے والے اگر ایک دفعہ جام محبت سے گھونٹ بھرلیں تو تاعمر ان کے رویوں میں مٹھاس آجاتی ہے۔ جن کے دلوں میں چاہتوں کے دیپ فروزاں ہوں وہ اگر صحرا میں بھی پاؤں رکھ دیں تو وہ بھی گل و گلزار بن جائے۔

☆ ☆ ☆
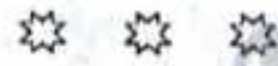
"اتنے دن کیوں لگا کر آئے ہو اس دفعہ۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی ثنا خفگی سے بولی تھی۔

"اتنے دن کہاں، صرف ایک ہفتہ تو لگا کر آیا ہوں۔" مہارت سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے عمار نے ثنا کے چہرے پہ نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں ایک ہفتہ مطلب سیون ڈیز' سیون ڈیز کم ہوتے ہیں۔" ثنا کا انداز ہنوز تھا۔

"میڈم! آفس کی طرف سے ڈیو لیوز ملی تھیں۔ ایسے خواہ مخواہ چھٹی مار کر نہیں بیٹھ گیا تھا۔" عمار نے مسکراتے ہوئے موڑ کاٹا تھا۔

"جی! آفس کی طرف سے لیوز ملی تھیں' لیکن میں تمہیں جسٹ دو دن کی لیوز الاؤ کرتی ہوں' انڈراسٹینڈ!" ثنا کا انداز تحکمانہ تھا۔

"کیوں میڈم! جب سارے ایمپلائز کو ہفتے کی چھٹیاں ملتی ہیں تو مجھ غریب پر یہ ستم کیوں؟" عمار نے تجاہل عارفانہ برتا۔ "یو نو ویری ویل مسٹر عمار! کہ سارے ایمپلائز میرے آفس کے محض ورکرز ہیں۔ بھلے سے ایک ماہ کی چھٹیوں پہ بھی چلے جائیں' مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مگر آپ کا مقام کسی کا دل ہے۔ اور یہ دل آپ سے استدعا کرتا ہے کہ اتنے دن آنکھوں سے دور نہ رہا کریں۔ یہ دل ہمہ وقت آپ کو آس پاس دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے۔ آپ کی اتنے دنوں کی دوری پہ پریشان ہوجاتا ہے۔ گھبرا جاتا ہے۔ پلیز اس دل کو اتنا نہ ستایا کریں۔" ثنا کمال اعتماد سے عمار کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر گہرے جذب سے بول رہی تھی۔

اتنا واضح اور کھلا اعتراف' عمار کی روح اندر تک شانت ہوگئی تھی۔ من کے اندر دور تک پھول کھلتے چلے گئے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ ثنا پہلی بار اس سے اپنی محبت کا اعتراف کررہی تھی' بلکہ جب جب وہ اپنی بے قراریوں' بے تابیوں پر مشتمل حکایت دل سناتی' تب تب عمار کو محسوس ہوتا جیسے اس کی بے مول ہستی انمول ہوگئی ہو۔

وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب بھی تھا۔ کیا تھا وہ "محسن بلڈرز کمپنی" میں فنانس ڈیپارٹمنٹ کا اسسٹنٹ منیجر' جس کا کام کمپنی کے مالی معاملات کی دیکھ بھال کرنا اور بس اور ثنا گردیزی' محسن گردیزی کی اکلوتی نور نظر' "محسن بلڈرز" کی تن تنہا مالک۔

ملازم و مالک کا محبت کے معاملے میں کیا تال میل۔ مگر محبت تو محبت ہوتی ہے۔ نجانے کب' کہاں اور کس پر سایہ فگن ہوجائے' کون جانے؟

ہینڈسم' خوش شکل اور دراز قد عمار ریحان پہلی ہی نظر میں ثنا کو اچھا لگا تھا۔ اعلا تعلیمی اداروں کی ڈگری ہولڈر' بلا کی کونفیڈنٹ خوب صورت و دلکش خدوخال کی مالک ثنا نے پسندیدگی سے محبت تک کا فاصلہ بہت تیزی سے طے کیا تھا۔ اور عمار کی قابلیت' ذہانت' محنت اور ایمان داری کی اس وقت قائل ہوگئی جب محسن گردیزی فالج کے حملے میں پیرالائز ہوگئے تھے۔

باپ کے بستر پر لگتے ہی ثنا نے تمام کاروبار اپنے ہاتھوں میں لیا تو اسے عمار کے ان خواص کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دل اور شدت سے اس کی ہمراہی کا

طالب ہوگیا۔ کار ایک ریسٹورنٹ کے سامنے آرکی۔ وہ دونوں یہاں لنچ کے لیے آئے تھے۔

"پاپا! تمہارا پوچھ رہے تھے؟" ثنا چیئر پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ویٹر قریب آگیا۔ "یقیناً" ان پہ بھی اپنی صاحب زادی کی طرح میری غیر موجودگی گراں گزرتی ہوگی۔" مینیو کارڈ دیکھتے ہوئے عمار نے شوخی سے چھیڑا تھا۔

"جی نہیں' منہ دھو رکھو۔ سارے ایمپلائیز کے شیڈول کا پتا ہوتا ہے انہیں۔ تم سے کوئی فنانشل میٹر ڈسکیس کرنا تھا انہوں نے۔" اس کی شوخی پہ ثنا چڑ کر بولی تھی۔

☆ ☆ ☆
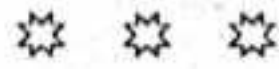
"کیسی لگ رہی ہوں میں؟" سلور ہائی ہیلز پر گھوم کر عریسہ نے ناز سے بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"انتہائی غیر ضروری اور بے موقع لگ رہا ہے تمہارا یہ سنگار" تکیے کا کور بدلتے ہوئے ثمامہ نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"واٹ' غیر ضروری۔"

عریسہ کی آنکھیں حیرت سے ابلیں۔

"میں اپنے ڈیئر فیانسی کے ساتھ ڈنر پہ جا رہی ہوں۔ اور اس کینڈل لائٹ ڈنر میں وہ مجھے انتہائی رومانٹک موڈ میں رنگ پہنائے گا۔ اور تم کہہ رہی ہو میری تیاری غیر ضروری ہے۔ تو کیا ایسے منہ دھو کر' گھریلو حلیے میں چلی جاؤں۔" عریسہ انتہائی آف موڈ میں بولی۔ ثمامہ کی بات نے اسے "حقیقتاً" حیران کیا تھا۔

"نہیں تمہاری تیاری نہیں بلکہ یہ ڈنر ہی مجھے غیر ضروری لگ رہا ہے۔" عریسہ کو سراپا دیکھتے ہوئے ثمامہ آرام سے بولی۔ عریسہ اس وقت بلیک زمین کو چھوتے فراک اور پاجامے میں ملبوس تھی۔ فراک کے فرنٹ اور آستینوں پر اسٹونز کا کام تھا۔ بالوں کا اسٹائلش سا انداز' سموکی آئیز میک اپ کے ساتھ' لائٹ براؤن لپ اسٹک میں وہ خاصی خوب صورت اور غیر معمولی لگ رہی تھی۔

"ہونو ثمامہ! مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے درمیان روایتی دو بہنوں والی اسٹوری شروع ہونے والی ہے۔ دو انگیجڈ بہنیں' چھوٹی بہن بہت خوب صورت' زندگی کا پل پل انجوائے کرنے والی' انتہائی رومانٹک' نہایت زندہ دل جو اپنے منگیتر کے ساتھ فل کمیٹڈ ہے۔ اور بڑی بہن' جس کے ایک ہاتھ میں جھاڑو ہوتی ہے۔ تو دوسرے میں ڈسٹر۔ جس کا ایک پاؤں کچن تو دوسرا لاؤنج میں ہوتا ہے' جس کے لیے اپنے منگیتر سے دو لفظ محبت کے کرنے سے بہتر اسٹور کی صفائی ہے۔ وہ بڑی بہن اپنی بے کیف' بے رنگ اور بدمزا زندگی کا انتقام لینے کے لیے ہر وقت بس چھوٹی بہن پر تنقید کرتی رہتی ہے۔" دونوں ہاتھ نازک کمر پہ ٹکائے عریسہ انتہائی جلے کٹے انداز میں بول رہی تھی۔

"توبہ ہے عریسہ! یہ تم اپنا اور میرا احوال سنا رہی ہو یا پرائم ٹائم ڈرامے کا خلاصہ؟" ثمامہ کی جو ہنسی چھوٹی تو کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔ عریسہ سخت کینہ توز نظروں سے اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"جاؤ میری بہن! جاؤ اپنے منگیتر کے ساتھ ڈنر کرنے۔" ثمامہ نے ہنسی پہ بمشکل قابو پاتے ہوئے عریسہ کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ پھر گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

"میرے کہنے کا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ یہ بار بار منگیتر کے ساتھ ہوٹلنگ کرنا' شاپنگ پر جانا' لانگ ڈرائیو' یہ ساری بے تکلفی ان فطری مسرتوں کو مدہم کردیتی ہے' جو شادی کے بعد انسان کو ملتی ہیں۔" وہ نرم و ہموار انداز میں اپنا موقف بیان کرتے ہوئے بولی۔

منگنی کا فنکشن ملتوی بلکہ منسوخ ہونے کا غم عریسہ کئی دنوں تک اپنے انداز میں مناتی رہی تھی۔ ہر کسی سے بات چیت مکمل بند۔ گھر کے سارے دروازوں' کھڑکیوں' درازوں کی شامت آئی ہوئی تھی۔ اتنے زور سے کھولتی' بند کرتی کہ در و دیوار تک ہل جاتے تھے۔

سب ہی اس کی روٹین سے ناک کے بانسے تک عاجز آچکے تھے۔

"چلو ایسا کرتے ہیں کہ کسی دن باہر ڈنر کرتے ہیں۔

وہیں تمہیں رنگ پہنا دوں گا۔ یہ مہمان گیدر رنگ٬ فوٹو سیشن سب شادی پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ رائٹ؟" باسم کو اس کا موڈ بحال کرنے کا ایک یہی طریقہ سوجھا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے٬ میں سوچتی ہوں اس بارے میں۔" بظاہر بے دلی سے اس نے نیم رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ ورنہ تو باسم کے ساتھ باہر جا کر ڈنر کرنا٬ اف اس سے بڑھ کر کچھ اور ہو سکتا تھا۔ گاڑی میں بجتا دھیمے سروں کا میوزک اور لمبی ڈرائیو۔ وہ پورا دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ معاً" باسم کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا تو اس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن ہو گئیں۔ فوراً" آگے بڑھ کر شمامہ کے رخسار کا بوسہ لیا اور پرس جھلاتی باہر نکل گئی۔

"پاگل نہ ہو تو۔" شمامہ سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کھڑکی پہ آ گئی۔ بھاری کرٹن ہٹا کر دیکھا۔ رضوان ولا روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ لان میں آگے مختلف پھولوں کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ باسم دلنشین مسکراہٹ لبوں پہ سجائے فرنٹ ڈور کھولے کھڑا تھا۔ عریسہ شاہانہ ناز و انداز سے سیٹ پہ براجمان ہوئی تھی۔ اسی دم اس کے موبائل پہ میسج بپ بجی۔ وہ چونک کر پلٹی اور بیڈ تک آئی۔ نویر کا میسج تھا۔

"میری پروموشن ہو گئی ہے۔ کل اس خوشی کو سیلی بریٹ کرنے سب گھر والوں کو ایک ہوٹل میں لے جا رہا ہوں۔ مگر تمہارے ساتھ الگ سے ڈنر پکا ہے۔ میری خوشیوں پہ اتنا ہی تمہارا حق ہے٬ جتنا باقی گھر والوں کا۔ صرف ڈنر نہیں٬ تمہیں شاپنگ بھی کروانی ہے۔ اچھی سی۔" ٹیکسٹ کے ایک ایک لفظ سے نویر کے جوش اور خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی چھوٹے سے میسج نے اس کے چہرے پہ خوشی کے بے شمار رنگ بکھیر دیے تھے جن میں تشکر کا رنگ سب سے واضح تھا۔

"کانگریٹس نویر! جب بھی گھر والوں کا باہر ڈنر کا پروگرام بنے٬ مجھے بھی شامل کر لیجئے گا۔ مجھے سب کے ساتھ انجوائے کرنے میں یقیناً" مزا آئے گا۔ اور شاپنگ وغیرہ کا تکلف فی الحال ضروری نہیں۔" وہ بیڈ پہ بیٹھ کر سکون سے ٹائپ کرنے لگی۔ اس نے کچھ دیر پہلے جو الفاظ عریسہ سے کہے تھے٬ بالکل صدق دل سے کہے تھے۔

☆ ☆ ☆

محسن گردیزی مکمل طبی سہولیات اور توجہ و احتیاط کی بدولت تیزی سے روبہ صحت تھے۔ بزنس کی طرف سے بھی انہیں اطمینان حاصل تھا کہ ثنا نے آفس کی تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے اپنے ذمہ لے رکھی تھیں۔ رات کو سونے سے قبل وہ ان کے بیڈ روم میں چلی آتی٬ ان کا احوال دریافت کرتی۔ آفس کے تمام معاملات٬ دن بھر کی کارگزاریاں انہیں بتاتی۔

اس کی باتوں میں ان کے فنانس منیجر عمار ریحان کا اکثر تذکرہ ہوتا۔ اور یہ تذکرہ ہمیشہ توصیفی پیرائے میں ہوتا۔

"پاپا! ریحان بہت ایمان دار اور انٹیلی جنٹ ورکر ہے۔ میں اس سے اکثر گائیڈ لائن لیتی رہتی ہوں۔ بہت بااصول اور ڈیسنٹ اپنے کام کے ساتھ انتہائی کمٹڈ۔" ریحان کا ذکر کرتے وقت ثنا کے چہرے پہ خاص قسم کے رنگ اترنے لگتے تھے۔ اس کی خوبیاں بتاتے ہوئے ایک پرحجاب مسکان اس کے لبوں پہ چمکنے لگتی تھی۔

محسن گردیزی مفلوج تھے۔ بولنے سے قاصر تھے۔ بدقت بولنے پر بھی چند الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر لبوں سے ادا ہوتے تھے۔ مگر ان کے حواس و شعور اور ذہن مکمل بیدار اور متحرک تھے۔ ثنا کے لبوں پہ باربار کا تعریفی تذکرہ انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

امبرین گردیزی ان کی چہیتی شریک حیات بریسٹ کینسر کے ہاتھوں زندگی کی جنگ ہار کر اس وقت انہیں تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھیں جب ثنا محض دو سال کی تھی۔

امبرین ان کی اولین چاہت تھیں۔ ان کی جواں مرگی ان کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ امبرین کے جانے کے بعد وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔

وہ کاروبار جو انہوں نے اپنے دوست کی شراکت سے شروع کیا ہوا تھا۔ ان کی عدم توجہی اور عدم دلچسپی کی بنا پر خسارے کا شکار ہونے لگا تھا۔ پھر اپنے بزنس پارٹنر و دوست سہیل انصاری کے بار بار سمجھانے، توجہ اور حوصلہ دلانے کی بدولت وہ کاروبار کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ ساتھ ہی انہیں ننھی ثنا کا خیال آیا تھا، جو ماں کے جانے کے بعد کلی طور پر اب گورنس کے حوالے تھی۔

ثنا کو بازوؤں میں بھر کر اس کے معصوم چہرے پہ بوسہ دیتے ہوئے انہوں نے خود سے عہد سے کہا تھا کہ وہ کبھی ثنا کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ اور نہ ہی اسے سوتیلی ماں کے دکھ سے آشنا کریں گے۔

بیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ وہ بزنس جو انہوں نے فورٹی پرسینٹ شیئر ہولڈر کی حیثیت سے اپنے دوست کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اپنی ذہانت، مسلسل محنت اور ایماندارانہ اصولوں کی بدولت اس بزنس کے تن تنہا مالک بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کاروباری حلقوں میں ان کی کمپنی نے ایک مستحکم پوزیشن حاصل کرلی۔ اب صرف ایک روایتی باپ کی طرح ثنا کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر تھی انہیں۔

ان کی بہن نازنین کئی بار ان سے اس سلسلے میں بات کرچکی تھیں۔

"بھائی جان! ارسل خیر سے اپنی تعلیم مکمل کرچکا ہے۔ اسے اپنے آفس میں کوئی کام دیجئے۔ ویسے بھی بعد میں سب کچھ اس نے سنبھالنا ہے تو ابھی سے کاروبار کے اسرار رموز سیکھ لے۔" وہ ثنا کی رائے لیے بنا انہیں کوئی جواب دینے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ہاں مگر ارسل کو انہوں نے آفس بھجوا دیا تھا۔ ساتھ ہی ثنا کو بھی اشارے کنائیوں میں اسے سلسلے میں ہدایت کردی تھی۔ ثنا نے ارسل کو پرچیزنگ سیکشن میں ریکارڈ مینیجر کی سیٹ دے دی تھی۔ اعداد و شمار کا گورکھ دھندہ، جمع، ضرب، تقسیم، ارسل تو ایک ہی دن میں بوکھلا گیا تھا۔ ایک ہی ہفتے میں اتنی فاش غلطیاں کہ ثنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ ارسل نے تو سارے ریکارڈ کا کباڑہ کرکے رکھ دیا تھا۔

"مسٹر ارسل! جب آپ کاروبار کی ابجد سے بھی واقف نہیں تو آپ کو یہ خوش فہمی کیونکر لاحق ہوتی کہ آپ پرچیزنگ چیک اینڈ بیلنس جیسی اہم اور حساس نوعیت کی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہیں؟" اپنے آفس میں بلا کر انتہائی افسران اسٹائل میں ارسل سے ثنا نے پوچھا تھا۔

ثنا کا روڈ اور سخت انداز ارسل پہ سخت گراں گزرا تھا۔ مارے توہین کے اس کے کان سرخ ہوگئے تھے۔

"یہ دیکھیں۔ سلائیڈ نمبر فائیو سلائیڈ نمبر نائن۔" ریوالونگ چیئر پہ بیٹھے بیٹھے ثنا نے اپنا لیپ ٹاپ کا رخ ارسل کی طرف کرکے اس کی غلطیاں اسے دکھائی تھیں۔

"کوئی ایک ایسی سلائیڈ ہے جس میں آپ نے غلطی نہ کی ہو۔" عمار نے بے حد دلچسپی سے ارسل کے چہرے پر سرخی سمٹتے دیکھی تھی۔

"اس دفعہ تو میں خود کریکشن کرلیتی ہوں، مگر نیکسٹ ٹائم بی کیئر فل۔" سرد لہجے میں کہتے ہوئے وہ دوسرے لفظوں میں اسے جانے کا کہہ رہی تھی۔

"اف۔ اتنی انسلٹ؟ وہ بھی اس عمار کے سامنے۔" ارسل کا دل چاہا یہیں کھڑے کھڑے اس دو چھٹانک کی لڑکی کو اوقات یاد دلا دے۔ یہ کرسی جس پہ یہ مزے سے بیٹھی جھول رہی ہے، اس کرسی کا حق دار وہ خود کو سمجھتا تھا۔ مگر اس نے تو اسے ہندسوں کے ہیر پھیر میں الجھا دیا تھا۔ کزن سمجھ کر بھی کوئی غلطی در گزر کرنے کو تیار نہیں۔ وہ ایک کھولتی نظر ثنا اور پھر عمار پہ ڈال کر گلاس ڈور دھکیلتا باہر نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نوریر نے اپنی پروموشن کی ٹریٹ میں نہ صرف اپنے گھر والے بلکہ ریحان ماموں اور رضوان ماموں دونوں کی فیملیز کو بھی شامل کیا تھا۔ سٹی گارڈنز کے وسیع اور سبزہ زار قطعوں میں رکھی ٹیبلز پر اس وقت ان تینوں فیملیز کا قبضہ تھا۔ رات کے وقت کی ٹھنڈی، عطر بیز

ہوا جسموں کو سرور آمیز سکون بخش رہی تھی۔ روشن جگمگاتے پول لیمپس کا عکس سوئمنگ پولز کے پانیوں میں جھلملا رہا تھا۔

افزاء، فاریہ، قرۃ، ثمامہ اور عریسہ ایک ٹیبل کے گرد بیٹھی تھیں۔ ہنسی اور گپ شپ کے درمیان عریسہ بڑے ناز سے وہ ڈائمنڈ رنگ سب کو دکھا رہی تھی جو پچھلے ہفتے باسم نے اسے ڈنر پہ پہنائی تھی۔ انگوٹھی میں جڑے ہیرے کی جگمگاہٹ زیادہ ہے یا عریسہ کے چہرے کی، قرۃ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔

"ویسے شادی سے پہلے کی یہ بے تکلفی مجھے نہیں پسند۔ منگیتر سے ایک فاصلے اور حجاب میں ملنا چاہیے، تب ہی اس رشتے کا حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ ورنہ تو یہ بار بار کا ملنا، تحفے تحائف کا تبادلہ باہم کشش اور لگاؤ کو ختم کر دیتا ہے۔" قرۃ عریسہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے سخت اور کاٹ دار لہجے میں بولی تھی۔

عریسہ ایسی اور اس سے ملتی جلتی باتیں روز گھر میں ثمامہ سے سنتی رہتی تھی۔ اس لیے مائنڈ کیے بغیر مکمل اعتماد سے جواباً "گویا" ہوئی۔

"ڈیئر یاجی! اس دنیا میں خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں محبت اپنا آپ دان کرتی ہے، اور اس سے بڑھ کر بھی خوش نصیب وہ ہوتے ہیں جنہیں اپنی محبت کے اظہار کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ محبوب کے محبت بھرے جذبات کی خاطر خواہ انداز میں پذیرائی کرنا جانتے ہوں۔ اور میرا اور باسم کا شمار بھی ایسے ہی خوش نصیبوں میں ہوتا ہے۔" نرم نظروں سے قرۃ کو دیکھتے ہوئے عریسہ نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات مکمل کی تھی۔ قرۃ کے لب بے ساختہ بھینچ گئے تھے۔

اسی دوران ویٹر گرما گرم، اشتہا انگیز ڈشز سرو کرنے لگا۔ سب کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی تھی۔

قرۃ کا دل نجانے کیوں بھر بھر آ رہا تھا۔ کچھ بھی تو اچھا نہ لگ رہا تھا۔ جس چہرے پہ نظر ڈالی، وہی چہرہ اسے خوش باش اور مطمئن نظر آیا تھا۔ سوائے اس کے۔ وہ اس وقت قنوطیت، افسردگی اور خود ترسی کی انتہا پہ کھڑی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ارسل بیٹا! اٹھو، اتنی دیر ہو گئی ہے۔ آفس نہیں جانا کیا۔" نازنین ارسل کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو دیکھا کہ ارسل ابھی تک سو رہا تھا۔ نازنین نے پردے سمیٹ کر ایک طرف اکٹھے کر دیے۔ تیز چمکیلی دھوپ اندر سارے میں پھیل گئی تھی۔

"اٹھو جانو! ہاتھ لینے، ناشتا کرنے، پھر چینج کرنے میں تمہیں اتنا وقت لگ جائے گا کہ آفس کے لیے دیر ہو جائے گی۔" وہ اس کے بیڈ پہ بیٹھ کے پیار سے اس کے ماتھے کے بال ہٹاتے ہوئے بولیں۔ نازنین کی بات پہ ارسل کے چہرے پہ ناگواری چھا گئی تھی۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔

"بھاڑ میں جائے آفس، میں کوئی آفس وافس نہیں جا رہا۔" ایک لمبی جمائی لینے کے بعد دونوں بازو پھیلا کر انگڑائی لی تھی۔

"مگر کیوں، اچھے بھلے تو جا رہے تھے، اب کیا ہوا؟" کمبل کو تہ لگاتے ہوئے نازنین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ممی! میں کہہ چکا ہوں کہ میں ماموں کے آفس میں نہیں کام کر رہا۔ وہ ثنا ایک نمبر کی روڈ اور بدتمیز لڑکی ہے۔ مجھ سے نوکروں جیسا ہی بیو کرتی ہے۔ ذرا سی غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ لے کے اتنا بے ہودہ کام ذمے لگا دیا۔" ارسل جلے بھنے انداز میں بولا۔

"ہاں میں جانتی ہوں ثنا بہت مغرور اور موڈی لڑکی ہے۔ بھابھی کے جانے کے بعد بھائی جان نے اسے لاڈ پیار سے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں پھپھو ہوں، مجال ہے جو کبھی مجھ سے لاڈ سے بات کی ہو۔ پھر بھی جانو! تم اس کا رویہ برداشت کرو۔ اس سے دوستی، لگاؤ پیدا کرو۔ جیسے وہ کہتی ہے۔ ویسے کرتے جاؤ، ایک بار شادی ہو جائے تو ساری چوکڑی بھول جائے گی۔ اس سارے بزنس کے تم تنہا مالک بن جاؤ گے۔" نازنین اسے ہمیشہ والا سہانا خواب دکھا رہی تھیں، ثنا کو بہو بنانے سے زیادہ انہیں

اس جائیداد میں دلچسپی تھی، جو ثنا کے نام تھی۔ اس لیے چالاکی، ہوشیاری اور مصلحت سے ثنا کا دل جیتنے کے گر ارسل کو بتاتی رہتی تھیں۔

"ہونہہ دوستی اور لگاؤ پیدا کروں۔" ارسل زہر خند ہوا۔

"آپ کی بھتیجی صاحبہ اس عمار کے ساتھ آل ریڈی سیٹ ہوچکی ہیں اس کے بازو میں ہاتھ ڈالے ہوٹلنگ اور شاپنگ کی جاتی ہے۔ آؤٹنگ، لانگ ڈرائیو۔ اسے عمار کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا۔ بھول جائیں کہ وہ اس گھر میں آپ کی بہو بن کر آنے پر رضامند ہوجائے گی۔" ارسل کی بات نے تو نازنین کو گم صم کردیا تھا۔

"یہ ثنا میرے بیٹے کے ہوتے ہوئے کسی اجنبی، غیر کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا کر اچھا نہیں کر رہی ہے۔" انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں بولتے ہوئے کشنز سیٹ کردیے تھے۔

"فارگیٹ اباؤٹ اٹ، میں تو سمجھا تھا کہ بس فائلز پہ سائن کرنے ہوں گے مجھے، لے کے اتنا مشکل کام میرے سر پر ڈال دیا۔ دو ٹکے کی شکل نہیں۔ اس سے بدرجہا خوب صورت لڑکیاں مجھ پہ مرتی ہیں اور یہ کس گھمنڈ میں رہتی ہے۔" حقارت بھرے انداز میں کہتے ہوئے ارسل نے اپنا موبائل ہاتھ میں لے لیا۔ روزمہ کی کال آرہی تھی۔

"ایکسیوزمی۔" وہ موبائل کان سے لگاتا باہر ٹیرس پہ چلا گیا تھا۔

ارسل نے انہیں سچ مچ پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی پریشانی کو دور کرنے کی خاطر وہ محسن گردیزی کے پاس چلی آئیں۔

"بھائی جان! آپ ثنا کو سمجھائیں۔ وہ ارسل سے تمیز سے پیش آیا کرے۔ بات بات پہ اسے جھڑک کر رکھ دیتی ہے۔ اپنے ساتھ آفس میں بٹھا کر اسے کاروبار کی باریکیاں سمجھائے۔ ارسل کے پاس ایم بی اے کی ڈگری تو ہے، لیکن تجربہ نہیں۔" محسن گردیزی بیڈ پہ ساکت لیتے نازنین کی باتیں سن رہے تھے۔

گلاس میں دودھ لے کر اندر آتی ثنا کے کانوں میں نازنین کی باتیں پڑیں تو اس کی پیشانی ناگواری سے سکڑ گئی تھی۔

"اوہ! تو پاپا سے میری شکایت کی جارہی ہے۔" وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی اور نازنین کو سلام کیا۔ "جیتی رہو، سدا خوش رہو، ادھر آکر میرے پاس بیٹھو۔" اس کے سلام کا خوش دلی سے جواب دیتے وہ محبت سے اسے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ مگر وہ محسن صاحب کے بیڈ کے قریب صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"بیٹا! آج ارسل آفس نہیں آسکا۔ کیونکہ آج اس کی ذرا طبیعت خراب تھی۔ اس لیے چھٹی کرلی۔"

"پھپھو! میں تو کہتی ہوں صرف آج نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ارسل آفس سے چھٹی کرے تو بہتر ہے۔" وہ سنجیدگی سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

نازنین کو اس سے اتنی صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔ جھٹ محسن صاحب کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں، ملاحظہ کرلی اپنی صاحب زادی کی بدتمیزی۔ ثنا نے ان کی نظروں میں پاپا کو جتانا صاف محسوس کرلیا تھا۔ اس نے صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی۔

"پھپھو! آئی ایم ساری میرے آفس میں ارسل کے لیے کوئی جگہ نہیں بنتی۔ ارسل انتہائی لاپروا، غیر ذمہ دار ہے۔ اور لیٹ آفس پہنچنا اور آف ٹائم سے پہلے نکل جانا اس کا معمول ہے۔ ایک تو اس کا کام مکمل نہیں ہوتا اور جو ہوتا ہے اس میں غلطیوں کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ انہیں درست کرنا الگ ایک سردرد۔ سارا دن یہ موبائل پہ اپنے فرینڈز کے ساتھ گپ شپ میں بزی رہتا ہے۔" وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے متانت سے بول رہی تھی۔ نازنین کا تنفس ایک دم سے تیز ہوا تھا۔ ان کے اکلوتے لاڈلے بیٹے پہ اتنی کھلی تنقید برداشت کرنا بھلا کہاں آسان تھا ان کے لیے بمشکل زہر کا گھونٹ بھر کر بولیں۔

"تو بیٹا جی! نیا نیا ماحول ہے اس کے لیے۔ ایڈجسٹ ہونے میں ٹائم تو لگے گا۔ ارسل ویسے بھی تمہارے رویے کی شکایت کرتا ہے۔ کہتا ہے ممی ثنا مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ میرے ساتھ کبھی لنچ پہ نہیں گئی، کتنا دل چاہتا ہے اسے باہر شاپنگ پہ لے جاؤں مگر یہ لفٹ ہی نہیں کراتی مجھے۔"

"کیوں، میں ارسل کے ساتھ کس خوشی میں ہوٹلنگ یا شاپنگ کروں۔" نازنین کی بات نے اسے خوب غصہ دلایا تھا، پھر بھی وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"تو عمار کے ساتھ کس خوشی میں سارا دن گھومتی رہتی ہو، قہقہے لگاتی، سارا دن آفس میں اس کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لگاتی ہو۔ کس رشتے سے وہ ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا ہے، کیوں اسے ہر وقت ساتھ لیے پھرتی ہو۔" نازنین نے زہریلی مسکراہٹ سے طنزیہ انداز میں پوچھا تھا۔ ثنا کا تو رواں رواں سلگ اٹھا تھا ان کے انداز پر۔

"پھپھو! عمار کا یہاں ذکر۔" وہ غصے سے چیخ کر بولی تھی۔ "کیوں اس کا تو ذکر بنتا ہے۔ یہاں پر۔" نازنین حظ لیتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

"بیمار، معذور باپ کی مجبوری کا فائدہ خوب اٹھا رہی ہو۔ اس مفلوج آدمی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تم کیا سمجھتی ہو ہم سب کو بے وقوف بنا لوگی۔ سارا شہر تمہاری اور اس کی عمار کی دوستی کا گواہ ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھنا، کھانا اور میرے بیٹے سے اجنبیوں کا سا سلوک۔" بیٹے کی دال گلتی نہ دیکھ کر نازنین نے محبت مروت کے سارے چولے ایک دم سے اتار کر پھینک دیے تھے۔ ثنا کے چہرے کی رنگت ایک دم سے زرد پڑ گئی تھی۔ بے حد پریشانی سے اس نے محسن صاحب کی طرف دیکھا جن کے چہرے پہ سخت اذیت کے تاثرات تھے۔

"پلیز آپ چلی جائیں یہاں سے۔ آپ کی لغو گوئی سے میرے پاپا کی طبیعت بگڑ سکتی ہے۔" وہ آنسو پیتے ہوئے سختی سے نازنین سے مخاطب ہوئی تھی۔

"میری لغو گوئی سے نہیں بلکہ بیٹی کے کرتوت کھلنے سے ان کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ ہائے میرا مجبور بھائی، کس قدر بے چارگی سے بیٹی کے ہاتھوں اپنی عزت کو مٹی میں رلتے دیکھ رہا ہے، مگر کچھ کر نہیں سکتا، کچھ بول نہیں سکتا۔"

"خدا کے لیے خاموش ہو جائیں، اپنے پاپا کی عزت مجھے اپنی جان سے عزیز ہے۔" وہ ایک دم چیخ کر بولی تھی۔

محسن صاحب کے چہرے کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو چکی تھی۔ منہ سے رال بہنے لگی تھی۔ کچھ کہنے کی کوشش میں ان کے منہ سے ناقابل فہم آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر اچانک سے ان کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔

"پاپا!" ثنا چیخ مار کر ان کی طرف بڑھی تھی۔

☼ ☼ ☼

محسن گردیزی کی حالت نہایت بگڑ گئی تھی۔ انہیں آئی سی یو میں منتقل کیا گیا تھا۔ رو رو کر ثنا کا برا حال تھا۔ وہ اپنے پاپا کی اس حالت کا ذمہ دار خود کو سمجھ رہی تھی۔ نہ وہ اس دن پھپھو سے دوبدو بات کرتی، نہ پاپا ان کی فضول باتوں کو دل پر لے کر اس حال کو پہنچتے۔

نازنین بھی ارسل کے ہمراہ اسپتال محسن صاحب کو دیکھنے آئی تھیں۔ ثنا نے مارے نفرت کے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ عمار ہر لمحہ اس کے ساتھ تھا۔ اسے تسلی و دلاسے دیتا ہوا۔

"پلیز ثنا! بیٹھ جاؤ۔ یوں خود کو تھکا کر تم خود کو بیمار کر لو گی تھوڑا سا ریسٹ کر لو۔" اسے مسلسل اسپتال کوریڈور میں بے چینی سے آتے جاتے دیکھ کر عمار نے عاجزی سے اسے ٹوک دیا تھا۔

"عمار! پاپا میں میری جان ہے۔ انہیں کچھ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی۔ میرا تو ان کے سوا دنیا میں کوئی ہے بھی نہیں۔" وہ عمار کے بازو پہ سر رکھ کر بلک کر رو پڑی تھی۔

"بی بریو ثنا! اللہ سے بھلائی کی امید رکھو۔ سر ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" عمار اس کا محبت سے سر

تھکتے ہوئے بولا تھا۔ محسن گردیزی کی حالت میں چار دن کے بعد قدرے بہتری آئی تھی۔ انہیں روم میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ ثنا وہیں اسپتال کے کوریڈور کے ٹھنڈے فرش پر سجدہ شکر بجالائی تھی۔

محسن صاحب نے اٹک اٹک کر بولتے ہوئے اسے عمار کے گھر والوں کو بلانے کا کہا تھا۔

وہ ان کی بات سن کر بے حد پریشان ہوگئی تھی۔ ان کی بے ربط اور ٹوٹی پھوٹی گفتگو سے اس نے ان کی خواہش کا اندازہ بخوبی لگالیا تھا۔

وہ فی الفور اسے عمار کے ہمراہ وداع کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ اس لیے اس کے فرض کی ادائیگی ہی اس وقت ان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ ڈاکٹر انہیں لندن اسپتال میں ریفر کررہے تھے۔ لندن روانگی سے قبل وہ ثنا کی طرف سے اطمینان چاہتے تھے۔ اس نے عمار سے بات کی تو وہ خاموش ہوگیا تھا۔

ابھی تو اس نے ثنا کے بارے میں کوئی بات تک نہیں کی تھی۔ بات کرنے' امی ابو کو اس بارے میں راضی کرنے' ان کے یہاں آنے اور اس کی شادی میں شمولیت' اس سارے عمل کے لیے یقیناً "مہینے درکار تھے۔

وہ ثنا کو روایتی احترام اور اہتمام سے اپنانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ اس بار ثمینہ سے اس بارے میں صاف بات کرنے کا تھا۔ مگر سوئے قسمت اس کے جانے سے قبل ہی محسن گردیزی کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ سو جو کام مکمل اطمینان اور تزک و احتشام سے کرنا تھا' انتہائی عجلت میں کرنا پڑگیا تھا۔ محسن صاحب کی لندن روانگی کی ڈیٹ آچکی تھی۔

عمار ثنا کے ساتھ مخلص تھا۔ اس کا ساتھ زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ قسمت اس کے ہاتھوں میں ثنا کا ہاتھ شادی کے روایتی دھوم دھڑکے کے شور میں نہیں بلکہ اسپتال کے سرد اور جامد ماحول میں دے رہی تھی تو اس نے دل کی گہرائیوں سے وہ ہاتھ تھام لیا۔

اہمیت ماحول اور وقت کی نہیں اہمیت تو من پسند ساتھی ملنے کی تھی۔ جنوری کی ایک سلونی سی شام میں چند گواہوں کی موجودگی میں ثنا اور عمار رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اک حسن کی دیوی سے مجھے پیار ہوا تھا۔۔۔ ہائے پیار ہوا تھا

دل اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا

بیڈ پہ کہنی کے سہارے دراز عمار شوخی سے گنگناتے ہوئے ثنا کے ہاتھوں کی چوڑیوں سے کھیل رہا تھا۔

ثنا شادی کے بعد عمار کے فلیٹ میں آگئی تھی۔ حالانکہ ثنا نے بہت زور لگایا کہ عمار ان کے گھر آجائے۔ پاپا کے جانے کے بعد تو ویسے بھی وہ گھر اب نوکروں کے رحم و کرم پہ تھا۔ لیکن گھر داماد بننا عمار کی غیرت کے لیے کسی تازیانے سے کم نہ تھا۔

"تمہیں اپنے گھر رخصت کرکے لے جانے کی بجائے تمہارے گھر آجاؤں تاکہ دنیا پورے زن مرید کا ٹائٹل میرے گلے میں ڈال دے۔" ثنا کی براؤن آنکھوں میں جھانکتے ہوئے عمار نے شوخی سے چھیڑا تھا۔

"اچھا جی دنیا والوں کی باتوں کا ڈر ہے' جب ایک انڈسٹریلسٹ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی سے عشق فرمارہے تھے تو اس وقت خیال نہیں آیا تھا کہ شادی کے بعد تیرا میرا نہیں چل سکتا۔" ثنا نے مصنوعی خفگی سے آنکھیں دکھا کر کہا تھا۔ یہ آنکھیں نئے نئے ملن کے خمار سے بوجھل ہورہی تھیں۔ دنیا جہاں کی خوشیاں ان کے فلیٹ میں جمع تھیں۔

"ہنی مون کے لیے کہاں چلنا ہے جان من!" عمار کی انگلیاں اب ثنا کی براؤن لٹوں سے کھیل رہی تھیں۔ آواز جذبات سے بوجھل ہورہی تھی۔

"نہیں عمار! فی الحال ایسے پروگرام کی گنجائش نہیں نکلتی۔ پاپا کی طبیعت کی طرف سے جب تک اطمینان حاصل نہیں ہوتا' اس وقت تک کوئی تفریح' کوئی

آؤ ننگ دل کو نہیں لگ سکتی۔" ثنا سنجیدگی سے بولی۔ عمار کو پا کر وہ جتنی خوش تھی' دل اتنا ہی اندر اندر سے پاپا کی صحت کے بارے میں متفکر رہتا تھا۔

"اوکے باس! جیسے آپ کا آرڈر۔ ہم تو آپ کے حکم کے غلام ہیں۔" عمار نے شرارت سے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے سیل پہ کال آ رہی تھی۔ اسکرین پر نظر ڈالی تو لب بے ساختہ بھینچ گئے تھے۔ ثمینہ کی کال تھی۔ وہ اپنی نئی نویلی ازدواجی مسرتوں میں گم اپنے حقیقی خونی رشتوں کو وقتی طور پر بھولے بیٹھا تھا۔

"ہیلو عمار! کیسے ہو بیٹا؟ گھر کب آ رہے ہو! تمہاری اور باسم کی شادی کی ڈیٹ ہم نے فکس کر دی ہے۔ تم آؤ تو تیاری فائنل کریں ہم۔" ثمینہ کی کھنکتی آواز نے جیسے فلیٹ میں چھائے طلسم کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ وہ جیسے خواب نگر کی طویل بھول بھلیوں سے یک دم سے حقیقت کی چار دیوار میں آگیا تھا۔ ایسی چار دیواری جس میں وہ صرف ثنا نہیں بلکہ بہت سے رشتوں کے ساتھ مقید تھا۔ یہ سارے رشتے اس کے اپنے تھے۔ بہت قریبی اور بہت پیارے ثنا اس کے چہرے پہ چھائے سرد و جامد تاثرات کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا عمار! خیریت تو ہے؟" وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر فکر مندی سے بولی۔

"ہاں کچھ نہیں' تم گھر چلنے کی تیاری کرو۔" وہ سپاٹ انداز میں گویا ہوا۔

"گھر کون سا گھر؟" ثنا کچھ نہ سمجھی تھی۔

"میرا اور تمہارا گھر' جہاں میری فیملی کے ساتھ تمہیں زندگی گزارنی ہے۔"

☆ ☆ ☆

ریحان ولا میں صبح پوری طرح بے دار ہو چکی تھی۔ ثمینہ ملازمہ کے سر پر کھڑے ہو کر صفائی کروا رہی تھیں۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے ریحان صاحب آسٹریلین طوطوں کے پنجروں کے پاس آ کھڑے ہوئے' پھر مڑ کر باسم سے پوچھنے لگے۔

"باسم! تمہیں میں نے شادی کے مکمل اخراجات کا تخمینہ لگانے کو کہا تھا۔؟"

"جی ابو! مہمانوں کی لسٹ دیکھ کر ہوٹل کی بکنگ کرائیں گے۔ مہندی وغیرہ کا فنکشن تو گھر پہ ہی ارینج ہو گا۔ گھر کی رینوویشن اسی ہفتے میں کروا لیتے ہیں۔" باسم نے ادب سے جواب دیا۔ وہ اس وقت اپنے لیپ ٹاپ پہ مصروف ڈیزائنر کے جدید گروم ڈریسز دیکھ رہا تھا۔ عریسہ کی خواہش تھی کہ اس کے برائیڈل لہنگے اور اس کی شیروانی کا کام میچنگ ہونا چاہیے۔

"تم فی الحال اپنے بیڈ روم کی ڈیکوریشن کرواؤ۔ عمار آجائے تو وہ اپنے روم کو خود ڈیکور کروائے' اس کی چوائس تم سے کب ملتی ہے؟" ثمینہ اس کے برابر صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"بجا فرمایا آپ نے' چوائس تو کیا بھائی صاحب خود ہی کہیں سے اس ناچیز سے میچ نہیں کرتے۔ شادی کو ایک ماہ رہ گیا ہے۔ اور محترم کا کچھ اتا پتا نہیں۔" کی پیڈ پہ انگلیاں چلاتے ہوئے وہ مصروف انداز میں بولا۔

"ہاں تو وہ تمہاری طرح اتاؤلا تھوڑی ہے۔ بہت ڈیسنٹ اور پر سکون طبیعت کا مالک ہے۔ شادی کو ایک فرض سمجھنے والا۔" وہ عمار کی حمایت میں مسکراتے ہوئے بولیں۔

اسی وقت پورچ میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔

"یہ کون آگیا ہے صبح صبح۔" ثمینہ باسم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے بولیں۔

"عمار۔" ثمینہ خوشی اور بے تابی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مگر عمار کے ساتھ کوئی اور بھی تو تھا۔ باسم نے بھی حیرانی سے عمار کے ساتھ کھڑی لڑکی کو دیکھا تھا' جو خاصی خوب صورت' اسمارٹ اور اپنے پہناوے سے ماڈرن لگ رہی تھی۔

"کیسی ہیں امی؟" ان سب کی حیران نظروں سے خائف ہوتا ہوا عمار خود آگے بڑھا اور ثمینہ کو گلے لگا لیا۔ بیٹے کے ساتھ آئی لڑکی نے حیرت سے ایسے جامد کیا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح عمار کے ماتھے پہ بوسہ دے

کر اس کے چہرے کو ہاتھوں میں بھرنا بھول گئیں۔

"یہ لڑکی کون ہے عمار!" اپنے دل سے اٹھتے طرح طرح کے وہموں کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

"امی! یہ ثنا ہے۔ میری بیوی اور آپ کی بہو۔" بے حد پرسکون انداز میں بولتے ہوئے عمار نے جیسے درمیان میں ایک بم پھوڑا تھا۔ سب اچھل ہی تو پڑے تھے۔ طوطوں کا باجرہ ڈالتے ریحان احمد کی مٹھی سے سارہ باجرہ نیچے گر گیا تھا۔ نجانے ان کی مٹھی کب کھلی تھی۔

"میں نے ایک ہفتہ پہلے ثنا سے شادی کی ہے۔ سچویشن کچھ ایسی بنی کہ آپ کو انفارم کرنا بھول گیا تھا۔" عمار ان کے پوچھے بغیر ہی بتانے لگا تھا۔

"عمار! تم کیا کہہ رہے ہو؟ اسی ماہ تمہاری قرۃ سے شادی طے ہے۔ اور تم کہہ رہے ہو یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے۔" ثمینہ حواسوں میں لوٹتے ہی چیخ کر بولیں۔

قرۃ سے طے کیا ہوا رشتہ آپ لوگوں کا ہے۔ میرا نہیں۔ میں نے بارہا آپ کو بتایا کہ مجھے قرۃ بالکل پسند نہیں۔ مجھے جب اس کی شکل نظر کو اچھی نہیں لگتی تو دل کو کیا اچھی لگے گی آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ اٹ از ناٹ فیئر۔" عمار اعتماد سے بول رہا تھا۔

"اور تم نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ماں باپ کو بتائے بغیر کر لیا' یہ فیئر ہے۔" ریحان احمد سکون سے بولے۔ وہ مرد تھے۔ ثمینہ کی طرح فوراً" حواس نہیں چھوڑ بیٹھے تھے۔ گرچہ بیٹے کے اس اقدام نے انہیں بھی خاصا شاکڈ کیا تھا۔

"جی مجھے احساس ہے کہ میں آپ کو انفارم نہیں کر سکا۔ مگر محسن انکل کی طبیعت کی وجہ سے یہ سب کچھ ایمرجنسی میں کرنا پڑ گیا تھا۔" عمار بغیر کسی شرمندگی کے بولا۔

"میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ رفعت کو کیا جواب دوں گی۔ یا خدا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" ثمینہ صوفے پہ بیٹھ کر رونے لگیں۔ باسم بے حد افسوس سے بھائی کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پہ اپنے اس فیصلے پر ذرا سی پشیمانی نہ تھی۔

"تم کیا سمجھتے ہو' میری یتیم بھانجی کو ریجیکٹ کر کے جو بھی بیوی لاؤ گے تم ہم اسے قبول کر لیں گے۔ ہمارے کیے گئے فیصلے تمہیں قبول نہیں تو اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔" ریحان فیصلہ کن انداز میں بولے۔ ثمینہ کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

"آپ زیادتی کر رہے ہیں ابو!" عمار احتجاجی انداز میں بولا۔ آپ نے بچپن میں میرا رشتہ قرۃ سے طے کیا تھا۔ اب سات سال کے بچے سے بتیس سال کے مرد تک کے سفر میں میرے شعور و احساس میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ قرۃ کہیں سے میرے ساتھ میچ نہیں کرتی۔ صرف اس بنا پہ میں اپنے دل کو اس کی طرف مائل کروں کہ وہ میری پھپھو کی بیٹی ہے' میری بچپن سے اس کے ساتھ بات طے ہے؟ زندگی کا ساتھی چننے کے لیے اور بھی کوالٹیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوب صورت شکل' کونفیڈنس' ہائی ایجوکیشن' کیا یہ سب مجھے قرۃ میں مل سکتا تھا۔" عمار بغیر جھجکے بول رہا تھا۔

"مجھے ایسی لائف پارٹنر چاہیے تھی جیسی ثنا ہے' گرومڈ' ریفائنڈ۔" وہ ایک نرم سی تفاخر بھری مسکراہٹ ثنا پہ ڈالتے ہوئے بولا' جس کے چہرے پہ ہراس چھایا ہوا تھا۔

وہ ایک ہمدرد' نرم دل اور پرسکون طبیعت کی مالک لڑکی تھی۔ عمار نے اسے قرۃ سے نسبت اپنی ناپسندگی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ راستے بھر وہ اسے گھر والوں کے متوقع ردعمل کے بارے میں تیار کرتا آیا تھا۔ مگر اب یہ ساری سچویشن اس جیسی نفیس اور نازک طبع کی مالک لڑکی کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی۔

"میری بیوہ بہن' کس منہ سے میں اس کے سامنے جاؤں گا۔" ریحان بے چارگی سے بولے تھے۔ اپنے مضبوط اور ٹھوس اعصاب کے مالک باپ کی یہ بے بسی باسم کو تڑپا گئی تھی۔

"کیا کہوں گا کہ اب شادی سے ایک ماہ پہلے اس کی بیٹی میں کون سے کیڑے نکل آئے ہیں۔" جو تم نے ہماری ساری زندگی کی محبتوں، نوازشوں اور عنایتوں کا یہ صلہ دیا ہے۔ وہ بالکل بکھرے بکھرے بول رہے تھے۔

"پلیز ابو! آپ قرۃ والے معاملے میں مجھے بلیم (الزام) نہیں کر سکتے۔" عماران کے کاندھے پہ روہانسا ہو کر بولا تھا۔

"آپ سب میری قرۃ کے متعلق ناپسندیدگی سے بخوبی واقف تھے۔ میں نے کبھی اس کا نام نہیں لیا، کبھی خود سے اسے کوئی گفٹ نہیں دیا۔ میرے لیے وہ Miss No body (مس نوبڈی) تھی، بس؟"

"کچھ بھی ہو۔ میں تمہاری اس خودسری اور نافرمانی پہ تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ میرے دل کے ساتھ ساتھ اس گھر کے دروازے بھی تمہارے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہیں۔" بے حد سرخ آنکھوں کے ساتھ ریحان احمد نے بے حد ضبط سے بولتے ہوئے گویا لاؤنج میں موجود ذی نفس کی روح تک نکال لی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اب کیسی طبیعت ہے قرۃ باجی کی۔؟" ثمامہ نے ہمدردی سے پوچھا تھا۔

"خود دیکھ لو، کیسی ہے؟" ضبط سے بولتے ہوئے نویرہ نے اسے جواب دیا۔ قرۃ مسکن ادویات کے زیر اثر سو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں پہ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ کملایا چہرہ سرسوں کے پھول کی مانند زرد تھا۔ ثمامہ کا دل بے ساختہ دکھ سے بھر گیا تھا۔ وہ اس ہوش و ہواس سے بے گانہ پڑی لڑکی کی دلی اذیت محسوس کر سکتی تھی۔

قرۃ کو آج ہی اسپتال سے گھر شفٹ کیا گیا تھا۔ اسے شدید نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ عمار کی ثنا کے ہمراہ آمد نے خاندان بھر کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ مگر رفعت کا گھر تو جیسے بھونچال کی زد میں آگیا تھا۔

انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ عمار ان کی بیٹی کی جگہ کسی اور لڑکی کو دے سکتا ہے۔ ان کی معصوم سیدھی سادی قرۃ کو بھی ریجیکٹ کر سکتا ہے کوئی۔

"ہائے عمار! میں تو تمہیں بددعا بھی نہیں دے سکتی۔ آخر میرا اپنا خون ہو۔ کیوں بیٹھے بٹھائے میری بیٹی کا دل نوچ لیا تم نے۔" گھر میں مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر فرد اپنی جگہ خاموش و افسردہ اس خاموشی کو وقتاً فوقتاً" رفعت کی سسکیاں توڑتی رہتی تھیں۔ قریبی رشتہ داروں کے ہمدردی و محبت سے لبریز جملے بھی کسی برچھی سے کم نہ لگ رہے تھے۔

"کہہ رہے ہیں، عمار کی بیوی بہت امیر اور خوب صورت ہے، اس لیے تو قرۃ بے چاری عمار کے دل پہ نہیں چڑھ سکی، کہاں کروڑوں کی مالک اور کہاں یتیم قرۃ بھلا کوئی مقابلہ بنتا ہے۔" قرۃ نے عمار کو بے حد چاہا تھا۔ ساری زندگی اسی ایک نام کی مالا جپی تھی اس کے دل نے۔ یہ ہینڈسم، دراز قد اور قدرے مغرور سا کزن اس کا نصیب ہے۔ یہ خیال ہی اسے ہواؤں میں اڑانے کے لیے کافی تھا۔ مگر ٹین ایج گزرتے ہی اسے عمار کی سرد مہری اور بے توجہی نے ٹھٹکا دیا تھا۔ اتنی بے تکلفی ہی کہاں تھی کہ خود سے آگے بڑھ کر اس بے مہر رویے کی وجہ سے پوچھ لیتی۔ اپنی بے لوث محبت اور پر خلوص جذبوں کی بدولت اسے یقین تھا کہ عمار ہی اس کا نصیب ہے۔ مگر عمار کی بے گانگی اور بے اعتنائی دیکھ کر اس کا یقین ڈولنے لگتا تھا۔

اور اس کی بے لوث و پر خلوص محبت ہار گئی تھی۔ عمار اس کا تھا ہی نہیں۔ اس حقیقت نے اسے چیر ڈالا تھا۔ اذیت سی اذیت تھی۔ درد جس کا کوئی انت نہ تھا۔ نارسائی کم مائیگی، تذلیل و تضحیک کے شدید احساس نے دل و دماغ پہ ایسا ہلا بولا کہ تیورا کر گر پڑی تھی۔

ڈاکٹرز نے نروس بریک ڈاؤن کی وجہ شدید ڈپریشن بتائی تھی۔ اور ہر ممکن حد تک اسے پرسکون اور مطمئن رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

"میں سامان لے کر آتا ہوں۔ تم لوگ رات کا کھانا کھا کر جانا۔" نویرہ، ثمامہ اور عریسہ دونوں سے مخاطب

ہوا۔

"نہیں نہیں، ہم بس چلتے ہیں۔ قرۃ باجی کو دیکھ لیا، کافی ہے۔" عریسہ جلدی سے منع کرتے ہوئے بولی کہ مبادہ نویر زیادہ اصرار نہ کرنے لگے۔

اسے اس ڈپریسنگ ماحول سے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ فی الفور یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ اصل میں اس کا موڈ بے حد آف تھا۔

عمار وغیرہ کے ہنگامے کی بدولت شادی کا طے شدہ تاریخ پہ منعقد ہونا تو ملتوی ہو چکا تھا، جب تک حالات معمول پہ نہ آتے، اس وقت تو شادی ممکن نہ تھی۔

اچھی بھلی وہ اپنے ساتھ ساتھ شمامہ کے ڈریسز ڈیزائن کر رہی تھی۔ لے کے سارا مزا خراب کر کے رکھ دیا تھا سب نے۔

وہ خوب جھنجلائی ہوئی تھی۔ اسے کسی کام میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"کافی ٹائم ہو رہا ہے۔ امی ویٹ کر رہی ہوں گی۔" عریسہ، شمامہ کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو بیٹا! کھانا کھا کر جانا۔ میں بھابی کو فون کر دیتی ہوں۔" آنسو پونچھتے ہوئے رفعت نے محبت سے انہیں روک لیا۔ نویر کافی سارا سامان لے آیا تھا۔ شمامہ خود اٹھ کر کچن میں آگئی اور کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

"ابھی سے کچن سنبھال لیا۔ ویسے تو مہینہ بعد تمہیں یہ جگہ لینی تھی، اب دیکھتے ہیں کب اس گھر میں مستقل رونق بخشنے آؤ گی۔" نویر اندر آکر شگفتگی سے بولا تو بریانی کے لیے مسالا تیار کرتے ہوئے شمامہ سرخ پڑ گئی تھی۔

نویر کا اتنے قریب آکے شوخ نگاہوں سے تکنا اسے حسب عادت گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

ڈیٹ فکس ہوتے ہی اس نے نویر سے پردہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی فون کالز تک ریسیو نہیں کرتی تھی۔

"جی جناب! کہاں تو مجھے اتنا اوئیڈ کیا جا رہا تھا۔ اور اب ڈنر کی تیاری۔"

نویر اب اس کے اتنے دنوں کے گریز کو لے کر چھیڑ رہا تھا۔

"جی، قرۃ باجی کی طبیعت پوچھنے آئی ہوں؟" شمامہ نے چڑ کر تصحیح کی۔ تو نویر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"بی بی معلوم ہے۔ آپ قرۃ کی طبیعت پوچھنے آئی ہیں۔ ورنہ تو دلہن بنے بغیر اس گھر میں آپ کا داخلہ ممنوع تھا ناں۔" وہ اس کے سرخ پڑتے چہرے کی دلچسپی سے دیکھتے ہوئے لطف لینے کے سے انداز میں بولا۔ بہن کی تکلیف دہ حالت، گھر میں چھائی افسردگی اور ماں کی پریشانی نے اس کے دل کو بوجھل کر کے رکھ دیا تھا۔ ایسے میں دل کی ملکہ کو اتنے دنوں بعد سامنے پا کر دل خود بخود شوخی پہ آمادہ ہو رہا تھا۔ شمامہ کا یوں آگے بڑھ کر سامان لینا اور اپنائیت اور بے تکلفی سے ڈنر کی تیاری نے اسے اندر تک شاد کر دیا تھا۔ دل و ذہن پہ چھائی کئی دنوں کی کثافت میں قدرے کمی آئی تھی۔

"تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں ابھی واپس چلی جاؤں؟" نل کے نیچے گوشت دھوتے ہوئے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بظاہر خفگی سے گویا ہوئی تھی۔

"واپس؟ میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے روک لوں۔" اس سے پہلے کے رومینس کے ریلے میں بہتے ہوئے نویر کچھ اور کہتا فاریہ اندر آگئی تھی۔

"شمامہ باجی! آپ بریانی اور قورمہ تیار کریں۔ میٹھا میں بنا لیتی ہوں۔" شمامہ کی جان میں جان آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! ہمیں قرۃ باجی کی طبیعت پوچھنے پھپھو کے گھر جانا چاہیے۔" باسم بے حد سنجیدگی سے ثمینہ سے مخاطب تھا۔

"میں کس منہ سے جاؤں گی۔ قرۃ، رفعت ان سب کا سامنا کیسے کروں گی۔ کیا کہوں گی ان سے۔" ثمینہ بے چارگی کی انتہا پہ کھڑی تھیں۔

"امی! حوصلہ کریں۔ میں آپ کے ساتھ چلتا

ہوں۔ ہمارا کیا دوش؟" وہ ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر ڈھارس بندھاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے ابو بھی جانے سے کترا رہے ہیں۔ مجھے جانے کا کہہ رہے ہیں۔ بہن کا سامنا کرنے کا ان میں یارا نہیں۔ سارا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیا ہے۔"

بے حد خاموشی اور سنجیدگی سے وہ رفعت کے ہاں چلے آئے تھے۔

"ہائے' اس گھر میں مجھے بارات لے کر آئی تھی۔ اب کیسے مجرموں کی طرح آنا پڑا ہے۔"

ڈیوڑھی میں آتے ہی ثمینہ کو رونا آگیا تھا۔ باسم ان کو کندھوں سے تھامے صحن میں داخل ہوا۔

"اب کیا کرنے آئی ہیں بھابھی۔ میری بچی کی بربادی کا تماشا دیکھنے آئی ہیں۔"

رفعت تخت پہ بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں' پہلے تو ان ماں بیٹے کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی' پھر چھری رکھ کر طنز سے ان کا سواگت کیا۔

"بربادی کیوں خدا نا خواستہ' خیر کا کلمہ بولو رفعت؟" ثمینہ جیسے کٹ کر بولی تھیں۔

"اب خیر کے کلمے کی کوئی گنجائش رہ گئی ہے۔ میری بچی موت کے منہ میں جاتے جاتے بچی ہے۔ اس کا دل ٹوٹا ہے۔ اس کے خواب' آرزوئیں سب مٹی میں مل گئی ہیں۔" رفعت تلخ لہجے میں بولتے ہوئے پھر سے چھری لے کر سبزی کاٹنے لگیں۔ جیسے ان لوگوں کے آنے سے انہیں کوئی فرق نہ پڑا ہو۔

"خدا گواہ ہے رفعت! میں نے قرۃ کے علاوہ کسی اور کا سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے اور تمہارے بھائی نے یہ رشتہ نیک نیتی سے جوڑا تھا۔ اب قسمت پر ہمارا کیا زور۔؟" ثمینہ گلوگیر انداز میں بولیں۔ نند کی لاتعلقی انہیں بری طرح چبھی تھی۔ باسم پلاسٹک کی چیئر پہ بیٹھا اپنے سیل پہ کسی کو ٹیکسٹ کرنے لگا تھا۔

"قسمت کی بات نہ کریں۔ جب عمار اس رشتے پہ راضی نہیں تھا تو آپ کو ہمیں اطلاع دینی چاہیے تھی۔ میری بچی اتنے سال خواہ مخواہ بے نام رشتے پہ تو نہ بیٹھی رہتی۔ کوئی اچھا رشتہ ہوتا تو اب تک اسے وداع کر چکی ہوتی؟" رفعت کے لہجے کی ترشی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سبزی بن چکی تھی۔ وہ اب چھلکے سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈال رہی تھیں۔

"وہ تو اب بھی رخصت ہو سکتی ہے۔ ان شاء اللہ کوئی اچھا رشتہ مل جائے گا۔" ثمینہ کا لہجہ کمزور تھا۔

"وہ تینتیس کی ہو چکی ہے قرۃ' نور سے ایک سال چھوٹی۔ کہاں سے ملے اچھا رشتہ اب؟" رفعت تڑخ کر بولیں۔

"بیٹا نوکری کے ساتھ کاروبار الفت چلاتا رہے اور ماں کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو؟"

"پھپھو! اب آپ زیادتی کر رہی ہیں؟" کافی دیر سے خاموش بیٹھے باسم پہ رفعت کا طنزیہ اور کسیلا انداز گفتگو' لاتعلقی و رکھائی سخت گراں گزر رہی تھی۔

ثمینہ جتنے لجاجت بھرے انداز میں صفائیاں دے رہی تھیں' ادھر سے اتنی ہی سرد مہری اور کٹھور پن کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ ماں کی ایسی "بے عزتی" وہ بھلا کب برداشت کر سکتا تھا۔

باسم کو مزید یہاں بیٹھنا دشوار لگ رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کھنچے ہوئے تھے۔

"اٹھیں امی! میرے ایم ڈی کی کال آرہی ہے۔ مجھے آفس پہنچنا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بغیر کسی کی طرف دیکھے ثمینہ سے مخاطب ہوا۔ ثمینہ اندر قرۃ سے ملنے گئیں۔ قرۃ بیڈ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ فاریہ اسے سوپ پلا رہی تھی۔ قرۃ کی آنکھوں میں ویرانیوں کی دھول اڑ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں ان کے لیے کوئی شناسائی کی رمق نہ تھی۔

نم آنکھوں سے ثمینہ نے قرۃ کے ماتھے پر بوسہ دیا اور باہر نکل آئیں۔ اس گھر میں انہیں ہمیشہ عزت ملی تھی' مان ملا تھا' اونچی جگہ پہ انہیں بٹھایا جاتا تھا' انواع و اقسام اشیاء سے ان کی خاطر کی جاتی تھی۔ ہنسی' مسکراہٹیں' ادب احترام۔ آج اس گھر سے انہیں لاتعلقی اور سرد مہری ملی تھی۔ وہ نند جس کی زبان بھابھی بھابھی کرتے نہیں تھکتی تھی' آج وہ زبان طنز

کے شعلے اگل رہی تھی۔

بھانجیوں نے سلام تک کرنا گوارا نہ کیا تھا۔ خاطر تواضع تو در کنار پانی کا گھونٹ تک کسی نے نہ پوچھا تھا۔ رشتوں کی یوں کایا کلپ نے ان کا دماغ لحہ بھر کو آندھیوں کی زد پہ رکھ دیا تھا۔

کار کا فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے' وہ لہرا کر گر پڑیں۔

"امی! کیا ہوا؟" ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے باسم کی نظر ان پر پڑی تو وہ تیزی سے گھوم کر ان تک آیا۔ بے حد پریشانی سے ان کا چہرہ تھپتھپا کر بولا۔

"امی! آنکھیں کھولیں اٹھیں گاڑی میں بیٹھیں۔" ثمینہ نے نیم وا آنکھوں سے باسم کا دھندلا چہرہ دیکھا۔

"باسم! میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔" وہ ڈوبی آواز میں بولیں۔ باسم نے انہیں گاڑی میں ڈالا اور تیزی سے سٹی اسپتال کا رخ کیا۔

☼ ☼ ☼

"اوہ گاڈ! کیا ہو رہا ہے ہمارے خاندان کو۔ پہلے قرۃ باجی کا نروس بریک ڈاؤن ہوا اور اب ثمینہ آنٹی بی پی شوٹ کی بدولت اسپتال پہنچ گئیں۔" شمامہ سر تھامے تفکر سے بول رہی تھی۔

"ہاں مجھے بھی لگتا ہے ان دونوں فیملیز نے ہم دونوں بہنوں کی شادی نہیں ہونے دینی۔ ایکا کر لیا ہے ہم کنواری ہی رہیں۔ کبھی ان جبینوں پہ سہاگن ہونے کی بندیا نہیں چمکے گی۔" کشن بازوؤں میں دبوچتے ہوئے عریسہ جل کر بولی تھی۔ اپنی شادی کے تاحال آثار نہ دکھائی دینے پر وہ سخت چڑی ہوئی تھی۔

"شرم کرو۔ تمہیں شادی کی پڑی ہے ان لوگوں کی پریشانی کا سوچو جن کے گھر کا بندہ ہاسپٹلائز ہو۔" شمامہ نے اسے ہلکے سے شرمندہ کیا تھا۔ وہ سرسوں کا تیل انگلیوں کی پوروں سے بالوں کی جڑوں میں لگا رہی تھی۔

"نہ عمار بھائی اپنی مرضی سے شادی کرتے' نہ اتنا ہنگامہ کھڑا ہوتا۔"

"اچھا چلو عمار بھائی نے لو میرج کر لی تو اس میں ایسا کون سا گناہ ہے۔ یہ تو دل کے معاملے ہیں۔ کوئی زور زبردستی چل سکتی ہے ان معاملوں میں بھلا۔ ان دونوں فیملیز کو قسمت کا لکھا سمجھ کر معاملات کو آگے بڑھانا چاہیے تھا۔ تنازعات کو ختم کر کے ہمیں یوں لٹکانے کی بجائے ہماری شادی کی فکر کرنی چاہیے۔" عریسہ آرام سے مشورہ دینے کے انداز میں بولی۔ ریموٹ سے ٹی وی آن کر لیا۔

"کہنا آسان ہے۔ اگر قرۃ باجی کی جگہ تم اور میں ہوتیں' تو اسپتال میں نہ ہوتیں تو اور کہاں ہوتیں۔ تمہیں باسم ریجیکٹ کر کے کسی اور سے شادی رچا لیتا' تو کیا تم یوں آرام سے کھاپی اور ٹی وی دیکھ رہی ہوتیں؟" تیل لگے بالوں کو بل دے کر اونچا سا جوڑا بناتے ہوئے شمامہ نے اسے حالات کا ایک اور رخ دکھایا تھا۔ جوڑے پہ کیچو لگایا اور واش روم جا کر ہاتھ دھو لیے۔

"امپاسبل! باسم سانس لینا تو چھوڑ سکتا ہے مگر مجھے نہیں۔" عریسہ کے لہجے میں مان بھرا غرور تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈیپ ریڈ و گرین شرارے' طلائی زیورات اور مہارت سے کیے گئے میک اپ نے شمامہ کے روپ کو ایسا جگمگایا تھا کہ اٹھنے والی ہر نظر سراہ رہی تھی۔ آف وہائٹ شیروانی و کلاہ میں نویر بھی اس کے پہلو میں بیٹھا خوب جچ رہا تھا۔ آج ان کی شادی تھی۔ نازش اور عریسہ مہمانوں سے خوش دلی سے مل رہی تھیں۔ ریحان اور ثمینہ کی فیملی رضوان لوگوں کی طرف سے شادی میں شریک ہوئی تھی کیونکہ رفعت نے انہیں رسما" شادی کا دعوتی کارڈ گھر بھجوا دیا تھا' خود جا کر مدعو نہیں کیا تھا۔

نازش اور رضوان نے نیک نیتی اور خلوص سے ہر ممکن کوشش کی کہ دونوں خاندان گلے شکوے بھلا کر کھلے دل سے شادی میں شریک ہوں۔ مگر رفعت کے دل میں کدورت کا بال آچکا تھا۔

"رضوان! دل صاف کرنا اور گلے ملنا' یہ سب کہنے میں آسان ہے۔ مگر اس دل پہ جو بیتی ہے۔ وہ ہم ہی جانتے ہیں' بھائی ہو کر بہن کے دل پہ ستم ڈھایا۔ اگر تمہاری بیٹی کو ایسے عین شادی کے موقعے پر کوئی آکر رد کردے تو کیا تم ان سے گلے جاکر مل لوگے' تمہیں بیٹی کے آنسو نظر نہیں آئیں گے۔ بس آج سے تم میرے ایک ہی بھائی ہو۔ میرے سمدھی بھی۔ بیٹی کے گھر آنا تو بہن کے سر پر بھی ہاتھ رکھ دینا۔" رفعت اٹل لہجے میں بولیں۔

"دیکھو رفعت! ریحان بھائی جان ہمارے بڑے بھائی ہیں ایسی قطع تعلقی مناسب نہیں۔ تم دل بڑا کرو۔ وہ تم سے بہت شرمندہ ہیں....."

"کیا خاک شرمندہ ہیں؟" رفعت' رضوان کی بات کاٹ کر تیزی سے بولیں۔

"نافرمان اور ناخلف بیٹے سے ایک ہفتہ تو ناراض نہیں رہ سکے۔ اسے اور اس کی بیوی کو گھر میں پوری عزت واحترام سے جگہ دی ہوئی ہے۔ اور تم کہہ رہے ہو وہ شرمندہ ہیں۔ ایسے بیٹے کو گھر سے نکال باہر کرتے۔ مگر نہیں انہیں تو مال دار بہو بڑی راس آگئی ہے۔ خوب خدمتیں کروا رہی ہیں ثمینہ بھابھی اس سے۔ ہمیں بے وقوف بنایا جارہا ہے کہ جی عمار نے چپکے سے شادی کی۔ اگر ایسی ہی من مانی کی تھی تو ایسی نافرمان اور خود سر اولاد کو گھر میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" رفعت کے دل کی کڑواہٹ ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

عمار اور ثنا پر ریحان احمد نے تو اسی وقت گھر کے دروازے بند کردیے تھے۔ گھر والوں کے کٹھور پن کو دیکھتے ہوئے عمار ثنا کو لے کر فوراً" لاہور آگیا تھا کہ وہاں رکنا سراسر اپنی مزید بے عزتی ہی تھی۔ ماں باپ کے رویے نے اسے سخت دل برداشتہ کیا تھا۔ پسند کی شادی اس کے نزدیک اتنا بڑا جرم نہیں تھا۔ جتنی اس کے خیال میں اسے سزا دی جارہی تھی۔ اپنی طرف سے تو وہ اپنے خونی رشتوں کو گڈ بائے کہہ آیا تھا' مگر ثمینہ کی خرابی طبیعت کی اطلاع ملی تو ساری ناراضی بھاپ بن کر اڑ گئی۔ فوراً" ثنا کو لے کر اسپتال پہنچا۔

ثمینہ کی حالت دیکھ کر شاکڈ رہ گیا تھا۔ پیلی زرد رنگت' کمزور سراپا' نحیف آواز' اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اس کی صحت مند اور خوب صورت سراپے کی مالک ماں ہے۔ ثمینہ کے پیروں پہ سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا تھا۔

"امی! مجھے معاف کردیجیے' میں نے آپ کا دل دکھایا۔ سو جوتے ماریے۔ مگر مجھے اپنی نظروں سے دور مت کریں۔ مجھے اپنی جنت سے مت نکالیں۔" وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ ثمینہ اس کی شادی کے فیصلے کی بدولت اس حال کو پہنچی ہیں یہ تو اسے معلوم نہ تھا کہ وہ باسم کے ساتھ رفعت کے ہاں گئی تھیں' جن کے سخت اور کٹھور رویے کو دل پہ لینے سے ان کا بی پی شوٹ کرگیا ہے۔ محسن گردیزی صحت یاب ہو کر پاکستان آئے تو ثمینہ کی طبیعت پوچھنے ان کے گھر آئے تھے۔ ریحان احمد ان سے مل کر بہت متاثر ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت' گفتگو' خاندانی پس منظر' کاروباری حیثیت' کچھ بھی تو نظرانداز کرنے کے قابل نہ تھا۔

ثنا سے بھی ہلکی پھلکی گفتگو کرلیتے تھے' مگر عمار سے ناراضی ہنوز برقرار تھی۔

ثنا کا "ریحان ولا" میں بہو تسلیم کیے جانا ہی رفعت لوگوں کو برانگیختہ کیے ہوئے تھا۔ اسی لیے تو صلح کی خاطر کی جانے والی رضوان کی تمام کوششیں ناکام ہوتی جارہی تھیں۔ وہ تہہ دل سے چاہتے تھے کہ ان کے بہن بھائی آپس میں پھر سے محبت کی ڈور میں بندھ جائیں' مگر رفعت کے قطعی اور اٹل رویے کو دیکھتے ہوئے نازش نے ہاتھ دبا کر مزید کچھ کہنے سے انہیں روک دیا تھا۔ شادی میں ثنا بھی شریک ہوئی تھی۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس عمار کے ساتھ وہ بجی سنوری خوب جچ رہی تھی۔ آج اس نے فیروزی بنارسی کے بلاؤز کے ساتھ شاکنگ پنک ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی' جس کے باڈر' بھاری کام سے بوجھل تھے۔ کانوں میں بھاری جھمکے و نیکلس' شانوں تک

کٹے اسٹائلش سے بال۔ ایک تو اس کی خوب صورتی دوسرے ثمینہ کی بہو دیکھنے کی خواہش، خاندان بھر کی اشتیاق بھری نظریں اس پہ جمی تھیں نوریر کو دودھ پلاتے وقت وہ بھی عریسہ کے ساتھ شامل ہو گئی۔

"یہ مت سمجھئے گا کہ عریسہ اکلوتی سالی ہے۔ مجھے بھی نیگ میں شامل کرنا ہوگا۔" وہ دھونس بھری اپنائیت سے نوریر سے مخاطب ہوئی تھی۔

"جی جی ضرور شامل کرتے ہیں۔ کوئی ایسے چھوٹے دل والوں سے آپ کا واسطہ نہیں پڑا ہے۔" نوریر نے بھی شگفتگی سے جواب دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
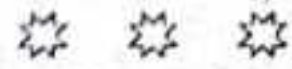
"ویسے ہم نے نوٹ کیا تھا کہ شادی میں عریسہ سارا وقت اپنے سسرال والوں کے گرد ہی گھومتی رہی تھی، ہمیں تو اس نے لفٹ نہیں کروائی تھی۔" شادی کے ایک ہفتے بعد ثمامہ نے گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت وہ ہانڈی بھون کر لاؤنج میں آئی ہی تھی کہ قرۃ نے اسے مخاطب کیا تھا۔ قرۃ کا لہجہ عام سا تھا، مگر الفاظ نہیں۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ قرۃ کے چہرے پہ کچھ جتانے والا تاثر تھا۔

"اچھا باجی! میں نے تو نوٹ ہی نہیں کیا؟" ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے اس نے صوفوں پر کشنز ترتیب سے رکھنے شروع کر دیے تھے۔

"کیوں، تم اسٹیج پر بیٹھیں سب کچھ تو اپنی نظروں سے ملاحظہ کر رہی تھیں تم نے کیوں نوٹ نہیں کیا۔" قرۃ کے لہجے میں چبھن در آئی تھی۔

"آپ کو تو پتا ہی ہے عریسہ کتنی لاابالی اور کھلنڈری سی ہے۔ احساس ذمہ داری تو اسے چھو کر نہیں گزرا۔ میری شادی پہ اسے صرف اپنے کپڑوں کی فکر تھی اور بس، میں بہن ہوں، میری چیزیں پوری ہیں یا نہیں اس کی اسے پروا نہیں تھی، بس سارا ٹائم اپنا میک اپ، جوتے، تیاری۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"خیر جتنی بھی لاابالی ہو۔ کم از کم بہن کے سسرال والوں کو عزت دینے کا شعور اسے ہونا چاہیے۔ ایک بار بھی ہم سے کھانے کا نہیں پوچھا۔ نہ ہماری فوٹو گرافس بنائیں۔ بس سارا وقت باسم کے کندھے سے لگی رہی اور اس کے گھر والوں کی خاطر واضع کرتی رہی تھی۔" رکھائی سے کہتے ہوئے قرۃ نے میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ویسے بھی جب سے ثمامہ نے گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کیا تھا، تب سے اس نے سارے کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ دل کچھ بھی کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ ذہن پہ ہر وقت نوریر کی شادی کی فلم سی چلتی رہتی تھی۔ جس پہ بار بار وہ منظر آتے رہتے تھے جس میں عمار اپنی بیوی کے ساتھ فنکشن میں شامل ہوا تھا۔ کتنے خوب صورت، مکمل اور مطمئن لگ رہے تھے وہ پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے۔ ان کے خوشی سے کھلتے چہروں سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی رفاقت میں بے حد خوش ہیں اوپر سے خاندان والوں کے تبصرے۔

"اے پرفیکٹ کپل۔ عمار کے ساتھ ایسی ہی شاندار لڑکی سوٹ کرتی ہے۔ ثمینہ بہت لکی ہے۔ دونوں بہوئیں دیکھنے کی چیز ہیں۔"

"سنا ہے کافی امیر باپ کی ہے، دولت کے ساتھ ساتھ صورت کا خزانہ بھی عمار کے ہاتھ لگا ہے۔ لکی ہے بھئی۔" رات کو تنہائی میں ان آوازوں کا شور اتنا بڑھ جاتا تھا کہ اس کا سر پھٹنے لگتا تھا۔ دل چاہتا کہ وہ زور زور سے چارپائی کے پایوں سے سر کو ٹکرائے، اتنا ٹکرائے کہ یہ سر پاش پاش ہو جائے۔ ان تکلیف دہ مناظر سے چھٹکارہ پانے کا بھلا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا۔

ثمامہ اس کی ذہنی و قلبی کیفیت سے پوری طرح آگاہ تھی۔ اس لیے اس تلخ نوائی پہ کچھ کہنے کی بجائے کچن میں چلی آئی تھی۔ نوریر ویسا ہی تھا، جیسا وہ اسے سمجھتی تھی، جانتی تھی۔ محبت کرنے والا، مخلص، ہمدرد اور خیال رکھنے والا، مگر باقی سب ویسے تھے۔ جیسا وہ انہیں برسوں سے جانتی آئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد رفعت شادی پہ ملنے والی سلامیوں کا حساب لگا رہی تھیں کہ ایک لفافے پہ ان کی نظر جم گئی تھیں۔

"نوریر! تم نے ثمینہ بھابھی سے سلامی کیوں لی

تھی؟" کڑک کر پوچھا گیا تھا۔
"امی! مجھے تو علم نہیں مامی نے مجھے کب لفافہ تھمایا۔ رش اتنا تھا کہ علم ہی نہ ہو سکا کس نے ہتھیلی میں کیا دیا ہے۔" نویر ان کے تنے ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔
"فوراً" اسی وقت ان کے پیسے انہیں واپس کرنے تھے۔ مجھے پتا ہے یہ سلامی انہوں نے میرے بیٹے کو نہیں دی بلکہ رضوان بھائی کے داماد کو دی ہے۔ آخر سمدھی جو ہوئیں ان کی۔" رفعت نے غصے سے کہتے ہوئے لفافہ پھاڑا۔ پورے پچاس ہزار تھے۔
"دیکھ لی نا ان کی کھڑولی۔ اگر اس وقت نویر ان کے بیٹے کا سالا ہوتا تو سلامی لاکھوں میں ہوتی۔ فرق آگیا نا ان کے دلوں میں۔ رضوان بھائی فرماتے ہیں کہ صلح کرلوں۔ رویوں میں کھوٹ نظر بھی آرہا ہے۔" شرر بار نگاہوں سے چائے سرو کرتی شمامہ کو دیکھتے ہوئے پیسے پرس میں رکھ دیے۔
"امی! آپ خواہ مخواہ نویر پر ناراض ہو رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے مامی جی نے اسے لفافہ اس وقت تھمایا ہو جب یہ ان کی بڑی بہو سے ہنستے ہوئے باتوں میں مصروف ہو؟" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے قرۃ بڑے آرام سے بولی تھی' تاہم اس کے طنز کو نویر اور شمامہ دونوں پاگئے تھے۔ وہ نیگ کے حوالے سے اس کی اور ثنا کی گفتگو کا حوالہ دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یار شمامہ! میں نے ایسے تو شادی کا نہیں سوچا تھا۔" اداسی سے بولتے ہوئے عریسہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔
"ارے میری جان! یہ کوئی رونے کی بات ہے۔ تمہاری باسم اور میری نویر سے شادی ہوئی ہے۔ ہماری محبتوں پر وصل کا چاند جگمگا رہا ہے۔ محض ایک دن شادی نہ ہونا' کون سی خدانا خواستہ ٹریجک حقیقت ہے۔" شمامہ نے پیار سے عریسہ کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی صبیح پیشانی پہ بوسا دیا۔ بس کی دل گرفتی نے حقیقتاً" اسے اداس کر دیا تھا۔ یہ سچ تھا کہ ویسا کچھ بھی نہ ہو پا رہا تھا جیسے ان دونوں نے مل کر پلان کیا تھا۔
مہندی کا فنکشن تھا زرتار آنچل تلے شمامہ دیگر کزنز کے ہمراہ عریسہ کو باہر اسٹیج پہ لے آئی۔ ثمینہ لوگ مہندی لے کر آچکے تھے۔ ثنا کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ "چھمک چھلو" پہ ثنا اور عمار نے ڈانس کرنا شروع کیا تو سب ہی مہمانوں نے شوخی اور ترنگ میں خوب خوب سیٹیاں اور تالیاں بجائیں۔ یک ٹک اس منظر کو دیکھتی قرۃ کی آنکھیں ایک دم سے جلنے لگی تھیں۔ دل سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ ساتھ چیئر پہ بیٹھی رفعت اس کی کیفیت کو بغور ملاحظہ کر رہی تھیں۔ وہ بٹی کے دل کی دگرگوں حالات سے بخوبی واقف تھیں' مگر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھیں' مگر قرۃ کے پھیکے پڑتے چہرے پہ ایسا انجانا سا تاثر تھا جس نے انہیں چونکا دیا تھا۔
"قرۃ! بیٹا تم ٹھیک تو ہو؟" وہ پریشانی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ قرۃ کا ہاتھ برف کی مانند یخ تھا۔
"امی! میرا دل ڈوبتا جارہا ہے۔" قرۃ کمزور نقاہت بھری آواز میں بولی۔ لمحوں میں اس کا چہرہ برسوں کا بیمار دکھائی دینے لگا تھا۔
"چلو' بس ہم گھر چلتے ہیں' ابھی تو بیماری جھیل کر اٹھی ہو' خدانا خواستہ زیادہ طبیعت نہ بگڑ جائے۔" رفعت اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ حسان کو کال کرکے انہوں نے بلالیا تھا۔ نویر آفس کے کام کی وجہ سے فنکشن میں شریک نہ تھا۔ مہمانوں میں گھری شمامہ کو ان کے جانے کا علم نہ ہوسکا۔ نہ ہی انہوں نے اسے بتانا گوارہ کیا تھا۔ قرۃ کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو چکا تھا۔
"امی! آپ کو اسے شادی پہ نہیں لے کر جانا چاہیے تھا۔ معلوم تو ہے یہ عمار اور اس کی بیوی کو نہیں دیکھ سکتی۔" نویر رفعت سے مخاطب ہوا۔
"بس بیٹا! قرۃ اس لیے چلی گئی کہ کہیں شمامہ محسوس نہ کرے کہ میری بہن کی شادی کی خوشی نہیں ہے ان کو۔" رفعت سادگی سے بولیں۔ نویر کے لب

بھنچ گئے تھے' ان کی بات سن کر۔

"اگر میری بچی کو بروقت گلوکوز کی ڈرپ لگ جاتی تو اتنا رنگ زرد نہ ہوتا' یہ تو حسان کو رکشا ڈھونڈنے میں وقت لگ گیا۔" رفعت یاسیت سے بولیں' نوید چونکا۔

"کیوں آپ نے شمامہ سے نہیں کہا کہ وہ آپ کو گھر میں ڈراپ کروا دیتی۔ ماموں کی گاڑی اور ڈرائیور تو ہر وقت ریڈی ہوتے ہیں گھر میں۔"

"ارے شمامہ کو تو قرۃ کی طبیعت کی خرابی کا علم تک نہیں۔ وہ ہمارے پاس پھٹکی نہیں' اکلوتی بڑی بہن ہونے کے ناتے سارا وقت ثمینہ بھابھی اور ان کے میکے والوں کی عزت خاطر میں مصروف رہی۔ ہم ماں بیٹیاں بس ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ دولہے کی اکلوتی پھپھو ہوں۔ خدا ایسا وقت کسی کو نہ دکھائے جیسا میں نے دیکھا ہے۔ اٹھ کر بھتیجے کی پیشانی چوم کر اسے اچھے نصیب کی دعا تک نہیں دے سکتی کہ بیٹی کا دکھ پاؤں میں زنجیر ڈال دیتا ہے۔" رفعت منہ پر دوپٹا رکھ کر رو پڑیں۔

کھانا کھلتے ہی شمامہ نے رفعت کو ڈھونڈنے کے لیے نگاہیں چہار سو دوڑائیں' مگر وہ وہاں موجود ہوتیں تو دکھائی دیتی نا۔ مجبوراً" شمامہ نے نوید کو کال ملائی۔

"نوید! پھپھو کہاں ہیں؟ کھانا بھی نہیں کھایا انہوں نے۔"

"قرۃ کی طبیعت خراب ہے۔ اس لیے وہ لوگ گھر واپس آگئی ہیں۔" نوید جواباً" ٹھنڈے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"کیا قرۃ باجی کی طبیعت خراب ہے؟" وہ تو سن کر پریشان ہو گئی۔ اچھی خاصی مقدار میں کھانا گاڑی میں رکھوایا۔ نازش کو گھر جانے کا بتا کر وہ فوراً" گھر آگئی۔

"باجی کی طبیعت خراب تھی تو مجھے تو آپ نے بتایا ہوتا۔" فکر مندی سے بولتے ہوئے وہ قرۃ کی طرف بڑھی۔ قرۃ مسکن اور ادویات کے زیر اثر سو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پہ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

"وہ کیوں بتاتیں۔ تم خود کہاں تھیں' تمہیں خود ان کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔" نوید چبھتے ہوئے انداز میں الٹا اس سے پوچھنے لگا۔

"نوید! میں مہمانوں میں بزی تھی۔"

"ہاں اور اتنی بزی تھیں کہ اپنے گھر والوں کی خبر رکھنے کا بھی خیال نہ رہا تمہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ شمامہ نے الجھ کر نوید کا چہرہ دیکھا۔

"جب امی اور یہ سب تمہارے حوالے سے شادی پہ گئے تھے تو تمہیں ان کی عزت اور خاطر تواضع کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے تھا۔"

"نوید! اپنے گھر والوں کو اگنور کرنے کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ کس بات کو لے کر خفا ہو رہے ہیں۔" آنسو حلق سے اتارتے ہوئے وہ بظاہر ہموار لہجے میں بولی تاہم سیاہ کاجل میں مقید خوب صورت براؤن آنکھوں میں پانی کی جھلملاہٹ ضرور اتری تھی۔ نوید کے دل کو کچھ ہوا۔ اس سجے سنورے روپ میں وہ ہمیشہ کی طرح اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوئی تھی۔ اتنی کہ اس کا دل چاہا کہ وہ اس کا من موہنا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کئی گستاخیاں کر ڈالے۔ اس وقت نگاہوں میں قرۃ کی کمزور شکل اور بیمار سراپا تھا اور کانوں میں رفعت کی باتیں۔ وہ شمامہ کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لینے کی شدید خواہش کو سختی سے کچلتا ہوا دوٹوک اور سخت لہجے میں بولا۔

"شمامہ! تم میری اولین چاہت ہو۔ تم میرے دل میں اپنا مقام اچھی طرح جانتی ہو' مگر میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ میرے گھر والوں کی بجائے کوئی اور تمہارے لیے مقدم ہو۔" وہ محض سر ہلا کر سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ کھانا کچن میں رکھوا کر اس نے ڈرائیور کو واپس بھیج دیا تھا۔ اس کے لائے کھانے کو کسی نے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ اگلی صبح رضوان احمد کو قرۃ کی خرابی طبیعت کا علم ہوا تو وہ اور نازش خود طبیعت پوچھنے چلے آئے بے حد اصرار و محبت سے سارے گھر والوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔

فان کلر کے لہنگے اور دیگر عروسی لوازمات کے ساتھ عریسہ جتنی پیاری لگ رہی تھی۔ بلیک ٹو پیس سوٹ

میں باسم بھی اتنا ہی دلکش لگ رہا تھا۔ بجھے بجھے انداز میں شمامہ دودھ کا گلاس لے کر آئی تو باسم کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی عریسہ نے جھپٹ کر اٹھا لیا۔

"دیکھ لو بیوی! ابھی سے من مانی شروع کردی۔" باسم محبت پاش نظروں سے عریسہ کو دیکھتے ہوئے شوخی سے پوچھ رہا تھا۔

"بالکل جناب۔ میرا جھوٹا پئیں گے تو ان شاء اللہ سکھی ساتھ نصیب ہوگا۔" عریسہ کمال اطمینان سے دودھ پیتے ہوئے بولی۔ ان کا یہ غیر روایتی پن سب ہی کے لیے محظوظ کن تھا۔ شمامہ نیگ لیے بغیر اسٹیج سے اتر آئی اور جا کر رفعت کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کا دل کسی چیز میں نہ لگ رہا تھا۔ کھانا کھاتے ہی رخصتی عمل میں لائی گئی۔ رضوان اور نازش کی آنکھوں میں بیٹی کی جدائی کے لمحے نے نمی بھر دی تھی۔ شمامہ تو عریسہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"اوہ شمامہ! کچھ تو میرے میک اپ کا خیال کرو۔" بھیگے لہجے میں عریسہ نے بظاہر شمامہ کو گھورا تھا۔ گاڑیوں کی لمبی قطار رضوان احمد کے گھر سے روانہ ہوئی تھی۔ رضوان ولا میں ایک دم سے سناٹا اتر آیا تھا۔ شمامہ ابھی تک چیئر پہ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

"بس بیٹا! بہنیں ماں باپ کے گھر جتنا وقت گزار لیں، مگر ان کو ایک نہ ایک جدا ہونا ہی ہوتا ہے۔" نازش نے ملازمہ کو پانی لانے کا کہا پھر شمامہ کے قریب بیٹھ کر پیار سے اسے خاموش کرانے لگیں۔ وہ شادی شدہ تھی، بخوبی اس حقیقت کی ادراک رکھتی تھی، رونا تو اسے نویر کے اجنبی اور سرد رویے کی وجہ سے آرہا تھا۔

"اف! اتنا غیریت بھرا کٹھور انداز، اور اتنی دل لگا کر تیار ہوئی، مجال ہے جو تعریف کی ہو۔" پانی پیتے ہوئے اسے پھر سے رونا آگیا۔

☆ ☆ ☆

باسم اور عریسہ شادی کے بعد حسب قاعدہ دعوتیں نمٹانے میں مصروف تھے۔ آج بھی وہ لوگ باسم کی خالہ کے ہاں مدعو تھے۔ اگلے ہفتے ثنا کے والد محسن گردیزی کے ہاں لاہور جانا تھا۔ محسن صاحب خود پیار اور بہت اصرار سے انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے گئے تھے۔

"اف! یہ اپنوں کی محبت اور ان کا خلوص مجبور کر دیتے ہیں، مگر سچ میں ان لگاتار دعوتوں نے مجھے تھکا کے رکھ دیا ہے۔" ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پہ بیٹھے بیٹھے گھوم کر باسم کی طرف رخ کرتے ہوئے عریسہ نے کہا۔

"ہاں یار! پر کیا کریں۔ اب ہم میریڈ ہیں۔ مکمل ذمہ داری سے رشتوں کو نبھانے کی عادت ڈالنی ہوگی ہمیں۔" یونہی وقت گزاری کو میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے باسم نے جواب دیا۔

"مہینہ تو ہوگیا ہے دعوتیں بھگتاتے بھگتاتے۔ ہمارا ہنی مون بھی لیٹ ہو رہا ہے۔ شمامہ کب سے ہم دونوں کی دعوت کا کہہ رہی ہے۔ اس کو مسلسل ٹالتے ہوئے مجھے اب عجیب سا فیل ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر کے رشتے نمٹاتے ہوئے، بہن کی دعوت کا دن ہی فارغ نہیں مل رہا۔" مسکارہ لگانے کی خاطر عریسہ چہرے کو آئینے کے بالکل قریب کرتے ہوئے بولی۔ ورق گردانی کرتے باسم کے ہاتھ ایک لمحہ کو تھم گئے تھے۔

"ہاں تو کسی دن چلی جاؤ نا اس کے ہاں۔ کسی ایک سے ایکسکیوز کر لیتے ہیں۔" ریلیکس انداز میں لیٹے لیٹے باسم نے ٹانگوں کی قینچی بنالی۔

"واٹ ڈو یو مین چلی جاؤں؟" عریسہ آئینے میں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"تم بھی تو ساتھ چلو گے۔"

"ناٹ ایٹ آل۔ پھپھو کے گھر کا پانی پینے کو دل نہیں چاہتا کجا کہ دعوت کھاؤں۔ جس گھر سے میری ماں روتی ہوئی روانہ ہو۔ اس گھر میں جانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم نہیں جانتیں۔ پھپھو نے میری ماں کی کتنی انسلٹ کی تھی محض ایک چھوٹے سے ایشو کی بدولت اور امی کی طبیعت کتنی بگڑی تھی۔ تم شمامہ کے

گھبرلا جھجک جاؤ' مگر میری طرف سے ویری سوری۔"
قطعیت سے کہتے ہوئے باسم نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے گلے پہ ابھرتی' غائب ہوتی گلٹی اس کے اندرونی خلفشار کی غمازی کررہی تھی۔

"باسم! دس از ناٹ فیئر۔ میں آپ کی بیوی ہوں' میں آپ کے بغیر بھلا کیسے کہاں جاسکتی ہوں' چاہے وہ میری بہن کا ہی گھر کیوں نہ ہو۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"عریسہ! بحث مت کرو۔ بلکہ اگر زیادہ ضد کی تو تمہیں ثمامہ سے بھی قطع تعلقی کرنی ہوگی۔" باسم انتہائی سختی سے بولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر چلا گیا۔ عریسہ منہ کھولے ہکا بکا اس دروازے کو دیکھے گئی جسے ابھی ابھی باسم انتہائی زور سے بند کر گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ ثمامہ اس کی بڑی اور اکلوتی بہن تھی' اپنی غمگسار اور دم ساز بہن سے ناتا توڑنا اپنی سانسوں کی ڈوری توڑنے کے مترادف لگا تھا۔ اس نے ثمینہ سے باسم کا رویہ ڈسکس کیا۔ خود ان کا جواب بھی کم سرپرائزنگ نہ تھا۔

"ہاں ٹھیک تو کہتا ہے باسم' رفعت نے کون سا کوئی کسرباقی چھوڑی ہے۔ اپنے بیٹے کی شادی پہ خود بہ جان دعوت دینے گئے' مگر ان کی طرف سے کوئی بھی ہمارے گھر نہ آیا۔ اب اگر ان کے دل اتنے پتھر ہو چکے ہیں' تو ہم کتنا ایثار کریں۔" وہ ٹھہرے ہوئے' مگر مضبوط انداز میں بول رہی تھیں۔ عریسہ کو اپنا سارا پہناوہ ساری خوشیاں پھیکی لگنے لگی تھیں۔ ذہن میں صرف ایک خیال پنجے گاڑ کر رہ گیا تھا کہ وہ ثمامہ کو کیسے اس کے گھر آنے سے انکار کرے گی۔

☼ ☼ ☼
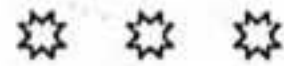
اور اس لمبی چوڑی شاندار سی مہمان داری کا وہی نتیجہ نکلا جو اس سے پہلے کی مہمان نوازیوں کا نکلا تھا۔ مہمان خواتین کا بڑا سا ٹولہ آیا۔ کھانے کی چیزوں سے خوب خوب انصاف کیا۔ گھوم پھر کر چھوٹا سا گھر دیکھا۔ قرۃالعین کو بھی سرتاپاؤں بغور جانچتی نظروں سے دیکھا۔ چند سوالات کیے پھر فون نمبر لے کر چل دیں۔

اگلے دن ماسی سلمی (رشتے کرانے والی) جواب لے کر آگئی۔

"سب کچھ ٹھیک ٹھاک لگا۔ گھر۔ گھروالے' مگر قرۃ بیٹا کی عمر زیادہ لگی۔ کہہ رہے تھے بتیس کا تو ہمارا اپنا بیٹا ہے۔ کم از کم پانچ سال تو دلہن چھوٹی ہونی چاہیے۔" رفعت کو تو سن کر طرارہ آیا۔

"کم بخت' منحوس لوگ۔ میری بیٹی کہاں سے ان کو بڑی لگی۔ خود اپنا کاکا' جھریوں والے منہ والا کسی قابل لگتا تھا میری قرۃ کے۔" ایک تو بیٹی کے ریجیکٹ ہونے کا غم' دوسرا مہمان داری پر لمبا چوڑا خرچہ۔ غصے میں بول بول کر اپنا بلڈ پریشر ہائی کرتی رہیں۔ قرۃ الگ کمرہ نشین ہو گئی تھی۔ ثمامہ کے لیے یہ ساری صورت حال خاصی تکلیف دہ تھی۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ قرۃ کا جلد از جلد کسی اچھی جگہ رشتہ ہو جائے۔ ورنہ تو قرۃ کی ذہنی حالت دیکھ کر اسے ہول اٹھتے رہتے تھے۔ قرۃ ہنسنا بولنا تو درکنار' پھاڑ کھانے والے انداز میں اس سے بات کیا کرتی۔

آج کل رپورٹ پازیٹو آنے کی وجہ سے اس کی طبیعت گری گری رہتی تھی' مگر مجال ہے جو قرۃ ذرا گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹا دے۔ فروہ وغیرہ تو اکیڈمی چلی جاتیں۔ چکر اور متلی نے ایسا بے حال کر رکھا تھا کہ کسی کام کو ٹھیک طرح سے نہ کرپاتی' مگر ایسی حالت میں بھی اسے عریسہ اور باسم کی دعوت کرنا یاد تھی۔

"سنیں! دو ماہ ہو گئے ہیں۔ عریسہ کی دعوت نہیں کی ہم نے۔" رات کو سونے سے قبل اس نے نویر سے کہا تھا۔ کمبل کی تہہ کھولتے نویر کے ہاتھ اس کی بات سن کر رک گئے تھے۔

"امی سے پوچھ لو۔ جب وہ چاہیں کرلو۔" نویر نے سادگی سے کہا تو اس نے ریلیکس ہو کر آنکھیں موند لیں۔ اگلی صبح اس نے چائے کا لبالب کپ بھرا اور رفعت کے پاس ادب سے رکھتے ہوئے خود بھی تخت پہ بیٹھ گئی۔

"پھپھو! عریسہ اور نویر کی دعوت کا کوئی دن نکالیں۔

زیادہ پرانے دولہا دلہن ہوں تو دعوت کا مزا نہیں آتا۔" اس نے ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔ جواب دینے کی بجائے رفعت نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر چند لمحے بعد بولیں۔

"تو تم کوئی ہوٹل بک کروالو نا ان کی دعوت کے لیے۔"

"جی۔" وہ ان کی بات سمجھ نہ پائی تھی۔

"شمامہ! تم اتنی بھولی ہو یا بن رہی ہو۔" وہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔ وہ ان کی نظروں سے محض خائف ہو کر رہ گئی۔

"یہ میری لاڈلی بیٹی آج جس حال میں ہے' اس کے ذمہ دار بھائی ریحان اور ثمینہ بھابھی ہیں اور عریسہ ان کی بہو نہیں تو کیا ہے اور ثمینہ کی بہو کی یہاں میرے گھر میں عزت ہو' ایسا میرے جیتے جی ہرگز نہیں ہو سکتا۔" رفعت کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ اب شرارے برسا رہا تھا۔

"بھول گئیں؟ کیا کیا تھا ان لوگوں نے ہمارے ساتھ۔ میری بیٹی کو اپنے نام پہ بٹھا کر ثمینہ بیگم اپنی من چاہی امیر کبیر بہو لے آئیں۔ میری بیٹی کے ارمان خاکستر ہو گئے۔ آج وہ بڑی عمر کی لگنے لگی ہے سب کو۔ سب پہلی منگنی ٹوٹنے کا سبب پوچھتے ہیں۔ ہم بے قصور کس کو دوش دیں؟" رفعت سینے پر ہاتھ مار مار کر زور سے بول رہی تھیں۔ شمامہ شدید رنج کی کیفیت میں گھری کچن میں واپس آ گئی۔

"یا اللہ! ان لوگوں کے دلوں پہ تو مہر لگ چکی ہے' اب میں کس منہ سے عریسہ کو کہوں کہ میرے گھر کبھی قدم نہ رکھنا۔" برتن دھوتے ہوئے اس کے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اللہ! شمامہ تم کتنی ویک ہو رہی ہو؟" سیب نفاست سے کاٹتے ہوئے عریسہ شمامہ سے کہہ رہی تھی۔

"نوید بھائی تمہارا خیال نہیں رکھتے تو مجھے بتاؤ۔ میں ان کی کلاس لیتی ہوں۔ ان کو والد صاحب کے درجے پہ فائز کر رہی ہو۔ انہیں تو چاہیے کہ دن رات تمہاری سیوا کریں۔" وہ دونوں لاؤنج میں منقش لکڑی کے جھولے پہ بیٹھی ہوئی تھیں جیسے شادی سے پہلے بیٹھ کر ہزاروں باتیں کیا کرتی تھیں۔ اور اب تو ان باتوں میں دلچسپی اشتیاق اور محبت اور بڑھ گئی تھی۔

دونوں نے گھر والوں کے رویوں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اب اپنے میکے کو ہی ملاقات کا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ ہر سنڈے باقاعدگی سے آتیں اور اپنے اپنے گھروں کی خوب ڈھیر ساری باتیں کرتیں۔

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ نوید تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ کیا اپنے بچے کا رکھیں گے۔ باقاعدگی سے میرا چیک اپ کرانے لے جاتے ہیں۔" شمامہ نے سیب کھاتے ہوئے سرشار لہجے میں کہا۔ اس کا کہا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ نوید واقعی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ہاں بس ثمینہ کی فیملی سے تعلقات رکھنے پر اس کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا۔

"تم سناؤ! شادی کو ساتواں مہینہ چل رہا ہے۔ ابھی تک ایسی ویلی نکمی پھر رہی ہو۔" شمامہ نے اب کے شرارت سے عریسہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ عریسہ پہلے سے زیادہ خوب صورت اور صحت مند ہو گئی تھی۔

"ارے نہیں بابا! ایک سال سے پہلے تو نو بے بی۔ باسم کہتا ہے ابھی تم خود بچی ہو۔ تمہیں ہینڈل کرنا مشکل ہے۔ اگر بچہ آ گیا تو وہ تمہارے بچپنے کی نذر ہو جائے گا۔" پاؤں کی ایڑی پر زور دے کر جھولا ہلاتے ہوئے عریسہ مزے سے بولی۔ اسی دم نازش اندر داخل ہوئیں۔

"بیٹا! آپ لوگ مینیو بتا دو۔ خدیجہ بوا ڈنر کی تیاری شروع کر رہی ہیں۔ وہ ڈشز بنواتی ہوں جو نوید اور باسم کو پسند ہوں۔" خاندانی اختلافات اپنی جگہ نازش دونوں دامادوں کی بہت عزت کرتی تھیں۔ دونوں بیٹیوں کی سسرال کو ایک جیسی اہمیت دیتی تھیں۔ بس معاشی فرق کی وجہ سے رفعت کو ایسا لگتا تھا کہ نازش ثمینہ لوگوں کو زیادہ عزت دیتی ہیں۔

"امی! کوئی اہتمام نہیں۔ باسم شہر سے باہر ہے' مجھے

ڈرائیور گھر چھوڑ آئے گا۔" عریسہ نے سہولت سے منع کر دیا۔ اصل بات یہ تھی کہ باسم نوریہ کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ اسے ان دنوں کی تلخ کلامی یاد آجاتی تھی۔ عریسہ باسم کے گریز کو سمجھتی تھی' اس لیے کبھی ڈنر پہ اصرار نہ کیا تھا۔ اتفاق سے کبھی سامنا ہو بھی جاتا' دونوں سرد مہری سے ایک دوسرے سے سلام کر لیتے۔

"چلو میں تمہیں اپنا بیڈ روم دکھاؤں۔ پوری سیٹنگ چینج کردی ہے میں نے۔" عریسہ اب اپنا موبائل کھولے شمامہ کو اپنا بیڈ روم دکھا رہی تھی۔

✸ ✸ ✸

اور وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ شمامہ اور نوریہ کے آنگن میں ننھی ایمان کی قلقاریاں گونجنے لگیں۔ قرۃ ایک ادھیڑ عمر' مناسب شکل و صورت کے مالک صادق حسین کے سنگ بیاہ کر چلی گئی۔ صادق حسین کی صدر میں کپڑے کی ایک دکان تھی۔ بہنوں کے ہاتھ پیلے کرتے کرتے خود اس کی عمر چالیس سے کراس کر گئی۔

ادھر مسلسل ذات کی ریجیکشن نے قرۃ کو خبطی اور سنکی بنا ڈالا تھا۔ رفعت کے پاس اس کی فوری شادی کے علاوہ اور کوئی حل نہ تھا۔ نوریہ اور شمامہ کو صادق حسین کی سیرت اور اعلا اخلاق نے بہت متاثر کیا تھا۔ ایمان کی پیدائش پہ عریسہ لدی پھندی ان کے گھر آئی تھی۔ ڈھیروں ڈھیر تحائف دینے کے ساتھ ساتھ بھانجی کو خوب خوب پیار کیا تھا۔ رفعت اور فروا نے اسے پہلی جیسی محبت اور گرم جوشی سے نوازا۔

کوئی شادی کے ڈیڑھ سال بعد عریسہ کی بھی گود ہری ہو گئی تھی۔

"میں بھی ڈھیر ساری چیزیں لے کے آؤں گی اپنے بھانجے کے لیے۔ بلکہ ایمان خود اپنے کزن کو دے گی۔" شمامہ فون پر عریسہ کو خوشی سے چور لہجے میں بتاتی۔

"بھانجا؟ باسم تو کہتے ہیں کہ ہماری پہلی بیٹی ہونی چاہیے۔" عریسہ ہنستے ہوئے محبوب انداز میں کہتی۔

"چلو! میں خالہ بن رہی ہوں۔ یہی کافی ہے۔"

✸ ✸ ✸

مگر ایک دن یونہی احتیاط سے سیڑھیاں اترتے ہوئے عریسہ کو ایسے زور کا چکر آیا کہ زمین آسمان آنکھوں کے سامنے گھوم گئے تھے۔

نیم وا آنکھوں سے ریلنگ کو تھامنے کی کوشش کی مگر کچھ ہاتھ آنے کی بجائے پاؤں مخملی قدمچے سے اکھڑ گئے۔ فٹ بال کی مانند لڑھکتی ہوئی نیچے آئی اور بے ہوشی کی وادی میں جانے سے پہلے اس نے اپنا سر کسی سخت چیز سے ٹکراتے محسوس کیا تھا۔

ملازمہ جو اتفاقاً "ادھر آئی تھی اس کی زوردار چیخ نے ثمینہ کو افتاں و خیزاں لاؤنج میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بروقت اسپتال لے جانے سے عریسہ کی جان تو بچ گئی تھی مگر اس کے اندر پانچ ماہ سے پلتی جان وہیں کوکھ میں دم توڑ گئی تھی۔

ایک شدید دکھ کی لہر نے سب کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ملول و لگرفتہ باسم کو اپنے بچے کی جان ضائع جانے کا دکھ تو تھا مگر وہ عریسہ کے ماتھے' بازو کی چوٹیں اور اس کی گہری چپ خاموشی سے بے حد پریشان تھا۔

"عریسہ! پلیز یار! سنبھالو' خود کو۔ تمہاری جان بچ گئی۔ اس پہ بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ہمیں اللہ پھر سے اولاد کی نعمت سے نواز دے گا۔ ٹینشن نہ لو۔" عریسہ کے ہاتھ کی پشت پہ بوسہ دیتے ہوئے باسم پیار سے بولتے ہوئے اس کی الجھی لٹیں اس کے کانوں کے پیچھے اڑسنے لگا۔ کم و بیش یہی الفاظ سب ہی بول رہے تھے مکمل محبت اور ہمدردی کے ساتھ۔ مگر باسم کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ وہ مزید چپ نہ رہ سکی۔ فوراً "باسم کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ باسم کے ساتھ مل کر اس نے بچے کے حوالے سے کتنا کچھ پلان کر رکھا تھا۔ پورے بیڈ روم میں پیارے پیارے بچوں کی تصاویر لگائیں۔ ٹوائز اور کپڑے خریدے۔ روز ناموں کی فہرست مرتب کرتے۔

باسم کے بازو پر سر رکھ کر اس نے کوئی رات ایسی نہیں گزاری تھی جس میں بچے کی باتیں نہ کی ہوں۔

ہولے ہولے اس کی نازک پشت سہلاتے ہوئے باسم نے اسے رونے دیا۔

رورو کر تو ثمامہ کا بھی برا حال تھا۔

"میری بہن جس کا نزلہ زکام میں برا حال ہوتا تھا۔ اب اتنی تکلیف کیسے برداشت کی ہوگی۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ پتا نہیں کس حال میں ہے۔ مس کیرج کو کہیں دل سے نہ لگالیا ہو۔" آنسو پونچھتے ہوئے وہ تیزی سے ایمان کی چیزیں بیگ میں بھرنے لگی۔

"جو ہونا تھا' ہوگیا اب عریسہ بالکل ٹھیک ہے۔ تمہارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" یہ کھردری آواز اور سخت لہجہ سوائے رفعت کے اور کس کا ہوسکتا تھا؟ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس کے ہاتھ اور آنسو ٹھٹھر کر جم گئے تھے۔

"مگر کیوں پھپھو! عریسہ میری اکلوتی بہن ہے۔ وہ میری بیٹی کو دیکھنے آئی تھی۔ آج وہ خود دکھی ہے تو میں نہ جاؤں۔" وہ سراپا سوال بنی۔

"اگر عریسہ رضوان بھائی کے گھر ہوتی تو تم مل آتیں مگر ثمینہ بھابھی کے گھر جانے کی قطعاً" کوئی ضرورت نہیں۔ تم اس گھر کی بہو ہو۔ تمہارا مرنا جینا ہمارے ساتھ ہے؟" رفعت سفاک لہجے میں پتھر برسا کر باہر چلی گئیں۔

"نوید! آپ بھی تو کچھ بولیں ناں۔ میں بس عریسہ کو ایک نظر دیکھ کر واپس آجاؤں گی۔" اس نے روہانسے انداز میں نوید کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ تو نوید جو ماں کے انداز و الفاظ پہ گم صم بیٹھا تھا۔ محض بے بسی سے ایک سانس بھر کر رہ گیا۔

"مجھے بس آپ کی پرمیشن چاہیے۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔"

"ثمامہ! تم پلیز صبر کرو۔ دعا کرو یہ برف جلد پگھل جائے۔ رشتوں کا یہ تلخ چہرہ خود میرے لیے بھی تکلیف دہ ہے۔ مگر امی کی نافرمانی بھی میں نہیں کرسکتا۔" اس کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھوں کی حدت منتقل کرتے ہوئے نوید دھیمے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ثمامہ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑائے اور اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

رضوان احمد ناک کی پھننگ پہ عینک ٹکائے اخبار کا مطالعہ کررہے تھے کہ نازش چائے کا کپ لے کر ادھر آگئیں۔

"رضوان! آپ کو رفعت سے سنجیدگی سے بات کرنی چاہیے اب۔ اس کا یہ ضدی رویہ ہماری بچیوں کی زندگی کو متاثر کررہا ہے۔" چائے انہیں تھماتے ہوئے نازش مکمل سنجیدگی سے بولیں۔

"کیا بات کروں۔ جب بھی کچھ کہیں تو وہ عمار اور قرۃ کے بریک اپ کو بیچ میں لے آتی ہے۔ جو چل رہا ہے چلنے دو۔ رفعت میری بہن ہے۔ میں اسے بخوبی جانتا ہوں۔ اپنی کہی بات سے پیچھے ہٹنا اس کی سرشت میں نہیں' اماں مرحوم بھی اس کی اس عادت سے عاجز رہتی تھیں۔ بس ہماری بچیوں کا میکہ آباد ہے۔ ہمیں صورت دکھا جاتی ہیں۔ یہ کافی نہیں کیا؟" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ اطمینان سے بولے۔

"کیا خاک صورت دکھا جاتی ہیں؟ دوسرا ہفتہ آگیا ہے۔ دونوں میں سے ایک نہیں آتی۔ عریسہ بیڈ ریسٹ پہ ہے تو ثمامہ کے گھر کے کام۔" نازش خاصا تپ کر بولی تھیں۔

"اب جب تک عریسہ کا ریسٹ ختم نہیں ہوتا۔ ثمامہ بھی ماں کو ملنے نہیں آتی۔ خدا نے کوئی نرینہ اولاد دی ہوتی تو آج یوں بیٹیوں کی راہ نہ دیکھ رہی ہوتی؟" نازش کے لہجے میں پرانا دکھ بول رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چلو اٹھو میں تمہیں عریسہ کے گھر لے چلوں۔؟"

نوید اس کے سر پر کھڑا بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ثمامہ نے آنکھوں پر رکھا بازو ہٹا کر بغور اسے دیکھا جیسے اس کے کہے کو سمجھنے کی کوشش کررہی ہو۔ چہرے پر الجھن زدہ تاثرات تھے۔

"میں کہہ رہا ہوں' تمہیں ریحان ماموں کے گھر جانا ہے یا نہیں؟" اسے یوں ہی لیٹا دیکھ کر نوید اب کے

قدرے جھنجلا کر بولا۔
"اٹھو! بس دس منٹ عریسہ کی طبیعت پوچھ کر واپس آجائیں گے۔" نویر اس کی آنکھوں میں اترتی بے یقینی کو نظرانداز کرتے ہوئے آرام سے برش اٹھا کر بال سنوارنے لگا۔ درحقیقت گھر میں پھیلی کئی ہفتوں کی ٹینشن سے وہ تنگ آچکا تھا۔ شمامہ نہ اس سے سیدھے منہ بات کرتی نہ گھر والوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی۔ امی کئی دفعہ اس کے رویے کی شکایت اس سے کرچکی تھیں وہ کیا کرتا' وہ تو خود اس سے بات کرنے سے گریزاں تھی۔ آنکھیں' منہ سوجائے سارا دن کمرہ بند کیے اندر پڑی رہتی۔ اسے حقیقت میں نویر کی کم ہمتی اور بے بسی نے بہت مایوس کیا تھا۔
وہ بھی کیا کرتا۔ مقابل اس کی ماں تھی' جس کے پاس اسے خاموش کرانے کے کئی دلائل تھے۔ اپنی بیوگی ان کی یتیمی' غربت' قرۃ کے ٹوٹے خواب۔ مگر آج جانے جی میں کیا آیا کہ شمامہ کو عریسہ کی طرف لے جانے کا کہہ ہی دیا۔
شمامہ کے اندر تو جیسے بجلی سے دوڑ گئی تھی۔ فوراً" کرنٹ کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پہ کھلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ نویر باہر آکر اپنے جوتے پالش کرنے لگا۔
"بیٹا! کہیں جارہے ہو؟" گاؤ تکیے کا غلاف بدلتے ہوئے رفعت نے پوچھا۔
"جی امی! شمامہ کو عریسہ کی طرف لے جارہا ہوں۔ وہ بہن کو بہت مس کررہی ہے۔" زور زور سے برش رگڑتے ہوئے اس نے عام سے انداز میں جواب دیا۔
رفعت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نویر کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ اپنے اور بہنوں کے مشترکہ کمرے سے باہر نکلتی قرۃ نے بھی اس کی بات سن لی۔ وہ وہیں برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ چہرے کے عضلات ایک دم سے تن گئے تھے۔
"تو ٹھیک ہے۔ تم بیوی کو عریسہ کی طرف لے جاؤ۔ میں واپس اپنے گھر جاتی ہوں' اور کبھی بھول کر بھی اس گھر کی دہلیز پہ قدم نہیں رکھوں گی۔ آج سے آپ کے اور میرے راستے الگ الگ۔" قرۃ کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ جیسے اپنے کہے پر عمل نہ کرنا موت کے مترادف ہوا اس کے لیے۔
"قرۃ! یہ ٹھیک نہیں ہے اب تم شادی شدہ ہو۔ اپنی نئی زندگی شروع کرچکی ہو۔ شمامہ کا عریسہ سے قطع تعلقی کرنا کسی طور مناسب نہیں۔" نویر نے تحمل سے بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"بیٹا جی! اب مناسب صرف یہ ہے کہ تم اپنی بیوی' بچی کو لے کر الگ ہوجاؤ' اپنی الگ دنیا بساؤ' تمہیں ہمارے دکھ سکھ سے کوئی غرض نہیں تو ہمیں بھی کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔" رفعت نے ایک دم سے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔
اپنے کمرے سے تیار ہوکر سرشار باہر آتے ہوئے شمامہ صحن میں آکر رک گئی۔ باہر کی صورت حال ہرگز خوش گوار نہیں تھی۔
"امی! آپ کو ہی کچھ اصول پسندی سے کام لینا چاہیے۔ آپ بھی قرۃ کا ساتھ دے رہی ہیں۔" نویر زچ ہونے والے انداز میں بولا۔
"تو میں کیا کہہ رہی ہو۔ تم ثمینہ کی طرف نہ جاؤ۔ صرف یہ کہہ رہی ہوں' اپنا الگ گھر بساؤ۔ خوش رہو۔ میرا کیا ہے۔ اتنی عمر گزر گئی تو باقی بھی گزر جائے گی۔ اب میرا احسان خیر سے اپنے پیروں پہ کھڑا ہوچکا ہے۔ وہ بہنوں کے فرض پورے کرسکتا ہے۔ وہی آخر تک ہمارا ساتھ نبھائے گا۔" رفعت لاتعلقی سے کہہ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔
"امی! فار گاڈ سیک! آپ زیادتی کررہی ہیں۔" عریسہ کے گھر جانے اور میرے الگ ہونے کا آپس میں کیا تعلق بنتا ہے۔؟ نویر تقریباً" گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شمامہ جو چند لمحے قبل نویر کی جی داری اور جرات فیصلہ پر جوش ہورہی تھی' اب شوہر کی بے بسی اور لاچاری نے اسے آبدیدہ کردیا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور نویر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
"نویر! کوئی بات نہیں۔ پھپھو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

میری عریسہ سے اسکائپ پہ بات ہوتی رہتی ہے۔ اس کا ریسٹ اب صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ امی کے گھر اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ ڈونٹ وری۔" بدقت لہجہ ہلکا پھلکا بناتے ہوئے وہ نارمل انداز میں بولی۔

نوری نے تشکر بھرے انداز میں شمامہ کو دیکھا تھا۔ اس تشکر میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼
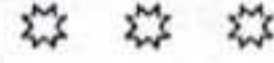
ہمارا رویہ ہماری شعور کی بنیادوں پر پروان چڑھتا ہے۔ ہمارا شعور ہی ہماری زندگی کی ترجیحات کا تعین کرتا ہے۔

قرۃ العین کی زندگی کی اولین ترجیح بلکہ خواب یا شدید ترین خواہش کہہ لیں تو وہ عمار کو چاہنا' اس کی چاہت کو پانا اور اس کی ہم سفری کو حاصل کرنا تھا۔

مگر تقدیر سے زیادہ اثر پذیر کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ تقدیر کے اسی الٹ پھیر نے عمار کو ثنا اور قرۃ کو صادق حسین کی ہمراہی میں دے دیا۔ طلب جتنی شدید ہو' نارسائی کا احساس اتنا ہی غالب رہتا ہے۔

قرۃ کی قنوطیت' تلخی اور ذات کے عدم توازن کی وجہ تقدیر کے فیصلے سے سمجھوتہ نہ کرنا تھی۔ ورنہ صادق حسین کی محبت' چاہت اور وارفتگی میں کوئی کمی تو نہ تھی۔

اس کے سپاٹ چہرے کے باوجود اس کے سجے سنورے وجود کو اپنے سادہ انداز سے خوب سراہتا۔ اس کی نرمی و توجہ سے قرۃ کا من ذرا جو پگھلنے لگتا تو پھر سے عمار کی یاد بری طرح سے اس پہ حملہ آور ہوتی کہ صادق حسین کا سارا والہانہ انداز اسے ایک دم سے برا لگنے لگتا۔ صرف صادق حسین ہی نہیں بلکہ اپنے گرد و پیش سارے ہنستے مسکراتے' خوش باش چہرے اسے برے لگتے تھے۔ جن میں شمامہ کا چہرہ سر فہرست تھا۔ جو بار بار ان لوگوں کا دم بھرتی تھی جنہوں نے اس کے دل کی نگری کو اجاڑا تھا۔ رفعت اپنی مامتا کے ہاتھوں اسے مکمل سپورٹ کرتی تھیں۔ شمامہ کا سنڈے کو میکے جانے کا پروگرام بنتا تو یہ بھی سنڈے کو میکے آن دھمکتی۔ اوپر سے فرمائشی پروگرام چلتے کہ لنچ یہ ہو تو ڈنر پہ یہ۔

شمامہ بے چاری کا سارا پروگرام اکارت چلا جاتا اوھر عریسہ دانت پیس پیس کر اسے بلاتی رہتی۔

رضوان' ریحان ساتھ نازش اور ثمینہ کا اس سال حج کی سعادت حاصل کرنے کا اکٹھے چانس بن گیا۔ چاروں رفعت اور اس کے بچوں سے الوداعی ملاقات کرنے آئے تھے۔ کل ان کی فلائٹ تھی۔ رفعت نے قرۃ کی دل جوئی کے خیال سے ریحان اور ثمینہ سے زیادہ لگاوٹ کا مظاہرہ نہیں کیا' ورنہ بڑے بھائی سے ملتے ہوئے ان کے کتنے ہی آنسو اندر مچل کر رہ گئے تھے۔ وقت رخصتی شمامہ اور عریسہ ایئرپورٹ پر ماں اور باپ کے گلے لگ کر خوب روئیں۔ یہاں تک کہ ان کی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

تمام ٹی وی چینلز ایک ہی نیوز کو بار بار بریک کر رہے تھے۔

دوران حج منیٰ میں بھگدڑ کے دوران شہید حجاج کرام کے ناموں کی فہرست جاری کی جا چکی تھی۔ سب کے دل یوں بند تھے گویا اپنی ہی دھڑکنوں کی آواز خود سن رہے تھے۔ ساکت لب اور پتھرائی آنکھیں ٹی وی اسکرینز پہ جمی تھیں۔ جاں بحق افراد میں ان چاروں رضوان' ریحان' ثمینہ اور نازش کا نام شامل نہیں تھا۔ مگر ان سے رابطہ بھی تو نہیں ہو پا رہا تھا۔ لاپتا افراد کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔

"باسم! میرے امی ابو کا کچھ پتا کرو۔ وہ کہاں ہیں۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" سر زور زور سے پٹختے ہوئے عریسہ' باسم سے کہہ رہی تھی۔ وہ کیا کہتا خود اس کے ماں باپ کا تا حال پتا نہ تھا۔ عمار و ثنا روتے دھوتے اسلام آباد سے آ چکے تھے۔

"بھائی! امی ابو کہاں چلے گئے۔ وہ کیوں جاتے ہوئے بار بار مجھے کہہ رہے تھے کہ گھر کا خیال رکھنا۔" باسم عمار کے گلے لگ کر سسک پڑا تھا۔ شہید حاجیوں

کی تعداد میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مگران چاروں کا تاحال کچھ پتا نہ تھا۔ عمار اپنے ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے خود معاملات حاصل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ مگر تاحال کوئی خوش آئند بات علم میں نہ آئی تھی۔

☼ ☼ ☼
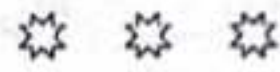
"ثمو! میری جان۔ کچھ کھالو۔ کب تک ایسے پڑی رہو گی۔" رفعت پچکارتے ہوئے شمامہ کو اٹھا رہی تھیں۔ شمامہ ان دنوں دوسرے۔جی سے تھی۔ ماں باپ کی گم شدگی کی اطلاع اس کے دل و دماغ پر ایک بجلی بن کر گری تھی۔

کھانا پینا ایک طرف، بس روتے ہوئے امی ابو کی تکرار اس کے لبوں سے جاری تھی۔ ایمان کو بھی فردا نے سنبھالا ہوا تھا۔ ہر فرد اپنی جگہ پریشان مگر بے بس تھا۔ رفعت خود بھی بھائیوں کی گم شدگی سے بہت غم زدہ تھیں۔

خدانا خواستہ اگر وہ نہ ملے تو اس سوچ سے ہی ان کا دل بند ہونے لگا تھا۔ شمامہ کی حالت الگ پریشان کر رہی تھی۔

"پھپھو! میرے امی ابو کو ڈھونڈیں۔ ان کے لیے دعا کریں۔ میں ان کے بغیر مر جاؤں گی۔ انہوں نے تو خانہ خدا کے قریب ہماری طویل زندگیوں کی دعائیں مانگی ہیں۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے وہ خود ہمارے پاس لوٹ کر نہ آئیں۔" شمامہ روتے ہوئے رفعت سے کہہ رہی تھی۔

"میری بیٹی! میں کیوں نہ دعا کروں۔ میرے دونوں ویر گم ہیں۔ میرے دل سے پوچھو۔ مجھ پہ کیا گزر رہی ہے۔ میری عمر میرے بھائیوں کو لگ جائے۔ ان کے گھر سلامت رہیں۔ اپنی بیویوں کے ساتھ خیر سے واپس آئیں؟" رفعت گلوگیر انداز میں بولیں۔ پھر روتی ہی چلی گئیں۔ بھائیوں کے ساتھ بیتا ایک ایک پل انہیں یاد آرہا تھا۔ اپنے ماں جائیوں کی محبت، بھائیوں کی مہر و وفا، ان کی نوازشیں۔ اسی وقت اٹھ کر وضو کیا۔ اور جائے نماز پر بیٹھ گئیں۔

بھول گئیں کہ کبھی عمار نے ان کی بیٹی کو ٹھکرایا تھا۔ کوئی ثنا ان کی بیٹی کے حق میں غاصب ثابت ہوئی تھی۔ یاد تھا تو اتنا کہ ان کے دو بھائی اپنی شریک حیات کے ساتھ سرزمین مقدس پہ مل نہیں رہے ان کے بچوں کی جان سولی پہ اٹکی ہوئی ہے۔ انتہائی خشوع و خضوع سے گڑگڑاتے ہوئے رب کے حضور ان چاروں کی سلامتی و خیریت کی دعا مانگنے لگیں۔ دعا مکمل کرنے کے بعد ان کے چہرے پہ سکون اتر آیا تھا۔ پھر بے حد اطمینان اور ٹھہراؤ سے سب سے مخاطب ہوئیں۔

"چلو! تم سب لوگ تیار ہو جاؤ۔ ہم ریحان بھائی کے گھر چلتے ہیں۔ رضوان بھائی کا تو گھر بند ہے۔ وہاں سب بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔؟"

☼ ☼ ☼

نازش کے صحیح سلامت ملنے کی اطلاع نے ان سب کے مردہ تنوں میں گویا زندگی کی نئی روح پھونک تھی۔

نازش کی اسکائپ پہ فردا "فردا" سب سے بات ہوئی تھی۔ وہ خود تینوں کی گم شدگی پہ بہت پریشان تھیں۔ ٹکٹ ملتے ہی عمار خود سعودی عرب روانہ ہو گیا۔ گھر میں دوست احباب کا تانتا بندھا تھا۔ باقی سب تو رات گھر کو لوٹ آتے، مگر رفعت کا مستقل قیام "ریحان ولا" میں ہی تھا۔

مخلص و ہمدرد رشتہ داروں کے لیے رفعت کی یہاں موجودگی باعث مسرت تھی۔ قرۃ ان دنوں امید سے تھی۔ اس لیے اس کے مزاج پہ خوش گوار احساسات کا غلبہ رہتا تھا۔ تند خوئی اور درشت مزاجی میں بھی خاطر خواہ کمی ہوئی تھی۔

اور پھر یہ ان سب کی رو رو کر مانگی گئی دعاؤں کا اعجاز تھا کہ عمار کی بھاگ دوڑ کے سبب باقی تینوں بھی مل گئے۔ ٹھیک ایک ماہ بعد ان پانچوں نے بخیر و عافیت اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا۔ سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، دل شکر کی تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اور چہروں

سے خوشی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آج رضوان احمد اور ریحان احمد دونوں کی پوری فیملیز کی دعوت رفعت کے ہاں تھی۔ چھوٹا سا آنگن زیادہ افراد کی بدولت بھرا ہوا تھا۔ فروا اور ثمامہ نے سارے صوفے اور چیئرز باہر صحن میں سیٹ کردی تھیں جن پہ براجمان مرد حضرات بڑی توجہ اور یکسوئی سے رضوان احمد اور ریحان احمد سے دوران سفر ہونے والے حادثے کی تفصیلات سن رہے تھے۔ ماحول میں اشتہا انگیز خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ثمامہ اور فروا کچن میں کوکنگ میں مصروف تھیں۔ افرا بھی ان کے ساتھ شامل تھی۔ مگر عریسہ حسب عادت سلیب پہ چڑھی بیٹھی ٹانگیں ہلاتے ہوئے مزے سے گرما گرم کباب کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں کررہی تھی۔

"اللہ عریسہ! تین کباب تو کھا چکی ہو۔ باقی ڈشنز کی تو جگہ چھوڑو معدے میں۔" سلاد بناتے ہوئے ثمامہ نے اسے ٹوکا تھا۔

"کمال ہے۔ ایک تو دعا کرتی تھیں کہ ہمارے گھرانے انڈیا پاکستان والے تعلقات چھوڑدیں۔ اب جب کہ دونوں شیروشکر ہوچکے ہیں تو تم بلاوجہ روک ٹوک کرکے میرا دل خراب کررہی ہو۔" انگلی پہ لگے کیچپ کو چاٹتے ہوئے عریسہ مزے سے بولی۔

"تم اور کوئی بات آسانی سے سمجھ جاؤ۔ ناممکن ڈاکٹر نے تمہیں زیادہ چلی اور سپائسی چیزیں کھانے سے منع کیا تھا۔" کھیر کا ڈونگہ فریج میں رکھتے ہوئے ثمامہ نے اسے یاد دلایا۔

صحن ہی میں نیچے فرش پہ لمبا دسترخوان لگادیا گیا۔ ثنا اور عمار بھی اپنے کیوٹ سے بیٹے سوید کے ہمراہ دعوت میں شریک تھے۔ بلاشبہ، تین سالوں پہ محیط نفرتوں، تلخیوں اور اور کدورتوں بھرا وقت گزر چکا تھا۔ کیونکہ ہر ایک نے یہ حقیقت جان لی تھی کہ نفرت تیزاب کی مانند ہوتی ہے۔ یہ جتنی دیر دل کے برتن میں رہتی ہے اتنا ہی یہ برتن گل سڑ چکا ہوتا ہے۔ ایثار نرمی، درگزر اور جھکنے اور معاف کرنے سے دل کی دنیا آباد ہوا کرتی ہے۔ اور جب دل آباد ہوں تو زندگی میں روشنیوں کا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔

☼ ☼

ناول وَلٹ

فائزہ افتخار

دسویں اور آخری قسط

ام ہانی بستر تہ کر رہی تھی۔۔۔ اگرچہ سلمیٰ اسے کسی کام کو ہاتھ تک نہ لگانے دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس سے جو بن پڑتا تھا وہ کر گزرتی تھی۔

سلمیٰ کی حالت بھی تو اب ایسی نہیں تھی کہ وہ بھاگ دوڑ کے گھر کے کام بھی نمٹائے اور بچوں کو بھی دیکھے۔ ام ہانی نے اس کے نہ نہ کرتے رہنے پر بھی نا محسوس طریقے سے کتنے ہی کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ خاص طور پہ بچوں کو تو وہ اپنے ساتھ ہی لگائے رکھتی۔۔۔ اس سے خود اس کا دل بھی بہلا رہتا تھا۔

"تو پھر آگیا خدا بخش؟"

کھلی کھڑکی سے اسے سلمیٰ کی آواز آئی۔ جو صحن میں بیٹھی آنے والے مہمان کے لیے ننھا سا کرتا سی رہی تھی۔

"کتنی بار کہا ہے کچھ چاہیے ہو تو مجھے کہلوا بھیجا کرے میں بچے کے ہاتھ بھجوا دیا کروں گی۔"

"مجھے کیا چاہیے ہو گا بھلا۔۔۔ روٹی' پانی۔۔۔ چائے سب کچھ خود ہی تو ڈیرے پہ پہنچا دیتی ہے۔۔۔ بچے بھی صبح شام وہاں آ کے مل لیتے ہیں۔۔۔ لیکن میرا دھیان تو تجھ میں اٹکا ہے۔ بس تجھے ایک نظر دیکھنے آگیا۔" ام ہانی کے کھیس تہ کرتے ہاتھ رکے۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اب دیکھ لیا مجھے۔۔۔ ہو گئی تسلی؟ اب تو جا ڈیرے پہ۔"

"کیسے ہو گی تسلی؟ تو پورے دنوں سے ہے۔ تجھے کسی بھی وقت میری ضرورت پڑ سکتی ہے سلمیٰ۔"

"آئے ہائے۔۔۔ دیوار سے دیوار ملی ہے۔ اور سارے پڑوسی ہی اتنے اچھے اور خیال رکھنے والے ہیں۔ وقت آئے گا تو ماسی دوڑی آئے گی ایک آواز پہ۔۔۔ تو سمجھتا کیوں نہیں خدا بخش۔۔۔ ایک ہی کمرے کی چھوٹی سی کوٹھڑی ہے ہماری اور بی بی عدت سے ہے تیرا یہاں آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

اور سلمیٰ کی اس بات سے ام ہانی پہ کھلا کہ خدا بخش کے شب و روز ڈیرے پہ کیوں بسر ہو رہے ہیں آج کل' ورنہ وہ اسے معمول کی بات سمجھ رہی تھی کہ شاید خدا بخش اپنی فصل کی کٹائی کے دنوں میں وہیں وقت زیادہ گزارتا ہو گا۔

"میں سب سمجھتا ہوں سلمیٰ مجھے بھی اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ میری وجہ سے بی بی کی بے پردگی نہ ہو۔۔۔ مگر۔۔۔" خدا بخش کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی محسوس کر کے سلمیٰ کو فکر لاحق ہو گئی۔

"سن۔۔۔ وہاں ڈیرے پہ زیادہ ٹھنڈ تو نہیں۔ تجھے ایک اور رضائی دوں؟"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں رات کو الاؤ جلا لیتا ہوں۔ ہاں تجھے کسی چیز کی ضرورت نہ پڑے اس لیے پوچھنے چلا آتا ہوں۔"

"ہاں ویسے۔۔۔ ضرورت تو ہے دودھ اور چینی ختم ہے۔ دے دے گا راشن والا؟ پہلے ہی کافی ادھار چڑھ گیا ہو گا۔"

"دے دے گا۔۔۔ دید لحاظ والے لوگ ہیں سب' وہ بھی جانتا ہے ہمیں ادھار سودا لینے کی عادت نہیں یہ تو مہمان ہیں گھر میں۔۔۔ تو میں لا دیتا ہوں ابھی۔"

وہ تو چلا گیا اور ام ہانی کچھ پریشان۔۔۔ کچھ شرمندہ سی

ہاتھ میں رکھے کھیس کو ایک جانب رکھ کے سر نیہوڑا کے وہیں بیٹھ گئی۔

یوں کسی پہ ان چاہا بوجھ بن جانے کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ☼ ☼ ☼

"ہنی... کہاں ہو تم؟"

میں سارے دن کی تلاش کے بعد تھکا ہارا کمرے میں داخل ہوا تو ام ہانی کی تصویر کے سامنے رک کر شکوہ کیے بغیر رہ نہ سکا۔

"کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے تمہیں... اور کہاں کہاں ڈھونڈوں، کہاں چھپ گئی ہو تم... اور کیوں؟ کس بات کی سزا دے رہی ہو مجھے... صرف تمہیں چاہنے کی۔ یقین کرو ہنی، میں وعدہ خلاف نہیں ہوں اور تم سے کیا عہد توڑنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا، تمہاری خوشی کے لیے میں کر لیتا تانیہ سے شادی... لیکن یہ وعدہ پورا کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس

میں میرا کوئی قصور نہیں ہنی مجھے سزا مت دو... مت دو مجھے سزا۔"

اس کا نام پکارتے پکارتے میں نیند کی اس وادی میں اتر گیا... جہاں مجھے اسے پھر سے تلاش کرنا تھا۔ مارے مارے پھرنا تھا۔ اسے پکارتے ہوئے۔

خواب میں بھی...

☼ ☼ ☼
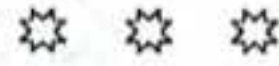
اون اور سلائیوں سے منا سا موزہ بنتے ہوئے، سلمیٰ کے چہرے پہ ممتا بھری مسکراہٹ کی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جو اس کے سانولے پن کو اتنی الوہی چمک دے رہی تھی کہ ام ہانی نے زیر لب ماشاء اللہ پڑھتے ہوئے فوراً" نظر پھیرلی... اور آگے بڑھ کے اس کی جھولی میں اپنی طلائی چوڑیاں رکھیں...

وہ حیرت کے مارے اچھل ہی پڑی۔

"یہ کیا بی بی؟"

"میں تم پہ بہت بوجھ بن گئی ہوں سلمیٰ۔" اب وہ اپنے گلے سے چین اتار رہی تھی۔

"اپنی پریشانیوں میں ایسی گم رہی کہ اس بات کا احساس تک نہ ہوا... تم بس یہ زیور بیچ دو... جب تک میں عدت میں ہوں اپنے لیے کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو سکتی تم انہیں بیچ کے میرے اخراجات پورے کر سکتی ہو۔"

کتنی ہی دیر تک تو سلمیٰ حیرت سے منہ کھولے اسے تکتی رہی۔ پھر گھبرا کے اپنی جھولی میں پڑی چوڑیاں دوبارہ سے پہنانے لگی۔

"توبہ توبہ... ایسا نہ کہیں بی بی... وہ دن آنے سے پہلے میں مرنہ جاؤں... جو آپ کے زیور بیچ کے آپ کو دو لقمے کھلانے پڑیں... آپ کا بھلا کیا بوجھ ہے اور کیا خرچا سارے دن میں گن کے دو نوالے لیتی ہیں آپ۔"

"مگر میری وجہ سے تمہارا شوہر بھی تو تین راتوں سے گھر سے باہر ہے۔ اتنی سردی میں۔" وہ مزید شرمسار ہو گئی۔

مگر سلمیٰ نے بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہائے تو کیا ہوا بی بی... مرد ذات ہے... سردی سے پگھل نہیں جائے گا۔ وہاں ڈیرے پہ پکی کوٹھڑی ہے۔ کوئی ننگے آسمان تلے نہیں سوتا اور الاؤ بھی جلا لیتا ہے رات کو... پھر... فصل کی رکھوالی بھی ہو جاتی ہے۔ اسی بہانے آپ کی عدت کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔ آپ یہ چوڑیاں اب دوبارہ نہیں اتاریں گی... بس۔"

"عدت ختم ہوتے ہی میں کوئی ملازمت کر لوں گی۔"

"لیں... بھلا اس گاؤں میں آپ کو کیا ملازمت ملے گی بی بی... میری اوقات نہیں ہے آپ کو نصیحت کرنے یا مشورہ دینے کی... لیکن پھر بھی چھوٹا منہ بڑی بات کروں؟ آپ حویلی چلی جائیں... نہ نہ... مجھے آپ کا وجود بھاری نہیں۔ لیکن بی بی، عزت اپنوں میں ہی ہوتی ہے۔"

"چلی جاؤں گی سلمیٰ... میں نے کہا نا... کچھ وقت لگے گا۔ ابھی گئی تو وہ پھر سے مجھے مجبور..."

گھبرا کے ام ہانی نے بات ادھوری چھوڑی... وہ کیا کہنے جا رہی تھی سلمیٰ سے، مگر سلمیٰ نے شاید اس کی ادھوری بات پہ دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ وہ تو یکایک درد سے دہری ہو رہی تھی۔

"بی بی... ہائے۔" اس کی سفید پڑتی رنگت دیکھ کے ہانی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"کیا ہوا سلمیٰ؟"

"بی بی ذرا برابر سے ماسی کو بلانا۔"

☼ ☼ ☼

کتنے ہی دن ہو گئے تھے سالار دفتر جاتا تھا... نہ کمرے سے نکلتا تھا۔ اماں دن میں دو بار کئی کئی گھنٹے دستک دینے کے بعد اگر کبھی دروازہ کھلوانے میں کامیاب ہو بھی جاتیں اور زبردستی اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھ ہی آتیں تو اگلے دن وہ ٹرے جوں کی توں واپس لے جاتے ہوئے ان کا کلیجہ کٹ جاتا۔

وہ چوبیس گھنٹے نشے میں دھت اوندھا پڑا رہتا تھا۔ نہ کسی سے کلام کرتا تھا نہ نظر اٹھا کے ہی ان کی جانب دیکھنا گوارا کرتا تھا۔

آج دل کڑا کر کے اماں نے اس سے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان ہی لی۔

"غصہ ہو گا تو ہو تا رہے بھلے.... اسی بہانے اس کی چپ تو ٹوٹے۔ بھلے مجھ پہ چلائے.... کمرے کی چیزیں اٹھا اٹھا کے پھینکے توڑ پھوڑ کرے مجھے برا بھلا کہے.... مگر .... مگر کچھ تو بولے۔"

"سالار۔" انہوں نے بیڈ پہ اوندھے گرے سالار کو مخاطب کیا۔

"تم ناراض تو ہو گے ہی کہ میں تمہارے بار بار کہنے کے باوجود واپس امریکہ کیوں نہیں جا رہی۔ اب بے شک یہ جاننے کے بعد مزید ناراض ہو جاؤ کہ میں نے تمہیں چھوڑ کے وہاں جانے کا ارادہ ٹالا نہیں.... بلکہ بالکل ہی ترک کر دیا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا رکیں۔ توقع تھی وہ پلٹ کے ان پہ برسے گا۔

زبردستی انہیں اپنی زندگی سے دور چلے جانے کا کہے گا۔ مگر وہ خاموش تھا۔ جیسے اب اسے ان کے ہونے نہ ہونے سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

جیسے وہ جان گیا ہو اب اس نے عمر بھر ہجوم میں بھی تنہا ہی رہنا ہے۔

"سالار' جانتی ہوں تم ناراض ہو مجھ سے۔" وہ آگے بڑھیں۔

"میرا وجود تمہیں اپنے آس پاس گوارا نہیں ہے.... مگر میں تو تم سے نفرت نہیں کرتی نا' کر بھی نہیں سکتی۔ میں تمہیں اس حال میں چھوڑ کے کیسے جا سکتی ہوں۔"

وہ اس کے پاس بیٹھ گئیں اور بہت دھیرے سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

ذہنی طور پہ تیار ہی تھیں کہ کب وہ ان کا ہاتھ زور سے جھٹک دے.... لیکن خلاف توقع سالار نے یہ بھی نہ کیا' تو ان کی ہمت بڑھی۔

"سالار لوٹ آؤ زندگی کی جانب.... میرے لیے نہ سہی اپنے لیے۔" اور اس کا شانہ ذرا سا ہلانا چاہا تو وہ کسی بے جان ہلکے سے وجود کی طرح لڑھک کے دوسری جانب ہو گیا۔

"سالار...." وہ زور سے چلائیں اور وحشت زدہ سی ہو کے اس کی ادھ کھلی ویران بنجر آنکھوں کو دیکھنے لگیں اور پپڑی زدہ سفید ہونٹ....

"سالار...." وہ اس کے دھڑکن سے محروم سینے پہ سر رکھ کے رونے لگیں۔

☼ ☼ ☼
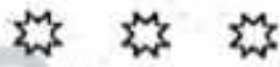
رات کا دوسرا پہر تھا۔ سلمیٰ برابر والی ماسی جو دایہ بھی تھی' اس کے ساتھ کب کی اس اکلوتے کمرے میں بند زندگی اور موت سے لڑ رہی تھی اور فکر مند سی ام ہانی اس کے دونوں بچوں کے ہمراہ صحن میں بھی دعائیں مانگتی۔ کبھی بچوں کو بہلاتی۔ کمرے سے کسی نئی زندگی کی پہلی آواز سننے کی منتظر تھی۔ سلمیٰ کے چھوٹے والے گود کے بچے کو تو تھپک تھپک کے اس نے سلا ہی دیا تھا.... مگر بڑی والی قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

"روؤ نہیں' ابھی آجائیں گی تمہاری اماں تمہارا چھوٹا سا بھائی لے کر.... میں ہوں نا' تمہارے پاس سو جاؤ۔" اس نے بچے کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔

"مجھے نیند نہیں آتی اماں کے بغیر۔"

"اچھا چلو.... میں تمہیں کہانی سناتی ہوں۔" ام ہانی نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور کہانی بنانے لگی۔

"ایک بڑے سے محل میں ایک شہزادی رہتی تھی اور ایک شہزادہ.... دونوں میں بہت دوستی تھی۔ شہزادی روتی تھی تو شہزادہ بھی رو دیتا تھا.... شہزادہ مسکراتا تھا تو شہزادی کے ہونٹوں پہ ہی خود بخود مسکراہٹ آجاتی تھی۔ پھر ایک دن شہزادی کو ایک بادشاہ نظر آیا۔ سونے کا بنا ہوا بادشاہ.... اتنا چمکیلا' اتنا روشن کہ شہزادی کی آنکھیں اسے دیکھ کے چندھیا گئیں اسے کچھ اور نظر ہی نہ آیا' اس سونے کے چمکتے دمکتے بادشاہ کے علاوہ.... پھر وہ سونے کا بنا بادشاہ' اسے محل سے نکال کے اپنے بڑے سے قلعے میں لے گیا۔

سونے کے بنے بادشاہ کا پتھروں سے بنا قلعہ.... شہزادے نے بہت کوشش کی اسے روکنے کی.... مگر شہزادی نہ مانی.... نہ رکی.... چلی گئی سونے کے بادشاہ کے ساتھ اور جب بادشاہ نے اسے پتھروں سے بنے اس قلعے میں قید کر دیا تو شہزادی کو پتا چلا کہ وہ بادشاہ تو سونے کا نہیں۔ آگ کا بنا ہوا ہے۔ بھڑکتے شعلوں سے.... پھر شہزادی ایک دن اس سنگلاخ قلعے سے بھاگ گئی اور وہ بادشاہ وہیں اپنی ہی آگ میں جلتا رہا۔ جلتا رہا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھسم ہو جانے کے لیے۔"

☼ ☼ ☼

رات کا آخری پہر تھا۔

سالار کی میت اس بڑے سے سنسان گھر کے وسط میں رکھی تھی۔

سفید چادر سے ڈھکی اور سرہانے اماں کے علاوہ کوئی اور ذی روح نہ تھا اس میت پہ آنسو بہانے والا۔

انہیں ہوش نہ تھا عزیز و اقارب کو خبر کرنے کا.... پرانے وفادار ملازم بساط بھر انتظامات کرنے اور ہر جگہ اطلاع پہنچانے کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

بچہ سو چکا تھا مگر کہانی سنانے میں مگن ام ہانی کو احساس نہیں تھا۔

وہ اپنی رو میں کہتی کہانی کے انجام تک جا رہی تھی۔

"شہزادہ اب بھی شہزادی کو ڈھونڈ رہا ہے اور شہزادی کو اب احساس ہو چکا ہے کہ وہ تو اس شہزادے کے بنا کچھ ہے ہی نہیں مکمل تو کیا ادھوری بھی نہیں.... کچھ بھی نہیں ہے وہ لیکن اب.... "

اچانک فضا میں کسی نومولود بچے کے رونے کی آواز گونجی اور ام ہانی نے چونک کر کوٹھڑی کے بند کواڑوں کو دیکھا جھلمل کرتی نم آنکھوں میں مسکراہٹ کوندی.... اور جھک کر سوتے ہوئے بچے کے ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے اس نے شکرانے کا کلمہ ادا کیا اور آہستگی سے بچے کا سر اپنے زانو سے تکیے پہ منتقل کرتے ہوئے اندر جانے لگی۔

درد کے باوجود سلمیٰ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ ام ہانی نے کمبل میں اپنے ننھے سے نرم و گلابی وجود کو گود میں لیتے ہوئے پیار سے چوم کر کہا۔

"مبارک ہو سلمیٰ.... ماشاءاللہ بہت پیارا ہے۔"

"آپ کے قدموں کی برکت سے بی بی۔"

"ایسے نہیں کہتے سلمیٰ۔" ام ہانی نے جھٹ سرزنش کی۔

"اللہ کا کرم ہے یہ.... نام کیا سوچا ہے اس کا؟"

"ابھی تک تو کوئی نہیں پہلے کا میں نے رکھا تھا دوسرے کا خدا بخش نے اب اس کا نام آپ رکھیں۔"

"میں....؟"

"ہاں بی بی آپ ہی رکھیں گی جو نام بھی آپ کو اچھا لگے۔" ام ہانی چند لمحے تک گود میں سوئے چندی آنکھوں والے بچے کو دیکھتی رہی اور جب بچہ نیند میں ہلکا سا مسکرایا تو اس کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ دھوپ کی طرح پھیل گئی۔

"مجھے جو نام دنیا میں سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے وہی نام رکھوں گی.... سعد۔"

"سعد صاحب...." سلمیٰ چونک کر بڑبڑائی۔

"یہ سعد ہے۔" ام ہانی کی انگلی اب ننھے سعد کی مٹھی میں قید تھی۔

"سعد۔"

☼ ☼ ☼

میں نیند سے ہڑبڑا کے جاگا تھا۔ یہ کوئی وہم نہیں تھا۔

مجھے واقعی اس کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے بہت واضح انداز میں میرا نام پکارا تھا۔ ویسے ہی.... جیسے وہ پکارا کرتی تھی۔

"سعد...." میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"ہنی تم نے پکارا مجھے۔" میں بڑبڑایا اور تبھی دروازے پہ دستک سن کر بے تابی سے دروازہ کھولنے لپکا۔

اب مجھے یقین ہو گیا ام ہانی نے ہی پکارا تھا مجھے.... وہ ضرور واپس لوٹ آئی ہے۔
اور دروازہ کھولتے ہی سامنے ابو کو دیکھ کے میں ٹھنڈا سا ہو کر وہیں تھم گیا۔
ان سے پوچھ تک نہ سکا کہ صبح کی پہلی پو پھٹنے سے ہی پہلے وہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ ابو بھی حد درجہ سنجیدہ لگ رہے تھے۔ میری جانب سے کسی سوال کے نہ آنے پہ خود ہی بتانے لگے۔
"سالار کی والدہ کا فون آیا تھا۔"
"ہنی لوٹ آئی ہے کیا؟"
میں پھر سے بے چین ہو گیا یہ تک فراموش کر بیٹھا کہ ہنی کے تمام رشتے اب اس شخص اور اس کے گھر سے ختم ہو چکے ہیں.... وہ واپس لوٹی بھی تو وہاں کیا کرنے جائے گی بھلا۔
"سالار کا دماغ کی شریان پھٹنے کے نتیجے میں رات کو انتقال ہو گیا ہے۔"

☼ ☼ ☼
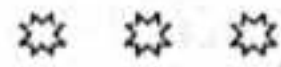
ام ہانی فجر کی نماز کے بعد دو گھنٹے کی نیند لے کر اٹھی .... رات تو آنکھوں میں کٹ ہی گئی تھی۔
آنکھ کھلتے ہی اس نے نوزائیدہ سعد کو پنگوڑے میں گہری نیند سوتے دیکھا.... سلمیٰ کہیں نہیں تھی.... ہانی کو افسوس سا ہوا اسے بے وقت نہیں سونا چاہیے تھا بلکہ سلمیٰ کے لیے ناشتے وغیرہ کا انتظام کرنا چاہیے تھا۔
جلدی سے چپل پہنتے باہر نکلی تو سلمیٰ صحن میں رات کی باسی روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کے چڑیوں اور کوؤں کے لیے پھیلا رہی تھی۔
"سلمیٰ تم یہاں کیا کر رہی ہو.... تمہیں ابھی بستر سے نہیں اٹھنا چاہیے تھا۔"
"کچھ نہیں ہوتا بی بی.... مجھے عادت ہے۔ کون سا پہلا بچہ ہے، ہم غریب لوگ بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ آرام ہمیں راس نہیں آتا الٹا اور بیمار پڑ جاتے ہیں۔" وہ ہنسی اور اپنے شغل کو جاری رکھا۔
"مگر ایسا بھی کون سا ضروری کام تھا یہ جو تم آج کا دن بستر پہ نہیں ٹک سکتی تھیں۔"
"کیسے رہتی بستر پہ.... میں روز چڑیوں اور کوؤں کو باجرہ یا روٹی ڈالتی ہوں بی بی.... جس دن سے آپ آئی ہیں یہاں پہ آپ کے نام کا صدقہ ہوتا ہے۔ تاکہ آپ پہ آئی ہر بلا ٹل جائے۔"
"اوفوہ سلمیٰ.... اس وقت تمہارے لیے آرام زیادہ ضروری تھا۔ ایک دن صدقہ نہ دینے سے کچھ نہیں ہو گا۔"
"کچھ تو ہوا ہے بی بی۔" وہ سوچتی نظروں سے آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"کچھ ہوا ضرور ہے۔ دیکھو ناں بی بی سارا باجرہ.... ساری روٹیاں ایسے ہی پڑی ہیں ایک بھی چڑیا کوا لینے کے لیے نیچے نہیں اترا۔" اس کی بات ام ہانی کے پلے نہ پڑی۔
"اس کا بھلا کیا مطلب ہوا سلمیٰ؟"
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں جو پچھلے کچھ دنوں سے آپ کا صدقہ دے رہی ہوں۔ وہ اللہ نے قبول کر لیا ہے۔ آپ پہ آئی بلا ٹل گئی ہے۔" اس کی بات سن کے ام ہانی نے بھی نظر اٹھا کے آسمان پہ اڑتے پرندوں کو دیکھا۔
"اللہ نے آپ کو اپنی سلامتی میں لے لیا ہے بی بی۔" سلمیٰ کی بات پہ اس کا دل بھی ایمان لے آیا تھا۔
"اللہ نے آپ کو اپنی سلامتی میں لے لیا ہے بی بی۔" اب ام ہانی کے چہرے پہ طمانیت کا نور پھیل گیا۔ ایک عرصے کے بعد خود اس نے بھی اپنا آپ ہلکا پھلکا سبک سا محسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

"کیوں جاؤں میں؟ بلکہ آپ بھی کیوں جانا چاہتے ہیں ابو؟" میں ان سے الجھ رہا تھا جو بلاوجہ کی مروت اور لحاظ دکھانے پہ مصر تھے۔
"ہمارا اس شخص سے کیا تعلق؟ کیا واسطہ؟" میں نے سوال کیا تو ابو بردباری سے کہنے لگے۔
"انسانیت کے ناتے سعد ہمارے گھر سے کسی ایک

کو تو اس کی آخری رسومات میں شریک ہونا چاہیے۔" امی نے بھی میری ہی تائید کی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے سعد ہمارا کوئی فرض نہیں ہے وہاں جانا۔"

"نائلہ سالار اپنی اچھائیوں اور برائیوں سمیت اس دنیا سے چلا گیا ہے وہ جانے اور اس کا خدا میں تو اس کی والدہ کے خیال سے جانا چاہ رہا تھا۔ وہ بزرگ ہیں اور غم کے اس موقع پہ بالکل تنہا ہمیں ان کو پرسہ دینا تو جانا چاہیے۔" ان کی اس بات پہ بھی میں قائل نہ ہو سکا۔

"آپ جانا چاہتے ہیں تو جائیں ابو.... میں نہیں جا سکتا۔ میں نہیں چاہتا ایک مرے ہوئے شخص کے لیے دعائے مغفرت کرنے کی بجائے میرے دل سے اس کے لیے وہ بددعا نکلے جو آخرت میں بھی اسے چین نہ لینے دے.... میں نہیں جاؤں گا۔ آپ جائیں ثواب کمائیے۔"

حتمی لہجے میں کہہ کر میں وہاں سے نکل آیا.... مبادا وہ مزید اصرار نہ کریں۔

"میں نے ٹھیک کیا ناں تانیہ؟" اب میں تانیہ سے تائید چاہ رہا تھا۔

"ہاں.... دل نہ مانے تو نیکی بھی کرنے کا فائدہ نہیں۔" وہ تو یوں بھی میری ہر بات میں میرے ساتھ ہی ہوتی تھی۔

"ہنی اتنی اچھی ہے تانیہ کہ اس کے ساتھ برا کرنے والے کا جی ہی نہیں چاہا ہو گا زندہ رہنے کو۔"

"ہاں سعد اور وہ اتنی اچھی ہے کہ اس نے چاہ کے بھی سالار کو کوئی بددعا تک نہیں دی ہو گی۔ اسے ہانی کی آہ نہیں لے ڈوبی.... وہ شاید پچھتاوے کی مار نہیں سہہ پایا۔" تانیہ کی بات پہ میں نے سر ہلایا۔

"ٹھیک کہتی ہو.... وہ کمزور دل کا مالک تھا مجھے دیکھو جی رہا ہوں اس کے بغیر۔"

"اچھا؟" تانیہ نے جتاتی نظروں سے مجھے گھورا۔

"جی رہے ہو؟" میں نظر چرا گیا اس کے سوال پہ۔

"پتا ہے سعد.... تم میں اور سالار میں بہت فرق ہے۔ ہانی نے اسے چھوڑا تو اس کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کی واپسی کا انتظار کرتا.... وہ جانتا تھا کہ وہ اسے کھو چکا ہے.... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لیکن تمہارے پاس امید ہے، حوصلہ ہے اور یہ یقین کہ اس کے دل میں بھی تمہارے لیے محبت ہے۔ وہ لوٹے گی سعد.... اس لیے تمہیں تو جینا ہی پڑے گا.... ہر حال میں۔"

"ہاں۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"صحیح کہتی ہو.... مجھے تو جینا ہی ہے۔" اور پھر گردن موڑ کے اسے دیکھ کے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مگر تمہیں کیوں مرنا ہے میرے ساتھ؟ واپس کیوں نہیں چلی جاتیں۔" وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔ ایک عرصے کے بعد....

"جاؤں گی.... چلی جاؤں گی.... ابھی سے تنگ آ گئے ہو مجھ سے؟ اچھا ہوا جو میں نے تم سے شادی نہیں کر لی۔ تمہیں تو چند ہی دنوں میں بری لگنے لگی ہوں.... خدا نا خواستہ ہماری شادی ہو گئی ہوتی تو آج تم مجھے.... یعنی اپنی بیوی کو یہی کہہ رہے ہوتے کہ واپس کیوں نہیں چلی جاتیں تم.... شکر ہے بچ گئی میں۔" وہ پھر سے ہنسی۔

اور اس بار اس کی ہنسی میں چھپا کرب مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچ رہی ہو نائلہ؟" جنازے سے واپس آنے کے بعد رضوان نے نائلہ کو کسی سوچ میں ڈوبا پا کے پوچھا۔

"تانیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے مجھے محبت کے نئے معنی سکھائے ہیں.... میں ماں ہوں سعد کی لیکن اس کے معاملے میں میرا دل کتنا تنگ ہو گیا تھا اور تانیہ.... اس کا دل کتنا کشادہ ہے۔"

"جو محبت کرتے ہیں ان کے دل کشادہ ہی ہوتے ہیں.... خود بخود وسیع ہو جاتے ہیں نائلہ.... اب ام ہانی کو دیکھو نجانے کہاں دربدر ہو رہی ہو گی۔ کیا کیا مصیبتیں اٹھا رہی ہو گی صرف اور صرف سعد اور تانیہ کی محبت میں اور تمہاری عزت میں بھی۔" نائلہ رو

پڑیں۔

"نہ یاد دلائیں مجھے.... مجھے ایک پل چین نہیں ہے رضوان.... جب تک وہ صحیح سلامت واپس نہیں آ جاتی میں یونہی کانٹوں پہ دن اور انگاروں پہ رات بسر کروں گی۔ میری وجہ سے ہوا یہ سب صرف اور صرف میری کم ظرفی کی وجہ سے 'پتا نہیں وہ کبھی مجھے معاف بھی کرے گی یا نہیں؟"

"تم نے اتنے سال اسے پالا ہے نائلہ.... اتنا بھی نہیں جانتیں اس کے بارے میں؟ کیا تمہیں اس سے معافی مانگنے کی ضرورت پڑے گی؟ کیا وہ تمہیں اس کا موقع دے گی۔"

☆ ☆ ☆

"چار ماہ بعد"

"یہ لے خدا بخش.... پراٹھے۔" خدا بخش دھلا دھلایا استری کیا کلف لگے کی شلوار قمیص پہنے 'تیل لگا کے بال سنوارے ہوئے کہیں جانے کے لیے بالکل تیار تھا جب سلمٰی نے دسترخوان میں باندھا ڈبا اسے پکڑایا۔

"راستے میں کھالینا...."

"ہاں.... لادے.... بازار کا کھانا ایک تو مہنگا اور اوپر سے خراب "اچھا ذرا بی بی کو بلا بات کرنی ہے میں نے۔"

"میں آ ہی رہی تھی خدا بخش بھائی۔" ہانی سر پہ دوپٹا درست کرتی اندر سے نکلی۔

"بی بی میں شہر جا رہا تھا۔ سوچا آپ سے پوچھ لوں اگر اس بار بھی آپ نے تصویریں بنانے کے لیے رنگ اور برش منگوانا ہو تو بتا دیں۔"

"نہیں.... مگر ایک اور کام ہے۔"

ہانی نے دیوار کے ساتھ زمین پہ رکھی دو پینٹنگز اٹھا کے اسے تھمائیں۔

"جو سامان آپ پچھلی بار لائے تھے اس سے میں نے یہ تصویریں بنائی ہیں آپ شہر جا رہے ہیں تو ان کو وہاں بیچ آئیں۔"

"ٹھیک ہے بی بی۔" خدا بخش نے بڑی احتیاط سے پینٹنگز سنبھالیں۔

"اور ان سے جو پیسے ملیں ان سے میرے سکول کے بچوں کے لیے کچھ کتابیں لے آئیں.... میں نام لکھ دیتی ہوں۔"

"ہانی بی بی.... دو ہفتے ہوئے ہیں آپ کو وہ سکول کھولے اور آدھے گاؤں کے بچے آپ سے پڑھنے لگ گئے۔ بڑا ہی اچھا کیا آپ نے یہ سکول کھول کے۔" سلمٰی کی بات پہ وہ مسکرائی۔

"ہاں.... میں نے سوچا زیور بیچ بھی دوں تو کتنے دن چلے گا۔ اچھا ہوا یہ زیور بیچ کر میں نے اسکول کھول لیا.... اچھا خدا بخش بھائی.... میرا ایک اور کام کریں گے آپ؟"

"حکم کریں بی بی؟"

"اگر ہو سکے تو واپسی پہ حویلی ہوتے آئیں.... سب کی خیریت بھی معلوم کرلیں اور.... اور ایک بات اور بھی ہے جو میں جاننا چاہ رہی ہوں.... لیکن یہ دھیان رکھیے گا کہ کسی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں کہاں ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں.... بس مجھے بتا دیں کیا پتا کروانا ہے اور کس سے کروانا ہے۔"

☆ ☆ ☆

مہ پارہ فون پہ نائلہ سے بات کر رہی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بھابھی.... بس آپ سب بہت یاد آتے ہیں۔" دوسری جانب سے خدا جانے نائلہ نے کیا پوچھا تھا کہ مہ پارہ لجا سی گئی۔

"جی.... وہ تو بہت خیال رکھتے ہیں میرا.... بہت اچھے ہیں وہ.... بس جگہ نئی ہے نا.... تو دل لگتے لگتے ہی لگے گا۔ آپ سب اور حویلی بہت یاد آتی ہے۔"

نائلہ نے شاید نئی تصویروں کی فرمائش کی تھی اب....

"ہاں جی بھابھی بھیجتی ہوں نئی تصویریں.... ان سے کہوں گی تانیہ کو اسی پہ بھیج دیں.... وہ کیا ہے۔ ہاں

فیس بک.... ارے ہاں! ایسے ہیں تانیہ اور سعد دونوں۔"
کافی کے دو مگ اٹھائے اندر آتے اسلم صاحب نے مہ پارہ کو یہ سوال کرتے بھی دیکھا اور جو جواب بھی اس نے سنا تھا.... اس کے رد عمل پہ مہ پارہ کے چہرے پہ ملال اترتے بھی دیکھا۔

"اللہ ام ہانی کو جلد ہم سب سے ملوا دے۔ بھائی صاحب کو سلام کہیے گا میرا۔ اللہ حافظ۔"

اس نے پژمردگی سے فون بند کر کے رکھا تو اسلم صاحب نے مسکراتے ہوئے کافی کا مگ آگے بڑھایا۔

"مجھے پتا تھا میری نئی نویلی دلہن میکے والوں سے بات کرنے کے بعد کافی اداس ہو گی اس لیے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے میں اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کے لایا ہوں۔"

"بھابھی بتا رہی تھیں.... کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا ان لوگوں نے ہانی کو.... اخباروں تک میں اشتہار دیے.... مگر...."

"صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے مہ پارہ۔"

"کبھی سوچا بھی نہیں تھا میری زندگی میں آپ کی صورت اتنا خوش گوار موڑ آئے گا اور آج میں اپنے گھر خوش باش ہوں تو میکے کی کسک چین نہیں لینے دیتی.... کاش وہاں سب ٹھیک ہو جائے پہلے جیسا۔" انگلی کی پور سے مہ پارہ نے پلکوں تک آجانے والے آنسو صاف کیے۔

"زندگی اسی کا نام ہے مہ پارہ.... سب کچھ بالکل پرفیکٹ تو کبھی بھی نہیں ہوتا.... تانیہ ہمیشہ یہ چاہتی تھی کہ میں اپنی زندگی کو مکمل کروں۔ بلکہ اسے ایک مکمل فیملی دوں اور آج میری زندگی میں تم ہو۔ اس کی زندگی میں ماں ہے.... مگر وہ ماں کی محبت لینے کے لیے ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

اسلم صاحب بھی اداس ہو گئے تو مہ پارہ کو افسوس ہوا۔ جو شخص سارا دن اس کے ہونٹوں پہ ایک مسکراہٹ لانے کے جتن کرتا رہتا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر اسے اداس کر بیٹھتی تھی۔

"وہ آئے گی۔ ان شاء اللہ ضرور آئے گی۔" مہ پارہ نے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسا دیا۔

"مگر اپنا وعدہ پورا کرنے کے بعد.... سعد اور ام ہانی کو ایک کر دینے کے بعد۔"

☼ ☼ ☼

پتوں کی سرسراہٹ پر مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی ان سوکھے پتوں کے فرش پہ چلتا میری جانب آرہا ہے۔ بنا مڑ کے دیکھے بھی میں جان سکتا تھا کہ یہ تانیہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" عجیب بے تکا سوال کیا اس نے "غالباً" محض مجھے مخاطب کرنے کے لیے یونہی بات برائے بات، ورنہ وہ جانتی تھی میں اس کھنڈر میں کیوں آتا ہوں۔

دیوار پہ ہاتھ پھیر کے کچھ تلاش کرتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

"خالی جگہ تلاش کر رہا ہوں تانیہ۔"

"خالی جگہ۔"

"تم جانتی تو ہو کہ میں نے ہمیشہ تب تب یہاں ان دیواروں پہ اپنا اور ہنی کا نام لکھا ہے، جب جب ہی ہر جھگڑے کے بعد ہماری صلح ہوتی تھی۔ ہم جب دوبارہ ملیں گے تو یہاں میں ایک بار اور اس کا اور اپنا نام لکھوں گا۔"

"ہاں.... ایک بار اور.... آخری بار۔" وہ میرے سامنے آکے اس دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔

"آخری بار؟" میں چونکا۔

"ہاں کیونکہ اس کے بعد تم کبھی اسے روٹھنے نہیں دو گے۔" وہ پورے اعتماد سے مسکرائی اور پھر مڑ کے خود بھی دیوار پہ خالی جگہ تلاش کرنے لگی۔

"لاؤ.... میں بھی دیکھتی ہوں۔ ایک ہی بار تو لکھنا ہے نا بھلا زیادہ سے زیادہ کتنی جگہ چاہیے ہو گی۔"

اس کی مسکراہٹ ہمیشہ میرے دل کو دلاسا دیتی تھی۔ میں بھی نئے حوصلے کے ساتھ کوئی خالی کونا ڈھونڈنے لگا۔

"لو یہ رہا اب یاد رکھنا اس پہ لکھنا ہے تم نے، نام۔"

☼ ☼ ☼

"ہاجرہ۔" نائلہ نے بہت دیر سے ہاجرہ کو کسی کام کا کہہ رکھا تھا مگر وہ تھی کہ نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

"ہاجرہ کہاں رہ گئی تھی تم؟" اسے باہر سے آتے دیکھا تو جھنجلا کے پوچھنے لگیں۔

"تم سے کہا تھا کہ دھوبی سے آئے سب کپڑے میرے سامنے ہر ایک الماری میں لگاؤ... میں کب سے سعد کے کمرے میں تمہارا انتظار کررہی تھی۔"

"جی میں آرہی تھی مگر باہر سے کسی مسافر نے گزرتے گزرتے صدا لگائی تھی اسے روٹی پانی دے رہی تھی۔"

"اوہ... اچھا۔ یہ صدقہ۔" ابھی دے دینا تھا۔ جمعرات ہے آج۔"

"نہیں جی... صدقہ لینے والا نہیں تھا وہ... بس گھر کی دال روٹی مانگی تھی اس نے' ویسے مجھے لگ رہا تھا اسی علاقے کا ہی رہنے والا ہوگا' پیچھے سے پوچھ رہا تھا کہ حویلی میں جو شادی ہونی تھی چھوٹے صاحب کی وہ ہوگئی۔"

"کمال ہے مسافر تھا اور یہ تک جانتا تھا اچھا تم جاؤ۔ وہ سب کپڑے اب صدیقہ کے ساتھ مل کے سنبھالو... میں ذرا سعد کو دیکھوں... صبح کا نکلا اب نظر آیا ہے۔"

☼ ☼ ☼

امی نے تو بہت سی باتوں کے دوران یونہی بر سبیل تذکرہ وہ بات بھی بتا دی۔ ان کی عادت تھی شاید میرا دھیان بٹانے کو سارے دن کی روداد مجھے سناتی رہتی تھیں۔ مگر میں بری طرح چونک گیا۔

"اور آپ اسے سیریسلی نہیں لے رہیں پتا تو کرنا تھا کہ کون ہے... کہاں سے آیا؟"

"ارے... کوئی مسافر تھا... گزر رہا تھا تو کھانا مانگ لیا۔ سب جانتے ہیں... اس حویلی سے مسافروں کو کسی بھی وقت کھانا مل جاتا ہے۔"

"لیکن امی..." میں الجھ گیا تھا۔

"یہ بات چونکانے والی ہے کہ وہ کون تھا جو اس طرح کی معلومات لیتا پھر رہا تھا... کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اسے... اور کیا تعلق ہے اسے اس بات سے کہ اب تک میری شادی ہوئی ہے یا نہیں۔" مگر امی نے اسے خاص توجہ نہ دی... اسی بے فکری سے مجھے کہنے لگیں۔

"غریب لوگ ہیں سعد... آس ہوتی ہے انہیں کہ ہم شادی بیاہ کی خوشی میں کچھ دے دلا دیں۔"

"پھر بھی امی... یہ بات کچھ..."

"کہا نا سعد... ایسی کوئی سر پہ سوار کرنے والی بات نہیں ہے... ہوگا کوئی..."

☼ ☼ ☼

"ارے... ایسے نہیں... لائن کے بالکل اوپر... اور پھریوں کرکے گھما دو تھوڑا سا..." ام ہانی سلمیٰ کے بیٹے کو ہاتھ پکڑ کے لکھنا سکھا رہی تھی۔ یہ ہی مشغلہ تھا اس کا دن رات... دن کو اپنے چھوٹے سے ایک کمرے کے اسکول میں پڑھاتے رہنا بچوں کو اور رات کو سلمیٰ کے بچوں کو اگلے دن کی بھی پیشگی تیاری کرانا۔ سلمیٰ کو ساگ سر پہ اٹھا کے اندر لاتے دیکھا تو بڑی خوشی سے اطلاع دی۔

"سلمیٰ... تمہارا بیٹا ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ بہت جلدی سیکھ جاتا ہے۔ دیکھنا... یہ میرا سب سے ہونہار اور لائق فائق شاگرد نکلے گا۔"

"اللہ آپ کو اجر دے گا بی بی..." اس نے ساگ کی گٹھڑی اتار کے کونے میں رکھی اور پھر ساتھ ہی درانتی سنبھال کے پیر کے انگوٹھے میں پھنسائی۔

"خدا بخش آتا ہوگا... اسے ساگ بڑا پسند ہے۔ آپ کھالیں گی بی بی یا کچھ اور بنا دوں؟"

"کھالوں گی سلمیٰ... بس ذرا مرچ تیز کرنے سے پہلے اور مکھن ڈالتے ہوئے میرے لیے ایک کٹوری نکال کے الگ کردینا۔"

"ہاں بی بی... مجھے دھیان ہی نہیں رہتا کہ آپ

ہلکے مسالے کھاتی ہیں... اچھا ہوا آپ نے یاد دلا دیا۔ وہ خدا بخش کی زبان بڑی چٹوری ہے' اس کو مرچیں بھی لپ بھر کے چاہیے اور مکھن بھی چوتا ہوا۔"

"تمہیں پتا ہے سلمیٰ... یہ میرا اس اسکول کا سب سے پہلا اسٹوڈنٹ ہے۔" ام ہانی کی توجہ پھر سے حرف حرف توجہ سے لکھتے بچے پہ گئی۔

"ابھی تو منے کو بھی پڑھانا ہے' بس تین سال کا ہو جائے... کب ہو گا؟"

"چار مہینے بعد..." ساگ کاٹتی سلمیٰ نے حساب لگا کے بتایا۔

"اور سعد... اسے تو میں اسی وقت پڑھانا شروع کروں گی' جب وہ بولنا سیکھے گا۔" ام ہانی نے چند مہینے کے سعد کو محبت سے دیکھا' جو بڑے سے نواڑی پلنگ سے جھولتی چادر میں سو رہا تھا۔

"ہائے اللہ بی بی... آپ نے کوئی ساری عمر یہاں تھوڑا ہی بیٹھنا ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے نا آپ سے... کہ ان تینوں کو ضرور پڑھاؤں گی... اپنے اور خدا بخش کی طرح جاہل نہیں رکھوں گی... لیکن اللہ کرے آپ جلدی واپس حویلی میں چلی جائیں' اپنوں کے پاس... اور ساتھ خیریت کے..." سلمیٰ کی خلوص سے دی گئی دعا بھی اسے اداس کر گئی۔

"چلی جاؤں گی سلمیٰ... چلی جاؤں گی ایک دن... مگر..." پھر چونکی... فوراً" خدا بخش کا دھیان آیا۔ اسے خبر لانے کا کام سونپا تھا۔

"خدا بخش بھائی کب تک واپس لوٹیں گے۔"

"آنے والا ہو گا۔"

"اللہ کرے... میرا کام کر دیا ہو انہوں نے... اور وہی خبر لے کر لوٹیں... جو میں چاہتی ہوں اور جس کے ہونے کی اتنے دن سے دعائیں کر رہی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"شعیب..." میں اتنے سالوں بعد اسے سامنے پا کے خوشی سے آگے بڑھا۔

پرانے دوست بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔ دل پہ پڑے بوجھ کو صرف اپنے ہونے کے احساس سے پل بھر میں سرکا دیتے ہیں' میں نے تب ہی دکھ کی اس کیفیت سے خود کو ذرا کی ذرا نکلتے محسوس کیا تھا جب کل شعیب کی کال آئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان آیا ہوا ہے اور مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔

"بہت خوشی ہو رہی ہے تمہیں اتنے سال بعد اپنے سامنے دیکھ کے۔" اس کے گلے لگتے ہوئے میں نے دل سے کہا تھا' مگر وہ عجیب کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"اچھا۔" اس نے تعجب کا برملا اظہار کیا۔

"لگتا تو نہیں کہ تو خوش ہے۔" اور کہہ بھی دیا۔

"اور خوش کیسے ہو سکتے ہیں۔" میں نے مقدور بھر مسکرانے کی کوشش کی' مگر وہ دوست تھا اندر تک اترا ہوا۔ کیسے دھوکا کھا جاتا۔

"سعد۔ کیا ہوا؟" اس نے وہ سوال کیا جس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تو تھا اور منتظر بھی... مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی چھوٹتے ہی پوچھ لے گا۔ میرے پاس اس کے سوال کے جواب میں اپنی کھوکھلی مسکراہٹ کو طول دینے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

"تمہاری وہ مسکراہٹ کیا ہوئی سعد۔ اتنا جبر کر کے کیوں مسکرا رہے ہو۔"

"اب جی بھی جبر کے ساتھ رہا ہوں تو مسکراؤں گا بھی تو جبر کے ساتھ۔" ہار مان کے میں نے اس کے سامنے دل کھول رہا۔

"سب خیریت ہے نا؟"

"ہاں خدا کرے خیریت ہی ہو۔ تم بیٹھو میں بتاؤں گا تمہیں سب تفصیل سے۔"

"ہاں ہاں بیٹھوں گا بھی۔ تمہارے گزرے سالوں کی ساری کتھا بھی سنوں گا۔ آنٹی کے ہاتھ کا کھانا بھی کھاؤں گا اور رات کو تمہاری حویلی کی چھت پہ کھلے آسمان کے نیچے پلنگ پر سوؤں گا بھی' مگر پہلے تو یہ تو لے۔" اس نے ایک ملفوف تحفہ میری جانب بڑھایا کوئی پینٹنگ لگ رہی تھی۔

"تحفہ لایا ہوں' میں تمہارے لیے؟"

"واہ یار۔۔۔ تم کب سے ان تکلفات میں پڑ گئے۔" مجھے ہنسی سی آ گئی۔ وہ کبھی بھی ایسا نہیں تھا ایسے تکلفات اور مروت لحاظ کا خیال رکھنے والا۔

"صحیح کہہ رہے ہو۔ مجھے خیال تک نہ آیا تھا کہ وطن واپس جا رہا ہوں تو سب کے لیے کچھ نہ کچھ لیتا جاؤں۔ بس من چاہا تو ٹکٹ کٹائی۔ دو جوڑے رکھے اور خالی ہاتھ لہراتا آ گیا۔ یہ تو لاہور میں ایک جگہ اتفاق سے اس پینٹنگ پر نظر پڑی پتا نہیں کیوں مجھے لگا یہ تمہارے لیے لینی چاہیے تو لے لی۔"

"وہی تو۔۔۔ کہاں سے لگ گئی یہ لت تمہیں کسی کے لیے کچھ لینے کی۔"

"اچھا بھئی۔ میں واپس لے جاؤں گا۔" وہ پیکنگ کھولنے لگا۔

"مگر تو دیکھ تو سہی۔ یہ منظر بالکل ایسا ہے جیسے تمہاری حویلی کی چھت سے نظر آتا نہر کا منظر، دیکھ ذرا۔" اور تصویر دیکھتے ہی میں دنگ رہ گیا۔ واقعی کسی نے بالکل ہو بہو وہی منظر کینوس پہ اتارا تھا۔ میں کیسے دھوکا کھا سکتا تھا۔

یہ منظر سالوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔

وہی منڈیر۔۔۔ وہی نہر۔۔۔ وہی درخت۔۔۔ وہی راستے۔۔۔ اور۔۔۔ اور وہی نام۔ پینٹنگ کے کونے میں ام ہانی کے دستخط دیکھ کے میں پتھر کا ہو کے رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے ٹھیک طرح سے پوچھا تھا نا؟" ام ہانی کو دھڑکا سا تو تھا، مگر پھر بھی یہ جواب سن کے وہ مایوس اور دل گرفتہ سی ہو گئی۔ یقین نہیں آ رہا تھا بھلا سعد اس سے کیا وعدہ کیسے توڑ سکتا ہے۔

"ایک ہی بیٹا ہے حویلی کا۔۔۔ سعد۔۔۔ نام لے کر پوچھنا تھا۔" اس نے پھر سے تسلی چاہی۔ مبادا خدا بخش کو ہی مغالطہ ہوا ہو۔

"بی بی وہیں جما پلا ہوں ساری حویلی کو جانتا ہوں اور میں نے حویلی کی ملازمہ سے پوچھا تھا اس نے بتایا کہ شادی تو ان کے دادا کی وفات پہ پانچ مہینے پہلے رک گئی تھی۔ پھر ہوئی ہی نہیں اب تک۔" یہ سن کر وہ مایوسی سے ڈھے سی گئی۔

"ٹھیک ہے۔" مرے مرے لہجے میں وہ بمشکل کہہ پائی۔

"شکریہ خدا بخش بھائی۔" خدا بخش کے جانے کے بعد سلمٰی اس کے پاس آئی۔

"کیا ہوا بی بی؟" ام ہانی ایک زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ کے کہنے لگی۔

"سلمٰی۔ لگتا ہے تمہارے بچوں کی قسمت میں مجھ سے ہی پڑھنا لکھا ہے، میں ساری عمر یہیں رہنے والی ہوں تمہارے پاس۔۔۔ سعد کے پاس۔"

"ایسا نہ کہیں بی بی میرے دل سے پوچھیں آپ کے قدم کتنے مبارک ہیں میرے اس کچے کوٹھڑے میں، لیکن دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ آپ واپس اپنوں میں جا کے بس جائیں۔" وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ کچی زمین پہ انگلی سے لکیریں کھینچتی رہی۔

"بی بی ابھی ابھی خدا بخش آیا ہے اور اب سویرے پھر جانے کا کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے عرس ہے کل۔"

"تو کیا صرف مجھے یہ اطلاع دینے کے لیے انہوں نے اتنی زحمت کی۔۔۔ اوہ۔" اسے تاسف سا ہوا۔

"نہیں نہیں بی بی۔ اسے پہلے پتا نہیں تھا کہ عرس کل ہے اب پتا چلا تو اس لیے واپس آیا کہ کل مجھے اور بچوں کو بھی ساتھ لے جائے، ہمارا بڑا والا منت کا ہے نا۔ عرس کے عرس لے جاتے ہیں۔"

"ہوں۔" وہ بے دلی سے سر ہلا کے رہ گئی۔

"بی بی۔ آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ۔ ایک ہی دن کی تو بات ہے۔"

"نہیں سلمٰی۔ تم جاؤ مجھے اسکول کا کام ہے کچھ بچوں کا حرج ہو گا۔"

"مگر بی بی۔ آپ اکیلے۔۔۔" وہ متذبذب تھی، مگر ام ہانی نے تسلی دی۔

"کوئی بات نہیں کچھ نہیں ہوتا، اتنے اچھے پڑوسی ہیں۔"

"اچھا پھر ایسا کرتے ہیں سویرے تڑکے ہی نکل

جائیں گے ہم اور شام تک واپسی کی کریں گے۔ آپ
کو رات اکیلا چھوڑنے پہ دل راضی نہیں ہے۔"
"سلمیٰ تم میری فکر نہ کرو یوں ایک ہی دن میں
آنے جانے کے سفر سے بچے بھی تھک جائیں گے۔"
"نہیں تھکتے ویسے بھی وہاں رات رکنا نرا خرچا
بڑھانے والی بات۔ آپ بس بتا دیں کچھ منگوانا ہے
عرس سے بی بی؟"
"نہیں۔ بس ایک دیا جلا آنا داتا کی نگری میں
میرے نام کا۔ دن رات دعائیں مانگتی ہوں' لگتا ہے
میرا کوئی گناہ' کوئی کوتاہی میری دعاؤں کی قبولیت کے
راستے میں رکاوٹ بن رہی ہے شاید کسی نیک ہستی
کے وسیلے سے دعا قبول ہو جائے۔۔۔ اور سلمیٰ۔۔۔ کہنا۔۔۔
ام ہانی نے عرضی بھجوائی ہے اوپر پہنچا دیں۔" اس کی
آواز آنسوؤں سے رندھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں یقین ہے سعد؟" تانیہ حیران تھی۔
"سنو تانیہ! یہ پینٹنگ ام ہانی نے ہی بنائی ہے۔"
میں پر اعتماد تھا۔
"لیکن میرا مطلب ہے کیسے کہہ سکتے ہو تم یہ۔۔۔
صرف ام ہانی لکھا ہے اس پہ کوئی اور نام بھی ہو سکتا ہے
یا اس نام کی کوئی اور لڑکی۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہو تانیہ۔" مجھے کوفت سی
ہوئی۔ کہاں تو وہ ہر وقت مجھے دلاسے دیتی' ہمت
بندھاتی رہتی تھی اور اب اگر امید کی ہلکی سی کرن نظر
آ رہی ہے تو وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے تاریک پہلو نکال کے
میرے سامنے رکھ رہی تھی۔
"کیا میں اس کے دستخط نہیں پہچانوں گا؟ اور
بالفرض اس نے اپنا نام بھی نہ لکھا ہوتا اس تصویر کے
نیچے تب بھی میں پہچان لیتا یہ۔۔۔ یہ منظر دیکھو یہ اس
کے سوا اور کون رنگوں میں ابھار سکتا ہے۔" وہ الجھن
بھری نظروں سے پینٹنگ کو دیکھنے لگی۔
"تانیہ تم کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو تم کیوں مجھے یہ
یقین دلانا چاہتی ہو کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔" میرے
دل میں اس کے خلاف وسوسہ سا آ گیا۔
"یقین نہیں دلانا چاہتی سعد۔ میں دل سے دعا مانگ
رہی ہو کہ تمہارا یقین سچ میں بدل جائے' مگر ہونے کو
کبھی بھی کچھ بھی ہو جایا کرتا ہے' میں صرف تمہیں
ذہنی طور پہ اس کچھ بھی ہونے کے لیے تیار کر رہی تھی
سعد۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پھر سے مایوس ہو جاؤ' میں
تمہیں ٹوٹا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔" اس کی نم آنکھوں اور
گیلے گیلے لہجے میں وہ خلوص تھا کہ میں پل بھر پہلے
والے اپنے وسوسے پہ خود ہی شرمسار سا ہو گیا۔
"تم نے شعیب سے ڈیٹیل (تفصیل) کی؟"
"ہاں اس نے لاہور میں جس جگہ سے یہ پینٹنگ
خریدی ہے اس کا ایڈریس لے لیا ہے میں نے۔"
"اوہ تو ہانی لاہور میں ہے۔"
"ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔" میں مسکرایا۔
بقول شعیب کے۔ جبری مسکراہٹ۔
"تم نے ہی تو کہا ہے ہونے کو کچھ بھی کبھی بھی
ہو سکتا ہے' لیکن پھر بھی میں لاہور جا کے اسے
ڈھونڈوں گا ضرور۔۔۔ ان پانچ مہینوں میں پہلی بار اس
کے بارے میں قدرت نے کوئی اشارہ دیا ہے مجھے۔
میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا۔"
"ٹھیک کہہ رہے ہو تمہیں ضرور جانا چاہیے اور
مجھے بھی۔"
"تم؟" میں نے بغور اسے دیکھا۔
"ہاں میرے بغیر کیسے جا سکتے ہو تم؟"
"سوچ لو تانیہ ہو سکتا ہے وہاں کافی دن لگ جائیں
تم کہاں میرے ساتھ ساتھ بھٹکو گی۔" میں ہچکچا رہا تھا۔
"اتنے دنوں سے یہاں بھی تو ہوں تمہارے
ساتھ۔ اس سے زیادہ دن تو نہیں لگیں گے ویسے بھی
سعد ہانی منزل تو صرف تمہاری ہے' مگر تلاش ہم
دونوں کی ہے۔" میں نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

صبح تڑکے کا سمے تھا۔ ام ہانی ننھے سعد کو کپڑے پہنا
رہی تھی پھر اس کے ہلکے ہلکے سے بالوں پہ بڑے ہی

دھیان سے کنگھا کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے ہی ٹوپی پہنادی۔

"لو۔ میں نے سعد کو پیارا سا گڈا بنا دیا۔ اب سعد اپنی اماں کے ساتھ لاہور جائے گا۔" اس کے گول گول پھولے ہوئے گالوں کو چومتے ہوئے وہ اداس سی ہو گئی۔

"دیکھو سعد۔ صرف آج کا دن مجھ سے دور رہنے کی اجازت ہے۔ سمجھے؟ زیادہ پھیل نہ جانا وہاں جا کے۔ شام ہوتے ہی تم نے واپس آنا ہے ورنہ میں اداس ہو جاؤں گی۔" اسے گود میں لے کر سینے سے لگاتے ہوئے وہ تو ابھی سے اداس ہو گئی تھی۔

"مجھے تمہارے بغیر اب نیند نہیں آتی سعد۔" اس نے ننھے سے کان میں سرگوشی کی۔

"تم صرف میرے سعد ہو' صرف میرے.... بس ایک تم ہو جسے میں صرف اپنا سعد کہہ سکتی ہوں جسے پیار کرتے ہوئے مجھے ندامت نہیں ہوتی۔ یہ احساس کچوکے نہیں لگاتا کہ میں کسی کا حق مار رہی ہوں۔ تم اپنی ہنی سے دور نہ جانا سعد۔ جلدی واپس آنا۔"

☼ ☼ ☼

صبح کی پہلی ٹرین سے میں تانیہ کے ہمراہ لاہور پہنچ گیا سب سے پہلے میں شعیب کے دیئے پتے پہ سیدھا اس دکان تک گیا جہاں سے اس نے وہ تصویر خریدی تھی۔۔ بہت پوچھنے پر وہ فقط اتنا بتا پایا کہ اسے یہ تصویر بیچنے والی کوئی لڑکی نہیں کوئی مرد تھا جو اپنی وضع قطع سے دیہاتی لگ رہا تھا۔

"دیہاتی؟"

"ہاں جی۔ میرا خیال ہے وہ ان مصورہ صاحبہ کا ملازم تھا۔ میرے سامنے اس نے فون کر کے بات کی تھی اس تصویر کی قیمت کے بارے میں۔ بی بی جی.... بی بی جی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔" میں چپ سا رہ گیا البتہ تانیہ مزید تفتیش کرنے لگی۔

"پلیز ذرا ذہن پر زور دے کر بتائیے فون پہ بات کرتے ہوئے اس شخص نے نام بھی لیا تھا کوئی؟"

"دھیان بھی ہو تو مجھے یاد نہیں' میں مصروف تھا اتنا دھیان نہیں دیا البتہ بی بی جی کی تکرار کئی بار کی تو ذہن میں رہ گئی یہ بات۔"

"کچھ اندازہ ہے کہ وہ لاہور ہی کا رہنے والا تھا یا کسی اور جگہ سے آیا تھا۔" اب ان سوالات کی بوچھاڑ پہ دکان دار خاصا جھلایا ہوا لگا۔ ظاہر ہے اس کی دکان داری خراب ہو رہی تھی۔

"یہ میرا کام نہیں ہے۔ ہم تصویریں اور ہینڈی کرافٹ خریدتے ہیں کوئی اسلحہ یا منشیات تو نہیں جو گاہک سے سودا کرتے ہوئے اتنی تفصیل پوچھیں۔"

"کمال ہے۔ اس میں برا ماننے والی کیا...." تانیہ کو بھی تاؤ آگیا' مگر میں نے اسے خاموش کراتے ہوئے نکلنے کا اشارہ کیا۔

"بس تانیہ.... ہو گیا۔" اور نکلتے نکلتے بڑی لجاجت سے دکان دار کو اپنا کارڈ دیتے ہوئے درخواست کی۔

"دیکھیں اگر کبھی وہ شخص دوبارہ کچھ بیچنے آئے تو .... ہو سکے تو اس سے رابطے کے لیے کوئی نمبر یا اتا پتا لے لیں اور مجھے اس نمبر پر کال کر دیں۔ بہت ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی آپ کو زحمت نہ دیتا۔"

☼ ☼ ☼

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" سب سن کے بھی وہ یقین نہ کر پا رہی تھی۔

"بھلا ایسا کیسے ممکن ہے کہ میں سعد سے کوئی وعدہ لوں اور وہ اسے نہ نبھائے میری خواہش جان کے بھی اس پہ عمل نہ کرے۔" لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ خدا بخش اس سے غلط بیانی نہیں کر سکتا۔

"سعد.... اگر تمہیں مجھ سے محبت کا دعوا ہے تو تم یہ گوارا بھی کیسے کر رہے ہو کہ میں یوں بھٹکتی رہوں؟ کیا تم نہیں چاہتے میں واپس لوٹ آؤں؟"

عرصے بعد وہ سعد سے ناراض ہوئی تھی اور ہمیشہ کی طرح یہ ناراضی بھی اوپری ہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہاں سے نکلنے کے بعد میں نے اردگرد کی دوسری

سب دکانیں بھی چھان لیں جہاں ایسی قسم کی سستے داموں بکنے والی وہ تصاویر رکھی ہوئی تھیں جن کو گمنام مصور اونے پونے بیچ جاتے تھے۔ ایک ایک تصویر کو بغور دیکھا کسی اور یہ وہ نام نظر نہیں آیا۔ اس خیال کے تحت کہ شاید ام ہانی کی تصاویر اب تک بک گئی ہوں۔ میں نے اسی حلیے والے شخص کے بارے میں بھی سب سے دریافت کیا جس کا اس دکان دار نے بتایا تھا' مگر کہیں سے حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔

تانیہ کا کہنا تھا کہ ہمیں یہاں کے گرلز ہاسٹل حتیٰ کہ دارالامان وغیرہ بھی چیک کرلینے چاہئیں۔ میں متفق تھا' مگر پتا نہیں کیوں' ہمت ایک دم جواب دے گئی تھی۔

''ہاں چلتے ہیں کچھ دیر سستالیں۔'' میں نزدیکی پارک میں اسے لیے آگیا اور ایک بنچ پہ ڈھے گیا۔

''دیکھو سعد۔ تصویر کل بکی ہے یعنی اگر وہ لاہور کہیں اور سے بھی آئی تھی تو ہو سکتا ہے اب تک یہیں ہو۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ نہ آئی ہو وہی شخص آیا ہو اس کی بنی پینٹنگ لے کر۔''

''لیکن وہ دیہاتی شخص کون ہو سکتا ہے؟ اور ہانی سے اس کا کیا تعلق ہے سعد؟'' تانیہ وہی سوالات پے در پے پوچھے جارہی تھی جو پہلے سے میرے ذہن میں ڈنک مار رہے تھے۔

''وہ سب سے چھپ رہی ہے۔ نہیں چاہتی کہ سامنے آئے اس لیے کسی کے ذریعے بکنے کے لیے بھجوائی ہوگی۔''

''اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس آدمی نے بھی کہیں سے خریدی ہو۔ ہانی سے ڈائریکٹ نہ لی ہو۔'' میں بالکل چپ رہنا چاہتا تھا نہ کچھ بولنا۔ نہ کچھ سننا چاہتا تھا۔ اسی لیے تانیہ کی مسلسل جرح پہ اکتا گیا۔

''پلیز تانیہ۔۔۔ مت کرو ایسی باتیں بلکہ کچھ بھی نہ کہو۔ مجھے اس یقین کے ساتھ اسے تلاش کرنے دو کہ وہ یہیں کہیں ہے۔ میرے بہت نزدیک۔''

''تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو کچھ دیر ہوٹل چل کے آرام کرلو شام کو دوبارہ نکلیں گے۔'' وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔۔۔ میں نہیں تھکا نہ کبھی تھکوں گا۔'' میں نے صاف جواب دے دیا۔

''تم چلی جاؤ۔''

''سعد۔۔۔ اسپتال' ہاسٹل' ہوٹل' آرٹ گیلریز ہر جگہ تلاش کریں گے ہم اسے۔۔۔ مگر۔۔۔''

''مگر کیا؟''

''مجھے لگتا ہے سعد۔ وہ خود ہی نہیں چاہتی کہ ہم کبھی اس تک پہنچ سکیں۔ جو کھو جاتے ہیں نا ان کو ڈھونڈنا آسان ہوتا ہے' مگر جو چھپ رہا ہو اس کو تلاش کرنا مشکل۔''

''ابھی بہت سی دنیا باقی ہے تانیہ! جہاں میں نے اسے تلاش نہیں کیا۔ تم اگر تھک گئی ہو یا تنگ آگئی ہو تو واپس جاسکتی ہو میرا دل مجھے ہار نہیں ماننے دے گا۔'' میں نے رکھائی سے کہہ دیا۔

''سعد۔ جیسے تم اسے تلاش کرنا نہیں چھوڑ سکتے ایسے ہی میں تمہارا ساتھ دینا نہیں چھوڑ سکتی۔ تمہاری مجبوری تمہارا دل ہے تو ایک کمینہ سا دل میرے پاس بھی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''یہ دل ہوتا ہی کیوں ہے تانیہ۔ جھوٹ بولتے ہیں لوگ کہ جینے کے لیے دل کا ہونا ضروری ہے۔۔۔ بکواس۔'' میں تلخ ہو گیا۔

''دل نہ ہوتا تو زیادہ کھل کے جیتے لوگ یہ دل ہی تو مرواتا ہے۔ قسم سے یہ دل نہ ہوتا تو جوان موتیں نہ ہوتیں۔''

☼ ☼ ☼

سلمیٰ نے دربار کے سامنے منت کا دیا جلاتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پہ درود بھیجتے ہوئے درخواست کی۔

''پیر جی۔۔۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میری ہانی بی بی کی عرضی اوپر رب سوہنے تک جلدی سے پہنچا دو۔۔۔ آپ کی بزرگی اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے ہی رب ان کی سن لے۔'' اور پھر

چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼
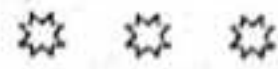
"یہاں کیوں آئے ہیں؟" تانیہ میرے لاکھ منع کرنے پہ بھی میرے ساتھ ساتھ تھی۔ یہاں... داتا دربار میں بھی۔

"دعا مانگنے؟"

"پتا ہیں کچھ عرصہ پہلے میں یہاں دعائیں مانگنے ہی آتا تھا پھر میں نے اللہ سے ڈائریکٹ ڈیلنگ شروع کردی۔ مجھے لگا جتنی شدت اور طلب میری دعا میں ہوگی وہ کسی اور کی دعا میں نہیں۔" میں رک کر اسی چوڑیاں بیچنے والی عورت کو دیکھنے لگا جس سے ایک بار ہانی کی فرمائش پہ منت کے کالے کڑے لیے تھے۔

"تو پھر کیوں آئے ہو؟" وہ تھکن اور بھوک سے نڈھال لگ رہی تھی۔

"کہا نا پتا نہیں۔" مجھے اب اس کے ساتھ سے کوفت اور جھنجلاہٹ ہو رہی تھی میں اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ اور وہ ایسی ڈھیٹ کہ اس جھنجلاہٹ اور کوفت کے میرے لہجے اور ہر انداز سے چھلک جانے کے باوجود بھی میرا ساتھ چھوڑنے پہ تیار نہیں تھی۔ اور اوپر سے سوال پہ سوال۔

"نہیں دعا مانگ کے دیکھوں؟" میں نے اس بار اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ ایک جلتے ہوئے دیے کے سامنے رک گیا۔ جس کی لو تیز ہوا سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ اپنے ہاتھوں کی اوٹ بنا کے میں نے اس کی لو کو بجھنے سے بچانا چاہا۔

"اب یہ کیا کر رہے ہو؟"

"پتا نہیں کس نے رکھا ہوگا یہاں، منت کا دیا ہوتا ہے کسی نے مراد مانگی ہوگی، ہوا سے بجھ گیا تو..."

"تو کیا؟ دعا قبول نہیں ہوگی؟"

"نہیں تانیہ دعا قبول کرنا یا نہ کرنا تو صرف اللہ کے اختیار میں ہے مگر کوئی نہیں جانتا اس کی دعا کب قبول ہوگی کب اس کی مراد پوری ہوگی میں صرف اس لیے اس دیے کو بجھنے سے بچانا چاہ رہا ہوں کہ بجھا ہوا دیا دیکھ کے منت ماننے والا مایوس نہ ہو جائے اسے یہ نہ لگے کہ اس کا دعا رد ہو گئی ہے مایوسی کیا ہوتی ہے یہ مجھ سے زیادہ کون جا سکتا ہے۔" تانیہ دکھ بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر اذان کی آواز پہ اپنا سر ڈھانپتے ہوئے اس نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"یا اللہ... میں تم سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی... مگر سعد کے لیے ہانی کو مانگ رہی ہوں... دے کیوں نہیں دیتے اسے؟"

☼ ☼ ☼

"یا اللہ..." عصر کی نماز کے بعد ام ہانی جائے نماز پہ دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے اللہ... کہ میں کچھ غلط کر رہی ہوں یا انجانے میں کسی کو دکھ دے رہی ہوں تو... تو جانتا ہے میری نیت کو میں تو بہت سوں کو دکھ سے بچانے کے لیے ایسا کر رہی ہوں پھر دل پہ یہ بوجھ کیسا؟ دل پہ بوجھ تو کسی گناہ یا کسی جرم کے بعد ہوتا ہے کیا انجانے میں مجھ سے واقعی کوئی جرم یا کوتاہی ہو رہی ہے میری رہنمائی فرما مولا۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو میری غلطی سدھار میں نے اب سب کچھ تجھے سونپا، جو ہوگا جیسا بھی ہوگا میں اسے تیری رضا سمجھ کے قبول کرلوں گی۔" یہ دعا مانگنے کے بعد عرصے بعد اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

"میرے پیچھے نہ آؤ تانیہ۔" اب میں سچ مچ چڑ گیا تھا۔ بلکہ باقاعدہ تپ رہا تھا اس پہ۔

"لیکن سعد... میں تو..." میری تیز رفتاری کا ساتھ دینے کی کوشش میں چلتے چلتے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ میں یک دم سے پیچھے مڑا اور دھاڑ کے کہا۔

"کہا نا جاؤ آج میں کچھ ٹھان کے نکلا ہوں... آر... یا پھر پار..."

"کیا مطلب؟" وہ بدحواس سی ہوگئی۔

"آج یا تو وہ مجھے ملے گی یا میں خود بھی کسی کو نہیں ملوں گا۔ میں بھی کھو جاؤں گا اس کی طرح۔"

"سعد۔" اس نے مجھے سمجھانا چاہا۔
"پھر سے وہی فضول باتیں۔ تم باز آؤ گے یا نہیں؟"
"اور تم میرا سایہ بننے سے باز آؤ گی یا نہیں؟ پلیز تانیہ۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔
"یہ میری تلاش ہے میرا جنون ہے۔" اس کی آنکھوں کے آنسو دیکھ کے بھی میں بے رحم الفاظ میں کہتا گیا۔ بلکہ باقاعدہ دھمکانے لگا اسے۔
"تم واپس چلی جاؤ ورنہ ماری جاؤ گی۔۔۔ بے موت۔"
"مرتو میں کب کی گئی تھی سعد۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔
"تم پہ۔" اس نے میرے شانے پہ اپنا بیگ شرارتاً "مارا۔ بالکل میری جبری مسکراہٹ کے جیسی اس کی یہ جبری شرارت مجھے اور بوجھل کر گئی۔
"جاؤ۔۔۔ نہیں آتی میں بس تمہارا انتظار کروں گی۔ صرف تمہارا نہیں تمہارا اور ہانی کا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔" اس نے جلدی سے پلکوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے آنسوؤں کو روکا اپنی ہتھیلی سے آنکھوں کو رگڑتے ہوئے۔
"اور خبردار جو اکیلے لوٹے۔" میں اس سے وعدہ تک نہ کر سکا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اور آگے بڑھ گیا۔
لیکن کچھ ہی دیر بعد میرے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی میں نے مڑ کے دیکھا وہ واپس جا رہی تھی۔ بالکل ایسے ہی سست قدموں کے ساتھ۔ میں نے ایک لمبی سانس بھر کے رخ بدلا اور سامنے دیکھا۔ مصروف ترین شہر کی مصروف ترین شاہراہ لوگوں کا جم غفیر۔
"کہاں تلاش کروں میں تمہیں ہنی۔" ہانیہ کے سامنے بڑے جوش سے اسے تلاش کرنے کا دعوا تو کر چکا تھا مگر اب پاؤں تھے کہ جیسے شل ہو رہے تھے بالکل دل و دماغ کی طرح۔ میں بے بسی سے چاروں طرف دیکھنے لگا کہ کہاں سے شروعات کروں۔ پھر بلا مقصد ہی اس پارک میں گھس گیا جہاں پہلے بھی ستانے کے لیے تانیہ کے ہمراہ آیا تھا۔ غائب دماغی کی

کیفیت میں وہاں بیٹھا میں سامنے تکے جارہا تھا جہاں کچھ بچے گیند سے کھیل رہے تھے تب ہی ایک گیند لڑھکتا ہوا میرے پیروں تک آیا۔ اس پہ بھی میں اپنی گم صم کیفیت سے باہر نہ نکل سکا اور تب بھی نہیں جب ایک بچہ بھاگتے ہوئے میرے پاس رکی اس گیند کو اٹھانے آیا۔ ہاں مگر جب مجھ سے ایک فٹ کے فاصلے پر وہ بچہ بھاگتے بھاگتے گر گیا تو میں بری طرح چونکا اور اٹھ کے اس بچے کو سنبھالا دیا۔ اس کے کپڑے جھاڑ رہا تھا جب ایک عورت چادر میں لپٹی چار پانچ ماہ کے بچے کو گود میں اٹھائے وہاں آئی۔

"ہاں صدقے میرا کاکا۔" وہ اپنے بچے کا سر منہ چوم رہی تھی۔ اور میں حیرت سے اسے دیکھتا پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر میں پہچان گیا۔ وہ سلمیٰ تھی... بلاشبہ...

"سلمیٰ؟" میرے پکارنے پر اس نے اپنا دھیان بچے سے ہٹا کے مجھ پر دیا حیرت اور آشنائی کی جھلک اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔

"تم سلمیٰ ہی ہو نا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہائے اللہ... سعد صاحب آپ؟" اس کے لہجے میں بے ساختہ سی خوشی ہوئی۔

"تو یہ تینوں بچے تمہارے ہیں...؟" میں نے ذرا ذرا سے وقفے والے۔ ان تینوں بچوں کو دیکھا... ایک وہ جو گیند اٹھانے آیا... اور گر گیا تھا... اور منہ بسورتا اپنے مٹی سے بھرے ہاتھوں سے آنسو صاف کر رہا تھا۔ دوسرا سلمیٰ کی انگلی تھامے لالی پاپ چوستا اور تیسرا گود میں...

"ان چار ہی سالوں میں صرف تین بچے..." میں نے اسی جبری مسکراہٹ کا سہارا لیا۔ وہ شرما سی گئی۔

"آپ کی دعائیں ہیں صاحب..."

"کیوں مجھ پہ مدعا ڈال رہی ہو... میں نے ایسی کوئی بے ڈھنگی دعائیں نہیں مانگیں اور وہ تمہارے بانسری والے کا کیا حال ہے۔"

"ٹھیک ہے جی... اور آپ کی ہی دعائیں ہیں سعد صاحب... آپ اس دن میری مدد نہ کرتے تو پتا نہیں میری زندگی کیسی ہوتی' کہاں ہوتی میں... اور کہاں ہوتا خدا بخش... یہ سب جو آج میرے پاس ہے آپ کی وجہ سے ہے... نہ کسی کی غلامی... نہ چاکری... نہ زبردستی کا کوئی رشتہ... اللہ کے کرم سے گھر ہے چھوٹا سا... کمانے والا... محبت اور عزت کرنے والا شوہر ہے... یہ بچے ہیں۔" میں نے شفقت سے لالی پاپ چوستے بچے سے نام پوچھنا چاہا۔ محض سلمیٰ کی بے تکان چلتی زبان کو روکنے کے لیے...

"نام کیا ہے تمہارا؟" مگر جواب گر کے اٹھنے والے بچے نے دیا۔

"یہ ناصر ہے... میرا نام احمد ہے... اور یہ ہمارا سب سے چھوٹا بھائی... سعد..." میں چونکا... اور پھر مسکرا دیا۔

"ارے واہ... یہ بھی سعد..."

"ہاں جی... ہانی باجی نے رکھا تھا اس کا نام۔" بچہ بے تکلف تھا... اور ماں کی طرح باتیں کرنے کا شوقین... اس کی بات نے میرے ذہن میں جھکڑ چلا دیے۔

"ہانی نے...؟" میں نے تعجب سے سلمیٰ کو دیکھا جو بوکھلائی ہوئی سی اب بچوں کو ہانکتے ہوئے آگے لے جا رہی تھی۔

"چلو چلو... شام ہو گئی ہے... تمہارے ابا آ گئے ہوں گے گیٹ پر... نکلو۔"

"رکو سلمیٰ..." مگر میرے پکارنے پہ بھی وہ نہ رکی۔ یوں ہی تیز تیز چلتے... بنا مڑے کہنے لگی۔

"اچھا سعد صاحب... خدا حافظ... دیر ہو رہی ہے ہمیں..." مگر میں ایسے کیسے جانے دیتا۔ آگے بڑھ کے میں نے اس کا راستہ روکا... اور اس کے گود کے بچے کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ مزید گھبرا گئی۔

"یہ بچہ... سلمیٰ... یہ بچہ... کتنی عمر ہو گی اس کی؟ تین' چار یا پانچ مہینے...؟"

"صاحب... وہ...؟" سلمیٰ سہم کے گھگیانے لگی۔

"لاری نکل جائے گی صاحب..." مگر میں اس کی

بات پہ توجہ دیے بنا سوال کرتا رہا۔

"اور ہاں پچھلے پانچ مہینے سے ہی لاپتا ہے... اگر اس نے بچے کا نام رکھا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ..." وہ سٹپٹا کے کتراتے ہوئے ایک جانب سے نکلنے لگی، تو میں نے اس کے بڑے بچے کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بے بس سی ہو کے رک گئی۔

"سلمٰی..." اب میرا لہجہ سخت ہوا۔

"تم جانتی ہو کہ ہنی کہاں ہے اور تم ٹھیک کہہ رہی تھی... کہ تمہارے پاس جو بھی ہے... وہ میرے دعاؤں کی بدولت ملا ہے تمہیں... ہنی کے لیے ہی تو دعائیں کی تھی میں نے... کہ وہ مل جائے اور وہ تمہیں مل گئی۔"

"پتا نہیں... آپ... کیا باتیں کر رہے ہیں سعد صاحب... چھوڑیں میرے بچے کو... ہم نے لاری اڈے وقت پہ پہنچنا ہے... یہ لاری نکل گئی تو دوسری آدھی رات کو ملے گی۔"

"ہاں... اور ہانی باجی رات کو اکیلے کیسے رہے گی۔ انہیں ڈر لگے گا۔" بچہ بھی مجھ سے انگلی چھڑوانے کے زور لگانے لگا اور وہ بات کہہ گیا جس کے بعد سلمٰی کے پاس سوائے ہار ماننے کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے جتاتی نظروں سے اسے دیکھا... تو وہ پسپا لہجے میں بتانے لگی۔

"کیا کروں سعد صاحب... بی بی نے منع کیا تھا... قسم دی تھی۔"

"تم نے اپنی قسم نہیں توڑی سلمٰی... اس بچے نے بتائی ہے حقیقت... بس تم اب مجھے اس کے پاس لے چلو... کہاں ہے وہ...؟" میں نے اس کی منت کی۔

"مگر سعد صاحب..." وہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔

"سلمٰی... تمہیں اس کی ناراضی کی زیادہ پروا ہے یا اس بات کی... کہ وہ خوش رہے؟ کیا چاہتی ہو تم... کہ وہ یوں ہی دربدر رہے... کبھی گھر واپس نہ جائے۔"

"کیوں نہیں چاہتی صاحب..." وہ رو پڑی۔

"میں تو انہیں اتنا سمجھاتی ہوں کہ ضد چھوڑ دیں... مگر وہ کہتی ہیں کہ وہ آپ کی خوشیوں کی راہ میں نہیں آنا چاہتیں۔"

"بدھو..." میں بے ارادہ کہہ گیا۔
"ہمیشہ مجھے بدھو کہنے والی خود کتنی بدھو نکلی... یہ تک نہیں جانتی... کہ میری خوشیوں کی ہر راہ اس تک پہنچ کے ختم ہو جاتی ہے... مجھے اس کے پاس لے چلو سلمیٰ..."

☼ ☼ ☼

تانیہ ہوٹل کے روم میں اکیلی گلاس ونڈو سے چپکی باہر رواں دواں ٹریفک کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر فون اٹھایا... سعد کو کال کرنے کے لیے... مگر پھر ارادہ ترک کرتے ہوئے واپس رکھ دیا۔ ویسے بھی سعد نے اس کی پچھلی تین کالیں بھی ریسیو نہیں کی تھیں۔ مگر عجیب بات تھی۔ تانیہ کو نہ تشویش ہو رہی تھی نہ فکر... کوئی دھڑکا نہ تھا۔ ایک کمال کا سکون سا اترا ہوا تھا رگ رگ میں... جیسے کچھ اچھا ہونے جا رہا تھا۔ جیسے وہ جو دعا کر کے گیا ہے' اسے پورا کر کے لوٹے گا۔

☼ ☼ ☼

رات ہو گئی تھی... مگر سلمیٰ نہ لوٹی تھی۔ پڑوس والوں نے ہانی کی تنہائی کے خیال سے اپنے بچے اس کے پاس بھجوا دیے تھے۔ وہی بچے تھے جو اس کے اسکول بھی آتے تھے۔ اس لیے وہ ان کو ہوم ورک کرانے اور اگلے دن کا سبق پڑھانے میں ہی وقت کاٹ رہی تھی۔
"دل سے کچھ مانگا جائے... تو اللہ کبھی مایوس نہیں کرتا۔" اس نے ایک سطر پہ انگلی پھیر کے پڑھتے ہوئے اپنے شاگرد کو سنایا۔ تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی۔
"ارے اس وقت کون آ گیا؟" وہ چونکی۔
"مس جی... خالہ سلمیٰ ہوں گی۔"
"نہیں... وہ یوں دستک نہیں دیتی۔"
"میں دیکھتا ہوں۔" ایک اور بچہ تھا... مگر ہانی نے روک دیا۔
"نہیں... تم بیٹھو... میں دیکھتی ہوں... شاید تم لوگوں میں سے کسی کے گھر والے بلانے آئے ہوں۔"

وہ دوپٹا اوڑھتی دروازے تک جانے لگی اور جاتے جاتے تاکید کرنا نہ بھولی۔
"سبق یاد کرو تم سب اپنا اپنا..." اور جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے سعد کو دیکھ کے وہ بت بن کے رہ گئی۔ کتنی ہی دیر دونوں کچھ بھی نہ بول پائے۔

☼ ☼ ☼

"رضوان... رضوان..." نائلہ خوشی سے بے حال انہیں جھنجوڑ کے جگا رہی تھی۔
"اٹھیں رضوان..."
"کیا ہوا... ؟خیریت... ؟" وہ نیند سے جاگنے کی وجہ سے بوکھلائے ہوئے تھے۔
"ہاں... سب خیریت... اللہ کا کرم... سعد کا فون آیا تھا..."
"ہانی مل گئی؟" انہوں نے خوشی سے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔
"ہاں..." وہ بھی شکرانے کے آنسوؤں پہ قابو نہ پا سکیں۔
"لا رہا ہے وہ اسے... کچھ ہی دیر میں..."

☼ ☼ ☼

"تمہیں کیا لگتا ہے ہنی... دور چلی جاؤ گی تو میں بھول جاؤں گا تمہیں... ؟" میں نے اس سے شکوہ کیا۔
"کیا تم نہیں جانتیں ہنی... کہ فاصلے بڑھ جائیں تو جنون اور بھی بڑھ جاتا ہے۔" اس نے نظر جھکالی اور ان جھکی پلکوں سے آنسو پر بند توڑ کے بہہ نکلے۔
"اور تمہیں یہ بھی لگا... کہ میں تمہیں ڈھونڈ نہیں سکوں گا۔ دنیا اتنی بڑی نہیں ہے ہنی... کہ تمہیں مجھ سے چھپا سکے۔"
"سعد..." بمشکل وہ کہنے کی ہمت کر پائی۔
"وہ... تانیہ..."
"ڈھونڈتی رہی ہے وہ بھی تمہیں... میرے ساتھ... ہر لحہ... ہر قدم... اور تمہارا انتظار کر رہی ہے... اس نے تاکید کی تھی کہ میں اکیلا نہ لوٹوں... چلو ہنی..." میں نے ہاتھ آگے بڑھایا اور اس نے بنا

کسی ہچکچاہٹ کے تھام لیا۔

☼ ☼ ☼

اور ٹھیک ایک ہی ہفتے بعد وہ دلہن بنی میرے پہلو میں کھڑی تھی۔ میں اسے لیے کھنڈر گیا تھا۔ نکاح کے بعد فوراً"... کیونکہ تانیہ جیسی سرپھری لڑکی کو ہماری شادی کا تحفہ دینے کے لیے وہی ایک جگہ مناسب لگی تھی اور اس وقت وہ کھنڈر کی دیوار پہ اس کونے میں میرا اور ہنی کا نام لکھ رہی تھی... جو خالی کونا ڈھونڈا بھی اسی نے تھا۔

"ہمیشہ تم دونوں لکھتے ہو آج میں نے لکھ دیا... وہ بھی آخری بار... اور خبردار جو اس کے بعد دونوں دور ہوئے ایک دوسرے سے... یوں بھی اب یہاں کسی دیوار پہ کوئی اور جگہ باقی نہیں بچی..."

"تو یہ دکھانے کے لیے تم ہمیں شادی کی تقریب سے سیدھا یہاں لے آئی۔"

میں نے اسے گھورا۔

"اور وہ تحفے کا بہانہ تھا سب..."

"ارے... یہ ہی تو ہے وہ تحفہ..." وہ کھلکھلائی۔

"دو کنجوس..." میں بھی ہنس دیا۔

"نہیں سعد۔ جو تانیہ نے دیا ہے وہ تو کوئی بھی کسی کو نہیں دے سکتا۔" ہنی کی بات پہ میں نے اس کی کمر کے گرد بازو حائل کرکے اسے خود سے نزدیک کرلیا۔

"پرفیکٹ پوز..." تانیہ اپنا فون نکالنے لگی۔

"اب ہلنا مت دونوں... تصویر لینے دو مجھے..." اور تصویر کھینچنے کے بعد جلدی جلدی فون بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"میری فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے اور شاید تم دونوں کی بھی برداشت کی حد اب ختم ہو رہی ہے۔ اس لیے اس ہڈی کا اب کباب سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔" وہ آگے بڑھی۔ہانی کو محبت سے گلے لگایا۔ دونوں کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور نہ جانے تانیہ مجھے دیکھنے سے کترا کیوں رہی تھی 'ہانی سے ملی... مگر مجھے خدا حافظ تک نہ کہا اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

کھنڈر سے باہر قدم نکالتے نکالتے تانیہ نے رک کر اپنے آنسو صاف کیے۔ مڑ کے پیچھے دیکھا۔ ہانی' سعد کے کاندھے پہ سر رکھے دیوار پہ لکھے اپنے اور اس کے نام پہ محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھی... اور سعد... اس کے چہرے پہ اس محبت کا نور پھیلا تھا جو ازل سے صرف اور صرف ام ہانی کے لیے تھا۔

"خدا حافظ سعد..." تانیہ نے زیر لب کہا اور پھر آگے بڑھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے آسمان کی جانب دیکھا۔

ستاروں سے بھرا... جگمگاتا آسمان...

اور تب ہی اس نے وہ منظر دیکھا... جس کے بارے میں صرف سن رکھا تھا۔ ایک ٹوٹتا ہوا تارا... وہ گنگ سی یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر ہنس پڑی۔ ایک بے بس... ہاری ہوئی ہنسی۔

"واہ... کیا ٹائمنگ ہے قدرت کی... زندگی میں پہلی بار ٹوٹا ہوا ستارا مجھے نظر بھی آیا... تو تب... جب مانگنے کے لیے میرے پاس کچھ رہا ہی نہیں۔"

☼ ☼

مالکن

سعدیہ اقبال

کچھ لوگ جدی پشتی امیر ہوتے ہیں.... اسی طرح ہم نچلی جاتی کے جدی پشتی "نوکر" تھے، جو جنم سے لے کر پیدائش تک نوکر رہتے ہیں۔ امیروں کی اس حویلی میں ہمارے باپ دادا نے بڑی وفاداری سے تمام عمر نوکری کی تھی اور پھر نسل در نسل ہماری باری آتی گئی۔ جب میں جوان ہوئی تھی تو مجھے بھی آہستہ آہستہ حویلی کے نئی کاموں کے لیے اپنی ماں کے ہمراہ جانا پڑتا تھا اور کبھی کبھی میں چڑ کر اپنی ماں سے سوال کرتی۔

"کیا ہوتا اگر میں بھی مالکن ہوتی اور تمام نوکر میرے حکم پر چلتے؟" تب میری اماں ہنس کر کہتی۔

"تیرا قصور نہیں ہے، انسان کا ضمیر ہی ناشکرا ہے۔" اور پھر میں وہیں ٹھنڈی پڑ جاتی، وقت گزرتا رہا اور ہماری نسل در نسل نوکری چلتی رہی.... اب تو میری بیٹی بھی جوان تھی، کچھ دنوں میں وہ بھی حویلی کے دن چڑھتے بڑھتے کاموں میں شامل ہو جاتی۔ پھر کچھ عرصے تک میرا بیٹا بھی بڑا ہو جائے گا اور حویلی کے بڑے بڑے کھیتوں پر چوکیدار یا پھر بڑے باغیچوں میں مالی تو ضرور ہی لگ جائے گا اور ہمارے گھر کی کمائی میں چند نوٹوں کا اضافہ کرے گا۔

ہماری جدی پشتی وفاداری اور ایمان داری مالکوں کی نظر میں تھی.... تب ہی وہ آنکھ بند کر ہم پر بھروسا کرتے تھے۔ حویلی میں اور بھی کافی تعداد میں نوکر تھے جو مختلف نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے مگر مالکوں کی نظر میں وہ قابل بھروسا نہ تھے۔ میں کئی گلے ہونے کے باوجود اپنی نوکر گری بڑی جانثاری سے کرتی تھی۔ جو بھی تھا مجھے اپنے باپ، دادا کی بنائی وفاداری کی عزت کا مان رکھنا تھا.... جو مجھے جسم کی ہڈیوں سے نکلے طاقت کے ایک ایک قطرے تک بھاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

کچھ دنوں سے حویلی میں چوری ہونے لگی تھی۔ کبھی کبھار قیمتی برتن یا آرائش کا سامان غائب ہو جاتا.... ان دنوں میری ڈیوٹی صاف صفائی کی تھی میرے ساتھ کچھ اور بھی نوکرانیاں صفائی کا کام سرانجام دیتیں مگر جب سے قیمتی سامان غائب ہونے لگا میری جان پر بن آئی، حالانکہ میرا قصور نا تھا مگر مالکوں کا کیا بھروسا کب الزام لگا دیں؟ اور میرے برسوں کی بنی برسوں کی عزت ملیا میٹ ہو جائے۔ پھر ایک دن مالکن نے سب نوکرانیوں کو جو گھر کے اندر کام کرتی تھیں طلب کر لیا اور خاصی لمبی تقریر کرنے کے بعد آخر میں جتایا۔

اس بار اگر کوئی چوری کرتا پکڑا گیا تو نہ صرف نوکری جائے گی بلکہ سامان کی بھرپائی کے ساتھ پولیس کا منہ بھی دیکھنا پڑے گا، میری نظر تم پر ٹکی رہے گی، ہم نوکروں پر مالکن کی کتنی نظر تھی، یہ بات میں اور شاید وہ چور جانتا تھا.... مالکن کو اس بھری حویلی میں اپنی اولاد، دیورانیوں اور نندوں کی الجھنوں سے فرصت ملتی تو وہ اس بڑی کی حویلی میں کام کرنے والے لاتعداد نوکروں پر نظر رکھتیں نا مگر کہیں نہ کہیں مجھے یہ لگتا تھا مالکن کا یہ آرڈر میرے لیے نہیں تھا، وہ مجھ پر اعتماد کرتی تھیں مگر نہ جانے میرے اندر کیا جاگا کہ اندر ہی اندر میں نے "مالکن" کی نوکروں پر نظر رکھنے والی ذمہ داری سنبھال لی اور چور یا چوری پر نظر رکھنے لگی۔ چور بے فکر تھا کہ مالکن تو میرے سر پر ہے ہی نہیں مگر وہ یہ نہ جان پایا کہ میں مالکن نہ سہی مگر بالا ہی بالا میں یہ کام کر رہی ہوں اور پھر ایک دن میرے شک کی بنا پر وہ چورنی ہاتھ آ گئی۔ مجھے شروع دن سے نئی کام پر آئی فریدہ پر شک تھا اور ایک دن میں نے کچن سے بچا کھانا لے جانے والی اس کی معمول کی گٹھڑی کھول لی اور واقعی اندر قیمتی آرائش کا چھوٹا موٹا ساز و سامان تھا اور بس پھر وہ منتیں

کرتی رہی۔

"چھوٹے بچے ہیں، نوکری چھن جائے گی، معاف کردے۔" مگر میں کیوں اس کی سنتی ایک چورنی کو حویلی میں پناہ دے کر میرے بڑوں کی بنائی نوکرگری کی ساکھ کو برباد کردیتی۔۔۔ مالکن کو بتانا تھا مجھے اور مالکن نے اسے نوکری سے نکالا ہی مگر میری منت پر پولیس کے حوالے نہ کیا۔۔۔ اس دن مالکن مجھ پر بہت خوش ہوئیں، برسوں کی وفاداری کا ٹیکا تو پہلے سے سجا تھا اور پھر جانتے ہیں کیا ہوا؟ میں "مالکن" بن گئی۔ نوکروں کی مالکن۔

مالکن نے مجھے تمام نوکروں کی نگران بنا دیا تھا۔ اب صرف مجھے نوکروں کے کاموں اور تمام سرگرمیوں پر نظر رکھنی تھی۔ اب نوکر مجھ سے پوچھ کر کام کرتے تھے۔ آج اپنی عمر کے تیس سال اس حویلی کو دینے کے بعد میں نچلے سے نچلے درجے کی ہی سہی مالکن بن گئی تھی۔ کیونکہ مالکن نے مجھے خود یہ ذمہ داری سونپی تھی، ایک وفادار اور ایماندار نوکرانی سمجھ کر۔۔۔ یہ "مالکن" والی سوچ میری خود ساختہ تھی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی جان گئی تھی کہ انسان کے جنم سے لے کر مرنے تک کچھ حقیقتیں ہمیشہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہیں، چاہے وہ سوچ کے زاویے کو کسی بھی بادشاہی تخت پہ بٹھالے۔

☆ ☆

بقیہ سروے

سب سے پہلے تو میری طرف سے میرے پیارے کرن کے لیے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ ساتھ ڈھیروں مبارک باد' اللہ پاک اسے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی سے نوازے۔ (آمین)

اب آتے ہیں جوابات کی طرف کہ میرا اور کرن کا ساتھ کتنے سالوں پر محیط ہے۔

1۔ میرا اور کرن کا ساتھ تقریباً" بارہ تیرہ سال پرانا ہے۔ بہت چھوٹی سی عمر میں ہی میں نے کرن کو پڑھنا اسٹارٹ کردیا تھا اور اس میں بھی زیادہ تر ہاتھ میری بیسٹ فرینڈ صائمہ کا تھا۔ گھر کا ماحول کچھ اس طرح کا تھا کہ ڈائجسٹ پڑھنے سے مجھے کبھی کسی نے منع نہیں کیا یہ ہی وجہ تھی کہ میرا اور کرن کا ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی مجھے لکھنے کا شوق نہیں تھا۔ تھا مگر مجھے لگتا تھا کہ لفظوں سے کھیلنا میرے بس کا کام نہیں لیکن پھر اس طرف بھی میری توجہ صائمہ نے ہی کروائی۔ اسے مجھ پر مجھ سے بھی کچھ زیادہ ہی یقین تھا شاید اس کے فورس کرنے پر ہی میں نے اپنا پہلا افسانہ "ضمیر" 2009 کو کرن کو ارسال کردیا جس کے شائع ہونے کے لیے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ تقریباً" تین ماہ کے اندر اندر میرا افسانہ شائع ہوچکا تھا جہاں میں حیران اور خوش تھی وہیں صائمہ کافی پرجوش ہورہی تھی۔ آخر کو اس کا یقین سچ ثابت جو ہوگیا تھا اس کے بعد میں کرن کے اور زیادہ قریب ہوگئی۔ لکھنے کا سلسلہ چل پڑا۔ وقت کیسے گزر تا گیا پتا ہی نہیں چلا آج سوچتی ہوں تو کل کی بات لگتی ہے۔

2۔ شکر ہے اللہ پاک کا کہ میری سالگرہ کا دن سب ہی یاد رکھتے ہیں اور مبارکباد بھی دیتے ہیں۔ ہاں اس دفعہ زندگی میں پہلی بار اس طرح ہوا کہ میری فرینڈ صائمہ نے بھی وش نہیں کیا اور یہ ہماری سترہ سالہ پرانی دوستی میں پہلی بار ہوا ہے۔ معمولی سی رنجش میں اس نے اتنے اہم دن مجھے اپنی دعاؤں سے محروم رکھا جو زندگی بھر شاید میں کبھی بھول نہیں پاؤں گی۔

محبت اور دعاؤں کے معاملے میں 'میں بہت خوش قسمت ہوں' اللہ کا شکر ہے میری فیملی ماشاء اللہ کافی لمبی چوڑی ہے۔ ماشاء اللہ سے چھ بھائی ہیں چار بھابیاں ہیں اور دس بھتیجے بھتیجیاں تو جناب پھر وشنگ بھی اسی حساب سے لمبی چوڑی ہوتی ہے۔

میری آنکھ کھلنے سے پہلے ہی سب ہاتھ میں ایک ایک گلاب کا پھول پکڑے ایک لائن کی صورت میرے کمرے میں موجود ہوتے ہیں۔ سب سے آگے ابو جی پھر امی جی پھر بڑے بھائی بھابی' پھر چھوٹے بھائی بھابی پھران سے چھوٹے اور آخر میں بچہ پارٹی پر جاکر لائن ختم ہوتی ہے۔

میں اپنی سالگرہ پر بالکل بچی بن جاتی ہوں۔ مجھے پرسنلی طور پر سالگرہ منانا بہت پسند ہے۔ گھر میں مختلف قسم کی ڈشنز بنتی ہیں مختلف قسم کے قیمتی تحفے دیے جاتے ہیں۔

ہم باہر سے کسی کو بھی انوائیٹ نہیں کرتے گھر کے ہی سب افراد ہوتے ہیں ہلا گلا ہنسی مذاق قہقہے اور پھر اسی طرح رات بارہ ایک بجے تک مسکراتے چہروں کے ساتھ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔

3۔ ہاں یہ تو ہے کہ لکھنا وقت اور ذہنی فراغت ضرور چاہتا ہے لیکن بعض اوقات اس طرح بھی ہوتا ہے کہ ذہنی فراغت کے باوجود انسان کچھ لکھ نہیں پاتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے لکھنا اسٹارٹ کیا تھا تو میں بہت زیادہ بزی ہوا کرتی تھی۔ فرسٹ ٹائم اسکول سیکنڈ ٹائم اکیڈمی چلانا پھر خود بھی ساتھ ساتھ پڑھنا۔ اس کے باوجود بھی میں لکھنے کے لیے ٹائم نکال لیتی تھی مگر اب مصروفیت اتنی زیادہ نہیں رہیں مگر پھر بھی نہیں لکھ پاتی ہوں۔ شاید سست ہوگئی ہوں۔

آج سے کوئی بیس پچیس سال پہلے ابو جی نے ایک چھوٹا سا اسکول بنایا تھا جہاں غریبوں کے بچوں کو مفت یا پھر بہت کم فیس میں علم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پہلے وہ بڑے بھائی کے زیر نگرانی رہا مگر پھر ان کے LLB مکمل ہوتے ہی اس ادارے کی ذمہ داری مجھ پر آگئی تو لکھنے کے ساتھ میں اسکول میں ہوتی ہوں اور باقی کا وقت اپنے پیارے بھتیجے بھتیجیوں کے ساتھ یا پھر لانگ ڈرائیو پر۔

4۔ اف یہ کیسا سوال پوچھ لیا جب سوچنے بیٹھی تو بہت سے واقعات ذہن کی اسکرین پر روشن ہوتے گئے۔ میرے اسکول کی ایک ٹیچر جو اکثر گم صم رہا کرتی تھی۔ میں جب بھی اسے دیکھتی تھی تو چونک جاتی تھی اس کی آنکھیں اس طرح کی تھیں کہ جیسے اپنے اندر کوئی بہت بڑی کہانی چھپائے ہوئے ہوں۔ پھر ایک دن روتے ہوئے اس نے اپنے دل کا درد مجھ سے شیئر کیا جسے سن کر حقیقتاً" میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ بہت پرانی بات ہے' میں اس پر لکھنا چاہتی تھی مگر لکھ نہیں پائی۔

(باقی آئندہ)

حورالعین اقبال

ادارہ

★ "آپ کا نام گھر والے کس نام سے پکارتے ہیں؟"

✻ "حورالعین... پیار کا نام حور' حوری' مٹھو' موم کی گڑیا (عمارہ کی)"

★ "کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟"

✻ "آئینہ کہتا ہے ٹھیک ٹھاک Cute بندی ہو لیکن تمہارے اس گھونسلے (کرلی بالوں) کا کچھ نہیں ہو سکتا۔"

★ "زندگی کے دشوار لمحات؟"

✻ "جب میڈیکل کالج کا ٹیسٹ دیا اور میرٹ لسٹ میں نام نہیں آیا' مت پوچھیں اس کے بعد ایڈمیشن ہونے تک آنسوؤں کے دریا بہائے ہیں۔"

★ "محبت آپ کی نظر میں؟"

✻ "میرے ماں باپ' بہن بھائی اتنے پیارے اور مخلص رشتے اور اتنی ڈھیر ساری نعمتیں جو اللہ پاک نے عطا کی ہیں شاید نہیں یقیناً" اسی کو محبت کہتے ہیں سچی اور خالص محبت۔"

★ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ؟"

✻ "ابھی تو ساری توجہ BBA مکمل کرنے پر ہے۔"

★ "پچھلے سال کوئی خاص کامیابی؟"

✻ "ایسی تو کوئی خاص کامیابی نہیں ملی... ہاں دوستوں کی فہرست میں ضرور اضافہ ہوا ہے اور تھوڑی بہت عقل سلیم بھی آگئی ہے۔"

★ "گزرے کل اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

✻ "گزرا کل بہت خوب صورت تھا اور آنے والا کل بھی ان شاء اللہ بہت بہترین ہو گا۔"

★ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

✻ "ضدی نہیں ہوں' مخلص رہتی ہوں' سستی نجانے کیوں اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے... لوگ کہتے ہیں کہ اچھی دوست ہوں۔"

★ "کوئی ڈر جو آپ میں آج بھی پنجے گاڑے ہوئے ہو؟"

✻ "راستہ بھٹک جانے سے' بہت ڈر لگتا ہے۔"

★ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

✻ "فیملی... دوستوں اور فیملی کے ساتھ گزارے ہوئے بہت سارے خوب صورت لمحات اور میرے ڈائجسٹ۔"

★ "آپ کی کمزوری اور آپ کی طاقت؟"

✻ "میری کمزوری میری فیملی ہے اس کے علاوہ مزے دار کھانے... طاقت اللہ تعالیٰ پر کامل یقین ہے۔"

★ "خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

✻ "گھر پر بھائی بہنوں اور کزنز کو جمع کر کے الٹی سیدھی شرارتیں کر کے دوستوں کے ساتھ ہوں تو پھر آؤٹنگ پر جا کر۔"

★ "آپ کے نزدیک دولت؟"

✻ "ایک اچھی زندگی اور اچھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دولت یقیناً" ضروری ہے۔"

★ "گھر آپ کی نظر میں؟"

✻ "اپنائیت کا احساس' ایک پر سکون جنت۔"

★ "کیا آپ بھول جاتی ہیں' معاف کر دیتی ہیں؟"

✻ "معاف تو کر دیتی ہوں لیکن بھولنا میرے لیے شاید مشکل ہے تو کوشش کرتی ہوں کہ بھول جاؤں۔"

★ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟"

✻ "اللہ تعالیٰ کو' اپنی فیملی کو ہماری جوائنٹ فیملی ہے اور اللہ کا شکر ہے سارے گھر والے بہت سپورٹر ہیں

اور ہمیشہ ان کرتے ہیں میرے ٹیچرز۔"

★ "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کرکے کاہل کردیا ہے کیا یہ واقعی ترقی ہے؟"

✻ "میرے جیسی ست الوجود کے لیے تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔"

★ "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

✻ "کوئی ایک عجیب خواہش ... ارے نہیں بھئی پورا عجائب گھر ہے خواہشوں کا جیسے سمیرا احمید کے "کارل" سے ملنے کی بڑی خواہش ہے خواب تو یہ ہے کہ ترکی ضرور جاؤں۔"

★ "برکھارت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

✻ "کبھی چھت پر اودھم مچا کر اور کبھی بس دور دور سے دیکھ کر۔"

★ "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

✻ "اگر تھوڑی اور محنت کرلیتی تو شاید بزنس کی اسٹوڈنٹ ہونے کے بجائے میڈیکل کی طالبہ ہوتی لیکن شکر ہے اس فیلڈ کے ساتھ بھی بہت خوش ہوں۔"

★ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب...؟"

✻ "جب ڈائجسٹ کا ڈھیر لگا کر اس کے درمیان بیٹھی ہوں اف اندرونی خوشی ہوتی ہے آخر کو اتنی محنت سے جمع کیے ہیں (ہے نا ہی) ہاہاہا۔"

★ "کامیابی کیا ہے آپ کی نظر میں؟"

✻ "کوئی بھی ایسا کام جس سے ہمارے ساتھ ہم سے منسلک لوگوں کو بھی خوشی ملے۔"

★ "مطالعہ آپ کی نظر میں؟"

✻ "مطالعہ بہت ضروری ہے... ذہن کو وسعت ملتی ہے اس کے علاوہ یہ شخصیت پر بھی بہت مثبت اثرات ڈالتا ہے... لوگوں کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔"

★ "پسندیدہ شخصیت؟"

✻ "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، محمد بن قاسم، قائداعظم۔"

★ "متاثر کن کتاب، مصنف، موویز؟"

✻ "مصحف، جنت کے پتے، سفال گر، نمرہ احمد، سعدیہ عزیز آفریدی، سمیرا احمید، ممتاز کنول، بشریٰ سعید ....

darkest hour Vertical Limits

The اور وعدہ رہا۔"

★ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

✻ "سامنے والے کا لہجہ صاف ستھرے ہاتھ پیر اور ذہانت۔"

★ "زندگی میں پالیا جو پانا چاہتی تھیں؟"

✻ "پانا تو پتا نہیں کیا کیا چاہتی ہوں لیکن کوشش کرتی ہوں کہ جو نہیں ملا اس پر افسردہ ہونے کی بجائے جو حاصل ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کروں۔"

★ "آپ کا غرور؟"

✻ "مسلمان ہونا یقیناً ہم سب کے لیے فخر کی بات ہے... اس کے علاوہ پاکستانی ہونا۔"

★ "زندگی کی فلاسفی آپ کی نظر میں؟"

✻ "زندگی ایک نعمت ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کو دوسروں کے لیے زحمت نہ بنائیں خود بھی خوش رہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کریں کیونکہ زندگی میں جو خوب صورت رنگ ہیں یہ ہمارے اردگرد کے لوگوں کی وجہ سے ہی ہیں مرنے کے بعد لوگ بے شک آپ کی زندگی کی مثال نہ دیں لیکن کم از کم آپ کو اچھے نام سے یاد تو رکھیں۔"

★ "مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"

✻ "نہیں ڈرتی نہیں ہوں بلکہ اپنا 100٪ دینے کی کوشش کرتی ہوں، مقابلہ کرنے سے پہلے ہی ہار تسلیم کرلینا بے وقوفی ہے... ہاں لڑائی جھگڑے اور بحث سے ڈر لگتا ہے۔"

✲ ✲ ✲

شگفتہ عمیر

القرآن

☆ دنیا کسی اتفاقی حادثے سے بنی ہوتی تو اس میں انسان کی قیامت تک کی ضروریات کا سامان مہیا نہ ہوتا۔

(آیت 20 الذاریات)

☆ انسان سے پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنے اختیارات کن مقاصد کے لیے استعمال کیے۔

(آیت 40۔39 الدخان)

☆ آخرت ہی نہیں دنیا میں بھی صحیح و غلط حرام و حلال کا فیصلہ کرنا اللہ ہی کا حق ہے۔

(آیت 10 الشوری)

☆ ایک شخص کے عمل کے اثرات کئی نسلوں کو متاثر کرتے ہیں اس لیے سب کا احتساب آخرت میں ہوگا۔

(آیت 19 حم سجدہ)

☆ جب کسی قوم میں بالکل بھی خیر نہ رہے تو اسے مٹا دیا جاتا ہے۔ (آیت 36 الذاریات)

دعا سرور۔۔۔۔ کراچی

چار اعمال

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابلیس کو افسردہ دیکھا وجہ دریافت کی بولا آپ کی امت کے چار اعمال بہت غمگین کرتے ہیں۔

اول یہ کہ جو لوگ اذان کی آواز سن کر جواب دیں ان کے تمام گناہ خدا بخش دیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جو لوگ نعرہ تکبیر بلند کر کے میدان جہاد میں کود جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو بخش دیتا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو لوگ رزق حلال کماتے ہیں اور کھاتے ہیں۔

چوتھے وہ جو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد آفتاب طلوع ہو جانے تک اپنی جائے نماز پر بیٹھے ذکر الٰہی کرتے رہتے ہیں خداوند تعالیٰ ان پر ان کے عزیزوں رشتہ داروں پر اپنی رحمتوں کا اتنا نزول کرتا ہے کہ کچھ شمار نہیں۔

مسز نگہت غفار۔۔۔۔ کراچی

ناک میں

حضرت نعمان نے باوجود عمر درازی کے کوئی مکان نہیں بنایا۔ ایک جھونپڑی میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ ملک الموت نے پوچھا۔

"باوجود اتنی بڑی زندگی کے آپ نے مکان کیوں نہیں بنایا؟"

آپ نے فرمایا "جس کی ناک میں آپ رہیں تو اس کو مکان بنانے کی کب سوجھتی ہے۔"

رفعت۔۔۔۔ ملتان

انسان

کسی کے چہرے پر مت جاؤ۔ کیونکہ ہر انسان بند کتاب کی مانند ہوتا ہے جس کا سرورق کچھ اور ہوتا ہے اور اندر کچھ اور تحریر ہوتا ہے۔

ملیحہ۔۔۔۔ کراچی
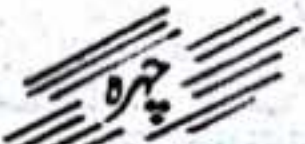
چہرہ

بیس سال کی عمر میں انسان کا جو چہرہ رہتا ہے' وہ قدرت کی دین ہے۔ تیس سال کی عمر کا چہرہ زندگی کے نشیب و فراز کی دین ہے اور پچاس سال کی عمر کا چہرہ

انسان کی اپنی کمائی۔ (اشفاق احمد)
ثنا فرمان..... رائن پور

خدا کی بندگی

کسی بادشاہ کا وزیر بہت دین دار اور عقل مند تھا اچانک نوکری چھوڑ کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گیا۔ ایک دن بادشاہ اس کے پاس گیا اور پوچھنے لگا۔
"تم نے نوکری کیوں چھوڑ دیں؟"
"وزیر نے کہا میں پانچ باتوں کی وجہ سے شاہی نوکری چھوڑ دی۔"
بادشاہ نے پوچھا وہ پانچ اسباب کون سے ہیں؟
وزیر نے کہا ایک تو آپ بیٹھے رہتے ہیں اور میں آپ کی خدمت میں کھڑا رہتا ہوں۔ اب خدا کی بندگی کرتا ہوں تو نماز میں بھی بیٹھنے کا حکم ہے۔ دوسری یہ کہ آپ بیٹھ کر کھاتے رہتے ہیں اور میں کھڑا آپ کو دیکھتا رہتا ہوں۔ مگر اب مجھے ایسا رازق مل گیا ہے۔ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور خود کھانے سے پاک ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ سوتے رہتے ہیں اور میں پہرا دیا کرتا ہوں۔ اب میں ایسے بادشاہ کی غلامی کرتا ہوں میں خود سوتا ہوں اور وہ میری نگہبانی کرتا ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ میں ڈرتا رہتا ہوں کہ آپ مر گئے تو آپ کے دشمن مجھے تکلیف دیں گے۔ اب ایسی ہستی کی خدمت کرتا ہوں جو ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس لیے مجھے کسی کا خوف نہیں۔ پانچویں وجہ ہے کہ میں ڈرتا رہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تو آپ مجھے نہیں بخشیں گے۔
اب مالک ایسا رحم دل ہے کہ دن میں سو مرتبہ بھی گناہ کروں تو وہ توبہ کرنے سے بخش دیتا ہے۔ (سبحان اللہ)

سلمٰی زبیر..... لاہور

ایبسٹریکٹ آرٹ

ایبسٹریکٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی ازراہ مروت بھی ستائش میں نے
آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں میں
لوگ کہتے ہیں کیا دیکھا تو شرماتا ہوں میں
صرف کہہ سکتا ہوں اتنا ہی وہ تصویریں تھیں
یار کی زلف کو سمجھانے کی تدبیریں تھیں
(سید محمد جعفری)
شاہدہ عامر..... کراچی

المیہ

عورت کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ محبت سے متعلق ہے۔ مرد اور عورت کی بنیادی محبتوں میں فرق ہے۔ مرد محبت کرنا چاہتا ہے۔ محبت کرنا اس کے بس میں ہے جس سے چاہیے، جس سے کرے۔ محبت کرنے کا ملاپ یا وصال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ وہ چاہی جائے۔ یہ فصل اس کے بس میں نہیں۔ اس کا انحصار دوسروں پر ہوتا ہے۔ وہ چاہیں۔ محبت کریں یا نہ کریں۔
(ممتاز مفتی کتاب "رام دین" میں "عورت کا المیہ" سے اقتباس)
ایمان سرفراز..... قصور

ایک خوب صورت بات

ایک انگریز نے مسلم شخص سے پوچھا۔
"تمہارے مذہب میں عورت سے ہاتھ ملانا کیوں منع ہے؟"
مسلم: "کیا تم ملکہ الزبتھ کے ساتھ ہاتھ ملا سکتے ہو؟"
انگریز: "سوچ بھی نہیں سکتا ہر شخص اس سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔ کیوں کہ وہ ملکہ ہیں۔"
مسلم: "تو یہی سمجھ لو کہ ہر مسلم لڑکی ملکہ ہے، ہر کوئی اس کے ساتھ ہاتھ نہیں ملا سکتا۔"

سلمٰی زبیر..... لاہور

وہ لوگ

☆ ۔ کتنے کم ظرف ہوتے ہیں جو دوسروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

☆ ۔کتنے اچھے ہوتے ہیں جو بے غرض دوسروں کے کام آتے ہیں۔
☆ ۔کتنے سنگ دل ہوتے ہیں جو دوسروں کے سکون لوٹ کر خوش ہوتے ہیں۔
☆ ۔کتنے بد قسمت ہوتے ہیں جو سچائی اور خلوص کی قدر نہیں کرتے ہیں۔
☆ ۔کتنے عظیم ہوتے ہیں جو دوسروں کی غلطیوں کو معاف کردیتے ہیں
☆ ۔کتنے کھوکھلے ہوتے ہیں جن کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔
☆ ۔کتنے ایثار پسند ہوتے ہیں جو دوسروں کی خوشیوں پر اپنی خوشیاں قربان کردیتے ہیں۔
☆ ۔کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اس کے بندوں سے پیار کرتے ہیں۔

ریما نور رضوان۔۔۔ کراچی

مقدر

یہ موسم سبز پتوں کا
سنہری دھوپ کرنوں کا
گلابوں کے مہکنے کا
ہمیں کب راس آیا ہے
ہماری زرد آنکھوں نے بنجر خواب ہی دیکھے
کہ اپنی خواب ہستی میں
عتاب آلود بستی میں
کوئی خوشبو نہ آنچل ہے
کوئی جھونکا نہ بادل ہے

رباب سرفراز۔۔۔ لاہور

زندگی

زندگی کی چار اعلا صداقتیں ہیں جو یہ ہیں۔
1 ۔ زندگی دکھ ہے۔
2 ۔ دکھ کا سبب خواہشات ہیں۔
3 ۔ خواہشات سے خود کو بچایا جا سکتا ہے۔
4 ۔ اس کے لیے نہ سخت ریاضت کی ضرورت ہے اور نہ ہی عیش پرستی بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

عائشہ ملک۔۔۔ چکوال

کچن غزل

میری محبت کو اپنے دل میں ڈھونڈ لینا
اور ہاں! آٹے کو اچھی طرح گوندھ لینا
مل جائے اگر پیار تو کھونا نہیں
پیاز کاٹتے وقت رونا نہیں
مجھ سے روٹھ جانے کا بہانہ اچھا ہے
تھوڑی دیر اور پکاؤ گوشت ابھی کچا ہے
مل کے پھر خوشیوں کو بانٹنا ہے
ٹماٹر ذرا باریک کاٹنا ہے
لوگ ہمارے محبت سے جل نہ جائیں
چاول ٹائم پر دیکھ لینا کہیں زیادہ نہ گل جائیں
کیسی لگی غزل بتا دینا
نمک کم لگے تو اور ملا لینا

علیشاہ۔۔۔ کراچی

شکوہ

میں نے تم سے
تمہیں مانگا
تو تم مسکرا دیے
تم یہ بھی تو کہہ سکتے تھے
میری جان!
اپنی چیزیں بھی بھلا مانگی جاتی ہیں

(وصی شاہ)

رضوانہ ملک۔۔۔ جلالپور پیروالا

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

صوفیہ سمیع، کی ڈائری میں تحریر
ایک خوبصورت نظم

بارش کی ان بوندوں نے
جب دستک دی دروازے پر
محسوس ہوا تم آئے ہو
انداز تمہارے جیسا تھا

ہولکے ہلکے جھونکے نے جب
آہٹ کی تو احساس ہوا وہ
لمس تمہارے جیسا تھا

میں تنہا چلا جب بارش میں
ایک جھونکے نے میرا ساتھ دیا
میں سمجھا تم ہو ساتھ میرے
احساس تمہارے جیسا تھا

پھر رک گئی وہ بارش بھی
میں سمجھا تم مجھے چھوڑ گئے
انداز تمہارے جیسا تھا

حرا قریشی، کی ڈائری میں تحریر
احمد ندیم قاسمی کی نظم

اظہار

تجھے اظہار محبت سے اگر نفرت ہے
تو نے ہونٹوں کو لرزنے سے تو روکا ہوتا

بے نیازی سے مگر کانپتی آواز کے ساتھ
تو نے گھبرا کے میرا نام نہ پوچھا ہوتا

تیرے بس میں تھی اگر مشعل جذبات کی لو
تیرے رخسار میں گلزار نہ بھڑکا ہوتا

یوں تو مجھ سے ہوئیں صرف آب و ہوا کی باتیں
اپنے ٹوٹے ہوئے فقروں کو تو پرکھا ہوتا

یونہی بے وجہ بھٹکنے کی ضرورت کیا تھی
دم رخصت اگر یاد نہ آیا ہوتا

تیرا غماز بنا خود تیرا انداز خرام
دل نہ سنبھلا تھا تو قدموں کو سنبھالا ہوتا

اپنے بدلے میری تصویر نظر آجاتی
تو نے اس وقت اگر آئینہ دیکھا ہوتا

حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ کاجل تیری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

نصرت جبیں، کی ڈائری میں تحریر
ابن انشا کی نظم

محبت بنا کچھ درکار نہیں،

وہ دوست جنہوں نے من میں مرے
مرے درد کا پودا بویا تھا
وہ دوست تو رخصت ہو بھی چکے
اور بار غم دل ساتھ مرا
اب چارہ گرو کچھ بولو نہیں
ان باتوں سے اب تمہیں کیا حاصل

مرے دوست تو شہد کے گھونٹ ہے
تجھے تلخ مزے کا پتا ہی نہیں
ترے دوست تو ہوں گے جلو میں ترے
ترا دل تو مگر ہے غموں کا امیں
یہ تو اجنبی لوگ ہیں ان کی بتا
کبھی ان کو بھی یاد کرے گا کہیں
کبھی طنز سے پوچھیں گے اہلِ جہاں
ترے دوست کا ہاتھ کہاں ہے بتا
مگر اہلِ وفا تو جھجکتے نہیں

جہاں سر پہ چمکتی ہے تیغ جفا
بڑے ناز سے دیتے ہیں سر کو جھکا
نہیں مانگتے کچھ بھی اجل کے سوا

ثوبیہ شاہین، کی ڈائری میں تحریر

قتیل شفائی کی غزل

جب سے آیا ہے ترے پیار کا موسم جاناں
دل میں رہتی ہے لگا تار چھما چھم جاناں

زخم جو تم نے دیے ان کا سندیسہ یہ ہے
بھیجنا اب نہ خدارا کوئی مرہم جاناں

جل رہے تھے مری پلکوں پہ جو یادوں کے چراغ
اب تو ان کی بھی لویں ہوگئیں مدھم جاناں

رک گئی سانس، بچھڑنے کی گھڑی جب آئی
دل مگر پھر بھی دھڑکتا رہا پیہم جاناں

باندھ لوں میں بھی تری یاد کے گھنگھرو لیکن
رقص کرنا بھی تڑپنے سے نہیں کم جاناں

تو نے چھوڑا نہ کسی ردِ عمل کے قابل
اب مرا شعر نہ شعلہ ہے نہ شبنم جاناں

جانتے کیا تجھ سے ہوئی بات کو گم صم ہے قتیل
اب ترا نام بھی لیتا ہے وہ کم کم جاناں

روبینہ صدف، کی ڈائری میں تحریر

سلیم کوثر کی غزل

ظلمت کدوں کی دہر میں کوئی کمی نہیں
سورج چمک رہا ہے مگر روشنی نہیں
سڑکوں پہ پھر رہی ہیں سلگتی ہوئی حیات
اور وہ حیات جس کو ابھی موت بھی نہیں

تم ساتھ چل رہے ہو مگر اتنا سوچ لو
دشت طلب میں سایۂ دیوار بھی نہیں

کب حادثوں نے چین سے سونے دیا مجھے
کس رات رنج و یاس کی آندھی چلی نہیں

تاراج کر دیا گیا، فصل بہار کو
موسم کی چار دن بھی گلوں سے بنی نہیں

سورج بھی رازداں ہے مرا، چاند بھی سلیم
میرے لیے کہیں بھی کوئی اجنبی نہیں

نگہت غفار، کی ڈائری میں تحریر

عطا شاد کی غزل

میں تجھ کو نذر کروں اور کیا وفا کے سوا
بس اب ایک دل ہے میرے پاس دعا کے سوا

خدا کرے تیرا ساتھ ہو قیامت تک
کوئی بھی تیرے مقابل نہ ہو بقاء کے سوا

تیرے بغیر مجھے اور کچھ سجھائی نہ دے
سنائی دے نہ مجھے کچھ تیری صدا کے سوا

تو ہم سفر ہے میرے کرب کی مسافت کا
متاع زیست بھی کیا ہے غم آشنا کے سوا

میں بھول جاؤں تجھے خود کو بھول جاؤں میں
تجھے نہ آئے نظر کوئی بھی میرے سوا

شگفتہ سلیمان

فرحین ظفر، سمی ظفر ــــــــــ کراچی

نگاہِ ہوش ربا میں بلا کا جادو ہے
کہ آنکھیں ملتے ہی دل کا پتا نہیں چلتا

شاہدہ ظفر، ثروت راشد ــــــــــ کراچی

آنکھیں ہی عیاں کرتی ہیں سب دل کے چھپے راز
کیوں تجھ کو یقیں میری نگاہوں پہ نہیں ہے

وشال فرحان ــــــــــ کراچی

اک نگاہِ برفیلی ایک بول پتھر کا
آدمی مرتا نہیں صرف خون بہنے سے

بینا ظفر، قرأت اکرام ــــــــــ کراچی

نگاہِ ناز کو روکو کہیں بجلی گرائے گی
کسی کی بے نیازی ہے کسی کی جان جائے گی

ھدرا ناصر، اقصیٰ ناصر ــــــــــ کورنگی

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

مدیحہ، ایمان فہمید ــــــــــ فیصل آباد

لوٹ آئے ہیں نگاہوں میں پرانے چہرے
پھر گئے وقت کی زنجیر ہلا دی کس نے

حنا کرن ــــــــــ پتوکی

وفا میں ہر ستم سہہ لے وفا کی شرط ہے اوّل
نگاہوں سے صدا دینا حیا کی شرط ہے اوّل
ترے مے خانے میں ساقی عجب دستور دیکھا ہے
ترا اک جام پینے میں وفا کی شرط ہے اوّل

بیا اسامہ انجم ــــــــــ فیصل آباد

تازہ گلاب کس نے دریچے میں رکھ دیا
کس کی نگاہِ خانۂ ویران تک آ گئی

سیدہ لوبا سجاد ــــــــــ کہروڑ پکا

یہ قیام کیسا ہے راہ میں، ترے ذوقِ عشق کو کیا ہوا
ابھی چار کانٹے چبھے نہیں، تیرے سب ارادے بدل گئے

سیدہ نسبت زہرا ــــــــــ کہروڑ پکا

اُجلے اُجلے چہرے ہم سے بچھڑ گئے تو سوچتے ہیں
کتنے اچھے افسانے لکھے کتنے بُرے انجام ہوئے

حورین زینب ــــــــــ کہروڑ پکا

میرے ہاتھ کی لکیروں میں یہ عیب چھپا ہے محسن
میں جس شخص کو چھو لوں وہ میرا نہیں رہتا

گڑیا شاہ ــــــــــ کہروڑ پکا

کہاں تک ہیں سنجانے محبتیں اس کی
یہ عمر، لمحہ، زمانے، محبتیں اس کی
کہاں ہے زندگی کرنے کی آرزو ہم کو
ہیں زندگی کے بہانے محبتیں اس کی

افشاں زرین، دریشہ ــــــــــ کراچی

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

کنول ــــــــــ بھائی پھیرو

یادیں بھی ہیں امید بھی ہے بے بسی بھی ہے
اے دوست کیا نہیں ہے ہماری نگاہ میں

لائبہ رانی ــــــــــ قصور

تیری نگاہ بھی اس دور کی زکوٰۃ ہوئی
جو مستحق ہے اس تک نہیں پہنچ پاتی

انیقہ انا ــــــــــ چکوال

ادا قاتل، بیاں قاتل، زباں قاتل، نگاہ قاتل
تمہارا سلسلہ شاید کسی قاتل سے ملتا ہے

کچھ موتی چُنے ہیں

ادارہ

محبت

"مگر محبت ہوتی کیسے ہے۔" نفیسہ نے پر تجسس تعجب سے پوچھا۔

"بالکل اچانک" جب آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا آپ کے اندر اگنا شروع ہو گیا ہے۔ محبت ایک دوسرے کے اندر اگنا ہے پہلے تو کسی بیج کی طرح دوسرے کے اندر فنا ہونا، اپنا آپ مٹا دینا پھر اگنا، جوں جوں محبت بڑھتی ہے، ایک دوسرے کے اندر جڑیں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس پودے کو ہر روز تازہ محسوسات اور جذبوں کی کھاد آنسوؤں کا پانی، دوسرے کے سانسوں کی ہوا اور من کی پر حرارت دھوپ کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر کبھی آپ کو اپنا آپ مرجھاتا ہوا محسوس ہو تو سمجھ لیں کہ دوسرے کے من کی زمین پتھریلی ہو گئی ہے اور اس نے آپ کے اندر سے اپنی جڑیں بے دردی سے سمیٹ لی ہیں۔ جب آپ ایک دوسرے کے اندر اگتے ہیں تو محبت پھول بن کر کھل اٹھتی ہے اور اس کی خوشبو آپ کے پورے بدن میں پھیل جاتی ہے دوسرے کا وجود اور آپ ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں محبت بڑی شفاف چیز ہے، کسی آئینے کی طرح اس پر ہلکا سا ناگواری کا کوئی میلا چھینٹا بھی فوراً دکھائی پڑتا ہے ہر سچی اور خالص چیز کے ساتھ ہی مسئلہ ہے تھوڑا سا نا خالص احساس بھی یکدم میری طرح محسوس ہونے لگتا ہے اس لیے کسی ایک بھی میلے لفظ، جملے کج ادائی یا دل کی کسی غافل دھڑکن سے محبت کے سیب کو کیڑا لگ جاتا ہے۔"

(محبت مردہ پھولوں کی سمفنی" از مظہر السلام)۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کھروڑپکا۔

دو طرح کے انسان

نفسیاتی اعتبار سے دنیا میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ، جو دوسروں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ وہ انسان کی محبت سے محظوظ ہوتے ہیں۔ تنہائی انہیں پریشان کرتی ہے، بوجھل کر دیتی ہے۔ ایسے لوگوں پر تنہائی میں دنیا جہاں کی پریشانیاں حملہ آور ہوتی ہیں۔ تنہا ہو تو وہ خود کو بے آب و گیاہ صحرا میں یا برفی پہاڑوں کے درمیان گھرا محسوس کرتے ہیں۔

دوسرے وہ، جو ایسے لوگوں کے برعکس ہوتے ہیں۔ وہ اندر کی دنیا کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو محفلیں بے زار کر دیتی ہیں۔ وہ دوستوں کی رفاقت زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے۔ بے چین مضطرب ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنی تنہائی عزیز ہوتی ہے۔ اپنی تصوراتی دنیا میں جا کر انہیں سکون ملتا ہے یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔

اول الذکر لوگ... مادہ پرست ہوتے ہیں

اور آخر الذکر... اندر کی دنیا میں مگن رہنے والے

(مہاساں)

اقرا۔ کراچی

خوف

ہماری خوشیوں کی سب سے بڑی دشمن دراصل یہی "اندر" کی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے، ہم جسے "کوئی" کہہ کر خود کو بہلانے کی کوشش کرتے ہیں دراصل یہ "کوئی" ہمارے اندر کنڈلی مار کر بیٹھا ہو خوف ہوتا ہے۔ ارد گرد کے انسانوں کا خوف، اپنے سے برتر انسانوں کا خوف، اپنے سے کم تر انسانوں کا خوف، ناکامی کے بوجھ سے خائف لرزتے دل کا خوف، آنکھوں کی اوٹ سے جھانکتے تاسف کا خوف، طعنوں کا خوف، ہمدردی کی آڑ میں رگ جاں کو آری کی طرح کاٹتے فقروں کا خوف، پابندیوں سے جکڑے اس معاشرے کا خوف... جی ہاں اس معاشرے کا خوف، کوئی ایسا نہ کہہ دے، کوئی ویسا نہ کہہ دے، کوئی دیکھ نہ لے، کسی کو پتا چل گیا تو؟

(من شرما خلق... تنزیلہ ریاض)

عدیلہ نواز۔ ڈیرہ اسماعیل خان

اردو گرامر

فعل کی دو قسمیں فعل لازم اور فعل متعدی بھی ہیں۔

فعل لازم وہ ہے جو کرنا لازم ہو۔ مثلاً افسر کی خوشامد' حکومت سے ڈرنا' بیوی سے جھوٹ بولنا وغیرہ۔

فعل متعدی عموماً" متعدی امراض کی طرح پھیل جاتا ہے۔ ایک شخص کنبہ پروری کرتا ہے۔ دوسرے بھی کرتے ہیں۔ ایک رشوت لیتا ہے دوسرے اس سے بڑھ کر لیتے ہیں۔ ایک بناسپتی گھی کا ڈبا پچیس روپے میں کردیتا ہے دوسرا گوشت کے سارے بارہ روپے لگاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ دونوں اپنے فعل متعدی کو فعل لازم قرار دیتے ہیں۔ ان افعال میں گھاٹے میں صرف مفعول رہتا ہے یعنی عوام۔ فاعل کی شکایت کی جائے تو وہ فائل میں دب جاتی ہے۔

ثناء شہزاد... کراچی

یادیں

کبھی یادیں بھی مٹتی ہیں؟ یادیں تو پتھر کی لکیروں کی مانند ہوتی ہیں جنہیں نہ تو کوئی کھرچ سکتا ہے' نہ مٹا سکتا ہے۔ یہ رہتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے رہتی ہیں یہ ٹھیک ہے کہ وقت اور حالات کے تقاضے انسان کو ان سے منہ موڑنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ لیکن ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا ہے۔ جب بھی ان کی طرف پلٹو' یہ تازہ ہوجاتی ہیں۔

(معاملے دل کے... رضیہ بٹ)

فضہ نور... روہڑی

گناہ

وہ کیسی عجیب سی کیفیت ہوتی ہے کہ جب دعا نہیں مانگی جاتی۔ دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو دیکھ کر انہی ہاتھوں سے کیے جانے والے گناہ یاد آجاتے ہیں تب ہمیں کیوں لگتا ہے کہ ہم گناہوں سے توبہ کرلیں گے اور پھر انہیں بھلا کر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ گناہ ایسے پیچھا نہیں چھوڑتے' ان کے آثار ہمیشہ ان جگہوں پر موجود رہتے ہیں۔ گناہ تو ساری عمر پیچھا کرتے ہیں۔ کیا ان سے کوئی رہائی تھی؟ کیا ان کی ملکیت سے کوئی آزادی تھی؟

(جنت کے پتے... نمرہ احمد)

صدف سمیع... کراچی

اسٹوڈنٹ

صاحب اب تو اسٹوڈنٹ کو پہچاننا مشکل ہوگیا ہے۔ ہم نے ایک صاحب سے پوچھا۔ "کیا آپ اسٹوڈنٹ ہیں؟"

تو انہوں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں جناب! یہ تو جلدی میں مجھے اوپر والا بٹن بند کرنا یاد نہیں رہا۔" البتہ اب کوئی اسٹوڈنٹ یہ کہے کہ اس پر کوئی کیس درج نہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پابندی سے کالج نہیں جاتا ہوگا۔ آج کل دنیا میں دو طرح کے طالب علم مشہور ہیں۔ ایک وہ جو قابلیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنی قابلیت کی وجہ سے ہیں۔ جب ہمیں پتا چلا کہ طلبا نے طالبان کے نام سے کابل پر قبضہ کرلیا ہے تو ہم یہ سمجھے کہ امتحان ملتوی کروانا چاہتے ہیں' لیکن انہوں نے طالب علموں والا ایک ہی کام کیا' وہ یہ کہ لڑکیوں کے کالج بند کروادیے۔

(نوک جھونک... ڈاکٹر یونس بٹ)

نازیہ حسین... سبی

کفران نعمت

سارے دن سب کے لیے اچھے اور سب کے لیے برے نہیں ہوتے' نہ ہی اللہ ہر انسان کو ہر قسم کی تنگی دیتا ہے' کچھ چیزوں میں تنگی ہوتی ہے' کچھ میں آسانی' انسان پریشانیوں کی گنتی کرنے کا ماہر ہے' نعمتوں کا حساب کتاب رکھنا اسے ہمیشہ بھول جاتا ہے۔

(مراۃ العروس... عمیرہ احمد)

ممتاز مظہر... کراچی

✿ ✿

روبینہ شریف

مسکراتی کرنیں
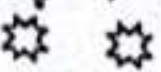
پچھتاوا

میاں بیوی میں ڈسکشن چل رہی تھی کہ چوری کرنے والا ایک دن پچھتاتا ضرور ہے۔
بیوی نے ناز سے اٹھلا کر شوہر کو دیکھا اور بولی۔
"چھوڑیں جی وہ جو آپ نے ہماری نیندیں چرائی تھیں۔ اس چوری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟"
شوہر نے کہا۔
"وہی بکواس کر رہا ہوں کہ چوری کرنے والا ایک دن پچھتاتا ہے۔"

رانیہ تحریم۔۔۔ مظفر گڑھ

پاس

کرکٹ ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا، اسٹیڈیم کے گیٹ پر ایک لڑکا پاس دکھا کر اندر جانے لگا تو گیٹ کیپر نے کہا۔
"یہ تمہارا پاس تو نہیں۔"
"یہ میرے والد کا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔
"وہ کیوں نہیں آئے؟"
"وہ بہت مصروف ہیں" لڑکا بولا
"کیا کر رہے ہیں وہ؟" گیٹ کیپر نے پوچھا
"اپنا پاس تلاش کر رہے ہیں" لڑکے نے جواب دیا۔

یاسمین ملک۔۔۔ چکوال

بے بسی

مولوی نکاح کے وقت "حاضرین میں سے اس شادی پر کسی کو اعتراض تو نہیں؟"
ایک سہمی سی آواز آئی "جی مجھے ہے"
مولوی "تم چپ رہو تم دولہے ہو۔"

طوبہ قمر۔۔۔ کراچی

خودکشی

پٹھان خودکشی پر تقریر کر رہا تھا۔ "خودکشی حرام ہے ظلم ہے گناہ ہے بزدلی ہے پاگل پن ہے ایسی حرام موت مرنے سے بہتر ہے انسان اپنے آپ کو گولی مار لے۔"

نشانورین، صائقہ نورین۔۔۔ بوتالہ جھنڈا سنگھ

بے ایمانی

بیوی شوہر سے "دیکھو میں کام کر رہی ہوں تب رومانٹک نہ ہوا کرو"
کام کرتی ہوئی ماسی بولی۔
"بیگم صاحبہ میں بھی صاحب کی اس حرکت سے پریشان ہوں۔"

صدف۔۔۔ لاہور

مشکل سوال

"اس فارم میں ایک ایسا سوال پوچھا گیا ہے جس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آیا۔" ایک صاحب نے باہر جانے کے سلسلے میں کاغذات کی خانہ پری کرتے ہوئے سر اٹھا کر اپنے دوست سے کہا۔
"کیا سوال ہے؟" دوست نے پوچھا۔
"لکھا ہے آپ کی والدہ شادی سے پہلے کیا کرتی تھیں؟ مسئلہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے تو وہ میری والدہ ہی نہیں تھیں۔"

فاطمہ قریشی۔۔۔ ملتان

امید

خالد اپنے بھائی کی عیادت کے لیے اسپتال پہنچا جو

کافی دنوں سے اسپتال میں زیر علاج تھا۔ کچھ وقت اس سے باتوں میں گزار کروہ وارڈ کی خوب صورت نرس کو ایک طرف لے گیا اور رازدارانہ انداز میں پوچھا۔
"سلیم کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کوئی امید بھی ہے کہ نہیں؟"
"ہرگز نہیں!" نرس تیزی سے بولی۔ "اس مولوی کا اور میرا مزاج تو بالکل نہیں ملتا۔ یہ تو ہروقت اللہ اللہ ہی کرتا رہتا ہے۔"

صوفیہ خان۔۔۔۔ راولپنڈی

قصور

ایک صاحب چلا چلا کر کہہ رہے تھے "آج میں اپنے کتے کو جان سے ماردوں گا۔"
کسی نے پوچھا "کیوں بھئی۔ اس بے چارے نے کیا قصور کیا ہے۔"
ان صاحب نے جواب دیا "آپ قصور کی بات کرتے ہیں؟ میں نے مرغی پالی 'اس نے کھالی' تو تاپالا' اسے زخمی کردیا۔ خرگوش رکھے ان کو بھگادیا اور میری ساس ایک مہینے سے آئی ہوئی ہیں۔ اس ایک مہینے میں یہ کمبخت کچھ نہیں کرسکا۔"

شگفتہ آفریدی۔۔۔۔ اوتھل

اثر

ایک مکان کے دروازے میں کھڑی ہوئی خوب صورت عورت سے جب ایک فقیر نے مالی مدد کے لیے التجا کی تو عورت اس سے کہنے لگی۔
"دیکھو تم جوان ہو' تندرست ہو' کام کاج کرکے کماسکتے ہو اور پھر بھی تم دو روٹی کے لیے ساری زندگی برباد کررہے ہو۔"
فقیر بولا "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا خود ہی کو دیکھیے۔ آپ اتنی حسین ہیں کہ باآسانی فلموں میں ہیروئن بن سکتی ہیں اور پھر بھی آپ گھر گرہستی میں اپنی زندگی برباد کررہی ہیں۔"
عورت نے کہا "ٹھہرو! میں ابھی تمہیں کچھ پیسے بھی دوں گی اور کھانا بھی۔"

انعم نور۔۔۔۔ لاہور

پھول

ایک شرمیلا نوجوان ایک خوب صورت لڑکی کو دل دے بیٹھا' مگر اظہار کی جرات نہ ہوتی تھی۔ ایک دن وہ اپنی محبوبہ کے لیے پھول لے گیا۔ پھولوں کا تحفہ پاکر لڑکی کے دل میں بے اختیار پیار مچل اٹھا اور اس نے پیار کا اظہار کردیا۔ لڑکا فوراً" اٹھ کر چل دیا۔
لڑکی نے دانستہ روک لیا اور بولی۔
"میں معافی چاہتی ہوں۔ شاید تم اس لیے اٹھ کر جارہے ہو کیا تمہیں میری بے باکی اچھی نہیں لگی۔"
نوجوان بولا۔
"یہ بات نہیں میں تو اور پھول لینے جارہا ہوں۔"
نورین ظفر۔۔۔۔ بہاولپور

دوراندیشی

"یہ تم اخبار سے کون سی خبر کاٹ رہے ہو؟" ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا۔
اس دوست نے کہا۔
"چھپا ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دے دی کہ وہ اس کی جیبوں کی تلاشی لیتی تھی۔"
"تم اس خبر کا کیا کروگے؟" دوست نے حیرانی سے پوچھا۔
"اپنی جیب میں رکھوں گا۔" دوست نے جواب دیا۔

ثنا میر۔۔۔۔ حیدر آباد

✡ ✡

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

زنگر برگر

اجزاء:

چکن بریسٹ	آدھا کلو
نمک	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
مسٹرڈ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
چائنیز نمک	ایک چائے کا چمچہ
ووسٹر ساس	دو کھانے کے چمچے
تیل	ایک کپ
بن	حسب ضرورت
چیز سلائس	ایک پیکٹ
مایونیز	حسب ذائقہ

فرائی کرنے کے لیے آمیزہ بنانے کے اجزاء

میدہ	دو چائے کے چمچے
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
یخ ٹھنڈا پانی	حسب ضرورت

کوٹنگ کے لیے اجزاء

کارن فلیکس	ایک کپ
بریڈ کرمز	ایک کپ
چپس یا کرسپ	ایک کپ

ترکیب:

سب سے پہلے چکن ٹکڑوں کو کسی بھاری چیز سے چپٹا کرلیں، پھر اوپر بتائے گئے تمام مسالے مکس کرکے چکن میں لگالیں اور رات بھر کے لیے رکھ دیں' تاکہ مسالے مرغی میں جذب ہو جائیں۔ فرائی کرنے کے لیے اوپر بتائے گئے تمام اجزاء کو اچھی طرح مکس کرکے یخ ٹھنڈے پانی سے گاڑھا آمیزہ بنالیں۔ کوٹنگ کے لیے تمام اجزاء کو موٹا موٹا کوٹ لیں۔ دھیان رہے کہ پاؤڈر نہیں بنانا۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے پھر مسالے لگے چکن کے ٹکڑوں کو پہلے فرائی کرنے والے آمیزے میں رول کرکے تیل میں گولڈن براؤن ہونے تک بارہ سے پندرہ منٹ کے لیے ڈیپ فرائی کرلیں۔ چھری سے بن کے دو ٹکڑے کریں اور ان پر مایونیز لگالیں' پھر فرائی مرغی کا پیس' چیز سلائس اور سلاد کا پتا رکھ کر برگر بنا کر کیچپ اور چپس کے ساتھ کھانے کے لیے پیش کریں۔

گجراتی مکس سبزی

اجزاء:

آئل	چار کھانے کے چمچے
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
بینگن	150 گرام

(موٹے ٹکڑے کاٹ لیں)

گاجر	90 گرام

(ایک انچ لمبے کیوبز بنالیں)

مٹر	90 گرام
آلو	150 گرام

(چھیل کر موٹے ٹکڑے کاٹ لیں)

شکر قندی	150 گرام

(ایک انچ لمبے ٹکڑوں میں کاٹ لیں)

ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	150 گرام
تازہ میتھی	150 گرام
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ناریل کدوکش کرلیں	150 گرام

ترکیب :

ایک سوس پین میں تیل گرم کریں اور اس میں زیرہ اور اجوائن ڈال کر کڑکڑائیں اب اس میں ادرک، لہسن پیسٹ، ہری مرچ پیسٹ ڈال کر کچھ دیر بھونیں۔ اس کے بعد ہرا دھنیا، تازہ میتھی اور ناریل ڈال کر کچھ دیر پکائیں۔ اس کے بعد ہلدی پاؤڈر، چینی، نمک ڈال کر مکس کرلیں۔ اب بینگن، آلو، شکر قندی، گاجر ڈال کر اتنا پانی شامل کریں کہ سبزیاں اس سے ڈھک جائیں اور آنچ ہلکی کرکے سبزیوں کے گل جانے تک پکائیں۔ اس دوران بیسن میں میتھی، سوڈا، اجوائن، نمک اور پانی ڈال کر نرم آٹا گوندھ لیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ اس تیار آٹے سے چیری کے برابر گول گول بالز بنا کر تیل میں ڈال کر تل لیں۔ جب سنہری ہو جائیں تو نکال اخبار پر پھیلا لیں اور پیش کرتے وقت تیار گجراتی مکس سبزی کے اوپر ڈال کر پیش کریں۔
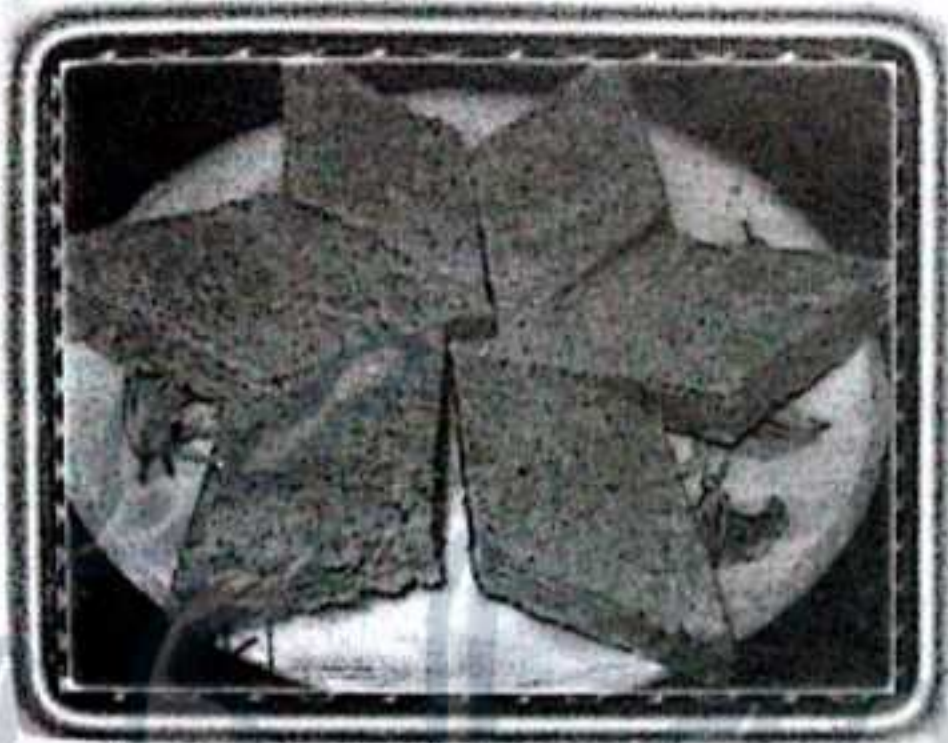
سوجی کے قتلے

ضروری اجزاء :

سوجی	ایک کلو
کشمش	ایک تہائی پیالی
چینی	تین پیالی
کھوپرا	ایک تہائی پیالی
سبز الائچی	6 عدد
کیوڑہ	ایک چمچہ
پانی	ڈیڑھ پیالی
ڈالڈا گھی	ڈیڑھ پیالی

ترکیب :

دیگچی میں گھی کڑکڑا کر سوجی ہلکی آنچ پر بھون لیں۔ جب سوجی بادامی رنگ کی ہو تو دیگچی اتار لیں۔ دوسری دیگچی میں چینی اور پانی کا شیرہ تیار کریں۔ جب ایک تار بن جائے تو اسی سوجی والی دیگچی چولہے پر چڑھا کر اس میں ڈال کر چمچہ سے ہلائیں۔ جب سوجی کا حلوہ گاڑھا ہونے لگے تو کشمش، کھوپرا اور روح کیوڑہ شامل کرکے چولہے سے اتار لیں اور کسی بڑے تھال میں پھیلا دیں۔ جمنے لگے تو چاندی کے ورق لگا کر سجا لیں۔

✡ ✡

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

فیروز جہاں۔۔۔ خانیوال

س۔ اس انسان کی کیا سزا ہو جو گزرا ہوا وقت بھول جائے؟

ج۔ اس کو سزا خداوند خود ہی دے دے گا۔ آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔

صائمہ گل۔۔۔ بہاول پور

س۔ اگر کوئی مرد شادی کے دن سہرے کے پیچھے روئے تو کیا سمجھنا چاہیے؟

ج۔ نکاح کے وقت اس نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اس کے والد بزرگوار نے زبردستی کروائی ہے "ہاں"

آنسہ شفق رحمن۔۔۔ بہاول پور

س۔ سنا ہے تم نے ماسی مصیبتے کا "مکر" چرا لیا ہے

ج۔ کھا بھی لیا۔

س۔ جلدی کا کام شیطان کا دیر کا کام؟

ج۔ انسان کا

عبیرہ ارم۔۔۔ راولپنڈی

س۔ "احمق مرد تو وہ ہے جو صرف عورت کی خوبصورتی پر مر مٹے اور احمق عورت؟"

ج۔ "اس میں یہی خامی ہے کہ بس صورت دیکھی اور گئی کام سے۔"

تبسم زہرا۔۔۔ کراچی

س۔ "کیا کبھی آپ نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا ہے۔ اور اگر دیکھا تو ڈر تو نہیں گئے؟"

ج۔ "نہیں کبھی نہیں ڈرا بلکہ عام زندگی سے بہتر پایا ہے خواب میں۔"

ارم ناہید۔۔۔ کراچی

س۔ "ذوقی بھیا! بیماری سے بچاؤ کے ٹیکے تو کمیٹی والے لگاتے ہیں۔ رشوت سے بچاؤ کے ٹیکے کہاں لگتے ہیں؟"

ج۔ "رشوت اپناؤ کے 'ٹیکے' ہیں ہمارے پاس۔ مگر اس کی کسی کو ضرورت ہی نہیں۔"

صائمہ عنبرین۔۔۔ جھمرہ سٹی

س۔ "توبہ یا اللہ! ذرا سے بیمار کیا ہوئے 'رائی کا پہاڑ' بنا دیا۔ حالانکہ تصویر میں تو ہٹے کٹے نظر آ رہے ہیں؟"

ج۔ "بیماری کے درمیان کی دکھاؤں تو سکتہ ہو جائے گا' جناب پر۔"

بشریٰ فضل الٰہی۔۔۔ چونڈہ

س۔ اوئے ہوئے۔۔۔ آخر نہ رہ سکے اور تصویر چھپوا دی۔ مگر حیرت ہے کہ تصویر کے "سر" پر کافی بال ہیں۔ جبکہ بقول آپ کے سر پر فقط "دس" بال ہیں۔ سچ سچ بتائیں یہ تصویر کس کی ادھار لی ہے؟

ج۔ اپنے پڑوسی کی۔

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

اس ماہ کا خط

سدرہ مرتضٰی..... کراچی

سب سے پہلے تو میں تعریف کرنا چاہوں گی کہ کرن میں بہت سی پرانی رائٹر واپس آگئی ہیں۔ اپنی پرانی لکھاریوں کا نام کرن میں دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے' وہ بیان سے باہر ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے مدیرہ کی جو رائٹر کافی عرصے سے کرن سے غائب تھیں وہ دوبارہ نظر آرہی ہیں ویل ڈن۔

مگر کرن میں کچھ نئی رائٹر بھی لکھ رہی ہیں۔ وہ بھی پسندیدگی کی فہرست میں شامل ہو گئی ہیں۔ جن میں ندا حسنین 'صدف آصف 'سحرش فاطمہ اور قراۃ العین خرم کے نام قابل ذکر ہیں۔ اب بات ہو جائے مارچ کے کرن کی۔

تنزیلہ جی آپ نے تو کاشف کا دیوالیہ ابھی سے نکال دیا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ فلم بننے کے بعد کچھ ہو گا۔ پلیز شہرین کو ماریئے گا نہیں۔

آسیہ مرزا کی کہانی بھی بہت بہترین انداز میں چل رہی ہے۔ ڈائیلاگز تو دل کو چھو جاتے ہیں۔ نایاب جی یہ ماہ رو تو بہت سادہ مزاج نکلی۔ پلیز اینڈ میں اچھا کیجیے گا۔ مجھے آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ "شاید" کی کیا بات کروں۔ اف... ام ہانی' تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ فائزہ نے ایک یادگار کردار دوبارہ تخلیق کیا ہے۔ ویل ڈن نفیسہ سعید۔ اس بار بہت مزے کے ٹاپک کے ساتھ آئیں۔

"تم بن" اور "پایا جو تجھے" دونوں ہی ہلکی پھلکی تحریر لگیں۔ "وفاشناس" میں صدف آصف نے بتا دیا کہ ایک شخص سے بار بار دھوکا کھانا عقل مندوں کا شیوہ نہیں۔ انہوں نے خاص طور پہ سوشل میڈیا کی برائیوں کی نشان دہائی کر کے آج کی لڑکیوں کو اچھا سبق دیا۔ راشدہ رفعت کا انداز بھی اچھا تھا۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا اچھی حکمت عملی ہے۔ امتل العزیز نے اچھی بات سمجھائی کہ سچی محبت کے صدقے سارے گلے شکوے معاف ہیں۔ اس بار افسانوں کا انتخاب واقعی بہت اچھا رہا۔ باقی سلسلے میں بہترین چل رہے ہیں۔

ج: پیاری سدرہ! تعریف کرنے کا بے حد شکریہ۔ امید ہے کہ آپ ہر دفعہ تبصرہ کریں گی۔ ہم منتظر رہیں گے۔

ام عمارہ حسین..... تلہ گنگ

کرن کی سالگرہ مبارک ہو دن دوگنی رات چوگنی ترقی ملے۔ اداریہ بہت اچھا رہا محمود ریاض کے لگائے پودے کو سلام۔ سروے کا نام "کھولے پنکھ یادوں نے" نام ہی ایسا تھا حمد و نعت سے فیض یاب ہو کر پنکھ کھولے اور دل باغ باغ ہو گیا نگہت سیما کو پڑھ کر۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ان پہ عقیدت کے۔ دل سے فین ہوں ان کی۔ شاید ہی کوئی تحریر ہو جو میں نے نہیں پڑھی۔ ثنا جاوید کا انٹرویو اچھا لگا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر سروے کے بجائے انٹرویو والا سلسلہ رائٹرز کے لیے شروع ہو۔ "راپنزل" کیا الفاظ ہیں تنزیلہ کے سمجھ نہیں آتی تعریف "راپنزل" کی کی جائے یا تنزیلہ ریاض کی "من مورکھ کی بات" آسیہ مرزا اپنی ازلی صلاحیت کے ساتھ جلوہ گر ہوئیں۔ اب آتی ہوں ناولز کی طرف تو جناب بازی نایاب جیلانی لے گئیں۔ بہت اچھا لکھنے پر مبارکاں اور پلیز کوئی افسانہ بھی لکھیں جلدی سے اور افسانے کا ذکر نکلا ساتھ ہنسی کا فوارہ بھی "چشم پوشی"

راشدہ رفعت.... آہاہا دل ناچ اٹھا۔ آپ نے قسم سے سو نمبر میں سے ایک سو ایک لیے۔ دوسرے نمبر پر دیا شیرازی کا "برانڈ فوبیا" بہت اچھا لگا۔ "شاید" فائزہ ایک تواتر سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ سعد' اِی ہانی کے ساتھ ٹریجڈی سے پاک ہونی چاہیے۔ ناولٹ "تم بن" ایک تو عنوان دو لفظی اوپر سے لکھنے والی مصباح علی دو لفظی۔ کیا کمال لکھا۔ ناولٹ میں نمبرون رہا۔ باقی سلسلے بہت جاندار تھے۔ ارے ہاں۔ سیدہ نسبت زہرا کے P.W.D کے لیے جانا بہت مبارک ہو۔ لیکن پلیز خطوط لکھتی رہنا۔

ج : پیاری ام عمارہ آپ نے بہت اچھا خط لکھا۔ کرن کی پسندیدگی کے لیے بے حد شکریہ۔

ثوبیہ شاہین..... ملتان

مارچ یعنی کرن کے سالگرہ نمبر کا کافی انتظار تھا۔ سرخ ڈریس میں ملبوس ماڈل سے سجا رسالہ ہاتھ میں لیتے ہی دل خوش ہو گیا۔ ٹائٹل دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا۔ بہت محنت کی گئی ہے ویل ڈن تنزیلہ ریاض کا "راپنزل" ہمیشہ کی طرح بہترین۔ آسیہ مرزا کا "من مورکھ کی بات نہ مانو" مناسب ۔فائزہ جی کا "شاید" بھی ٹھیک ہی تھا۔ نایاب جیلانی جی کہانی کا ایک ہی انداز ہے۔ مکمل ناول میں اس بار نادیہ احمد کا ناول "دل ہی تو ہے" پسند آیا۔ کہانی پر گرفت مضبوط تھی۔ ناولٹ میں فرحت شوکت بازی مار گئیں۔ اب بات ہو جائے افسانوں کی "موج بہار" سمیرا غزل کا اچھا انداز تحریر' اس کے بعد "محبت کے صدقے" پڑھا پسند آیا۔ "وفا شناس" صدف آصف کی بہت ہی شاندار اور آج کے دور کی منہ بولتی کہانی' مصنفہ کو ہماری تعریف پہنچادیں۔ "برانڈ فوبیا" بھی پسند آگئی۔

رائٹرز کا سروے پڑھ کر بہت مزا آیا اور بجیا کے لیے آنکھیں نم ہو گئیں۔

ج : پیاری ثوبیہ بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کو سالگرہ نمبر پسند آیا اور آپ کا انتظار بے کار نہیں گیا۔ صدف آصف تک آپ کی تعریف پہنچادی گئی ہے۔

نصرت جبیں..... لاہور

سب پہلے' حمد و نعت آنکھیں نم کر گئیں۔ ثنا جاوید سے ملاقات پسند آئی۔ لکھاریوں کا سروے دلچسپی سے بھرپور تھا۔ فائزہ افتخار کا ناولٹ "شاید" سسپنس لیے ہوئے چل رہا ہے۔ "ردائے وفا" ٹھیک ٹائم پر ختم ہو گیا۔ نایاب جیلانی جی اپنی کہانی میں کچھ نیا پن لائیں۔ تنزیلہ ریاض پلیز صفحات کو کچھ بڑھائیں۔ آسیہ مرزا کا "من مورکھ" کچھ خاص نہیں لگا۔

نادیہ احمد اور مصباح علی کی تحریریں بھی مقبولیت کی سند پا گئیں۔ افسانے سارے ہی اچھے لگے۔ راشدہ رفعت کا "چشم پوشی" مزے دار انداز میں تحریر' میاں جی کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ "وفا شناس" صدف آصف نے اس بار بھی ایک معاشرتی مسئلہ کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا۔ بجیا کے انتقال سے ادبی دنیا میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ باقی سلسلے بھی پسند آئے۔ غرض سالگرہ نمبر بہت پسند آیا۔

ج : پیاری نصرت آپ کو کرن میں خوش آمدید کرتے ہیں۔ آپ کے خط کو ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالا گیا کیونکہ ردی کی ٹوکری کا کم از کم کرن میں کوئی وجود نہیں۔ سالگرہ نمبر پسند کرنے کا شکریہ۔ آئندہ بھی آپ خط لکھتی رہیے گا۔

حنین ملک..... فیصل آباد

مارچ کے کرن کا ٹائٹل دیکھتے ہی منہ سے نکلا واہ واہ۔ اس کے بعد رائٹرز کا سروے پڑھا۔ تشنگی لگی اگلے مہینے کا انتظار مشکل ہے۔ سب سے پہلے نادیہ احمد کا ناول "دل ہی تو ہے" پڑھا زبردست۔ تنزیلہ ریاض کا "راپنزل" اچھا جا رہا ہے۔ فائزہ افتخار کا "شاید" یکسانیت کا شکار ہو گیا ہے۔ آسیہ مرزا کا "من مورکھ" ٹھیک جا رہا ہے۔ نفیسہ سعید کا "مرجینا" پسند آیا۔ اس کے علاوہ مصباح علی کی کہانی بھی اچھی تھی۔ افسانوں میں صدف آصف کا "وفا شناس" سب پر بازی لے گیا۔ بہترین اور جدید انداز میں لکھی گئی۔ راشدہ رفعت کا افسانہ "چشم پوشی" اور امتل العزیز کا "محبت کے صدقے" مزا دے گئے۔ "برانڈ فوبیا" میں حقیقت بیان کی گئی۔ باقی سلسلے بھی ٹھیک لگے۔ ایک اہم بات تو رہ ہی گئی' کرن کی سالگرہ کے موقع پر آپ سب کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

آخر میں ایک بات کہنا چاہوں گی کرن ڈائجسٹ کا معیار پہلے کے مقابلے میں بہت بلند ہوا ہے۔

ج : کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ آپ ہر ماہ خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا کریں۔

افشاں علی...... کراچی

سب سے پہلے کرن کو 38 ویں سالگرہ مبارک 'دل کی گہرائیوں سے دعاگو ہوں کہ کرن کی یہ روشنی یونہی چمکتی رہے آمین۔ اس بار کا سالگرہ نمبر اتنا شان دار تشکیل دیا کہ 'بے ساختہ دل خط لکھنے پر مچل اٹھا' آخر کو یہ آپ نے ہمارے لیے ہی سجایا ہے۔

"کھولے پنکھ یادوں نے" اس بار کا سروے بہت عمدہ رہا۔ خاص کر کرن کی مشہور رائٹرز کے جواب پڑھ کر بہت اچھا لگا "ام طیفور" "جی "تسی چھاگئے"۔

مرجینا کی اسٹارٹنگ پڑھ کے بچپن میں پڑھی علی بابا اور قاسم کی اسٹوری یاد تازہ ہو چلی۔ مگر آگے جا کے اینڈنگ بالکل مختلف ہوئی۔ "پایا جو تجھے" اچھا ناولٹ تھا جبکہ ٹاپ آف دا ناولٹ "تم بن" لگا۔ مصباح علی بہت خوب لکھا آپ نے۔

"چشم پوشی" انوکھی تحریر رہی۔ واقعی بعض اوقات گھی نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔ "وفاشناس" صدف آصف جانا پہچانا نام 'بہت اچھا افسانہ' ایک ہلکا سا سبق ان لڑکیوں کے نام جو بعض اوقات فیس بک اور سوشل میڈیا کو اس حد تک اہمیت دینے میں مگن ہو جاتی ہیں کہ انجانے میں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار لیتی ہیں۔ "محبت کے صدقے" بھی بہت اچھا افسانہ تھا۔ سچ کہا کہ رشتوں کو محبت سے منانا چاہیے۔ "موج بہار" واقعی موج بہار ہی افسانہ تھا۔ جب تک کوئی بات یا واقعہ آپ پر نا بیتے' آپ کا اس کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ "برانڈ فوبیا" ہاہاہا نام جتنا مختلف کہانی اتنی حقیقت سے قریب تر ناول پھر ایک ہی ساتھ پڑھ کر رائے دوں گی۔ مکمل ناول 'نادیہ احمد نے بہت اچھا لکھا' الغرض اس بار کا شمارہ بہت زبردست رہا۔ باقی رہے مستقل سلسلے 'تو وہ سب ہی شان دار ہوتے ہی ہیں۔

ج: پیاری افشاں 'کرن کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ "نامے میرے نام" میں دوبارہ آئیں 'بہت خوشی ہوئی آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی اور پسندیدگی کی وجہ سے کرن نے کامیابی حاصل کی ہے۔

صبا خان...... بہاولپور

سب سے پہلے تو کرن کی سالگرہ کے موقع پر کرن کے پورے اسٹاف کو مبارک باد۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ سب کی محنت کی وجہ سے ہی پرچے کا معیار دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ مارچ کا ٹائٹل بہت عمدہ اور حسب تقریب لگا۔ اس کے بعد رائٹرز کا سروے پڑھا۔ سب نے ہی سوالات کے بہترین جواب دیے۔ فاطمہ ثریا بجیا کا اس دنیا سے جانا بلا شبہ ایک بڑا نقصان ہے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔ آسیہ مرزا کا "من مورکھ" کا اسٹارٹ اچھا چل رہا ہے۔ نایاب جیلانی کا "دل ٹوٹ کے ہارا" مخصوص طرز تحریر نادیہ احمد کا ناول بھی پسندیدگی پا گیا۔ تنزیلہ ریاض اور فائزہ افتخار اپنے ہی انداز میں آگے کی جانب گامزن ہیں۔ ناولٹ میں سب سے اچھا نفیسہ سعید کا "مرجینا" لگا۔ اس کے بعد افسانوں کی باری ہے۔ سب سے پہلے صدف آصف کا "وفاشناس" پڑھا۔ بہترین اور آج کے دور کی عکاسی کرتی ہوئی کہانی تھی۔ راشدہ رفعت کا افسانہ بھی زبردست لگا۔ "محبت کے صدقے" امتل عزیز صاحبہ نے اچھا لکھا۔ باقی سلسلے بھی ٹھیک تھے۔

ج: پیاری صبا آپ نے نامے میرے نام میں شرکت کی بہت خوشی ہوئی۔ کرن کو پسند کرنے کا شکریہ۔ امید ہے آپ آئندہ بھی کرن کی کہانیوں پر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

مسز نگہت غفار...... کراچی

"کھولے پنکھ یادوں کے" یہ سلسلہ بہت اچھا لگا تمام بہنوں کی باتیں سنیں بہت ہی اچھا لگا۔

"کہانیاں" سب سے پہلے آسیہ مرزا اپنی بہت پرانی دوست کا ناول پڑھا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔

"محبت کے صدقے" "مرجینا' موج بہار' دل ہی تو ہے۔ سارے خوب صورت عنوانوں پر مشتمل افسانے پسند آئے۔ ناول 'ناولٹ سب ہی اپنی اپنی جگہ اچھے تھے "چشم پوشی" مختصر لیکن بہت اچھی تھی۔ "موج بہار" سبق آموز تھی۔ "پایا جو تجھے" اختتامی پیراگراف اچھا تھا "برانڈ فوبیا" دیا شیراز کی کہانی بالکل حقیقت سے قریب ہے آج کل یہ ہی کچھ ہو رہا ہے کوئی سنبھل جاتا ہے وقت سے پہلے عقل آجاتی ہے کوئی ان لغویات میں گم ہو کر پچھتاوے سمیٹتا ہے "کرن کرن خوشبو" میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ 'بہترین خصلتیں' دونوں تحریریں' حنا ثریا انیقہ رانا' بسمہ علی ان کے مراسلات اچھے تھے۔

ج: پیاری نگہت پچھلے ماہ ہمیں آپ کا خط موصول نہیں

ہوا ورنہ ضرور شائع کیا جاتا۔ دیکھ لیجئے کہ اس دفعہ ملا اور شائع کردیا گیا اور سلسلوں میں بھی شامل کیا گیا۔

فوزیہ ثمرٹ ام ہانیہ عمران..... گجرات

مارچ کا کرن 16 تاریخ کو ملا۔ سرورق ماڈل پیاری تو لگ رہی تھی۔ مگر برائیڈل سرورق کچھ زیادہ پسند نہیں آتے مجھے پہلے کی طرح اداریہ کو پڑھا۔

سب سے پہلے "راپنزل" کو پڑھا۔ اس بار بھی قسط مزے کی تھی۔

"دل ٹوٹ کے ہارا تھا" عون پہ بے تحاشا غصہ آیا بڑا ہی ڈھیٹ بندہ ہے۔ اپنی انا کو لے کر بیٹھا ہے۔ مجھے تو ماہ رو اب مظلوم لگتی ہے۔

ناولٹ "مرجینا" موضوع وہی پرانا تھا گھریلو سا۔ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔

مصباح علی کا "تم بن" میرے خیال میں پورے ڈائجسٹ کی مزاحیہ تحریر تھی۔ ہیروئین کیا اتنی ہی بے وقوف ہوتی ہے۔ "پایا جو تجھے" یہ موضوع بھی اچھا ڈھونڈا فرحت صاحبہ نے کچھ خاص نہیں لگا۔

"شاید" یہ تو بہت ہی اچھا کیا۔ فائزہ جی نے ام ہانی کی تو جان چھوٹی سالار سے اب یہ تو تحریر کو ایویں ہی طویل کرنے والی بات ہے۔ افسانے سبھی کے سبھی اچھے تھے خاص کر "چشم پوشی" اپنی طرز کی انوکھی کاوش تھی۔ سچ ہے گھی ہمیشہ الٹی انگلیوں سے نکلتا ہے۔

"وفاشناس" اچھا سبق تھا ماوری جیسی لڑکیوں کے لیے۔ کچھ موتی چنے ہیں اس بار کچھ پسند نہیں آئے۔ "نامے میرے نام" میں خود کی غیر حاضری اچھی نہیں لگی۔

"محبت کے صدقے" "اب محبت میں اتنا بھی کریز نہیں ہونا چاہیے کہ اگلے بندے کا سانس گھٹنے لگے۔

"برانڈ فوبیا" ان عورتوں کا سیاپا۔ جن کو صرف اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ شوہر جہاں سے بھی پورا کرے یہ ان کی سردردی نہیں ہوتی۔

"موج بہار" کافی سبق آموز تحریر تھی۔ حرا جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو میکے کو بڑا مان دیتی ہیں پر جب سر پر پڑتی ہے تو عقل ٹھکانے لگتی ہیں جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

ج : پیاری فوزیہ اب کا شمارہ کرن کی مستقل قارئین میں ہوتا ہے یہ تو غلط بات ہوئی ناکہ اگر آپ کا خط یا تحریریں ہم تک دیر سے پہنچے اور کرن میں شائع نہ ہو تو آپ کو کرن پڑھنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ کا خط لکھنا ہم کو بہت اچھا لگتا ہے آپ لکھتی رہا کریں خط شامل نہ بھی ہو تو اس کو پڑھا ضرور جاتا ہے۔

فضہ نور..... روہڑی

مارچ کا ٹائٹل اچھا لگا دلہن بنی ماڈل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ حمد اور نعمت دونوں ہی ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔ انٹرویو اچھے لگے اظفر رحمان کے آخری سوال کا جواب دل کو بھا گیا.... "کھولے پنکھ یادوں نے" میں تمام مصنفین کے جواب لاجواب تھے در ثمین بلال کا کرن کے بارے میں یہ کہنا کہ کرن ایک بہترین رہنما اور دوست کی طرح گھر بیٹھے قارئین کی زندگی سنوارنے میں اہم کردار ادا کررہا ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ افسانے سب ہی سبق آموز تھے لیکن "چشم پوشی" نے دل خوش کردیا۔ "راپنزل" میں کاشف کے ساتھ رخشی نے بہت اچھا کیا۔ تنزیلہ جی پلیز سمیع کو شہرین سے الگ مت کیجئے گا۔ "دل ٹوٹ کے ہارا" میں عون کو ماہ رو کے ساتھ ہی کردیجئے گا آخری قسط اتنی جلدی کیوں کردی ہے' نایاب جیلانی' مصباح علی کا ناولٹ "تم بن" ہلکی پھلکی سی تحریر زبردست' نفیسہ سعید "مرجینا" میں زہرہ اور علی کا صبر اور پھر اس کا صبر "مرجینا" کی شکل میں مل گیا مصطفیٰ کا کردار لاجواب تھا۔ مکمل ناول ابھی پڑھا نہیں باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔

ج : ہمیں افسوس ہے کہ فروری کا شمارہ دیر سے ملنے کی وجہ سے آپ تبصرہ نہ کرسکیں مگر خوشی ہے کہ اس بار آپ شامل ہوگئیں آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا شکریہ۔

عائشہ وحید..... کراچی

لکھوں؟ یا نہ لکھوں؟ یہ کشمکش آج ختم ہوئی اور میں نے کرن میں شرکت کے لیے قلم اٹھا ہی لیا۔ 7th کلاس سے کرن کی خاموش قاری ہوں۔ تب تو شاید افسانے اور ناول سمجھ بھی نہیں آتے تھے مگر بس پڑھنے سے مطلب تھا۔ انٹرویوز کو پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ مگر جناب ایسی بات بھی نہیں ہے کہ یہ نا سمجھی زیادہ عرصہ برقرار رہی۔ تھوڑے ہی عرصے میں کہانیاں سمجھ آنے لگیں کرن نمبرون ہے۔ بے شک اب آتے ہیں سالگرہ نمبر کی طرف شمارہ آتے ہی پہلی دوڑ نایاب جیلانی کے "دل ٹوٹ کے ہارا تھا" کی طرف لگائی۔ وہ لفظوں سے کھیلنے کا ہنر جانتی ہیں۔ پڑھنے والا ان کی تحریر کے سحر میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔ ثنا جاوید سے

ملاقات اچھی رہی۔ اظفر رحمن تو زبردست، مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ افسانے سارے ہی بہترین تھے۔ "تم بن" بہت ہی اچھی لگی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں مشعل فیاض سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ میں نے بھی مقابل ہے آئینہ میں شرکت کے لیے جوابات بھیجے ہیں۔ پلیز مجھے جگہ ضرور دیجئے گا۔ پہلی بار خط لکھا ہے امید ہے آپ شائع ضرور کریں گے۔

ج : پیاری بہن عائشہ آپ نے پہلی بار خط لکھا بہت خوشی ہوئی کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ آئندہ بھی خط لکھتی رہیے گا اور "مقابل آئینہ" میں ان شاء اللہ آپ کو بھی ضرور شریک کیا جائے گا۔

روزینہ نعیم، یاسین نعیم۔۔۔ کھیالی گوجرانوالہ

مارچ کا ٹائٹل بھی اچھا تھا لیکن جیسے ہی فہرست پر نظر پڑی تو غصہ خوشی کا پردہ چاک کرکے میرے چہرے پر نمودار ہوا آہو "دل ٹوٹ کے ہارا تھا" پر جو نظر چلی گئی تھی پھر کیوں اپنا موڈ خراب کرنا جی! تو سب سے پہلے حسب معمول "نامے میرے نام" کو کھولا اور اپنا نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا لیکن اتنا کاٹ دیا آپ نے میرے خط کو اچھی والی ٹیچر بن جائیں آپ اچھا "کھولے پنکھ یادوں نے تو دل خوش کر دیا۔ ویسے تو ساری رائٹرز ہی آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی مانند ہیں پر صائمہ اکرم چوہدری میری موسٹ فیورٹ ہیں۔ بہت بہت مزا آیا ان کے متعلق پڑھ کر اس مہینے یکم مارچ کو میری سالگرہ تھی تو ڈائجسٹ کو دیکھ کر دل خوش ہوا کہ سالگرہ نمبر ہے اس لیے ساری کہانیوں کو میں نے حق سمجھ کر وصول کیا۔ مشعل فیاض سے بھی ملاقات اچھی رہی۔

افسانوں کی تو سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے چاہے وہ محبت کے صدقے ہو یا پھر "چشم پوشی" مجھے "موج بہار" میں دونوں بھابھیوں کی سوچ ایک دم غلط لگی۔ دوسروں کے لیے انسان ایسے ہی بے حس ہو جاتا ہے دیا شیرازی کا "برانڈ فوبیا" اف لوگوں میں یہ عادت وقت کے ساتھ مسلسل پروان چڑھتی جا رہی ہے اور اس کو بڑھانے میں ہمارے مارننگ شوز کا ہاتھ زیادہ ہے جب دیکھو برانڈڈ چیزوں کے اسٹال لگائے بیٹھی ہوتی ہیں۔ فائزہ افتخار کو تو سلام شکر ہے کہ ہانی کی زندگی سے سالار اعظم کو نکال دیا۔ "دل ٹوٹ کے ہارا" کے متعلق کیا کہوں جی فریحہ نے تو دل خوش کر دیا دل کر رہا تھا اسے پکڑ کر گول گول چکر لگاؤں۔ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا اس نے بدلہ لینے کا ماہ رو سے اور عون سے بھی۔

ج : لیجئے جی خوش دونوں کے نام شائع کر دیے ہیں اور خط کو کاٹنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ اگر طویل خط شائع ہو گئے تو بہت ساری بہنوں کے خطوط شائع نہ ہو سکیں گے۔

ثناء شہزاد۔۔۔ کراچی

.ثناء جاوید مجھے بہت پسند ہیں ان سے ملنا اچھا لگا .اظفر رحمان کے جواب بہت اچھے لگے۔ آصف الیاس صاحب ماشاء اللہ کافی محنتی ہیں اللہ پاک انہیں اور زیادہ کامیابیاں عطا کرے۔ اس بار کا سالگرہ نمبر ہر لحاظ سے بیسٹ تھا۔ سب کہانیاں اچھی لگیں۔ افسانے تو پانچوں ایک دوسرے پر سبقت لے گئے کسی ایک کو نمبر ون پہ رکھنا مشکل ہے سب اے ون تھے "من مورکھ کی بات" نہایت عمدگی سے آگے کا سفر طے کر رہا ہے "راپنزل" میں تنزیلہ ریاض نے یہ تو بتا دیا کے نینا کاشف کی بیٹی ہے اب اور حقیقتوں پر سے بھی پردہ اٹھا دیجئے کہ "راپنزل" کون ہے اور پلیز یہ میری ریکویسٹ ہے شہرین کو مت ماریے گا۔ "شاید" میں اب مجھے ہانی پر غصہ آ رہا ہے جو فضول میں سعد سے ضد لگا کر بیٹھ گئی ہے "مرجینا" میں نفیسہ سعید نے بہت خوب لکھا "تم بن" میں مصباح علی نے بھی اچھا لکھا لائبہ کو موی اور طیفی بھائی نظر آئے مگر زولجان کا خیال نہیں آیا جو اس سے خاموش محبت کرتا تھا مجھے زولجان کا نام بہت اچھا لگا پلیز آپ ناموں کے معنی بھی بتایا کریں "پایا جو تجھے" میں دبیر کا اپنی بہنوں کے لیے اتنا کیئرنگ ہونا اچھا لگا ایک بھائی کو بہنوں کے لیے ایسا ہی ہونا چاہیے "دل ہی تو ہے" نادیہ احمد تو بازی لے گئیں ویری نائیس بہت بہت اچھا لگا۔

ج : پیاری ثنا! آپ کو سالگرہ نمبر کا پرچہ پسند آیا۔ آپ کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

سلمٰی زبیر۔۔۔ لاہور

سب سے پہلے حمد و نعت سے مستفید ہوئے۔ ثنا جاوید اور اظفر رحمان سے ملاقات اچھی رہی۔

"کھولے پنکھ یادوں نے" تمام رائٹر کو پڑھ کے بہت اچھا لگا سب سے بیسٹ صائمہ اکرم اور نفیسہ سعید کا لگا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ "دل ٹوٹ کے ہارا

تھا" نایاب نے تو کمال ہی کر دیا۔ فریحہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا عون کی اگر منگنی ہوتی تو کوئی اور بات تھی۔ اب تحریم کس کا شوہر ہے اس بار ماہ رو کا کردار بہت فنی تھا۔ پلیز اس کا اینڈ ٹھیک کیجیے گا۔ "من مور کھ کی بات" آسیہ جی فضا کے ساتھ بہت برا ہوا۔ اب بابر کو بھی اس کی سزا ضرور دیجیے گا۔ "راپنزل" اس بار بھی اسٹوری کافی جاندار تھی۔ کاشف کے ساتھ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ جو شخص بیوی کو دھوکا دیں اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ "شاید" میں فائزہ جی آپ کی تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں شکر ہے کہ ہانی کی جان چھوٹی اس وحشی انسان سے پلیز اب سعد اور ام ہانی کو جدا مت کیجیے گا۔ نفیسہ سعید کا تو نام ہی کافی ہے اسٹوری بہت سپر تھی پڑھ کے مزا آیا "پایا جو تجھے" دبیر کچھ ضرورت سے زیادہ مغرور تھا مگر اینڈ کا اس کا کردار بہت اچھا لگا مصباح علی نے بھی خوب لکھا شروع میں جتنا فنی تھا آخر میں اتنا سیریس ہو گیا لائبہ کا کردار بہت اچھا تھا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف مجھے سب سے بیسٹ اسٹوری راشدہ رفعت کی لگی۔ ایسے لوگوں کو ایسے ہی قابو کیا جاتا ہے "وفا شناس" میں یوشع کا کردار ذرا نہیں بھایا مگر اس کا اینڈ بہت سپر ہوا باقی افسانے بھی زبردست تھے۔

ج : پیاری بہن سلمٰی! ہماری کوشش تو ہوتی ہے کہ سب بہنوں کے خطوط اور تحریریں شائع کریں مگر بعض اوقات آپ لوگوں کے خط تاخیر سے ملتے ہیں اب تو آپ خوش ہے کہ خط بھی شائع کیا اور سلسلوں میں بھی آپ کو جگہ ملی۔ خط لکھنے کا شکریہ آئندہ بھی لکھتی رہیے گا۔

ستارہ امین کومل..... پیر محل

خرابی صحت پھر ہسپتالوں کے چکروں نے مجھے ایسا چڑچڑا کر ڈالا کہ میں آپ لوگوں سے چاہنے کے باوجود بھی مخاطب نہ ہو سکی۔ اب جب اللہ کریم کے کرم سے طبیعت ذرا سا بہتر ہوئی تو پہلا خیال یہی آیا ہائے کتنے ماہ سے میں تبصرہ نہیں لکھا۔ تو جناب مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر خوب صورت سرورق سے سجا دل خوش ہوا کرن کتابچہ گھر کی بیکری زبردست لیکن میرا اس میں سے کچھ بھی بنانے کا کوئی موڈ نہیں آہو بیکری جو گھر دے کول اے اداریہ پڑھا۔ "حمد و نعت" سے دل منور کیا۔ ثنا جاوید، اظفر رحمن اور آصف الیاس کو کراس کرتے "کھولے بنکھ یادوں نے" بہت اچھے جوابات تھے سب کے آگے جناب ہماری پیاری پیاری مصنفین قطار بنا کر ہمیں سالگرہ پہ خصوصی تحاریر پیش کر رہی تھیں۔ پھر ہم نے بھی کیک تسمجھ کر کھائیں۔ ماشاء اللہ سارا شمارہ بہت پیارا ہر ہر سلسلہ بہترین تھا۔

ج : پیاری ستارہ امین کومل! اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ آپ نے طبیعت کی ناسازی کے باوجود خط لکھا بے حد شکریہ۔

حرا قریشی..... بلال کالونی ملتان

ذکر کرتی تھی ہر جگہ تیرا، میں نے خوشبو کے کان کھینچے ہیں

"شاید" کی گزشتہ اقساط پر بھی بات کروں تو سالار ایک ایسا شخص محسوس ہوتا ہے جو ژالہ باری سے محبت کا زعم رکھتے اسے جانتے بوجھتے یعنی ہماری، ہم سب کی سانجھی محبت "ام ہانی" کو طوفانوں کی زد میں دھکیل دیتا ہے۔ فائزہ جی اس قسط نے باکمال دھاک بٹھائی "چشم پوشی" کا حسین باقی تمام افسانوں پر بھاری رہا۔ "موج بہار" (رعنائی تو تھی پر محدود تھی) برانڈ فوبیا (بس پڑھ ہی لیا) محبت کے صدقے (تاریخ، تہوار سے بیش بہا قیمتی رشتے "ایک انمول پیغام کی آپ کی جانب سے پذیرائی ہوئی۔ از حد شکریہ!) "وفا شناس" شہاب کے اعتماد نے ماوری کو محبت کا ادھورا کھویا مان لوٹا دیا۔ یوشع جیسے لوگوں سے تو ہم دور ہی بھلے بھئی!) مرجینا میں مرجینا اور مصطفیٰ کی چھٹی حس نے خوب کام دکھایا۔ محترمہ کی خود اعتمادی اور دانش مندی کی داد دیتے ہیں) "تم بن اور پایا جو تجھے" بوریت کا اثر زائل کر دیتیں پر مسرت تازگی کا احساس بخشتی تحریریں تھیں۔ دل ہی تو..... نے گلاب کی پتیوں سی مہک اور سرما کی ٹھنڈی دھوپ سا مزہ دیا۔ "دل ٹوٹ کے ہارا تھا اور من مور کھ" کی بات پر فی الحال خاموشی ثبت کی ہے جلد ہی چپ کا قفل کھولے سرگوشیاں کرتے ابھریں گے۔ "راپنزل" (جواب ہی نہیں کوئی پڑھنے والا کا.....! ہر دفعہ اب تنزیلہ جی آپ کی تعریف ہی کرے جائیں بھلا!) انٹرویوز میں بھی تانکا جھانکا کی۔ مشعل فیاض نے حسن صورت مزاح کے خوب رنگ بکھیرے۔ ہر دفعہ فطرت عبارت میں چھپی لفظ بہ لفظ حیرت و اشتباء کی لطیف صفات اجاگر کرتے ہیں۔

ج : حراجی! آپ کا خط پڑھ کر ہمیں ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ آپ کے خوب صورت الفاظ من کو موہ لیتے ہیں۔ ہمارا مشورہ ہے

کہ آپ کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ دیں لگتا ہے کہ آپ اس میدان میں کامیاب ہو جائیں گی۔

آسما کنول..... اکوڑہ خٹک

پہلی دفعہ کرن کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں امید ہے عزت افزائی ہوگی میں تقریباً "12 سال سے کرن کی خاموش قاری ہوں آج "دل ٹوٹ کے ہارا" نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا حمد سے لے کر تبصرے تک پورا پڑھتی ہوں تب سکون ملتا ہے میں حافظ قرآن ہوں اور اپنا مدرسہ چلاتی ہوں لیکن کرن کے لیے ہر حال میں وقت ضرور نکالتی ہوں۔ ڈر بھی لگ رہا ہے کہ اگر آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو میری دوست میرا مذاق اڑائے گی۔ میری لکھائی کی وجہ سے میرا خط ردی کی ٹوکری میں مت ڈالیں کیونکہ میں نے اسکول نہیں پڑھی صرف مدرسہ کی تعلیم حاصل کی ہے لیکن مجھے کرن کی مستقل قاری بننے کا شوق نہیں جنون ہے۔

ج : پیاری بہن آسما! آپ اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں یہ آپ بہنوں کا ہی پرچہ ہے آپ بغیر ڈر خوف کے اس میں شامل ہوں اب ہر مہینے خط لکھیے اور کہانیوں پر تبصرہ کریں ہم منتظر رہیں گے۔

زکی امان..... اسلام آباد

سالگرہ نمبر تو سچ کا تحفہ لگا۔ لسٹ دیکھی اپنی پسندیدہ کئی رائٹرز لسٹ میں نظر آئیں دل خوش ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے مصباح علی کا ناولٹ "تم بن" پڑھا کیونکہ مجھے ان کی تحریر کا انتظار تھا۔ واہ بھئی خوب لکھا۔ دوسرا ناولٹ امتل العزیز کا "محبت کے صدقے" بہت اچھا لگا نفیسہ سعید تو بہت اچھا لکھتی ہیں لیکن "مرجینا" ایسا لگا جیسی علی بابا چالیس چور سے بے تحاشہ متاثر ہو کر لکھا گیا ہو افسانوں میں مجھے راشدہ رفعت کا "چشم پوشی" زبردست لگا۔ آپ ناول کب لکھیں گی؟ مکمل ناول میں مجھے نادیہ احمد کا "پایا جو تجھے" بھی زبردست صبرینہ اور معید کے ساتھ ہم نے بھی نیو یارک کی سیر کر لی۔ اسٹوری بھی اچھی تھی۔ اب بات کروں گی آسیہ مرزا کے سلسلے وار "من مورکھ کی بات نہ مانو" بھئی واقعی بہت اچھا لگا۔

ج : پیاری زکی امان! آپ نے تبصرہ کیا بہت اچھا لگا سالگرہ نمبر کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ آپ کو نادیہ احمد کا ناول اچھا لگا' نادیہ احمد کے ناول کا نام "دل ہی تو ہے" اور "پایا جو تجھے" فرحت شوکت کا ناولٹ تھا۔

جویریہ..... اسلام آباد

ہاسٹل کی زندگی بہت مشکل ہوتی ہے مگر ایسے میں ہمارے ڈائجسٹ تنہائی اور نف پڑھائی میں بہت ساتھ دیتے ہیں۔ افسانے پڑھے اور "برانڈ فوبیا" دیا شیرازی کا بہت اچھا لگا اور سمیرا غزل کا "موج بہار" بہت اچھا لگا اور خاصا درس لیے تھا۔ اس لیے مجھے یہ دونوں بہت اچھے لگے۔ ناولٹ میں مصباح علی کا "تم بن" نمبر لے گیا ان کا جملہ "قسمت میں جو جب اور اتنا تب ہی ملتا ہے۔" بہت اچھا لگا۔ بہت ہی حقیقی بات کہی انہوں نے ویلڈن۔

"راپنزل" کی تو میرا خیال ہے تنزیلہ جی کی تعریف نہیں بلکہ سلام پیش کرنا چاہیے۔ بہت ہی سمجھ دار ہیں۔ "شاید" فائزہ جی سعد بے چارے پر بہت ترس آتا ہے۔

پلیز میرا خط لگا دیجیے گا کیونکہ میں برستی بارش میں پوسٹ کروانے جاؤں گی۔

ج : پیاری بہن جویریہ! آپ کی کرن سے محبت ہے جو آپ برستی بارش میں بھی خط پوسٹ کرنے گئیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ پڑھائی کے دوران بھی کرن کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔

نشا نورین..... بوتالہ جھنڈا سنگھ

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور ہلکی ہلکی بارش میں کرن کا ملنا کسی سرپرائز سے کم نہیں تھا بارش میں کرن پڑھنے کا اپنا ہی مزا ہے اور تو اور اس دفعہ سب رائٹرز نے کمال لکھا۔

سب سے پہلے تو نعت شریف پڑھی مکمل ناول میں نادیہ احمد نے "دل ہی تو" ہے لکھ کر دل جیت لیا اور نفیسہ سعید نے "مرجینا" لکھ کر کمال کر دیا بلکہ اتنا اچھا ناولٹ لکھ کر حیران کر دیا۔ مرجینا کی نوک جھونک مزا دے گئی ویلڈن نفیسہ سعید "تم بن" کی تو کیا بات ہے لائبہ کی نادانیاں پر جہاں غصہ آ رہا تھا پر شکر ہے دیر سے سہی پر عقل آ گئی "پایا جو تجھے" واہ فرحت شوکت اتنا اچھا ناولٹ لکھنے پر اور کیا کہنے ناول ابھی نہیں پڑھے افسانے بھی اس دفعہ سارے ہی چار چاند لگا گئے۔ باقی مستقل سلسلے بھی اچھے لگے۔

ج : پیاری بہن! خط لکھنے کا بے حد شکریہ پچھلی دفعہ آپ کا خط تاخیر سے ملنے کی وجہ سے نہ لگ سکا' ہم معذرت چاہتے ہیں۔

✿ ✿